تاریخ اسلام

مکمل ۴ جلدیں

مولانا سید علی نقی النقوی

تاریخ اسلام

(مکمل ۴ جلدیں)

○ از قلم ○

سید العلماء مولانا سید علی نقی النقوی مرحوم

ناشر

امامیہ دار التبلیغ

C-362 گلی 12 جی 6/2 اسلام آباد

○ ملنے کا پتہ ○

عباس بک ایجنسی

رستم نگر درگاہ حضرت عباس لکھنؤ

فون نمبر : (R) 647590 (o) 647596

فیکس نمبر : (0522) 647910

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

اشاعت اول : ۱۹۹۶ء

اشاعت دوم : ۲۰۰۰ء

تعداد اشاعت : ۱۰۰۰

ناشر : امامیہ دار التبلیغ، 3620-C گلی 12

جی 6/2، اسلام آباد

ہدیہ : =/140

ملنے کے پتے :

محفوظ بک ایجنسی

مارٹن روڈ، کراچی

Tel: 4124286- 4917823 Fax: 4312882
E-mail: anisco@cyber.net.pk

عباس بک ایجنسی

رستم نگر درگاہ حضرت عباس لکھنؤ

فون نمبر : (R) 647590 (o) 647596

فیکس نمبر : (0522) 647910

بسم الله الرحمن الرحيم

عرضِ ناشر

تاریخ کا ایک طالب علم بھی اس حقیقت سے انکار نہ کر سکے گا کہ ملتِ جعفریہ کے افراد جو واقعاً اسلامی روایات کے حقیقی ورثہ دار تھے شروع ہی سے سیاسی طاقتوں کے ظلم وجور کا نشانہ بنے رہے۔ زبان و قلم پر پہرے رہے، زبانیں گدیوں سے کھینچی گئیں، ہاتھ قلم کئے جاتے رہے، اعضاو جوارح پارہ پارہ ہوئے، سر گردنوں سے جدا ہوتے رہے۔ خون کے گارے سے دیواریں بنائی گئیں۔ دیواروں میں زندہ چنوائے گئے لیکن کیا کہنے ہمارے ان علماء اعلام کے (خداتعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے) کہ جنہوں نے ہر قسم کی قربانیاں پیش کیں لیکن شیعی علم الکلام اور فقہ جعفری کو زندہ رکھا۔

یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جسے کبھی فراموش نہ کیا جاسکے گا۔ اسی وجہ سے عقائد واحکامِ شرعیہ تو اصلی صورت میں ہم تک پہنچ گئے مگر تاریخ کی کتابیں حکومتوں کے زیر اثر کچھ ایسے انداز سے مرتب ہوئیں کہ مفاہیم و مطالب اپنی اصلی شکل میں سامنے نہ آسکے اور شیعہ نکتۂ نگاہ سے تاریخ اسلام اپنے صحیح خدوخال کے ساتھ سامنے نہ آسکی، اور اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی کہ صحیح معنی میں تاریخ اسلام لکھی جائے۔

اسی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سرکار سید العلماء علامہ سیّد علی نقی نقوی مرحوم نے اس اہم کام کا بیڑا اُٹھایا اور ایک مُستند تاریخ اسلام مرتب کی۔

یہ کتاب سب سے پہلے امامیہ مشن لکھنؤ نے ہندوستان میں طبع کی اس کے بعد 1971ء میں لاہور سے ادارہ امامیہ مشن پاکستان کے روحِ رواں جناب خواجہ حبیب علی

کے زیرِ نگرانی الگ الگ 3 حصوں میں شائع کی گئی۔

اس کا چوتھا حصّہ ہندوستان میں شائع ہوا تھا۔ جو اب اس دوسرے ایڈیشن میں شامل کر دیا گیا ہے۔

اس کتاب کے پہلے حصّے میں ہجرت رسولؐ خدا کے واقعات نہایت اختصار کے باوجود بڑی خوبصورتی اور جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرے حصّے میں تاریخ اسلام کے نظامِ جہاد کو اس طرح نکھار کر پیش کیا گیا ہے کہ ملک گیری کی تمام جنگوں کی حقیقی پوزیشن واضح ہو جاتی ہے۔ تیسری جلد میں جنگِ اُحد کے بعد کے حالات سے فتح خیبر ۷ھ تک کے ضروری واقعات پیش کئے گئے ہیں۔

امامیہ دار التبلیغ اسلام آباد نے اس کتاب کو عمدہ انداز میں شائع کرنے کا شرف حاصل کیا ہے، ادارہ علامہ حافظ سید ریاض حسین قبلہ نجفی پرنسپل جامعۃ المنتظر لاہور کا شکر گزار ہے جن کی وساطت سے امامیہ مشن پاکستان کے منتظمین نے اس کتاب کے شائع ہونے پر مسرت کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ امامیہ مشن پاکستان کو دِن دوگنی رات چوگنی ترقی نصیب فرمائے۔ آمین۔

شکر گزار

ثقلین کاظمی

اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

تاریخ اسلام حصہ اول

1 آغاز آفرینش ---------- 1
2 تاریخ اسلام اور اس کا آغاز ---------- 7
3 حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور ان کے اسلامی کارنامے ---------- 8
4 آل ابراہیم سرزمین حجاز میں ولادت اسماعیل اور ہجرت ہاجرہ ---------- 16
5 بیٹے کی قربانی ---------- 17
6 تعمیر کعبہ ---------- 21
7 حج کا اعلان ---------- 22
8 اولاد ابراہیم کی دو شاخیں ---------- 24
9 بنی اسرائیل اور اسلام ---------- 24
10 حضرت اسحاقؑ ---------- 25
11 حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ ---------- 26
12 نسل حضرت اسماعیلؑ ---------- 28
13 نسل قریش کی ابتدا ---------- 32
14 واقعہ فیل اور اس کے اسباب ---------- 37
15 حضرت عبداللہؑ ---------- 40
16 حضرت ابوطالبؑ ---------- 41
17 پیغمبر اسلامؐ کی ولادت ---------- 41
18 نشوونما ---------- 42
19 یتیم الابوین ---------- 42
20 دادا کی تربیت ---------- 42

21	ابو طالب کی مشفقانہ پرورش	43
22	سفر شام	44
23	سیرت کی بلندی	45
24	حلف فضول	45
25	شام کا دوسرا سفر	46
26	خانہ آبادی	46
27	بنائے کعبہ	51
28	طلوع آفتاب رسالت	54
29	پہلی وحی	56
30	سابقین الی الاسلام	57
31	تقیہ پر عمل	59
32	دعوت عشیرہ	61
33	مجمع عام میں پہلی تبلیغ	62
34	اسلام کا پیغام انقلاب	63
35	جناب ابو طالب سے گفت و شنید	70
36	براہ راست معاملت کی کوشش	77
37	مسلمانوں پر تشدد	78
38	ملک حبشہ کی طرف ہجرت	80
39	شہنشاہ حبش کا دربار	82
40	اسلام کی رفتار ترقی	84
41	شعب ابو طالب میں محصوری	85
42	وفات حضرت ابو طالب	93
43	وفات جناب خدیجہ الکبریٰ	98
44	سفر طائف	100
45	مصائب کی شدت	103
46	یثرب کے نصیب کی بیداری	105

47	عقبہ اولی	111
48	مدینہ میں اسلام کی کامیابی	112
49	بیعت عقبہ ثانیہ اور قرارداد ہجرت	116
50	اصحاب کی روانگی	119
51	منصوبہ قتل اور رسولؐ خدا کی ہجرت	120

تاریخ اسلام حصہ دوم

52	رسول خداؐ کا مدینہ میں ورود اور آپ کا استقبال	129
53	ہجرت کی تاریخی اہمیت	142
54	ہمدردوں کی وفات	146
55	بنی نجار کا فخر	147
56	مہاجرین کی بحالی	147
57	اصحاب صفہ	148
58	مواخات	148
59	یہودیوں سے معاہدہ	150
60	اذان واقامت کی تشریح	156
61	نماز کی چار رکعات	157
62	آغازِ جہاد اور اس کے اسباب	157
63	بدر سے پہلے کی آویزشیں اور ان کی نوعیت	166
64	جنگ بدر	172
65	سبب جنگ	173
66	افسانہ غارت گری کی بنیاد	177
67	سلاطین بنی امیہ کی مزید خاطرداری	185
68	صحابہ کا امتحان اور مقدادؓ کی مجاہدانہ تقریر	186
69	حالات جنگ	190

70 نتیجہ جنگ مشرکین کی شکست اوران کے مقتولین کی کثرت واہمیت ----------- 197
71 جنگ کے بعد ----------- 203
72 غزوہ بنی قینقاع ----------- 212
73 عقد حضرت سیدۂ عالم ----------- 213
74 اس سال کے دوسرے واقعات ----------- 214
75 غزوہ سویق ----------- 217
76 سن ۳ ہجری کے چھوٹے واقعات ----------- 218
77 سبط اکبرؑ کی ولادت ----------- 221
78 جنگ احد ----------- 223
79 مسلمانوں کا مال غنیمت پر ٹوٹنا اور جنگ کا بگڑ جانا ----------- 236
80 وفاداروں کے کارنامے ----------- 244
81 پیغمبر خداؐ پر حملوں کی شدت ----------- 248
82 حضرت علیؑ بن ابی طالب کا بے مثال کارنامہ ----------- 252
83 جنگ کے بعد ----------- 261
84 بھائی کی لاش پر بہن کی آمد ----------- 264
85 ایک خاتون کا جذبہ ایمانی ----------- 265
86 عبرت ناک ----------- 265
87 دفن شہداء اور مراجعت ----------- 267
88 شہداء کا ماتم ----------- 268
89 نبیؐ اور علیؑ کی تلواریں فاطمہ زہراؑ کے ہاتھ میں ----------- 269
90 غزوہ حمراء الاسد ----------- 270

تاریخ اسلام حصہ سوئم

91 رجیع اور بیئر معونہ کے دوالمناک المیئے ----------- 272
92 مشرکین مکہ کی سازش ----------- 272

93 رسولؐ کا علم غیب ---------- 272
94 تبلیغی وفد کا قتل ---------- 273
95 حضرت خبیب کا جذبہ ایمان ---------- 274
96 تختہ دار پر نعرہ ایمان ---------- 274
97 اہل نجد پر پیغمبرؐ اسلام کی بے اطمینانی ---------- 275
98 ظالموں پر نام بنام لعنت کرنا سنت رسولؐ ہے ---------- 276
99 یہودیوں سے تصادم کا آغاز ---------- 276
100 غزوہ بنی نضیر ---------- 278
101 آنحضورؐ کو قتل کرنے کی یہودی سازش ---------- 278
102 رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی خباثت ---------- 279
103 حضرت علیؑ قلعہ یہود کا محاصرہ کرتے ہیں ---------- 280
104 بنی نضیر کی جلاوطنی ---------- 280
105 فدیہ اسلام (حسینؑ) کی ولادت ---------- 281
106 غزوہ بدر الموعد ---------- 281
107 غزوہ بنی مصطلق ---------- 282
108 غزوہ احزاب یا جنگ خندق ---------- 283
109 اسلام کے خلاف یہود، قریش اور کفار کا گٹھ جوڑ ---------- 283
110 تعین سال کے متعلق ابن خلدون کی کمزور دلیل ---------- 284
111 حضرت سلمانؓ کی تجویز خندق ---------- 285
112 حکم قرآن اور صحابہ کی عملی مخالفت ---------- 286
113 السلمان منا اھل البیت ---------- 288
114 مدینہ کا محاصرہ ---------- 289
115 جنگ کے نازک وقت بنی قریظہ کی عہد شکنی ---------- 289
116 مجاہدین اسلام پر دشمن کی ہیبت کا منظر قرآنی الفاظ میں ---------- 292
117 نعرہ تکبیر کا رعب ---------- 293
118 معرکہ خندق اکیلے علیؑ کا کارنامہ ہے ---------- 296

119 عمر بن عبدود کی دھاک ---------- 297
120 عمر بن عبدود خندق پار کرتا ہے ---------- 298
121 عمر بن عبدود کے رعب سے مسلم فوج کی حالت ---------- 300
122 عمر بن عبدود کے مقابلے میں علیؑ کی للکار ---------- 300
123 عمر بن عبدود کا مسلمانوں کی مذہبی غیرت کو چیلنج ---------- 301
124 جنگ کے لیے حضرت علیؑ کو اسلحہ پہنا کر رسولؐ خدا دعا کرتے ہیں ---------- 302
125 کل ایمان اور کل کفر کا مقابلہ ---------- 303
126 ضربت حضرت علیؑ کی خصوصیات ---------- 304
127 دشمن دین کا قتل ---------- 305
128 عمرو کے دوسرے ساتھیوں کا فرار ---------- 307
129 پیغمبرؐ کا لاش مشرک کی قیمت لینے سے انکار ---------- 307
130 کافر حضرت علیؑ کی شکل میں موت دیکھتا ہے ---------- 308
131 ضرار کا حضرت عمرؓ بن خطاب پر احسان ---------- 308
132 بلند ظرفی کا مثالی نمونہ ---------- 309
133 مقتول عمر ابن عبدود کی بہن کی زبانی حضرت علیؑ کا قصیدہ ---------- 309
134 جناب سعد ابن معاذ معرض شہادت میں ---------- 310
135 سعد ابن معاذؓ کی دعا ---------- 311
136 جنگ خندق کا اختتام ---------- 312
137 بہشت کی ضمانت پر بھی صحابہ کی خاموشی ---------- 313
138 ابوسفیان کا نعرہ فرار ---------- 313
139 بنی قریظہ کی سرکوبی ---------- 314
140 حضرت علیؑ علمدار لشکر ---------- 314
141 حضرت علیؑ کی ہیبت سے دشمن نے ہتھیار ڈال دیے ---------- 315
142 حضرت سعد بن معاذ کی ثالثی ---------- 316
143 ثالث کا فیصلہ ---------- 321
144 دو اہم واقعے ---------- 325

145 سزا کی سختی پر تبصرہ ---------- 327

146 بنی قریظہ کا انجام ---------- 330

147 جناب سعد بن معاذ کی قبولیت دعا اور وفات ---------- 332

148 کچھ چھوٹی مہمیں ---------- 332

149 معرکہ حدیبیہ یا صبر وایمان کا امتحان ---------- 335

150 واقعہ کا پس منظر ---------- 335

151 حضرت عمرؓ کفار مکہ سے خوفزدہ تھے ---------- 338

152 صحابہ سے اس امر پر بیعت لی گئی کہ وہ جنگ سے فرار نہیں کریں گے ---------- 340

153 کیا صحابہ بیعت پر قائم رہے؟ ---------- 342

154 صلح نامہ حدیبیہ کی شرائط ---------- 345

155 اسلام میں جمہوریت نام کی کوئی چیز نہیں ---------- 346

156 صلح کے لیے صحابہ سے کوئی مشورہ نہیں لیا گیا ---------- 347

157 صحابہ کے جذبات قوتِ ایمان پر غالب آگئے ---------- 350

158 صحابہ قریب بہ ہلاکت۔ حضرت عمرؓ کا رسالت میں شک ---------- 350

159 حضرت عمرؓ فتح مبین کو نہ سمجھ سکے ---------- 352

160 رسول پاکؐ نے صحابہ کی کثرت رائے کو ٹھکرا دیا ---------- 354

161 حضرت عمرؓ اپنی گستاخی پر تمام عمر نادم رہے ---------- 355

162 صحابہ کے لئے صبر آزما مرحلہ ابو جندل کا واقعہ ---------- 355

163 صلح حدیبیہ کے اثرات ---------- 359

164 غزوہ خیبر ---------- 361

165 خیبر پر حملے کا پس منظر اور اس کی نوعیت ---------- 362

166 فوج اسلام کی روانگی اور محاذ جنگ ---------- 363

167 نبی اکرمؐ اور حضرت علیؑ دونوں کی علالت ---------- 364

168 حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ خود ہی علم لے کر جاتے رہے ---------- 366

169 فتح خیبر کے لئے پیغمبر اسلامؐ کا تاریخی اعلان ---------- 369

170 عطائے علم پر تبصرہ ---------- 370

171 حضرت علیؑ کی مدح میں رسولؐ خدا کے خصوصی الفاظ ---------- 371
172 صحابہ کی تمنائے علم کے لئے بے قراری ---------- 373
173 حصول علم کے لئے ہر شخص خود کو نمایاں کرتا ہے ---------- 374
174 صبح خیبر کا منظر اور حضرت علیؑ کی طلبی بحالت آشوب چشم ---------- 375
175 سعد بن وقاص اور حضرت عمرؓ بن خطاب کی حسرت ---------- 376
176 رسولؐ خدا کے لعاب دہن کا اعجاز ---------- 377
177 رسولؐ خدا حضرت علیؑ کو اسلحہ جنگ سے آراستہ کرتے ہیں ---------- 379
178 اسلامی جنگ کا معیار فتح ---------- 379
179 ضربت حیدری کی گونج ---------- 380
180 حضرت علیؑ کی حیرت انگیز طاقت کے مظاہرے اور فتح خیبر کی تکمیل ---------- 383
181 صفیہ کی اسیری اور پیغمبر خداؐ کی دل جوئی ---------- 385
182 صفیہ کو اقرباء کی لاشوں کے پاس سے گزارنا رسولؐ خدا کو ناگوار ہوا ---------- 386

تاریخ اسلام حصہ چہارم

183 فدک ---------- 389
184 مہاجرین حبشہ کی مراجعت ---------- 394
185 منبر رسولؐ ---------- 396
186 عمرۃ القضاء ---------- 397
187 پیغمبر اسلام کے خطوط اور ان کے اثرات ونتائج ---------- 399
188 جنگ موتہ ---------- 407
189 پس منظر ---------- 410
190 خالد بن ولید کا کارنامہ ---------- 416
191 مشرکین کی بدعہدی اور بنائے مخاصمت ---------- 421
192 عزم روانگی اور بعض صحابہ کی مخبری ---------- 426
193 پیغمبر خدا کے امن پرور اعلانات ---------- 433

194	عفو عام کا تاریخی اعلان	441
195	تطہیر کعبہ یا بت شکنی	450
196	تبلیغی مہمیں	456
197	غزوہ حنین	458
198	ایک باحمیت خاتون کا غصہ	465
199	جنگ اوطاس و طائف	467
200	مال غنیمت کی تقسیم پر پیغمبرؐ خدا کا معجز آفرین خطبہ	468
201	غزوہ تبوک	471
202	رسولؐ خدا کی جان لینے کا منصوبہ	473
203	تبلیغ سورہ برائت	478
204	واقعہ مباہلہ	482
205	فتح یمن	485
206	حجۃ الوداع	487
207	حج کی مفصل کیفیت	490
208	جانشینی حضرت علیؑ کا اعلان اور خطبہ غدیر خم	493
209	کتاب لغات و معاجم میں غدیر خم کے خطبہ کی گونج	499
210	نزول آیۂ بلغ	499
211	خطبہ غدیر خم کے خاص خاص فقرات	501
212	خلیفہ دوم کی مبارکباد	506
213	مدینہ کی طرف واپسی اور لشکر اسامہ کی تیاری	508
214	رسولؐ خدا کی علالت اور زندگی کے آخری لمحات	513
215	نقل مکان اور امامت نماز کا منصوبہ	515
216	نفسیاتی کرب و اذیت اور آخری کوشش	519
217	آخری وصیتیں	526
218	زندگی کا آخری دن اور وفات رسول خداؐ	527
219	مدینہ میں کہرام اور تاریخ وفات رسول خداؐ	530

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانبیآء والمرسلین وآلہ الطاھرین

آغاز آفرینش

اللہ ہی اللہ تھا اور کچھ نہ تھا۔ پھر اس کی مشیت کے اشارہ سے ایک جوہر نور پیدا ہوا جس سے عدم کی ہمہ گیر ظلمت وجود کی صلاحیتوں سے جگمگا اٹھی۔ اس ایک نور کے احاطہ میں تیرہ نور اور چمک رہے تھے۔ ان انوار کی کرنوں میں جو فضا بن کر محیط ہوئیں اس کے بعد تو لاکھوں چھوٹے بڑے نور اپنی اپنی تڑپ دکھانے لگے۔

زمانہ تھا نہیں تاکہ وقت بتایا جا سکے کہ کب تک یہ عالم رہا۔ پھر عمومی طور پر ارواح کی پیدائش ہوئی۔ جنہوں نے روشنی کے ساتھ ماسوی اللہ کے لئے زندگی کی ہوا چلائی۔ قیامت تک کی پیدا ہونے والی ذی روح مخلوق آج اپنے ارادہ و شعور کے جوہر سمیت جمع تھی اور اس وقت خالق نے ان سے اپنی معرفت اور اطاعت کا اقرار لیا اور سب نے اس کا عہد و پیمان باندھا۔ نہ کہنے والے کو خطاب میں زبان درکار تھی نہ سننے والوں کو کانوں کی احتیاج۔ وہ جسم و جسمانیت سے بری اور یہ بھی جسمیت سے بے لوث۔ اس سوال و جواب کا مضمون جب ہمارے سنانے کے لئے الفاظ کے قالب میں آیا تو الست بربکم کے سوال اور بلیٰ کے جواب سے اس کا ماحصل معلوم ہوا۔

روح کے بعد مادہ کی باری آئی۔ مادہ کے ساتھ ساتھ صورت کی جلوہ گری ہوئی۔ پہلی صورت جس کا عالم مادی میں پتہ چلتا ہے مادہ پانی اور ہوا کی ہے۔ نیچے

پانی اور اوپر ہوا۔ پھر ہوا کے جھونکے اس پانی کے اندر چلے اور ان کے تھپیڑوں سے اس پانی میں تموج پیدا ہوا۔ پانی کے جوش و خروش سے کف پیدا ہوا اور بخارات بلند ہوئے۔ یہ بخارات فضائے ہوا میں بلند ہو کر محیط ہو گئے جو آسمان کہلائے۔ اس میں سات طبقے قرار دیئے گئے اور ان ساتوں آسمانوں میں ملائکہ کی عظیم الشان بستی بسائی گئی۔ یہ مادی کثافتوں اور گناہ کی آلائشوں سے بری پاک مخلوق ہیں جن کا کام صرف اللہ کی عبادت اور اطاعت کرنا ہے۔ عالم طبیعت کے انتظام و تدبیر کا کام ان کے سپرد کر دیا گیا ہے کہ وہ اسے احکام الٰہی کے ماتحت انجام دیں۔

انہیں آسمانوں میں ہزاروں ثوابت اور سیارے چمکائے۔ ان میں کوئی سورج ہے اور کوئی چاند اور کچھ ستارے ہیں۔ جو سورج کے ارد گرد چکر لگاتے ہیں۔

پانی کی سطح پر تھوڑے حصہ میں خالق کے ارادے نے اسی کف کی موٹی تہ ایسی جما دی جیسے دودھ پر بالائی ہوتی ہے۔ اس تہ کا نام زمین ہوا اور جس جگہ سے یہ جمنا شروع ہوئی تھی اسی کا نام مکہ قرار پایا جہاں مسلمان حج کو جاتے ہیں مگر زمین کے ادھر ادھر چاروں طرف اور پھر نیچے پانی ہی پانی تھا جو تھپیڑے مار رہا تھا اس لئے وہ ڈانواں ڈول اور بے قرار تھی۔ اسے بھاری بھر کم بنانے کے لئے پہاڑ پیدا ہوئے جو اس میں میخوں کی طرح گڑ گئے۔ پہاڑوں سے چشمے پھوٹے جنہوں نے خشک زمینوں کی سیرابی کا انتظام کیا۔ اونچے اونچے ٹیلے اور دور افتادہ مقامات جن تک چشموں کا پانی نہیں پہنچ سکتا تھا ان کے لئے بادل پیدا ہوئے جو پانی کا خزانہ لے کر سفر کرتے اور ان دور افتادہ مقامات کو اپنی بارش سے سیراب کرتے ہیں۔

اب ان چشموں کی آبیاری اور ان بادلوں کی آب باری سے زمین کی سوئی ہوئی نمو کی طاقتوں نے کروٹ لی۔ اس میں زندگی پیدا ہوئی۔ سبزہ لہلہانے لگا اور طرح طرح کے درخت ' بیل بوٹے سطح زمین پر جھومنے اور لہریں لینے لگے۔ اب عالم میں رنگ و بو کی کوئی کمی نہ تھی مگر سوا سمندر کے خروش اور چشموں کی روانی یا کبھی بادلوں کی کڑک اور گرج کے کوئی آواز نہ تھی مگر جب ان درختوں کے پھلوں اور پتیوں نے خوان رزق چن لیا تو عالم کے سناٹے کو چہل پہل سے تبدیل

کرنے کے لئے بہت سی جاندار مخلوق' رنگ برنگ کے حیوانات عدم کے سمندر سے نکل کر وجود کے ساحل پر اکٹھا ہونے لگے اور چرند پرند' بہائم اور درندوں کا ایک جمگھٹا لگ گیا اور شور برپا ہو گیا مگر اس مخلوق میں حرکت اور ارادے کی تنظیم کے لئے شعور نہ تھا- یہ پوری کارگاہ ڈھکتے ہوئے شیروں' لپکتے ہوئے بھیڑیوں اور ڈسنے والے اژدہوں سے محشرستان بنی ہوئی تھی- اس کی تنظیم کے لئے پہلے آگ سے پیدا کی ہوئی ایک مخلوق بنی جان کو برسرکار لایا گیا کہ اس نوع کو موقع آزمائش میں لا کر اس کو اپنی صلاحیتوں کی حد کا اندازہ کرا دیا جائے- اس نے اپنی بڑھی ہوئی حرارت مزاج سے اس دنیا میں غیظ و غضب کی آگ بھڑکا دی اور دوسری کائنات میں نظم و ضبط پیدا کرنے کی بجائے خود باہمی جنگ و جدال اور خونریزی سے فساد عظیم برپا کیا اور اپنے خالق کی اطاعت چھوڑ کر اس کے احکام کی خلاف ورزی شروع کر دی-

اس وقت آسمان پر نور کی پیداوار مخلوق تھی جسے ملک کہتے ہیں اور زمین پر بہ نار کی پیداوار تھی جسے جن کہتے ہیں- وہ ہمہ تن اطاعت و عبادت تھے اور یہ ہمہ تن کفر و معصیت بن گئے- اس لئے وہ ان کو دیکھ کر نالاں تھے- آخر خالق کا غضب نازل ہوا اور یہ پوری کی پوری قوم اس زمین سے بے دخل ہو گئی- ان میں سے ایک جو اس وقت تک عابد و زاہد نظر آتا تھا اپنی اس عبادت کے نتیجہ میں بچا لیا گیا اور اسے عالم بالا کے بسنے والے ملائکہ کی صفوں میں جگہ دے دی گئی- جہاں وہ ان کے ساتھ ایسا گھل مل گیا جیسے کہ ان ہی میں سے ہے اس کا نام عزا زیل تھا جو بعد میں ابلیس اور شیطان کہلایا-

اب خالق کی طرف سے فرشتوں کے درمیان ایک اعلان ہوا کہ میں زمین پر اپنی طرف سے ایک نائب مقرر کرنے والا ہوں- فرشتے جو بنی جان کی خونریزی اور فساد دیکھ چکے تھے کہنے لگے کہ کیا ایسے کو مقرر کیا جائے گا جو زمین میں فساد برپا کرے اور خونریزی؟ حالانکہ ہم تیری تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں- جواب ملا کہ جو میں جانتا ہوں اس کو تم نہیں جانتے- یعنی میرے کاموں میں جن کی حکمتیں راز

میں ہیں تمہیں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ ملائکہ خاموش ہو گئے۔ پھر ایک دفعہ یہ اعلان ہو گیا کہ میں ایک مخصوص نوع مخلوق بشر کو مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں۔ جب میں اس کا پتلا تیار کر لوں اور اس میں اپنی پسند کی ہوئی خاص روح داخل کر لوں تو تم سب اس کے لئے سجدہ میں جھک جانا۔ اسے سب نے سن لیا اور اس وقت کسی نے انکار نہیں کیا۔

اب خالق نے اپنی قدرت کے انتظام خاص سے شور و شیریں ہموار و ناہموار ہر طرح کی زمین سے خاک یکجا کرائی۔ پانی کی شرکت سے اس کا پیکر تیار ہوا جسے ہواؤں نے خشک کھنکھناتا بنا دیا اور اس کو اپنی پسندیدہ روح ڈال کر خدا نے جاندار بنایا۔ یہ انسان اول ابوالبشر آدمؑ تھے۔

اب ملائکہ کو حکم ہوا کہ اس کے سجدے کے لئے جھک جاؤ۔ سب نے تو پیشانیاں سجدہ میں رکھ دیں مگر عزازیل نے انکار کر دیا اور کہا میری خلقت آگ سے ہے جو محل میں خاک سے بلند ہے۔ پھر بھلا میں اس کو کیونکر سجدہ کروں۔ یہ اس کا تکبر اور انکار غضب خالق کا سبب بنا اور حکم ہوا کہ نکل جا۔ ملاء اعلیٰ اور صفوف ملائکہ سے وہ نکل تو گیا مگر اس نے انسان کی بلندی کے دعوے کو شکست دینے کے لئے خالق سے قیامت تک کی اپنے لئے مہلت لے لی کہ دیکھو تو سہی جو تمام انسانوں کو گمراہ کرکے دم لوں اور دکھا دوں کہ یہ اس عزت کا حقدار نہیں ہے جو اسے دی گئی۔ خالق نے بھی اپنی بات بالا ہونے کے ثبوت اور اس کی حجت کو ختم کرنے کے لئے اسے مہلت دے دی کہ تو لاکھ کوشش کرے پھر بھی انسانوں میں میرے کچھ سچے اور اچھے بندے ایسے رہیں گے جو کسی طرح تیرے ورغلانے میں نہ آئیں گے اور حق اور نیکی کے راستے سے نہ ہٹیں گے۔

اب جو انسان گمراہی میں پڑتے اور فساد کے مرتکب ہوتے ہیں وہ اپنی بساط بھر شیطان کی بات پوری کرنے میں حصہ لے کر اس کے مددگار بنتے ہیں اور جو نیکی اور خدا پرستی کے راستے پر قائم رہتے ہیں اور جو نیکی اور خدا پرستی کے راستے پر قائم رہتے ہیں وہ اپنے خدا کی بات کو برقرار رکھتے اور اس کے مددگار قرار پاتے ہیں۔

آدمؑ ہی کے پیکر کی بچی ہوئی مٹی سے صنف اناث کی پہلی فرد حواؑ کی پیدائش ہوئی جنہیں خالق نے آدمؑ کا شریک زندگی قرار دیا اور ان دونوں کو کچھ مدت کے لئے جب تک اسے منظور ہوتا اپنے ایک مخصوص باغ پر بہار میں رہنے کا حکم دیا مگر اس وقت انہیں ایک خاص درخت کے قریب جانے سے روک دیا' یہ کہہ کر کہ اگر اس درخت کے پاس گئے تو فوراً اس جنت سے باہر کر دیئے جاؤ گے۔

شیطان' کہ جسے آدمؑ کی بلندی اور عزت کی بنا پر ان سے پرخاش پیدا ہو گئی تھی حضرت حوا کے ذریعے سے آدمؑ کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ اس درخت کے قریب گئے بغیر اگر اس میں سے چکھ لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ احتیاط کی رو سے بہتر ان کے لئے یہی تھا کہ وہ کم از کم اس بارے میں رب العزت سے اجازت حاصل کر لیتے مگر انہوں نے اس بارے میں تساہل سے کام لے کر بیوی کے مشورے ہی پر عمل کر لیا جس کا محرک دراصل بر بنائے عداوت ابلیس ہوا تھا۔

اس درخت سے کھانا تھا کہ جنت کے لباس ان کے جسم سے اتر گئے اور خالق کے حکم سے فوراً ان کو اس جنت سے نکل کر اس دنیا میں آنے کا حکم ہو گیا۔ جہاں ایک وقت میں تو انہیں آنا ہی تھا اس لئے کہ وہ اسی زمین کی خلافت کے لئے تو پیدا ہی کئے گئے تھے۔ اب انہیں اپنے کیے کا پچھتاوا بہت ہوا اور انہوں نے خالق کی بارگاہ میں بڑی توبہ و انابت کی جسے بالاخر اللہ نے قبول کیا۔ مگر بہرحال اب انہیں اس دنیا میں آنا لازم تھا جسے اب ان کی اولاد ہی سے آباد ہونا تھا۔ چنانچہ وہ اترے اور اب ان کے اولاد ہونا شروع ہوئی جس میں اللہ نے بڑی کثرت و برکت عطا فرمائی کیونکہ ان ہی سے اس پوری زمین کی بستی بسانا تھا۔

خدا نے آدمؑ کو نظام زندگی میں دخل رکھنے والی ہر ضروری چیز کا علم دے کر بھیجا تھا۔ ایسا جو زندگی بسر کرنے کے لئے کافی ہو سکے اور پھر وہ ان کے ذریعے سے ان کی اولاد تک پہنچے تو اسی علم کے سہارے سے وہ انسانی فکر و نظر کے ساتھ باقی مجہول اشیاء تک پہنچ کر اپنی اختیاری ترقی کے درجوں کو طے کر سکیں مگر اب بڑا

مسئلہ نسل آدم کے آگے بڑھنے کے لئے ان کی اولاد کی شادی کا تھا کیونکہ نوع انسانی میں سگے بھائی بہنوں کی شادی کی سنت کا جاری ہونا صحیح نہ تھا۔ اس مشکل کو حل کرنے میں جنت کی حوروں، اور بنی جان کے باقی ماندہ نیک افراد سے کام لیا گیا اور اس طرح نسل انسانی آگے بڑھی۔

آدمؑ کے یوں تو بہت سے بیٹے تھے مگر ایک فرزند شیثؑ اپنے باپ کے کمالات کے حامل تھے۔ یہی ان کے جانشین قرار پائے۔ اس کے علاوہ ان کے دوسرے بیٹوں میں دو بھائی قابیل اور ہابیل تھے۔ یہ دونوں بھائی صفات و کردار میں مختلف تھے۔ ہابیل نیکو کار تھے اور قابیل نا فرجام۔ ایک تو طبیعتوں کا اختلاف پھر ہابیل کی نیکی کا نتیجہ یہ تھا کہ باپ کی نظر عنایت ان پر زیادہ تھی۔ یہ قابیل کے لئے ہابیل سے پرخاش کا سبب تھا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ دونوں نے بارگاہ الٰہی میں قربانیاں پیش کیں۔ اس زمانہ میں جس کی قربانی قبول ہوتی تھی ایک آگ آسمان سے اتر کر اس کی قربانی کو جلا دیتی تھی۔ اس آگ نے ہابیل کی قربانی کو آکر جلا دیا۔ اور قابیل کی قربانی خالص نیت سے نہ تھی۔ اس کو چھوڑ دیا۔ اب قابیل نے طے کر لیا کہ ہابیل کی زندگی کا خاتمہ کر دے گا۔ اور ان سے بھی کہہ دیا کہ میں تمہیں زندہ نہ چھوڑوں گا۔ ہابیل نے کہا کہ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ قربانی کی قبولیت خلوص و پاکیزگی کردار سے وابستہ ہوتی ہے۔ رہ گیا یہ کہ تم مجھ کو قتل کرنا چاہتے ہو، تو اچھا تمہیں اختیار ہے مگر میرا ہاتھ تمہارے قتل کے لئے کبھی نہیں اٹھ سکتا۔ آخر قابیل نے ہابیل کو قتل کر ڈالا۔ یہ پہلا خون تھا جو نوع انسانی میں زمین پر بہایا گیا۔

شیثؑ کی اولاد پھولی پھلی اور دنیا میں پھیلی - ان میں برائیوں کے دور کرنے اور اچھائیوں کو رواج دینے کے لئے برابر ہادیان و معلمین آتے رہے جنہیں انبیاء و مرسلین کہتے ہیں اور جنہوں نے لا تعداد مشکلوں کا مقابلہ کرکے نوع انسانی کو بلندی کی منزل تک پہنچانے میں ہر امکانی کوشش صرف کی۔

نظری و عملی اعتبار سے جس ضابطہ حیات کی تبلیغ یہ انبیاء کرتے رہے وہی دین اور شریعت ہے جس کے اصول ہمیشہ یکساں رہے اور وہی غیر متبدل اصول حقیقتاً دین اسلام ہیں۔

تاریخ اسلام اور اس کا آغاز

ان الدین عند اللہ الاسلام

اس آیت کی روشنی سے جو حقیقت ظاہر ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ دین الٰہی ہمیشہ سے اسلام ہے۔ جتنے انبیاء و مرسلین آئے وہ اسلام ہی کی تبلیغ کے لئے۔ آدمؑ جو پیغام لائے وہ بھی اسلام ہی تھا اور نوحؑ نے جس تعلیم کو پہنچایا وہ بھی اسلام ہی تھی اور اسی طرح جتنے انبیاء و مرسلین مبعوث ہوئے وہ سب اسلام ہی کے مبلغ تھے۔ اس لحاظ سے آدمؑ نوحؑ اور تمام انبیاء کی سرگزشت زندگی سب تاریخ اسلام کا جز ہے۔ مگر مذاق تاریخی، حقیقتوں کی گہرائی میں اس باریک بینی کا متحمل نہیں ہے۔ وہ حقیقت جس کا نام اسلام ہے بے شک ہمیشہ سے تھی مگر وہ اصطلاحی طور پر اسلام کے نام سے موسوم نہ تھی۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی اصطلاح کا آغاز حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کے وقت سے ہوا۔ سب سے پہلے یہی بزرگوار تھے جنہوں نے اس دین کے پیروؤں کا نام مسلم رکھا۔ جیسا کہ ارشاد ہوا ہے ھو سما کم المسلمین من قبل (حج آیت ۷۸) اور سب سے پہلے اس لقب سے موسوم ہونے والے یہی حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند اسماعیلؑ تھے اور انہوں نے اپنی اولاد کے لئے اس کے باقی رکھنے کی بارگاہ الٰہی میں دعا کی۔

واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت و اسماعیل ربنا تقبل منا انک انت

السمیع العلیم ربنا واجعلنا مسلمین لک و من ذریتنا امة مسلمة لک وارنا مناسکنا و تب علینا انک انت التواب الرحیم

(بقرہ آیت ۱۲۷ - ۱۲۸)

اس سے یہ ظاہر ہے کہ اولاد ابراہیمؑ جو سلسلہ نسل اسماعیلؑ سے اس کے بعد ہوئی ان میں سے جو دین صحیح کے پابند ہوں وہ دین اسلام ہی کے پیرو سمجھے جا سکتے ہیں کیونکہ یہی ان کے مورث اعلیٰ کا دین تھا جس کے بقا کی انہوں نے اپنی اور اسماعیلؑ کی مشترک نسل (ذریتنا) میں دعا کی تھی لہٰذا درمیان میں سلسلہ نسل اسحاقؑ میں یہودیت اور عیسائیت کے دین جو رائج ہوئے وہ بنی اسرائیل سے مختص تھے۔ اولاد اسماعیلؑ کے لئے نہ تھے۔

اولاد اسماعیل کے لئے جو دین تھا وہ وہی دین ابراہیمی تھا جو ملت حنیفیہ اور اسلام سے موسوم تھا اور جو بنص قرآن یہودیت' نصرانیت اور شرک سب کا مقابل تھا۔

ما کان ابراهیم یهود یا ولا نصرانیاولکن کانا حنیفًا مسلمًا و ما کان من المشرکین (آل عمران آیت ۶۷)

ابراہیم خلیل اللہ اور ان کے اسلامی کارنامے

جناب ابراہیم بحیثیت مسلم اول سب سے پہلے فرد ہیں جنہوں نے کھل کر شرک کے خلاف علم احتجاج بلند کیا۔ اس وقت شرک کی تین قسمیں رائج تھیں۔ اول اجرام علویہ یعنی ستاروں' چاند اور آفتاب کی پرستش۔ حضرت ابراہیمؑ نے حکیمانہ انداز بیان میں ان اجرام کو خدا سمجھنے سے اختلاف کیا۔ فلما جن علیه اللیل رای کوکبا "رات کو تاریکی چھائی تو ایک ستارہ نظر آیا" قال هذا ربی "کہا یہ میرا پروردگار ہے" اگر پہلے ہی آغاز کلام مخالفت سے کرتے تو مخاطب گروہ ابتدا ہی سے روگردان ہو جاتا۔ آگے سننے کے لئے تیار ہی نہ ہوتا۔ لہٰذا طریقہ گفتگو یہ اختیار کیا کہ پہلے جیسے ان کی ہمنوائی کر رہے ہیں۔ اس طرح ان کو حقیقت طلبی کی

راہ میں اپنا رفیق سفر بنا لیا ہے۔

فلما افل قال لا احب الآفلین

جب وہ غروب کر گیا تو کہا۔ "میں غروب ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی خدا وہ ہونا چاہئے جسے زوال و فنا نہ ہو۔ یہ ایک معیار تھا جو آخر تک حقیقت شناسی کے لئے کافی تھا۔ مگر مخاطب گروہ کے ذہن نشین بنانے کے لئے اسی معیار پر ان کے ہر ہر معبود کو لا کر دکھلا دیتا تھا کہ وہ قابل پرستش نہیں ہے۔

فلما رای القمر بازغا قال هذا ربی فلما افل قال لئن لم یهدنی ربی لاکونن من القوم الضالین

"جب چاند کو چمکتے دیکھا' کہا۔اچھا تو یہ میرا رب ہوگا۔ جب وہ بھی غروب کر گیا تو کہا ۔ اگر میرا رب میری رہنمائی نہ کرے تو میں بھی گمراہوں میں ہو جاؤں۔" ان لفظوں سے ظاہر کر دیا کہ وہ اپنے ذہن میں اپنے ایک رب کی معرفت لئے ہوئے ہیں جو ان تمام معبودوں کے علاوہ ہے۔

اب آفتاب کی باری آئی۔

فلما رای الشمس بازغة قال هذا ربی هذا اکبر فلما افلت قال یا قوم انی بری مما تشرکون انی وجهت وجهی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین

"جب سورج کو چمکتے دیکھا تو کہا۔ اچھا یہ میرا پروردگار ہے۔ یہ تو زیادہ بڑا ہے۔ جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا' اے میری قوم والو میں ان سب چیزوں سے جنہیں تم شریک کرتے ہو بری ہوں۔ میں نے اپنا رخ کیا ہے صرف اس کی طرف جو آسمان و زمین کا خالق ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں"۔

اب سفر ختم ہو گیا اور منزل حقیقت تک رسائی ہو گئی۔ ثابت ہو گیا کہ یہ چیزیں جن کی پرستش کی جارہی ہے قابل عبادت نہیں ہے۔

دوسری قسم کا شرک جو رائج تھا وہ اصنام پرستی کی صورت میں تھا۔ یعنی پتھر وغیرہ کے بت اپنے ہاتھ سے تراش کر پھر ان کی عبادت کی جاتی تھی۔ یہ وہ واضح

شرک ہے جس کے مرتکب گروہ کا اصطلاحی نام ہی مشرکین ہو گیا ہے اور یہ شرک اس وقت تک دنیا میں موجود ہے۔ اس کے برخلاف ابراہیمؑ کو اپنے آس پاس ہی جہاد شروع کرنا پڑا۔ ان کے متصل حلقہ کا ایک اتنا قریبی ان کا بزرگ جسے وہ خود بھی باپ کہہ کر پکارتے تھے اور قرآن مجید بھی باپ کے لفظ سے یاد کرتا ہے، خود بت تراشی کا پیشہ اختیار کیے ہوئے بت پرستی کا علمبردار تھا۔

جناب ابراہیمؑ نے پہلے ملائمت سے سمجھایا کہ :-

یا ابت لم تعبد مالا یسمع ولا یبصر ولا یغنی عنک شیئا

جب اس پر کوئی اثر نہ ہوا تو آخر انداز بیان میں تلخی پیدا ہوئی۔

اتتخذ اصناما الهة انی ارٰک و قومک فی ضلال مبین

جب اس پر بھی اثر نہ ہوا تو پوری جماعت کے دل پر ایک عملی چوٹ لگا کر انہیں اصنام کی بے حقیقتی پر متنبہ کرنے کی کوشش کی اور یہ موقع اس وقت نکالا کہ جب وہ سب اپنی عیدگاہ میں کسی مشرکانہ رسم کے ادا کرنے کے لئے جارہے تھے ابراہیمؑ کو بھی لے جانا چاہا۔ انہوں نے ناسازی مزاج کا عذر کر کے جانے سے انکار کر دیا اور جب وہ لوگ چلے گئے تو انہوں نے تمام بتوں کو توڑ کر ان کے پرخچے اڑا دیئے۔ فجعلهم جذ اذا بس ایک بت کو چھوڑ دیا جو سب میں بڑا تھا۔

الا کبیرا لهم لعلهم یرجعون

جب وہ لوگ واپس ہوئے تو تلاطم پڑ گیا اور شور مچا۔

قالو سمعنا فتی یذکر هم یقال له ابراهیم

"یہ ہمارے خداؤں سے کس نے سلوک کیا"؟

کچھ لوگوں نے کہا کہ ایک جوان کو ہم نے سنا ہے کہ وہ اکثر ان کو برا کہتا رہتا ہے - اس کا نام ابراہیمؑ ہے۔ ہو نہ ہو وہی ہوگا۔

ابراہیمؑ بلائے گئے۔ پوچھا گیا:-

ء انت فعلت هذا بالهتنا یا ابراهیم !

"کیا تم نے ہمارے خداؤں سے یہ سلوک کیا ہے؟" کہا :-

بل فعلہ کبیر ھم ھذا فاسئلو ھم ان کانوا ینطقون

"میں ایسا کیوں کرتا؟ اس بڑے بت نے ایسا کیا ہوگا۔ خود ان سے پوچھو نا' اگر یہ بولتے ہوں"۔

یہ ایک لطیف پیرایہ میں ان بتوں کی بے بسی' عاجزی اور پھر ان کے خدا سمجھے جانے کی رکاکت کا اظہار تھا۔ حقیقت واضح تھی۔ استدلال کا ان کے پاس جواب نہ تھا مگر اپنے خداؤں کے مسمار ہونے پر غضب کا غصہ تھا اس لئے ابراہیمؑ کی جان لینے پر آمادہ ہو گئے جس کی تفصیل عنقریب آئے گی۔

تیسری قسم انسان پرستی۔ وہ اس طرح تھی کہ بادشاہ وقت نمرود اپنی خدائی کا اعلان کرتا تھا۔ابراہیمؑ نے اس شرک کے خلاف بھی اعلان کیا اور اس سے بحث کی۔ جب اس نے پوچھا تم اپنا پروردگار کسے سمجھتے ہو؟

ربی الذی یحی و یمیت

میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے

قال انا احیی و امیت

اس نے لفظ کے مفہوم کو مجاز پر ڈھال کر کہا:۔

"میں بھی مارتا جلاتا ہوں"۔ اس طرح کہ کسی بے گناہ کی جان لے لی اور ایک ایسے شخص کی جس کے لئے سزائے موت کا حکم ہو چکا تھا' جان بخشی کر دی۔

ابراہیم نے کہا:۔

فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب۔

اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تم مغرب سے نکال دو"۔

فبھت الذی کفر

وہ کافر مبہوت اور لاجواب ہو گیا مگر اس کے نتیجہ میں غیظ و غضب اس کا ابراہیمؑ کے خلاف بہت بڑھ گیا۔

ان تمام توحید رب کی تبلیغوں اور شرک کے خلاف ہدایتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ طے کر لیا گیا کہ ابراہیمؑ کو آگ میں جلا دیا جائے جن کا ذکر قرآن میں ایک جگہ

اس طرح ہے۔

قالوا حرقوه و انصرو الهتكم ان كنتم فاعلين

انہوں نے کہا بس ابراہیمؑ کو آگ میں جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو اگر کرنا چاہتے ہو۔

دوسری جگہ اس طرح ہے:۔

قالوا ابنوا له بنيانا فالقوه فی الحجيم۔

"انہوں نے کہا کہ ایک احاطہ ان کے لئے بنا کر اس میں آگ بھڑکا دو اور انہیں اس آگ میں ڈال دو"۔

روایتوں میں آگ کی کیفیت بتائی گئی ہے کہ ایک مہینہ تک باہتمام تمام لکڑیاں جمع ہوئیں اور پھر ان میں آگ دی گئی اور مشتعل کیا گیا۔ شعلوں کی بلندی وہ تھی کہ طائر ہوا میں پرواز کر سکتا تھا۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ کوئی شخص جا کر ابراہیمؑ کو اس آگ میں ڈال نہ سکتا تھا اس لئے منجنیق تیار کیا گیا اور منجنیق میں ابراہیمؑ کو غل و زنجیر میں مقید کرکے بٹھایا گیا اور پھر آگ میں پھینک دیا گیا۔

ابھی تک حکمت الٰہی نے یہ سب کچھ ہونے دیا اور اسکی قدرت کسی منزل پر بھی سد راہ نہ ہوئی اس لئے کہ ابھی انسانی عمل اخری منزل تک نہ پہنچا تھا۔ اگر قدرت الٰہی مزاحم ہو جاتی تو نہ ظالموں کے ظلم کی آخری حد سامنے آتی اور نہ صابر کے صبر کی۔ ظالموں کو کہنے کا موقع تھا کہ ہم جلا تھوڑے ہی دیتے۔ ہم تو فقط دھمکا رہے تھے اور مظلوم کی نسبت غلط فہمی رہ جاتی۔ کہ آخر تو انسان کا دل رکھتے تھے۔ کسی وقت تو متزلزل ہو ہی جاتے لیکن انسانی اختیار کی منزل ختم ہو گئی۔ اس وقت جب جسد ابراہیمی منجنیق سے جدا ہوا اب ظالمین خود بھی اگر چاہتے کہ ابراہیمؑ جلنے سے محفوظ رہیں تو ممکن نہ تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو کچھ کر سکتے تھے اب سب کچھ کر چکے تھے اور ابراہیمؑ کے لئے بھی اب کوئی صورت نہ تھی کہ وہ طالب امان ہو کر یا اپنے طرز عمل کی تبدیلی کا اعلان کرکے اپنی جان بچا سکتے۔ بس جہاں سے انسان کی طاقت ختم ہوئی وہاں سے خالق کی قدرت شروع ہوئی۔ ارادہ باری

متعلق ہوا کہ :- یا نار کونی بردا" و سلاما علیٰ ابراھیم مطلب یہ تھا کہ آگ نقطہ اعتدال برودت پر آئے جو کسی صورت سے مزاج انسانی کے لئے مضرت رساں نہ ہو۔

یہ خلیل حق کی اپنی ذات سے قربانی تھی جو اسلام کی راہ میں سب سے پہلے پیش ہوئی اور اس میں خود ابراہیمؑ کی طرف سے ذرہ بھر بھی کمی نہ رہی۔ یہ اور بات ہے کہ ابھی خالق حکیم کے کچھ اہم مقاصد ذات ابراہیمؑ سے وابستہ تھے۔ اس لئے اس نے خود اپنے مقاصد کی خاطر آخر میں ابراہیمؑ کی حفاظت کا سامان کر دیا اس لئے شہادت واقع نہیں ہوئی۔

اس مشاہدہ قدرت اور تجلی حقانیت کے بعد چاہئے تو یہ تھا کہ تمام قوم ایمان اختیار کر لیتی مگر ان کے کفر و عناد میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور تمام حجت کی منزلیں ختم ہو چکی تھیں اس لئے داعی اسلام نے ہجرت کا ارادہ کر لیا تاکہ اب زمین خدا کے دوسرے حصوں کو دعوت حق سے روشناس کرائیں۔ صرف دو افراد تھے بحیثیت مومن جو جناب ابراہیمؑ کے ساتھ تھے ایک ان کی زوجہ مکرمہ سارہؑ اور دوسرے ان کے حقیقی بھتیجے لوطؑ۔ جن کا ذکر قرآن مجید اس طرح کرتا ہے۔ فامن لہ لوط و قال انی مہاجر الی ربی سیھدین۔ یہ تینوں تاریخ اسلام کے پہلے مہاجر ہیں جو سرزمین بابل (عراق) سے نکل کر شام کی طرف روانہ ہوئے۔ دو چار مقاموں کی ردوبدل کے بعد جناب ابراہیمؑ فلسطین میں مقیم ہوئے اور لوطؑ کو مقام اردن پر تبلیغ حق کے لئے بھیج دیا۔ یہاں ان کو ایک نہایت بداعمال اور سرکش قوم سے سابقہ پڑا جو نفسانی خواہشوں کی تکمیل میں بڑے شرمناک کاموں کا ارتکاب کرتی تھی۔

لوطؑ نے ان کی ہدایت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ وہ قرآن کے لفظوں میں یہ ہے :-

فما کان جواب قومہ الا لن قالوا اخرجوا آل لوط من قریتکم انھم اناس یتطھرون۔

"قوم کی طرف سے ان کے تعلیمات و ہدایات کا جواب صرف یہ ملا کہ انہوں

نے آپس میں کہا کہ لوطؑ اور ان کے پورے خاندان کو اپنے گاؤں سے باہر نکال دو۔یہ ایسے لوگ ہیں جو ہمارے گناہوں میں ہمارے ساتھ شرکت نہیں کرتے اور پاک دامانی کے علمبردار ہیں۔

یہ ہیں اسلامی تاریخ کے ابتدائی نقوش جو مصائب' تکالیف' ایذا رسانیوں اور غربت و جلا وطنی کے واقعات کو اپنا سرمایہ بنائے ہوئے ہیں۔

جب ہی تو پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا تھا۔ "بدا الاسلام غریبا" "اسلام کا آغاز ہی غربت اور بے وطنی سے ہوا"۔ پھر بھلا مسلمانوں کو کب زیبا ہے کہ وہ حوادث و مصائب اور شدائد و ابتلا سے پریشان ہوں اور ہمت ہار دیں۔ انہیں تو ان چیزوں کو اپنے خصائص قومی میں سمجھ کر ان کے برداشت کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہنا چاہئے۔

جب حکمت باری نے قوم لوطؑ میں قطعی اصلاح کی گنجاء ش نہ پائی تو ان پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس موقع پر اسلام کے داعی اول کا یہ کردار قابل ملاحظہ ہے کہ باوجودیکہ اس کے پہلے متعدد بار انبیاء و مرسلین مسلسل نافرمانی اور سرکشی کی بنا پر امت کے لئے عذاب کی دعا کرتے رہے تھے مگر رہنمائے اسلام کی یہ خصوصیت شروع سے رہی کہ وہ خلق خدا کی ایذا رسانی اور مسلسل سرتابی کے باوجود ان کے لئے بددعا کے واسطے تیار نہیں ہوتا۔ بلکہ خالق سے ان کی سفارش کرتا ہے۔ چنانچہ جب فرشتے قوم لوطؑ پر عذاب نازل کرنے کے لئے آئے اور راستے میں جناب ابراہیمؑ سے آکر ملے اور اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو ابراہیمؑ نے قوم لوطؑ پر عذاب نازل کیے جانے کے خلاف بارگاہ الٰہی میں اصرار کے ساتھ مسلسل عرضداشت پیش کی جسے قرآن میں خالق نے ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے کہ:۔

یجادلنا فی قوم لوط۔

"ابراہیمؑ ہم سے قوم لوط کے بارے میں لڑتے رہے"۔

یہ تعبیر حضرت رب العزت کی جانب سے حضرت ابراہیمؑ کی اس حیثیت کے

پیش نظر ہے جو انہیں خلیل کے لقب کی صورت میں عطا کی گئی تھی۔ یقیناً ابراہیمؑ نے اپنے اس اصرار کو اگر بیان کرتے تو اسے التجا، درخواست، دعا، مناجات وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کرتے مگر خداوند تعالیٰ نے ان کو جو دوست کا لقب دے دیا تھا تو ان کی ان عرضداشتوں کو دوستانہ بے تکلفی کے انداز میں اس لفظ سے یاد کیا کہ وہ ہم سے لڑنے لگے۔ یہ لڑائی اور جھگڑا خالق کے تقاضائے رحمانیت و ربوبیت کے بالکل مطابق تھا۔ اس لئے وہ ابراہیمؑ کے لئے کوئی نقص نہیں بلکہ رفعت نظر اور وسعت حوصلہ کا ثبوت تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس خاص محل پر حکمت الٰہی کا مقتضا یہی تھا کہ ابراہیمؑ کی اس عرضداشت کو قبول نہیں کیا گیا اور قوم لوط پر عذاب نازل کر ہی دیا گیا۔ بس لوط اور ان کے گھر کے آدمی بچ گئے لیکن ان کی زوجہ جو ایمان و عمل کے جوہر سے خالی تھی ان سے الگ کر دی گئی اور عذاب الٰہی سے دوچار ہوئی۔

ان فی ذلک لعبرۃ لا ولی الالباب

آل ابراہیمؑ سرزمین حجاز میں

ولادت اسماعیلؑ اور ہجرت ہاجرہؑ

شام میں آئے ہوئے حضرت ابراہیمؑ کو مدت گزر گئی۔ ابراہیمؑ اور ان کی بیوی سارہ دونوں کی عمر زیادہ ہو چکی ہے مگر نعمت اولاد سے محروم ہیں۔ انتہائی مایوسی کے بعد جناب سارہؑ نے حضرت ابراہیمؑ سے خود کہا کہ وہ ہاجرہؑ سے جو ان کے پاس خدمت کے لئے رکھی گئی تھیں تعلقات ازدواجی قائم کریں کہ شاید ان سے خداوند عالم اولاد عطا فرمائے۔

حضرت ابراہیمؑ نے ان کی فرمائش پر عمل کیا۔ چنانچہ جب ہاجرہؑ کے یہاں اسماعیلؑ کی ولادت ہوئی جس سے حضرت ابراہیمؑ کی ولادت ہوئی جس سے حضرت ابراہیمؑ کی مزید توجہ کا جناب ہاجرہؑ کی طرف مبذول ہو جانا فطری تھا۔ اب جناب سارہؑ کو ہاجرہؑ کا قیام اپنے پاس ناگوار ہونے لگا اور خلیل حق سے فرمائش کی کہ آپ ان ماں بیٹے کو میرے پاس سے ہٹا دیں اور کہیں دور لے جا کر رکھیں۔

حکمت باری سبحانہ' اس پردہ میں ایک بڑی امت ' ایک بڑے ملک بلکہ تمام عالمین کے لئے ایک مرکز کی تشکیل کا مرقع دیکھ رہی تھی اس لئے اس نے اپنے خلیل کو مامور کر دیا کہ وہ سارہ کے اصرار کی تعمیل کریں اور ہاجرہؑ اور ان کے فرزند کو ملک شام سے باہر لے جائیں۔

کہاں ارض فلسطین اور کہاں مکہ کی سرزمین' مگر اسی رہنمائے مطلق کی رہنمائی

میں جو خلیل کو یہاں تک لے آئی ایک ایسی جگہ جہاں نہ پاس کوئی چشمہ نہ کوئی سبزہ' نہ زراعت اپنے اللہ پر بھروسہ رکھنے والی پاک بی بی کو اس کے شیرخوار معصوم کے ساتھ بغیر کسی ظاہری سہارے کے بٹھا دیا اور خود سرزمین شام کی طرف واپس تشریف لے گئے۔

وہ بے آب و گیاہ میدان اور اس میں ایک خاتون محترمہ اور ایک بے زبان بچہ' تھوڑے ہی وقت کے بعد بچہ پر پیاس کا غلبہ ہوا۔ ہاجرہؓ نے تلاش آب میں صفا و مروہ کے درمیان سات چکر کیے جس کی یادگار مناسک حج میں صفا و مروہ کے درمیان سعی کی شکل میں ہمیشہ کے لئے قائم ہے۔ آخر بقدرت خدا اسی زمین سے چاہ زمزم نمودار ہوا۔ "ہر کجا چشمہ بود شیریں" بس پانی کا برآمد ہونا تھا کہ چاروں طرف سے طیور جمع ہوئے اور طیور کی رہنمائی سے انسانوں کا گذر ہوا۔یہ دنیائے اسلام کے مرکز کا سنگ بنیاد تھا جس کی تاریخ کے اجزا میں بے سروسامانی' غربت اور ہجرت' بھوک اور پیاس سب ہی چیزیں نمایاں طور پر نظر آ رہی تھیں اور یہی شدت و صعوبت آئندہ کی فراخی و خوشحالی کی تمہید قرار پائی۔فان مع العسر یسراً ان مع العسر یسراً

بیٹے کی قربانی

ابراہیمؑ کی ایک قربانی جو بہت اہم تھی وہ بیٹے کی قربانی تھی۔ اہل کتاب یہود و نصاریٰ مدعی ہیں کہ وہ فرزند اسحاقؑ تھے۔ مگر قرآن مجید سے جو ظاہر ہوتا ہے اور بائبل کے سیاق سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے یہ ہے کہ وہ جناب اسمٰعیلؑ تھے۔ درایت بھی اس کی تائید میں ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ واقعہ جناب اسحاقؑ سے متعلق ہوتا تو اس کی یادگاریں بنی اسرائیل اور ملک شام میں نظر آتیں کیونکہ اسحاقؑ بنی اسرائیل کے مورث اعلیٰ تھے اور شام میں ان کا مسکن تھا۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ اس کی یادگاریں ان کے مذہبی روایات اور رسوم دینی میں بالکل نہیں پائی جاتیں اور نہ ملک شام میں اس کے آثار نظر آتے ہیں۔

برخلاف اس کے اولاد اسماعیلؑ میں اس کی یادگاریں قائم ہوئیں جو قبل اسلام بھی جاری تھیں اور بعد اسلام بھی برقرار رہیں جو عیدالاضحیٰ اور مناسک حج سے ظاہر ہیں- نیز اس یادگار کا مرکز سرزمین مکہ ہوئی- اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا تعلق اسماعیلؑ سے تھا اسحاقؑ سے نہیں تھا-

اب واقعہ کی تفصیل ملاحظہ ہو جو بائبل میں بھی شرح و بسط کے ساتھ موجود ہے اور قرآن مجید نے بھی اسے درج کیا ہے اور یہ اس کی اہمیت ہے کہ آگ میں ابراہیمؑ کے پھینکے جانے کا اشارہ قرآن نے صرف چند جملوں میں کیا ہے لیکن ذبح فرزند کے واقعہ کو چند مسلسل آیتوں میں کافی توضیح کے ساتھ درج کیا ہے- اس طرح کہ :-

فلما بلغ معه السعی قال یا بنی انی اریٰ فی المنام انی اذبحکَ فانظر ماذا تریٰ-

"جب اسماعیل اس حد تک پہنچے کہ باپ کے ساتھ ان کی جدوجہد میں شرکت کرنے لگے"-

یہاں پر تقاضائے اختصار نے درمیان کی منزلیں بعد کے کلام سے پتہ چل جانے کی وجہ سے ترک کرا دی ہیں' ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے فرزند کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے ہیں- حکم الفاظ سے نہ تھا جن سے فوری ہونے کا اندازہ ہوتا اس لئے ابراہیمؑ نے اس دن اس بارے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا- دوسری رات پھر خواب دیکھا- یہ دن بھی گزر گیا- تیسری رات پھر بعینہ وہی خواب دیکھا- اب تو ابراہیمؑ نے محسوس کیا کہ حکم کی تعمیل فوری منظور ہے- لہٰذا وہ تعمیل پر تیار ہو گئے لیکن اگر وہ اسماعیل سے کوئی تذکرہ نہ کرتے تو قربانی حضرت ابراہیمؑ کا عملی کارنامہ تو ہوتی' اسماعیلؑ کو کوئی خاص درجہ حاصل نہ ہوتا-

ابراہیمؑ نے چاہا کہ ان کا فرزند مقام قربانی میں خود اختیاری بلندی کا حامل ہو جائے اس لئے اپنے بیٹے کو بلا کر کہا (یہاں سے صراحتہً قرآن میں ذکر ہے) "بیٹا! میں خواب میں دیکھ رہا ہوں" اس لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کئی مرتبہ خواب دیکھ

چکے تھے۔ اگر ایک دفعہ دیکھا ہوتا رایت کہا جاتا کہ میں نے خواب دیکھا ہے۔ یہ نہ کہتے کہ "دیکھ رہا ہوں" کہ "تمہیں ذبح کر رہا ہوں" اب "تم ذرا غور کرو کہ تمہاری کیا رائے ہے"۔

یہ امتحان الٰہی تھا کہ اتنا شدید حکم بیٹے کو ذبح کرنا اور ذریعہ حکم بہ ظاہر اتنا سبک یعنی خواب۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ملک بھیجا جائے اور وہ آکر بصورت پیام الٰہی حکم پہنچائے مگر یہ ہوتا تو اس کے حکم ہونے میں کوئی پہلو تامل کا پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ خالق نے چاہا کہ ذریعہ ایسا اختیار کرے جسے ناقص نفوس خواب کہہ کر ٹال سکتے ہیں۔ اس طرح ابراہیمؑ کی بلندی نفس نمایاں ہو کہ انہوں نے منشائے الٰہی بتانے والے خواب کو کتنی اہمیت دی اور یہ صرف انبیاء کا کام ہو سکتا ہے کیونکہ خواب ان کے لئے ایک طریقہ وحی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس لئے بجز نبی کسی معمولی آدمی کو اس قسم کے خواب پر عمل جائز نہیں ہے۔

پھر ابراہیمؑ نے بھی بیٹے سے یہی کہا کہ انی ارٰی فی المنام انی اذبحک یہ نہیں کہتے کہ مجھے حکم ہوا ہے کیونکہ حکم کہہ دینے کے بعد آخر کا ٹکڑا کہ "غور کرو تمہاری کیا رائے ہے" بے جوڑ ہو جاتا پھر یہ جناب اسماعیل کا بھی امتحان تھا کہ وہ باپ کے خواب کو کیا سمجھتے ہیں اس لئے جہاں تک امتحان کے سوالات کا پرچہ تھا خواب رہا۔ اللہ نے خواب دکھایا اور ابراہیمؑ نے بھی خواب ہی کے لفظ کے ساتھ اسماعیلؑ سے بیان کیا مگر جہاں سے جواب شروع ہوتا ہے وہاں سے لفظ بدل جاتی ہے۔ اسماعیلؑ نے یہ نہیں کہا کہ جو خواب دیکھا ہے اسے پورا کیجئے بلکہ کہا:۔

یا ابت افعل ما تومر ستجدنی انشاء اللّٰہ من الصابرین

اے بابا، جو حکم ہوا ہے اس کی تعمیل کیجئے۔ اللہ نے چاہا تو مجھے صبر کرنے والوں میں سے پایئے گا"۔

اب حضرت ابراہیمؑ نے امتثال حکم الٰہی کا انتظام کیا۔ اسماعیلؑ کو میدان منیٰ میں لائے۔ ذبح کے لئے بالکل تیار ہوئے۔ فرزند کو سامنے لٹایا اور چھری گلے پر رکھ دی۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ اس کا تذکرہ قرآنی لفظوں میں یوں ہے۔

فلما اسلما و تله للجبین و نادیناه ان یا ابراھیم قد صدقت الرویا انا کذلک نجزی المحسنین ان ھذا لھو البلاء المبین و فدیناه بذبح عظیم

جب دونوں باپ بیٹے قربانی کے لئے تیار ہو گئے اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا"

یہاں یہ امر خاص طریقہ پر قابل توجہ ہے کہ قربانی کے لئے عملی طور سے آمادہ ہو جانے کو قرآن نے لفظ اسلما سے تعبیر کیا ہے کہ وہ "مسلم" ہو گئے۔ اس طرح ذہن مسلم پر یہ اثر ڈالا ہے کہ قربانی پر آمادگی ایک مسلم کی نمایاں عملی شان ہے جس میں واضح طور پر اس کا اسلامی جوہر آشکار ہوتا ہے۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ عام طور پر سمجھا اور کہا جاتا ہے کہ خالق نے قربانی کا حکم برطرف کر دیا مگر یاد رکھنا چاہئے کہ حکم کا تعلق افعال اختیاری سے ہوتا ہے اور ذبح میں جہاں تک کہ اختیاری افعال کا تعلق ہے وہ سب منزلیں ابراہیمؑ نے طے کر لی تھیں۔ پھر اب حکم برطرف کیے جانے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ اس کے علاوہ یہاں حکم کسی خطاب لفظی کے ذریعہ سے تو نہیں تھا۔ حکم بذریعہ خواب تھا' خواب کو دیکھنا چاہئے کہ کیا تھا؟

اگر خواب میں جناب ابراہیمؑ نے یہ دیکھا ہوتا کہ میں بیٹے کو ذبح کر چکا ہوں تو سمجھا جا سکتا تھا کہ اس کی تعمیل میں کوئی جز باقی رہ گیا مگر انہوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں۔ جو دیکھا تھا وہ پورا عمل میں آ گیا۔ پھر حکم برطرف کیے جانے کا خیال کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔ پھر سب سے زیادہ فیصلہ کن دلیل یہ ہے کہ خالق کریم کی ندا جو قرآن میں اس کے بعد درج ہے اسے دیکھا جائے خالق کی ندا یہ نہیں کہ بس بس اے ابراہیمؑ ہم نے اپنا حکم منسوخ کیا' برطرف کر دیا بلکہ بنص قرآن آواز یہ آئی کہ :۔

یا ابراھیم قد صدقت الرویا۔

"اے ابراہیمؑ تم نے خواب سچ کر دکھایا"۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکم بلا امتثال برطرف نہیں ہوا۔ بلکہ جتنا حکم تھا

اس کی پوری پوری تعمیل ہو گئی جس کی سند خالق نے اپنی اس ندا کے ساتھ دے دی۔

انا کذلک نجزی المحسنین

"یوں ہی ہم جزا دیتے ہیں حسن عمل رکھنے والوں کو"۔

یہ ایک اصول عام کا اعلان ہے کہ ہمارا پورا نظام مجازات و قربانیوں ہی سے وابستہ ہے اور بلند مقاصد کی تکمیل اور رضائے الہٰی کی خاطر جس حد تک قربانی کی جائے گی اس حد تک جزا کا استحقاق ہوگا۔ ان ھذا لھو البلاء المبین یقیناً یہ کھلی ہوئی آزمائش تھی۔ و فدیناہ بذبح عظیم۔

یہ حقیقت ہے کہ تمام اوامر و نواہی اور پورا نظام تشریع نوع انسانی سے قربانیوں کے مطالبہ پر مشتمل ہے اور انبیاء مرسلین یا ائمہ دین ان سب کے تقرر کا مقصد کلی قربانی کی اعلیٰ مثالیں پیش کرنا ہے۔ اگر قربانی اسماعیلؑ پیش خدا قربانی کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہوتی تو اس قربانی کو ملتوی کرنے اور فدیہ بھیجے جانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ مگر چونکہ علم الہٰی میں ایک مکمل ترین قربانی اسی نسل اسماعیل میں وجود میں آنے والی تھی اور آج کی قربانی اگر مختتم طور پر ہو جاتی تو اس نسل ہی کا وجود نہ ہو سکتا جو قربانیوں کی مکمل تاریخ اپنے عمل سے مرتب کرنے والی تھی۔ اس لئے خالق کو اس "ذبح عظیم" کی وجہ سے اسماعیلؑ کی قربانی کو فدیہ بھیج کر ملتوی کرنا ہی اصلح معلوم ہوا۔ مگر اس سے خود ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے کارنامہ کی اہمیت میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ وہ اپنے عمل کی تمام منزلیں جو ان کے ارادہ و اختیار سے متعلق تھیں طے کر چکے تھے اور ان میں ایک ذرہ بھی کمی نہیں ہوئی۔

تعمیر کعبہ

جب اسماعیلؑ بڑے ہو گئے تو خالق کی طرف سے ابراہیمؑ مامور ہوئے کہ وہ اور اسماعیلؑ دونوں مل کر خانہ کعبہ کی تعمیر کریں اور یہ بنص قرآن پہلا گھر تھا جو کسی

مخص مخلوق کی طرف منسوب ہوتے ہوئے نہیں بلکہ خالق کی طرف منسوب ہوتے ہوئے تمام خلق کے لئے بنایا گیا۔

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا و ھدی للعالمین

"بیت" کو ہدایت عالمین کہنا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ اس بیت والے (اہل بیت) کچھ ہوں گے جو تمام عالمین کے لئے رحمت و ہدایت کا ذریعہ ہوں گے جن کے فرد اکمل کے لئے خطاب ہوگا وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین۔

یہ خانہ کعبہ کی تعمیر درحقیقت اس دین اسلامی کے ایک مرکز کی تعمیر تھی جو تمام عالمین کے لئے سرمایہ فلاح و نجات ہے دونوں باپ بیٹے انتہائی خلوص کے ساتھ اس کی تعمیر میں مصروف ہوئے۔ اس طرح کہ حضرت خلیل اللہ معماری کر رہے تھے اور اسماعیلؑ مزدوری کر رہے تھے حالانکہ مکہ میں قبیلہ جرہم آ کے بس چکا تھا اور قبیلہ کی آبادی کے بعد ظاہر ہے کہ معماروں اور مزدوروں کی بھی کمی نہیں تھی مگر خالق کو یہی منظور تھا کہ اس گھر کا خلیل اور ان کے فرزند کے پاک ہاتھوں سے بنے اور اس طرح ہمیشہ کیواسطے فرزندان اسلام کے لئے اس تصور کی داغ بیل ڈال دی کہ محنت مزدوری کوئی عیب نہیں ہے جب کہ ہمارے دینی و روحانی مورث اعلیٰ خود اس کام کے لئے خالق کی طرف سے برسرکار لائے گئے۔

یہی وہ موقع تھا جب حضرت ابراہیمؑ اپنے فرزند کی شرکت میں دیواریں اونچی کرتے جاتے تھے اور اپنی ذریت کے لئے اسلام پر قائم و برقرار رہنے کی دعا کرتے جاتے تھے۔

و اذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت و اسماعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم ربنا واجعلنا مسلمین لک و من ذریتنا امۃ مسلمۃ لک وارنا مناسکنا و تب علینا انک انت التواب الرحیم۔

حج کا اعلان

جب خانہ کعبہ تعمیر ہو چکا تو خطاب الٰہی جناب ابراہیمؑ کی طرف متوجہ ہوا کہ:۔

اذن فی الناس بالحج یا توک رجالا و علٰی کل ضامر یا تین من کل فج عمیق-

اب تم عامہ خلائق میں خانہ کعبہ کے حج کا اعلان کر دو- دیکھنا کہ اس کے اعلان ہوتے ہی وہ تمہاری طرف دوڑ پڑیں گے خواہ پیادہ اور خواہ سوار- بڑے بڑے دور افتادہ اور ناہموار مقامات سے یہ بھی دعائے ابراہیمی کی قبولیت کی تمہید تھی جبکہ انہوں نے اپنی بیوی ہاجرہؑ اور صغیر فرزند اسمٰعیلؑ کو یہاں لا کر رکھا تھا تو اسی وقت عرض کیا تھا-

انی اسکنت من ذریتی بواد غیرذی زرع عند بیتک المحرم ربنا لیقیموا الصلوٰۃ فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرات لعلھم یشکرون-

خدا نے دلوں کو اس طرف موڑنے کا یہ سامان کیا کہ اس جگہ کو مرکز حج بنا دیا اور کسی حکم شرعی میں خالق نے یہ ذمہ داری نہیں لی کہ خلق خدا اس پر عمل بھی کرے گی مگر اس دعوت حج میں کچھ ایسی تاثیر قرار دی کہ تمام عرب خواہ وہ مومن ہوں یا کافر اس آواز سے متاثر ہو گئے- یہاں تک کہ جب حضرت محمد مصطفیٰ دعوت اسلام کے ساتھ مبعوث ہوئے تو ا سوقت عرب نماز' روزہ اور زکواۃ تمام فرائض دینیہ سے بیگانہ تھے مگر حج کی رسم اس وقت پورے جاہ و جلال کے ساتھ قائم تھی اگرچہ انہوں نے اس میں غیر مستحسن اجزا بھی داخل کر دیئے تھے مگر خانہ کعبہ کی مرکزیت کا احساس ان میں قائم تھا اور یہ اس غیر معمولی تصرف روحانی کا اثر تھا جسے دعوت ابراہیمی میں خالق نے مضمر کر دیا اور یہی اس اسلامی مرکز کے بقاء و دوام کی ہمیشہ کے لئے ضمانت ہے-

اولاد ابراہیمؑ کی دو شاخیں

جناب ابراہیم علیہ السلام کی اولاد دو شاخوں میں تقسیم ہوئی۔ ایک بنی اسرائیل اور دوسرے بنی اسماعیل۔ بنی اسرائیل جناب سارہؑ کے بطن سے پیدا ہونے والے فرزند جناب اسحاقؑ کی اولاد ہیں اسحاق کے فرزند یعقوبؑ کا لقب اسرائیل تھا اس لئے یہ نسل ان کی طرف منسوب ہونے سے بنی اسرائیل ہوئی۔ اور بنی اسماعیل ہاجرہؑ کے بطن سے پیدا ہونے والے فرزند جناب اسماعیلؑ کی اولاد تھے۔ جو حجاز کی سرزمین پر پھلے پھولے اور اسلام کی مرکزیت کے اصلی حامل قرار پائے۔

بنی اسرائیل اور اسلام

اپنی ذریت سے امت مسلمہ کے ہونے کی دعا تو جناب ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ کی شرکت میں کی تھی مگر چونکہ مسلم ہونے میں خود آپ مرکزی حیثیت رکھتے تھے اس لئے آپ کی اولاد میں خواہ وہ نسل اسحاق سے ہو جب تک کوئی دوسرا اولوالعزم صاحب شریعت و کتاب نبی جس کی طرف دین کی نسبت ہو مبعوث نہیں ہوا جتنے اس وقت تک افراد دیندار ہوئے وہ دین اسلام ہی کے پیرو تھے اس لئے جناب ابراہیمؑ سے جناب موسیٰؑ تک جتنے نبی ہوئے وہ سب اسلام ہی کے مبلغ تھے۔ ہاں جب موسیٰؑ اور عیسیٰؑ مبعوث ہوئے تو اگرچہ اصول دین میں وہ بھی کچھ مختلف نہ

تھے مگر چونکہ نظام شریعت ان کا دوسرا تھا اس لئے ان کی طرف منسوب ہو کر دین موسوی اور دین عیسوی اسلام کا مقابل ہو گیا یعنی اب براہ راست جو ملت ابراہیمیہ کے پیرو تھے وہ مسلم تھے اور جو موسیٰؑ یا پھر عیسیٰؑ کے ماننے والے ہوئے وہ یہودی یا عیسائی ہوئے۔

حضرت ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے درمیان جو اہم شخصیتیں ہوئی ہیں وہ ابراہیمؑ کے فرزند اسحاقؑ اور اسحاقؑ کے فرزند یعقوبؑ اور یعقوبؑ کے فرزند یوسفؑ ہیں۔ ان سب کے کارنامہ ہائے حیات تاریخ اسلامی کا جز ہیں اور قرآن نے کھلم کھلا ان کے مسلم ہونے کا اعلان کیا ہے۔

ام کنتم شهداء اذ حضر يعقوب الموت اذ قال لبنيه ما تعبلون من بعدى قالوا نعبد الهك واله ابائك ابراهيم و اسماعيل و اسحاق الها واحدا" و نحن له مسلمون

اس سے ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل بھی ابتدا میں دین اسلام ہی کے پیرو تھے۔ اور اسی لئے قرآن نے بار بار انہیں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ کوئی نیا دین لے کر نہیں آئے ہیں بلکہ یہ وہی ہے جو تمہارے بزرگ مرتبہ آباؤ اجداد کا دین تھا۔

اسحاقؑ

جناب اسحاق کے متعلق قرآن کریم میں کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں ہے جو اسلامی تاریخ کا جز بن سکے۔ توریت میں آپ کے بعض واقعات مذکور ہیں اور اسرائیلیات کے تحت میں بعض اسلامی کتب تاریخ و سیر میں بھی ان کی صدائے بازگشت آگئی ہے مگر وہ عقل و نقل ہر معیار سے ناقابل قبول ہیں۔ اگر ایک قول کے مطابق اسحاق کو ذبیح مان لیا جائے تو بے شک ان کی ذات سے متعلق واقعہ کا اسلامی تاریخ سے بہت بڑا تعلق ہو جائے گا مگر یہ پہلے ہی بیان ہو چکا ہے کہ ذبیح اللہ حضرت اسماعیلؑ ہیں اسحاق نہیں ہیں۔

یعقوبؑ اور یوسفؑ

ان دونوں باپ اور بیٹے کی روداد زندگی قرآن کریم میں احسن القصص کہہ کے پیش کی گئی ہے۔ اس کے خصوصی اجزا ہیں۔ یوسف کا خواب' بھائیوں کا حسد' یوسفؑ کو بھائیوں کا سیر و سیاحت کے بہانے لے کر جانا اور کنویں میں پھینک دینا۔باپ کے پاس آکر یہ دروغ بیانی کہ یوسفؑ کو بھیڑیے نے کھا لیا' یعقوبؑ کا مسلسل گریہ جس سے آنکھیں سفید ہو گئیں۔ برادران یوسف کا گریہ۔ یعقوبؑ پر بجائے ہمدردی کے طعن و تشنیع کرنا اور ان کے رونے سے ناگواری کا اظہار کرنا۔ ایک قافلہ والوں کا یوسفؑ کو کنویں سے باہر نکال کر مصر لے جانا' نبی خدا کا بطور غلام فروخت کیا جانا۔ عزیز مصر کے محل میں زوجہ عزیز کی طرف سے پیغمبر کا شدید آزمائش میں مبتلا ہونا اور اس میں ان کا آخر تک ثابت قدم رہنا۔ بے جرمی کے جرم میں یوسفؑ کا قید خانہ میں ڈال دیا جانا' بعد میں یوسفؑ کا تخت حکومت پر پہنچنا' بھائیوں کا قحط سالی کی وجہ سے محتاج ہو کر آنا اور یوسفؑ کا ان کو اپنی شخصیت کے ظاہر کیے بغیر عطا و احسان سے سرفراز کرنا' پھر اس کے بعد آخری سفر میں ان کا یوسف کی شخصیت پر مطلع ہونا اور اپنے سابق کردار پر پشیمان ہو کر معذرت خواہ ہونا اور یوسفؑ کا وسعت حوصلہ سے کام لیتے ہوئے ان کی بکشادہ پیشانی معاف کر دینا واقعہ کی یہ تمام کڑیاں قرآن مجید میں بالتفصیل اپنی شان اعجاز کے ساتھ مذکور ہیں جسے ہر شخص قرآن کریم یا اس کے ترجمہ میں دیکھ سکتا ہے۔

اس کو یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ ایک خاندان کا آپس میں جھگڑا ہے۔ اس لئے اس کو تاریخ اسلام سے کیا تعلق۔ حقیقت امر تو یہ ہے کہ وہ چاہے ہابیل و قابیل کی باہمی نزاع ہو اور چاہے برادران یوسف کا اختلاف۔ ہمیشہ نزاع و اختلاف کی بنیاد عقائد و اوصاف ہی کے اختلاف پر ہوتی ہے۔ اگر دو بھائی صفات و خیالات میں متحد ہیں تو ان میں اختلاف پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ جب تضاد ہو گا تو اچھے اور برے میں حق اور باطل ہیں' صحیح اور غلط میں ہوگا۔

برادران یوسفؑ اگر مسلک میں یوسفؑ سے متحد ہوتے تو کبھی وہ ان کے ساتھ دشمنی پر آمادہ نہ ہوتے۔ قرآن کریم نے جو مختلف ان کے اقوال و اعمال ذکر کیے

ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ایمان و اطاعت کے جوہر سے بالکل خالی تھے۔ مثلاً اپنے والد بزرگوار جناب یعقوبؑ کے متعلق ان کا یہ کہنا لیوسف و اخوہ احب الی ابینا منا و نحن عصبة ان ابانا لفی ضلال مبین۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ جناب یعقوبؑ کی نبوت پر قطعاً ایمان نہ رکھتے تھے یا ان کا یعقوبؑ کے گریہ و بکا پر معترض ہوتے ہوئے یہ کہنا تاللّٰہ تفتا تذکر یوسف حتی تکون حرضا او تکون من الھالکین

اس میں ایک نفسیاتی حقیقت یہ بھی کارفرما ہے کہ ظالم کبھی تذکرہ مظلوم پسند نہیں کرتا اور یہ معیار ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کسی مظلوم کی یاد پر معترض وہی ہوگا جو اس پر مظالم کا ذمہ دار ہو یا اس کے ظالموں کے ساتھ ذہنی حیثیت سے مشارکت رکھتا ہو۔

اس واقعہ کا قرآن مجید میں اس تفصیل سے بیان ہونا ہی اس کی دلیل ہے کہ اسے تاریخ اسلام سے کوئی اہم تعلق ہے اور یہ حقیقت ہے کہ تاریخ اسلام اور مسلمانوں کی ذہنیت کی تعمیر میں ان واقعات کا بڑا دخل ہے۔ ایک ایسی قوم کو مصائب اور مشکلات سے گھبرانا چاہئے جس کی تاریخ اپنے آغاز میں عیش و آرام اور قوت و اقتدار سے معمور ہو لیکن تاریخ اسلام کا مرقع تو آغاز ہی سے اشکوں کی تری، خون دل کی رنگینی اور غل و زنجیر کے نقش و نگار سے آراستہ ہے۔ پھر بھی انہی مشکلات میں آسانیاں اور انہی ناکامیوں سے کامیابیاں پیدا ہوئیں۔ پھر آج اور کسی وقت بھی مسلمانوں کو مشکلات تکالیف سے تو گھبرانا نہ چاہئے۔ پھر سب سے آخر میں یوسف کے عمل کی یہ بلندی کہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد کس طرح اپنے بھائیوں کو معاف کر دیتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللّٰہ لکم و ھو ارحم الرحمین۔

یہ وہ کردار کی رفعت ہے جسے ارتقائے اسلامی کی انتہائی منزل میں حضرت محمد مصطفیٰؐ نے دہرایا اور یوسفؑ کے بلندی کردار کی قدر شناسی تھی کہ وہ فقرہ زبان پر جاری فرماتے ہوئے جناب یوسفؑ کا حوالہ دیا۔

فتح مکہ میں جب آپ کی مخالف قریش کی جماعت ان تمام مظالم کے بعد جو وہ ہجرت کے پہلے اور بعد کر چکی تھی آپ کے سامنے بے بس کھڑی ہوئی تھی تو آپ نے وہی یوسفؑ کا فقرہ زبان پر جاری فرماتے ہوئے ان کو صاف دلی کے ساتھ معاف فرما دیا تھا اور کہا تھا کہ میں تم سے وہ کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا۔ آج بھی اسلام کا مطالبہ اپنے نام لیواؤں سے یہی ہے کہ انھیں جہاں اقتدار حاصل ہو اپنی مخالف اقلیت کے ساتھ ایسے ہی فیاضانہ برتاؤ سے کام لیں اور یہی انسانیت کا مطالبہ ہے ہر اس جماعت سے جو کسی نقطہ ارض پر اقتدار کی حامل ہو جائے اور اس کے خیالات سے مختلف گروہ بے بسی کی حالت میں اس کے قبضہ اقتدار میں آگیا ہو۔

نسل اسماعیلؑ

جب ہاجرہ اور ان کے فرزند اسماعیلؑ زمین مکہ پر لائے گئے تو یہاں آبادی کا نام و نشان نہ تھا مگر جب چاہ زمزم نمودار ہوا تو اب طیور نے ادھر کا رخ کیا اور طیور سے انسانوں کو یہاں کے پانی کے وجود کا علم ہوا۔ اسی زمانہ میں قبیلہ جرہم کا ادھر سے گزر ہوا۔

تاریخ، عرب کے تین طبقہ بتاتی ہے۔ پہلا طبقہ جو یمن کی نسل یعرب بن قحطان سے تھا عرب عاربہ کہلایا۔ ان میں قبائل عاد و ثمود، طسم و جدیس اور جرہم اولی تھے، ان کا کفر و عصیان بہت بڑھا تو عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے اور اسی لئے ان کو قبائل بائدہ "نیست و نابود شدہ قبیلے" کہا جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ عرب متعربہ یہ وہ تھے جو عرب عاربہ سے ازدواجی رشتوں کے ساتھ منسلک ہوئے اور پھر ان کی اولاد میں عربی زبان نے نشوونما پائی۔ یہ قبیلہ جرہم جو سرزمین مکہ پر آکر آباد ہوا انہی قبائل میں سے تھا۔ اس کو جرہم ثانیہ کہا جاتا ہے۔اسماعیل نے اس قبیلہ میں نشوونما پائی۔ اس لئے یہ بڑھے تو عربی زبان بولتے ہوئے۔ پھر ان کی شادی بھی اسی قبیلہ میں ہوئی اس لئے اولاد کی مادری زبان عربی ہوئی اور اب یہ قوم عرب کا تیسرا

طبقہ ہوا جو عرب مستعربہ کہلایا۔ خالق کا کرنا یہ کہ عرب کا نام اور اس کا وقار دنیا میں قیامت تک کے لئے انہی عرب مستعربہ سے قائم رہا۔

عرب عاربہ تو پہلے ہی فنا ہو چکے تھے۔ عرب مستعربہ کی نسلیں اب تک ممکن ہے کہ صحرائی قبائل میں موجود ہوں لیکن تاریخ میں بہرحال ان کا نام و نشان کوئی نہیں ہے۔ ہاں جو تمام عالم میں قوم عرب کے عزت و افتخار کے علمبردار ہیں وہ آل اسماعیلؑ ہی ہیں جو تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ خدا کا وعدہ تھا جو اس نے ابراہیمؑ سے نسل اسماعیلؑ کے بارے میں کیا تھا کہ میں اس کی نسل میں برکت دوں گا اور اس میں بارہ سردار قرار دوں گا۔ اس وعدہ کا ذکر توریت سفر تکوین باب ۱۷ میں ان الفاظ میں ہے:۔

"اور اسماعیلؑ! میں نے اس کے حق میں تیری بات سنی' دیکھ اب میں اسے برکت دوں گا اور اس کو بار آور کروں گا اور بہت افزائش دوں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسل اسماعیلؑ کے خاص افراد کے لئے سردار کی اصطلاح اسی وقت قرار پائی جو سادات آل رسولؐ کے لئے اب تک قائم ہے۔ اسماعیلؑ کے بیٹوں میں قیدار کی نسل بہت پھلی پھولی اور حجاز میں آباد ہوئی۔ یہی پیغمبر اسلامؐ کے مورث اعلیٰ ہیں۔

عدنان

جناب رسول خداؐ کا نسب عدنان تک معتبر تواریخ اور کتب انساب میں متفقہ حیثیت سے درج ہے۔ عدنان کی شخصیت اولاد اسماعیلؑ میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی تھی اور جس طرح عرب عاربہ آل قحطان ہونے پر مفتخر تھے اسی طرح بعد میں آنے والی اسماعیلی نسل آل عدنان ہونے پر نازاں تھی۔

رسولؐ کا نسب عدنان سے اسماعیلؑ تک اگرچہ بہت سی کتابوں میں درج ہے مگر ایک حدیث بھی اس کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ حضرت نے فرمایا۔ اذا بلغ نسبی

عدنان فامسکوا "یعنی میرے شجرہ نسب کو عدنان تک پہنچا کر خاموش ہو جایا کرو"۔

اس کا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ عدنان سے اسماعیل تک کا جو شجرہ بیان کیا جاتا ہے اس کی حضرت نے تصدیق نہیں فرمائی لیکن خود حضرتؐ نے اس کے مقابل میں جو صحیح شجرہ تھا اسے بیان بھی نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ علم الانساب کی اہمیت کو گھٹانے کی ایک شکل ہو اور بہت ممکن ہے کہ اس حدیث کا یہ مطلب ہی جو سمجھا گیا ہے صحیح نہ ہو۔ بلکہ اس سے مراد وہ ہو جو ابن اسحاق کے الفاظ سے مستفاد ہوتا ہے۔انہوں نے کہا ہے:۔

فمن عدنان تفرقت القبائل من ولد اسماعیل بن ابراھیم علیہما السلام (سیرۃ ابن ہشام جلد ا صفحہ ۵)

اس کا مطلب یہ ہے کہ عدنان سے اسماعیل تک تمام اولاد اسماعیل کا شجرہ متحد ہے۔ ممکن ہے کہ اس درمیان میں جو مختلف شاخیں پیدا ہوئی ہوں وہ کچھ دور بڑھ کر ختم ہو گئی ہوں اور جو نسل باقی رہی وہ ہر طبقہ میں ایک ہی شاخ سے وابستہ ہو اور ممکن ہے کہ بعض طبقوں میں بس ایک ہی شخص پیدا ہوا ہو' یا ایک ہی شخص سے نسل چلی ہو لیکن عدنان وہ ہیں جن کی اولاد سے مختلف قبیلے ہوئے۔ اس صورت میں حدیث رسولؐ سے مراد یہ ہوگی کہ میرے خصوصی شجرہ میں جب عدنان تک پہنچ جاؤ تو آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کے بعد میرا شجرہ وہی ہے جو تمام آل اسماعیل کا ہے۔

معد

عدنان کے دو فرزند تھے۔ معد اور عک - عک کی شادی یمن کے اشعری قبیلہ میں ہوئی۔ اس لئے ان کی اولاد یمن میں پھیلی۔ معد کی اولاد حجاز میں رہی اور پیغمبر اسلامؐ ان ہی کی نسل میں تھے۔ جنگ صفین میں نسل عک کے قبائل معاویہ کے ساتھ تھے اور انہوں نے جناب امیرؑ کی فوج کے مقابلہ میں جان توڑ کر مقابلہ کیا تھا۔

نزار

معد کے چار فرزند تھے۔ نزار' قضاعہ' قنص اور ایاد۔ان کی اولاد میں چار قبیلے ہوئے جن میں قضاعہ اور ایاد کے قبیلوں کے افراد کے نام عرصہ تک تاریخ میں مل جاتے ہیں۔ قنص کے قبیلہ کا پتہ کچھ زیادہ دن تک نہیں چلتا۔ نزار کو ان سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی اور آل نزار عرب میں ممتاز درجہ رکھتے معلوم ہوتے ہیں۔

مضر

نزار کے تین فرزند ہوئے۔ مضر' ربیعہ اور انمار' پہلی دونوں نسلیں ربیعہ اور مضر ملک عرب میں بڑی اہمیت کی حامل ہوئیں۔ قبیلہ انمار کی دو شاخیں خثعم اور بجیلہ ہوئیں جن کی طرف منسوب افراد کے نام تواریخ میں عرصہ تک نظر آتے رہے ہیں۔

الیاس

مضر کی نسل دو بیٹوں سے پھیلی ایک الیاس دوسرے عیلان۔

مدرکہ

الیا سکے تین فرزند ہوئے۔ مدرکہ' طانجہ اور قمعہ۔ مدرکہ کا اصلی نام عامر تھا مگر بچپنے میں اونٹوں کو بھگا کر لے جانے والے ایک لٹیرے گروہ کے کامیاب تعاقب کی وجہ سے ان کا لقب مدرکہ ہو گیا۔

خزیمہ

مدرکہ کے دو فرزند خزیمہ اور ہذیل ہوئے جن سے دو بڑے قبیلے عالم وجود میں آئے۔

کنانہ

خزیمہ کی اولاد کنانہ' اسد' اسدہ اور ہون تھے۔ پہلے دو کی نسل دو قبیلوں کی

شکل میں تاریخ میں نمایاں درجہ رکھتی ہے۔ آخری دو کی نسل کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔

نضر

کنانہ کے فرزند چار ہوئے۔ نضر، مالک، عبد مناف اور ملکان۔ ان میں بھی دو کی نسل مشہور ہے۔ آخری دو گمنام ہیں۔

مالک

نضر کے دو فرزند مالک اور نملہ تھے۔ مالک بنی ہاشم کے اجداد میں سے ہیں۔ دوسرے فرزند کی نسل بظاہر ختم ہو گئی۔

فہر

مالک کے صرف ایک بیٹے فہر جو مشہور و معروف ہیں۔

نسل قریش کی ابتدا

یہ نسل قریش کے نام کے ساتھ کس وقت سے ملقب ہوئی۔ اس میں علمائے تواریخ و انساب میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قریش نضر بن کنانہ کا لقب تھا جو فہر بن مالک کے جد امجد تھے اور ان ہی کی اولاد قریش کہلاتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ فہر بن مالک کا لقب ہے اور آپ کی اولاد قریش ہے۔ ان کے پہلے یہ نسل کنانی کہلاتی تھی۔

وجہ تسمیہ میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ تقرش سے ماخوذ ہے جس کے معنی اکتساب کے ہیں اور چونکہ ان کو تجارت میں انہماک تھا اس لئے قریش کہلائے اور دوسرا قول یہ ہے کہ تقرش کے معنی اجتماع کے ہیں اور چونکہ ان کے ذریعے سے تمام قوم کی شیرازہ بندی ہوئی اس لئے قریش کہا گیا۔ بہرحال اس لقب میں نسل قریش کے کردار کی تعمیر کے واسطے ایک اچھی روایت مضمر ہے خواہ یہ کہ وہ کبھی بے کاری کی زندگی کو شعار نہ بنائیں اور کسب معاش میں دوا دوش کو کسر شان نہ سمجھیں اور خواہ یہ کہ انہیں تفرقہ بندیوں سے پرہیز کرنا چاہیے اور حتی

الامکان اتحاد و اتفاق کے راستے کا سالک رہنا چاہئے۔

غالب

فہر کے چار بیٹے تھے غالب' محارب' حارث اور اسد۔

لوی

غالب کے دو فرزند لوی اور تیم ہوئے جن سے دو قبیلوں کی بنیاد قائم ہوئی او، دونوں تاریخ میں مشہور ہیں۔

لوی کے چار فرزند ہوئے کعب' عامر' سامہ اور عوف۔ یہ چار قبیلوں کے مورث اعلیٰ ہوئے۔

مرہ

کعب کے تین بیٹے مرہ' عدی اور ھصیص ہوئے۔ ان میں سے پہلے دو کی اولاد میں دو قبیلے تاریخ میں معروف ہیں۔ تیسرے کی نسل کا پتہ نہیں ملتا۔

کلاب

مرہ کے بھی تین بیٹے تھے۔ کلاب' تیم اور یقظہ۔ پہلے دو قبیلے مشہور اور تیسرے کی اولاد غیر معلوم ہے۔

قصی

کلاب کے دو بیٹے تھے۔ قصی اور زہرہ۔ ان میں سے اول الذکر بڑے بالغ نظر' حکیمانہ فکر کے مالک اور مدبر تھے۔ انہوں نے اپنی اولاد کو شراب خواری سے پرہیز کرنے کی وصیت کی تھی اور کہا تھا۔

یا بنی ایاکم و شرب الخمر فانها ان اصلحت الابدان افسدت الاذهان و الادیان (امالی صدوق)

"یعنی اے میرے بچو! شراب خواری سے ہمیشہ پرہیز کرنا۔ اس لئے کہ اگر

جسم کو کچھ فائدہ پہنچائے تو عقلی قویٰ اور دینی احساسات کو تو یقیناً تباہ کرنے والی ہے"۔

عملی اور اصلاحی کارنامہ ان کا یہ ہے کہ قبیلہ قریش کے افراد کو جو دور دور تک منتشر ہو گئے تھے انہوں نے یکجا کر کے خانہ کعبہ کے گرد سکونت اختیار کرنے پر آمادہ کیا اور تنظیم قومی کی کامیاب ترین سعی انجام دی۔ اسی لئے ان کا لقب مجمع ہوا۔ خانہ کعبہ کی تولیت جو عرصہ سے اولاد اسماعیلؑ کے ہاتھ سے نکل گئی تھی قصی کے ہاتھ میں واپس آئی اور تمام معزز عہدے جو قوم پر اقتدار کا ذریعہ تھے ان کے لئے مجتمع ہوئے۔

فکان قصی اول بنی کعب بن مالک اصاب ملکا اطاع له به قومه فکانت الیه الحجابة و السقایة والرفادة و الندوة واللواء فحاز شرف مکة کله (ابن ہشام)

ان کا فرمان قوم میں ایک مذہبی قانون کی طرح واجب العمل سمجھا جاتا تھا۔

و کان امره فی قومه من قریش فی حیوته و من بعد موته کالدین المتبع لا یعمل بغیره)

عبد مناف

قصی کے چار فرزند تھے۔ عبدمناف' عبدالدار' عبدالعزیٰ اور عبد۔ جن میں سے پہلے دو کی نسل دنیائے تاریخ سے روشناس ہوئی۔ خصوصیت کے ساتھ عبد مناف کو خود اپنے والد بزرگوار کی حیات میں ممتاز عزت اور شہرت حاصل ہوئی۔

کان عبد مناف قد شرف فی زمان ابیه و ذہب کل مذہب (ابن ہشام)

عبد مناف کا اصلی نام مغیرہ تھا (سیرت ابن ہشام) عبد مناف لقب ممکن ہے ددھیال یا ننھیال کے دوسرے رشتہ داروں نے رکھ دیا ہو۔ اور اسے شہرت دے دی ہو اس لئے آباؤ اجداد رسولؐ کے موحد ہونے کے خلاف اسے بطور ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔

(حدیقہ سلطانیہ جلد ۲ صفحہ ۱۴۰)

ہاشم

عبد مناف کے چار فرزند تھے۔ ہاشم' عبد شمس' مطلب اور نوفل۔ ان میں سے ہاشم اپنے والد بزرگوار کے صحیح جانشین اور مکہ معظمہ کے منصبی اعزازات کے حامل تھے ان کی فیاضی مہمان نوازی بھی شہرہ آفاق تھی اور ان کا لقب ہاشم بھی زمانہ قحط سالی میں تمام قریش کو کھانا کھلانے کی وجہ سے ہوا۔ چنانچہ ایک شاعر نے کہا ہے

عمر والذی هشـ [illegible] رید لقومه - قوم بمكة مسنتون عجاف

(ابن ہشام جلد ۱ صف ۸۵)

عبد شمس کی اولاد میں بنی امیہ ہوئے۔ مطلب اور نوفل کی نسل زیادہ دور تک چلتے معلوم نہیں ہوتی۔

عبدالمطلب

جناب ہاشم کے چار بیٹے تھے۔ عبدالمطلب' اسد' ابو صیفی اور نضلہ۔ ان میں سے زیادہ مشہور عبدالمطلب ہوئے۔ ان کا اصلی نام شیبہ تھا۔ "عبدالمطلب" لقب کی نسبت ان کے چچا مطلب کی طرف ہے جو ان کے والد بزرگوار ہاشم کے بعد ان کے منصبی اعزازات کے حامل ہوئے تھے۔ یہ مطلب بڑے سخی اور فیاض تھے۔ یہاں تک کہ قریش میں فیض ہی کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔

اس انتساب کی وجہ یہ ہے کہ جناب ہاشم اپنی زندگی کے اواخر میں مدینہ گئے تھے تو وہاں قبیلہ بنی عدی میں نجار کی ایک خاتون سے عقد کیا اور وہیں شیبہ کی ولادت ہوئی۔ جناب ہاشم انہیں ننھیال میں چھوڑ کر مکہ واپس گئے اور وہاں انتقال فرمایا۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کے بھائی مطلب اپنے بھتیجے کو لانے کے لئے مدینے گئے مگر ننھیال والوں نے بھیجنے سے انکار کیا۔ صرف والدہ نے بچہ کو جانے کی اجازت دے دی اور جناب مطلب بھتیجے کو اونٹ پر اپنے پیچھے بٹھا کر مکے لائے۔ راستے والوں میں ناواقف اشخاص میں سے جس نے بھی دیکھا یہ سمجھا کہ مطلب کوئی غلام

خرید کر لائے ہیں اور اس کا چرچا عبدالمطلب کے لفظ سے کرنے لگے۔ اسی طرح یہی لفظ مشہور ہو گیا۔ مطلب کی وفات کے بعد عبدالمطلب اپنے خاندانی اعزازات کے حامل ہوئے اور آپ کو وہ اقتدار اور مرتبہ حاصل ہوا جو آپ کے آباؤ اجداد کو بھی دینوی حیثیت سے حاصل نہ ہوا تھا۔

شرف فی قومه شرفا لم یبلغه احد من آبائه واحبه قومه و عظم خطره فیهم

(سیرۃ ابن ہشام جلد ا صفحہ ۸۷)

قدرت کی طرف سے بھی آپ کو مرجعیت و شہرت بڑھانے کے سامان ہوتے گئے چنانچہ چاہ زمزم جو عرصہ سے روپوش ہو گیا تھا آپ ہی کے ہاتھوں ظاہر ہوا۔ نیز بہت سے تبرکات جو مدت سے غائب ہو گئے تھے دوبارہ دستیاب ہوئے آپ نے حاجیوں کی سقایت کے لئے خاص انتظامات کیے جس کی وجہ سے "ساقی الحجیج" کے الفاظ سے یاد کیے جانے لگے۔ جیسا کہ حذیقہ بن غانم شاعر نے کہا ہے۔۔

وساقی الحجیج ثم للخبز هاشم
و عبد مناف ذالک السید الفهری

(ابن ہشام صفحہ ۹۴)

واقعہ فیل اور اس کے اسباب

جناب عبدالمطلب کے دور کا ایک بڑا نمایاں واقعہ' واقعہ فیل کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی اجمالی تفصیل یوں ہے کہ تبع بادشاہ یمن کو کچھ مفسدوں نے خانہ کعبہ کا حال بتایا کہ وہاں بڑا زرد جواہر چڑھایا جاتا ہے۔لہٰذا اس پر حملہ کیجئے تو بہت دولت ہاتھ آئے گی۔ اس نے اپنے ساتھ کے راہبوں سے پوچھا تو انہوں نے خانہ کعبہ کے مذہبی احترام وتقدس کا تذکرہ کیا اور کہا کہ وہ ہمارے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ کا بنایا ہوا گھر ہے اور بہت لائق عزت ہے۔ تبع نے ان مفسدوں کو سزا دی اور خود اسے خانہ کعبہ کے ساتھ غائبانہ عقیدت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ اس نے مکہ معظمہ آکر خانہ کعبہ کا طواف کیا او رمراسم حج ادا کیے اور خانہ کعبہ پر غلاف چڑھائے اور اس کے احترام کے تحفظ کے لئے کچھ احکام نافذ کیے۔ و کان تبع فیما یزعمون اول من کسا البیت واوصی بہ (ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۴)

تبع کے بعد کئی بادشاہوں کے دور گزرے یہاں تک کہ کچھ انقلاب کے بعد ایک شخص نے جس کا نام ذونواس تھا سلطنت یمن پر قبضہ کر لیا اور حمیری سلاطین کی حکومت ختم ہو گئی۔ اس نے اہل یمن کو یہودی مذہب کے اختیار کرنے پر مجبور کرنا چاہا۔ اور جب انہوں نے اس کی اطاعت سے اس بارے میں انکار کیا تو اس نے ان کا قتل عام کروایا۔ ابو نواس کے خلاف قیصر روم سے امداد طلب کی گئی۔ اس

نے عیسائیت کی حمایت کے لئے نجاشی بادشاہ حبشہ کو امداد کے لئے کہا جس نے ستر ہزار کا لشکر ارياط کی قیادت میں یمن روانہ کیا۔ اسی فوج کا سردار ابرہہ اشرم تھا۔ بعد میں ارياط اور ابرہہ میں مقابلہ ہوا۔ ارياط قتل ہوا اور ابرہہ تمام یمن کا بادشاہ ہو گیا۔

ابرہہ نے صنعا میں گرجا تعمیر کرایا جس کے متعلق اس کا خیال یہ تھا کہ دنیا میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہوگی اور اس نے منصوبہ باندھا کہ تمام عرب کے حج کا مرکز اسے قرار دے مگر خانہ کعبہ کی مرکزیت جو مدتوں سے قائم تھی اس کے اس مقصد میں سدراہ تھی اس لئے اس نے طے کیا کہ وہ اپنی فوجی طاقت سے کعبہ کو منہدم کر دے گا۔ چنانچہ وہ ایک بڑی فوج لے کر روانہ ہو گیا۔ اس خبر سے تمام عرب میں تملکہ پڑ گیا اور راستے میں کئی جگہ کچھ قبائل نے سدراہ ہونے کی کوشش کی مگر ہر ایک کو شکست ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ مکہ معظمہ کے پاس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

انجام کار

مکہ میں کوئی فوجی طاقت نہ تھی۔ راستے میں جو قبیلے سد راہ ہوئے تھے سب شکست کھا چکے تھے۔ بظاہر اسباب ابرہہ کے مقصد میں اب کوئی چیز مزاحم نہ تھی۔ مگر عبدالمطلب کی روحانی بصیرت انہیں بالکل مطمئن بنائے ہوئے تھی۔ ابرہہ نے بیرون مکہ قیام کرکے ان کے پاس پیغام بھیجا کہ ہمیں تم لوگوں سے کوئی مطلب نہیں ہے ہمیں تو صرف اس گھر کو منہدم کرنا ہے اس لئے اگر تم ہمارے سد راہ نہ ہو تو ہم تم سے کوئی تعرض نہ کریں گے۔ عبدالمطلب نے جواب دیا کہ جنگ کی تو ہم میں طاقت ہے ہی نہیں۔ رہ گیا گھر' وہ ہمارا نہیں ہے خدا کا ہے اگر وہ تمہارا مزاحم نہ ہو تو ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ پھر جب ابرہہ سے منہ در منہ بات چیت ہوئی تو عبدالمطلب نے اپنے مویشیوں کے بارے میں احتجاج کیا جو ابرہہ کی فوج والوں نے اپنے قبضہ میں کر لیے تھے۔ ابرہہ نے کہا "تعجب ہے کہ آپ اپنے مویشیوں کے بارے میں مجھ سے خواہش کر رہے ہیں اور اس خانہ مقدس کے

بارے میں کچھ نہیں کہتے جس سے آپ کی قومی عزت وابستہ ہے"۔

عبدالمطلب نے بڑے اعتماد کے ساتھ ان تاریخی الفاظ میں جواب دیا انی انا رب الابل و ان للبیت ربا سیمنعه "ان اونٹوں کا مالک میں تھا اس لئے ان کے بارے میں میں نے کہا اور گھر کا مالک ایک اور ہے جو اس کی خود حفاظت کر لے گا"۔

(ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۳۱' ۳۲)

ان الفاظ میں حقانیت کا وہ وزن ہے جس کا مقابلہ ہفت آسمان بھی نہیں کر سکتے۔ ان الفاظ کے کہنے کا حق صرف اسے ہی ہو سکتا ہے جو منشائے قدرت کو دل کی آنکھوں سے صاف صاف دیکھ رہا ہو۔

ابرہہ جناب عبدالمطلب کے انتباہات سے ہوشیار نہیں ہوا اور اپنے ارادہ پر اٹل رہا۔ عبدالمطلب نے اہل مکہ کو کہا کہ وہ مکہ سے نکل جائیں اور جا کر پہاڑوں اور گھاٹیوں میں پناہ لے لیں اور خود عبدالمطلب نے کچھ مخصوص افراد قریش کی معیت میں آخری بار زنجیر خانہ کعبہ پکڑ کر ان اشعار کی شکل میں مناجات کی۔

لا ھم ان العبد یمنع رحله فامنع حلالك
لا یغلبن صلیبھم و محالھم ابدا محالك
ان کنت تارکھم و قبلتنا فامرمابدالك

خلاصہ یہ ہے کہ ہر ایک اپنے گھر کی حفاظت خود کرتا ہے اب تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما۔

یہ مناجات کر کے وہ خاموش نتیجہ کے منتظر ہو گئے۔

ابرہہ اپنی مادی قوت پر پورے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ آگے بڑھا مگر نتیجہ وہی سامنے آگیا۔ جس سے عبدالمطلب کا روحانی ضمیر با خبر تھا۔ طیرا ابابیل کا غیبی لشکر آیا اور ابرہہ مع اپنے تمام لشکر کے تباہ و برباد ہو گیا۔ اس غیر معمولی مظاہرہ قدرت کو شعرائے عرب نے نظم کیا اور اسے اپنے اشعار کے ذریعے سے تاریخ

عرب کا ناقابل انکار واقعہ بنا دیا جس طرف اشارہ قرآن کریم نے سورہ فیل کی صورت میں کیا ہے۔ عرب شعراء کے یہ کثیر التعداد اشعار ابن ہشام نے اپنی کتاب سیرت میں درج کیے ہیں۔

عبدالمطلب کے بعد

عبدالمطلب کے دس بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں کی تعداد کے لحاظ سے عبدالمطلب کو "ابوالسادۃ العشر" کہا جاتا ہے۔ بیٹوں کے نام یہ ہیں:۔

عبداللہ' ابو طالب' حمزہ' عباس' زبیر' حارث' جحل' مقوم' ضرار اور ابولہب' ان میں سے پہلی تین شخصیتوں کو تاریخ اسلام میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ عباس بھی مسلمان ہوئے جن کی نسل میں سلاطین بنی عباس مشہور معروف ہیں۔ ابو لہب کا نام مخالفت کے لحاظ سے تاریخ میں نمایاں ہے۔

عبداللہ

یہ پیغمبر اسلامؐ حضرت محمد مصطفیؐ کے والدبزرگوار ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عبدالمطلب نے زمزم کے کھودنے کے موقع پر جب قریش نے ان کی مخالفت کی اور انہیں اپنی تنہائی کی وجہ سے بے بسی کا احساس ہوا اس لئے کہ اس وقت ان کے فقط ایک فرزند حارث تھے اور وہ بھی کمسن تو انہوں نے نذر مانی کہ اگر ان کے بیٹوں کی تعداد پوری دس ہو جائے تو وہ ان میں سے ایک کو راہ خدا میں قربان کر دیں گے۔خداوند عالم نے ان کی تمنا کو پورا کیا اور دس بیٹے ان کے ہو گئے۔ اب انہیں اپنی نذر کا خیال آیا اور ننھیال والوں کو بلا کر نذر کی اطلاع دی۔ سب نے اس کی تکمیل پر آمادگی ظاہر کی۔ جناب عبدالمطلب نے طے کیا کہ وہ قرعہ ڈالیں گے اور جس کے نام نکلے گا اسی کی قربانی ہو گی۔ قرعہ ڈالا گیا تو عبداللہ کے نام پر نکلا۔ تمام قوم جمع ہو کر سد راہ ہوئی اور کہا کہ اس کے عوض میں اونٹوں کی قربانی کر دو۔ مجبور ہو کر عبدالمطلب نے عبداللہ کے بالمقابل دس اونٹوں کے نام پر قرعہ ڈالا مگر قرعہ عبداللہ ہی کے نام نکلا۔ پھر بیس اونٹوں کے لئے قرعہ ڈالا اور اسی

طرح دس دس اونٹ بڑھاتے رہے مگر ہر دفعہ قرعہ عبداللہ ہی کے نام نکلتا۔ آخری مرتبہ جب پورے سو اونٹوں کے ساتھ قرعہ اندازی کی تو قرعہ اونٹوں کے نام نکل آیا۔ یہ ایک منشاء قدرت کی تکمیل تھی جس کا ظہور بعد میں اس طرح ہوا کہ شریعت اسلام میں ایک انسان کے مقابل میں دیت یعنی اس کے خون کا معاوضہ سو ہی اونٹ مقرر کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اپنے پدر بزرگوار کے زیر سایہ پروان چڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ اس لئے کہ ایک قول کے مطابق حضرت ابھی شکم مادر ہی میں تھے اور دوسرے قول کے مطابق پیدا ہو چکے تھے مگر بہت کمسن تھے کہ جناب عبداللہ کا انتقال ہو گیا۔

ابو طالب

یہ حضرت پیغمبر اسلامؐ کے سگے چچا' آپ کے والد بزرگوار جناب عبداللہ کے حقیقی بھائی تھے۔ دونوں کی والدہ فاطمہ بنت عمرو مخزومی تھیں۔ جناب عبدالمطلب کے بعد حضرت ابو طالب کی پوری زندگی پیغمبر اسلامؐ اور پھر خود اسلام کی حفاظت و امداد میں گزری جس کی شہادت آغاز تاریخ اسلام کا ہر ہر قدم دے گا اور اس کا ذکر اپنے محل پر آئے گا۔

پیغمبر اسلامؐ کی ولادت

جب وفات پیغمبرؐ کی تاریخ مسلمانوں میں متفق علیہ نہ رہ سکی تو ولادت کی تاریخ میں اختلاف ہونا کونسا تعجب خیز ہے۔ غنیمت یہ ہے کہ مہینہ متفق علیہ ہے۔ یعنی ربیع الاول مگر اس مہینہ میں کس دن حضرتؐ متولد ہوئے۔ اس بارے میں اہل سنت میں متعدد قول ہیں۔ دوسری' آٹھویں' دسویں اور زیادہ مشہور بارہویں تاریخ ہے۔ علمائے امامیہ میں "کلینیؒ" بھی بارھویں کے قائل ہیں لیکن زیادہ تر علمائے شیعہ سترہ ربیع الاول کو ولادت مانتے ہیں۔ چونکہ اس فرقہ کا دارومدار اہل بیت رسولؐ پر ہے اس لئے ان کا اس تاریخ پر قریباً" متفق ہونا اس کا پتہ دیتا ہے کہ اہل بیتؑ سے

ان کو یہی علم حاصل ہوا تھا اور ظاہر ہے کہ گھر کی بات میں گھر والوں سے زیادہ کس کا بیان معتبر سمجھا جا سکتا ہے۔

نشو ونما

عرب میں شہر کے ماحول کو زبان کے خراب ہونے کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے اس لئے بچوں کو زمانہ رضاعت ہی میں بادیہ نشین عربوں میں بھیج دیا جاتا تھا جن کے متعلق یہ امر مسلم تھا کہ ان کی زبان اپنی اصلی فصاحت پر باقی ہے۔ چنانچہ حضرت کے لئے بھی پیدائش کے بعد ایسا ہی انتظام کیا گیا تھا اور قبیلہ بنی سعد کی ایک خاتون حلیمہ بنت عبداللہ آپ کی مرضعہ مقرر ہوئیں اور آپ نے جوان ہونے تک اسی قبیلہ میں قیام کیا۔

یتیم الابوین

پدر بزرگوار کا سایہ تو پہلے ہی اٹھ چکا تھا۔ ۶ برس کا سن تھا کہ آپ کی والدہ بھی دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ وہ آپ کو لے کر مدینہ اپنے میکے والوں سے ملنے گئی تھیں۔ واپسی میں بیمار ہوئیں اور مقام ابوا پر انتقال کیا۔ (طبقات ابن سعد و سیرت ابن ہشام)

بعض علمائے نفسیات کا خیال ہے کہ خود اعتمادی اور برداشت مشکلات کے لئے بسا اوقات یتیمی مدد گار ہوتی ہے خالق نے اپنے رسولؐ کو بچپن ہی میں باپ اور ماں دونوں کے سہارے سے محروم کر کے ان کے جوہر کمال میں اضافی سبب کے تصور کا خاتمہ کر دیا۔ بقول امیر الشعرا شوقی بک مصری۔

نعم الیتیم بدلت مخائل فضله
والیتیم رزق بعضه و ذکآء

دادا کی تربیت

باپ اور ماں دونوں کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد حضرت محمد مصطفیؐ کی تربیت

کے کفیل آپ کے جد بزرگوار جناب عبدالمطلب ہوئے اور اس فریضہ کو باہتمام تمام انجام دیتے رہے۔ایسی محبت اور توجہ کے ساتھ کہ جس سے خود ان کی اولاد بھی اس درجہ پر بہرہ ور نہ تھی۔

قبضه اليه جده عبدالمطلب ورق عليه رقة لم يرقها على ولده
(طبقات ابن سعد جلد ۱ صفحہ ۷۴)

عبدالمطلب کی آنکھیں بچپن ہی میں آپ سے عظمت و جلالت کا اندازہ کر رہی تھیں۔ چنانچہ ان کے لئے جو مسند کعبہ کے پاس بچھائی جاتی تھی اس پر ان کی عدم موجودگی میں ان کے صاحبزادوں میں سے کسی کی مجال نہ تھی کہ بیٹھ جائے مگر رسولؐ اپنے اسی بچپنے کے عالم میں آتے تھے تو بے تکلف اس مسند پر بیٹھ جاتے تھے اور آپ کے چچا آپ کو ہٹانا چاہتے تھے اور عبدالمطلب دیکھ لیتے تھے تو فرماتے تھے کہ میرے بچہ کو یہیں بیٹھنے دو۔ بخدا اس کی ایک بڑی شان ہے جو ظاہر ہو کر رہے گی۔ (ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۰۸)

ابو طالب کی مشفقانہ پرورش

حضرت محمد مصطفیؐ کی عمر آٹھ برس کی تھی کہ آپ کے بزرگ مرتبہ اور انتہائی شفیق دادا کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔

وقت وفات اپنے فرزند حضرت ابو طالب کو جو پیغمبر اسلامؐ کے حقیقی چچا تھے۔ آپ کی تربیت کے لئے وصیت کی۔ حالانکہ وہ اپنے باپ کی اولاد میں نہ تو سن میں سب سے بزرگ تھے اور نہ وہ دولت مند ہی تھے مگر عبدالمطلب نے اس خدمت کے لئے انہی کو منتخب کیا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ پیغمبر اسلامؐ کے والد بزرگوار عبداللہ سے انہیں انتہائی محبت تھی اور پھر اب تک خود رسول خداؐ کے متعلق عبدالمطلب نے محسوس کر لیا ہوگا کہ آپ سے انہیں جو محبت ہے وہ کسی کو نہیں اور اس کے علاوہ شاید سب سے بڑی وجہ یہ ہو کہ ابراہیمی نسل میں جو صفات و اخلاق توارث کے طور پر چلے آرہے تھے اور جن کی تکمیل کے لئے قدرت نے اس آخری رسولؐ کو بھیجا تھا ان صفات کے حامل اولاد جناب

عبدالمطلب میں اب ابوطالب ہی نظر آتے تھے لہٰذا انہی کی آغوش عطوفت اس پیغمبرؐ کے لئے موزوں و مناسب معلوم ہو رہی تھی۔ چنانچہ ابوطالب نے جس شفقت و محبت سے رسول اللہؐ کی پرورش کی ہے وہ تاریخ کی ایک متفق علیہ اور مثالی حقیقت ہے۔ آثار کے مشاہدہ سے یہ امر نمایاں تھا کہ جیسی محبت انہیں رسول اللہؐ سے ہے وہ اپنی اولاد سے بھی نہیں ہے۔ جیساکہ مورخ ابن سعد نے لکھا ہے۔

کان یحبه حبا شدیدا" لا یحبه ولده و کان لا ینامه الا عن جنبه و یخرج فیخرج معه و صب ابوطالب صبابة لم یصب مثلها بشی قط و کان یخصه بالطعام و کان الصبیان یصبحون رمضا شعشا و یصبح رسول الله و هینا کحیلا۔

(طبقات مطبوعہ لندن جلد ۱ صفحہ ۷۵، ۷۶)

سفرشام

حضرتؐ کی عمر ۱۲ برس کی تھی جب ابو طالبؑ نے ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ شام کا سفر کیا۔ (ابن سعد، جلد ۱، صفحہ ۷۶)

پیغمبر خداؐ نے اصرار کیا کہ میں بھی ساتھ چلوں گا۔ ابو طالب نے آپ کو بھی ساتھ لے لیا۔ (ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۱۳)

اس سفر میں بحیرا راہب سے ملاقات ہوئی۔ صرف اتنی دیر کے لئے کہ ابوطالب نے اثناء سفر میں اس کے گرجا کے پاس منزل کی اور اس نے رسولؐ کے چہرہ اور آپ کے خط و خال پر نظر ڈال کر خود ہی آپ کے متعلق دریافت کیا اور ابو طالب کو ہدایت کی کہ ان کی حفاظت کرو اور ذرا یہود سے ہوشیار رہو۔ کہیں حسد کی وجہ سے انہیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں بلکہ منع کیا کہ نہیں وطن واپس کر دو اور شام نہ لے جاؤ۔ مگر جناب ابوطالب نے کہا کہ اللہ کی حفاظت کافی ہے۔ (ابن سعد)

اتنی بنیاد پر عیسائیوں نے یہ عمارت کھڑی کی کہ قرآن میں جو امم سابقہ کے حالات اور مذہبی حقائق و معارف ہیں وہ بحرا راہب سے ماخوذ ہیں۔ صورت واقعہ کی نوعیت سے ظاہر ہے کہ عیسائیوں کا اس تنکے سے سہارا لینا رسول کی عظمت کے

مقابلے میں بحر حیرت کے اندر خود ان کے ڈوبتے ہونے کی دلیل ہے۔

سیرت کی بلندی

ابتدائی عمر سے پیغمبر خدا کی بلندی کردار اور پاکیزگی اخلاق کا ہر مشاہدہ کرنے والے کو احساس ہوتا تھا۔جاہلیت کے غلط رسوم عادات سے آپ قطعی بے تعلق رہتے تھے اور مروت و انصاف امانت داری' حسن معاشرت' حقوق ہمسایہ کی ادائیگی' حلم و برداشت اور راست گفتاری میں تمام قوم کے افراد سے امتیاز خاص کے مالک نظر آتے تھے۔ اسی لئے قریش کے لوگ عموماً آپ کو "امین" کے نام سے یاد کرنے لگے تھے۔

(ابن سعد' جلد ۱ صفحہ ۷۶) (ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۱۵)

حلف فضول

رسول اللہ کی عمر ۲۰ برس کی تھی جب قریش کے درمیان وہ معاہدہ ہوا جسے "حلف فضول" کہتے ہیں۔ قریش کے تمام قبائل بنی ہاشم' بنی اسد' بنی زہرہ اور بنی تیم کے نمائندے عبداللہ ابن جدعان تیمی کے مکان پر جمع ہوئے اور یہ عہد ہوا کہ ہم مظلوموں کی مدد کریں گے چاہے وہ اس دیس کے باشندے ہوں یا پردیس سے آئے ہوئے ہوں اور حقدار کے حق کی حمایت کریں گے اور جب تک اس کا حق نہ مل جائے چین نہ لیں گے۔ اس قسم کے عہد کی تحریک پیغمبر خدا کے ایک چچا زبیر بن عبدالمطلب نے کی تھی اور تاریخ عرب میں اب تک اس شریفانہ اصول پر کوئی معاہدہ نہیں ہوا۔ (طبقات ابن سعد' جلد ۱ صفحہ ۸۲)

پیغمبر خدا اس عہد میں شریک ہونے پر اظہار مسرت فرماتے رہے اور آپ مبعوث بہ رسالت ہونے کے بعد بھی اس معاہدے کے علم بردار رہے۔ آپ فرماتے تھے کہ اب دین اسلام کے نفاذ کے بعد بھی کوئی مجھے اس معاہدہ کی بنا پر آواز دے تو میں اسے لبیک کہوں گا۔

شام کا دوسرا سفر

جب حضرت کی عمر شریف ۲۵ سال کی تھی تو اس وقت آپ کو شام کا دوسرا سفر درپیش ہوا۔

واقعہ یہ تھا کہ خدیجہ بنت خویلد عرب کی ایک بہت باعزت مالدار تاجرہ تھیں۔ وہ مختلف اشخاص کو اپنا مال تجارت دے کر شام کی طرف ہر سال روانہ کیا کرتی تھیں اور مضاربہ کے اصول پر ان کے لئے منافع کا کوئی حصہ مقرر کر دیا کرتی تھیں۔ اس مرتبہ خواہ جناب ابوطالب کی تحریک سے خود حضرت محمد مصطفیؐ نے اپنے کو اس کام کے لئے پیش کیا جیسا کہ ابن سعد نے لکھا ہے۔ (طبقات جلد ا صفحہ ۸۲) اور خواہ خود خدیجہ نے آپ کی سچائی اور امانتداری کے چرچے سن کر آپ سے خواہش کی ہو کہ آپ اس ذمہ داری کو قبول فرمالیں جیسا کہ ابن ہشام نے لکھا ہے۔

(سیرت ابن ہشام جلد ا صفحہ ۱۱۸)

بہرصورت یہ امر متفق علیہ ہے کہ جناب خدیجہ نے پہلے ہی آپ کے سامنے یہ پیشکش کی کہ جتنا وہ ہمیشہ کسی دوسرے کو دیا کرتی تھیں اس سے دونا وہ آپ کو دیں گی۔ اس سے دوسرے قول کی تائید ہوتی ہے کہ جناب خدیجہ آپ کے ممتاز اوصاف سے واقف ہونے کی بناء پر خود اس کی خواہش مند تھیں کہ یہ کام آپ کے ہاتھوں انجام پائے باوجودیکہ آپ کو یہ پہلا تجربہ تھا مگر آپ کی سچائی' امانتداری اور معاملہ فہمی کا یہ اثر تھا کہ آپ کے ہاتھ سے خدیجہ کو نفع بھی ہر مرتبہ کی نسبت دونا ہوا اور اس لئے انہوں نے آپ کی خدمت میں نذرانہ اپنی قرارداد سے بھی زیادہ پیش کیا۔

خانہ آبادی

خدیجہ بنت خویلد ممتاز قبیلہ قریش کی محترم خاتون تھیں۔ آپ کا سلسلہ نسب تین پشتوں کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نسب سے متحد ہو جاتا تھا۔ اسطرح:۔

قصی بن کلاب

عبد مناف	عبدالعزی
ہاشم	اسد
عبدالمطلب	خویلد
عبداللہ	خدیجہ
محمدؐ	

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رشتہ میں حضرت پیغمبر خداؐ سے بڑی تھیں اور بلحاظ طبقہ آپ کے والد بزرگوار جناب عبداللہ کے موازی ہوتی تھیں۔ اور اس لئے عمر میں بھی آپ سے بڑا ہوناخلاف توقع نہیں ہے۔ چنانچہ مورخین بتاتے ہیں کہ حضرتؐ کی عمر بوقت عقد ۲۵ سال کی تھی (ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۱۸) اور جناب خدیجہ کی عمر ۴۰ برس کی تھی۔ (ابن سعد جلد ۱ صفحہ ۸۴)

جناب خدیجہ کے والد کا حرب فجار کے پہلے انتقال ہو گیا تھا (ابن سعد جلد ۱ صفحہ ۸۴) مگر ایک دوسری روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے والد زندہ تھے اور پیغمبر خداؐ کے ساتھ ان کی شادی ان کے والد ہی نے کی (سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۱۸) لیکن غالباً" پہلی روایت زیادہ درست ہے۔

خاندانی عظمت کے علاوہ اللہ نے انہیں مال و دولت بھی بہت عطا کیا تھا اور تمام قریش کے دلوں پر ان کی عزت و وجاہت کا اثر قائم تھا۔ اس صورت میں جیسا کہ ابن سعد نے لکھا ہے قریش میں سے ہر شخص ان سے نکاح کرنے کا آرزو مند تھا۔ اور اس کے لئے بڑی دولت لٹانے کے لئے تیار تھا۔ (طبقات جلد ۱ صفحہ ۸۴) مگر حضرت محمد مصطفیٰؐ کی امانت داری اور سچائی جس کا اس تجارتی مہم کے سلسلہ میں جناب خدیجہ کو تجربہ ہو چکا تھا کچھ ایسی ان کے دل پر اثر انداز ہوئی کہ انہوں نے خود ایک خاتون نفیسہ بنت منبہ کو بھیج کر حضرت کو آمادہ کرایا کہ آپ خدیجہ کی خواستگاری فرمائیں۔

نفیسہ حضرتؐ کے پاس آئیں اور کہا کیا بات ہے آپ شادی کیوں نہیں

کرتے؟ حضرتؑ نے فرمایا' میرے پاس پیسہ نہیں ہے۔ کہا' اگر اس کی ضرورت نہ ہو اور پھر بھی آپ کو ایسی شریک حیات مل جائے جس میں حسن و جمال' دولت و مال' شرف اور عزت سب اوصاف جمع ہوں اور وہ نسبی حیثیت سے آپ کی برابر والی بھی ہو تو؟ آپ نے فرمایا' ایسی کون ہے؟ انہوں نے کہا' خدیجہ ! فرمایا۔ اس کی کیا صورت ہے؟ نفیسہ نے کہا۔ میں اس کی ذمہ دار ہوں۔ حضرت نے فرمایا۔اچھا' تو مجھے منظور ہے۔ اس جواب کو سن کر وہ خوشی خوشی خدیجہ کے پاس گئیں اور انہیں اطلاع دی۔ یہ معلوم ہونے پر جناب خدیجہ نے رسول اللہؐ کے پاس کہلوا بھیجا کہ آپ فلاں دن فلاں وقت تشریف لائیں۔ اس کے علاوہ اپنے چچا عمرو بن اسد سے کہلوا بھیجا کہ وہ ان کی شادی حضرت کے ساتھ کر دیں۔ چنانشہ روز معین پر حضرت مع جناب ابو طالب اور دیگر اعمام کے وہاں تشریف لے گئے۔

(ابن سعد' جلد ا صفحہ ۸۴)

جناب خدیجہ کی طرف سے ان کے چچا عمرو ابن اسد نے اور جناب رسالت مابؐ کی جانب سے جناب ابوطالبؑ نے صیغہ نکاح جاری فرمایا۔ اور تقریب عقد بخیروخوبی عمل میں آئی۔

جناب ابوطالبؑ نے صیغہ عقد جاری کرنے سے قبل اس مجمع میں جو خطبہ پڑھا تھا وہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ انہوں نے کہا۔

الحمد لله الذی جعلنا من ذرع ابراهيم و ذرية اسماعيل و جعل لنا بيتاً" محجوباً" و حرما آمنا يجبیٰ اليه ثمرات كل شی و جعلنا الحكام علی الناس فی بلد نا الذی نحن ثم ان ابن اخی محمدً بن عبداللّٰه بن عبدالمطلب لا يوزن برجل من قريش الارجح ولا يقاس باحدمنهم الاعظم عنه و ان كان فی المال قل فان المال رزق حائل و ظل زائل وله فی خديجه رغبة ولها فيه رغبة والصداق ماسالتم عاجله و اجله من مالی وله خطر عظيم و شان رفيع و لسان شافع جسيم

ہر تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں ابراہیمؑ کی نسل میں اور اسماعیلؑ کی

اولاد میں قرار دیا اور ہمارے لئے ایک گھر بنایا جس کا حج کیا جاتا ہے اور ایک حرم جو مرکز امن وامان ہے اور جہاں ہر طرح کے میوے سمٹ کر آتے ہیں اور ہمیں اپنے اس شہر میں جہاں ہم ہیں خلق کے قضایا کا طے کرنے والا حاکم بنایا۔ امابعد۔ بلاشبہ میرا بھتیجا محمدؐ بن عبداللہ وہ ہے جس کا قریش کے کسی بھی آدمی سے موازنہ کیا جائے تو اس کا پلہ گراں نظر آئے گا اور جس سے بھی اس کی نسبت دیکھی جائے یہ اس سے بڑا معلوم ہوگا اور اگر وہ مال و دولت میں کم ہے تو اس سے کیا ہے۔ مال تو ایک وقتی نعمت اور ناپائیدار چھاؤں ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ اسے خدیجہ کی طرف اور خدیجہ کو اس کی طرف رغبت ہے۔ مہر جتنا تم کہو معجل اور موجل ہر طرح میں اپنے مال سے ادا کروں گا اور اس کے علاوہ اس ہستی کی ایک عظیم الشان اور بلند منزل اور مقبول بارگاہ خدا بات ہے۔ جو بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

(اعلام الوریٰ طبرسی رحمتہ اللہ علیہ)

اس خطبہ کے الفاظ اپنے متکلم کی گہری معرفت اور رسول خداؐ کے حال و مستقبل کے مراتب سے کامل واقفیت کا ثبوت ہیں اور اس کے انداز بیان کی بلندی کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ معنی ہی نہیں بلکہ کئی جگہ لفظاً بھی اس کلام ربانی کے مطابق ہے جو ابھی دنیا میں اترا بھی نہ تھا۔

"مسلمانان عالم" کا مصنف لکھتا ہے کہ:۔

"بارہ اونس سونا اور پچیس اونٹ حق مہر مقرر ہوا جو چچا ابوطالب کی فیاضی سے فوراً ادا کر دیا گیا"۔ (صفحہ ۳۸)

جناب خدیجہ کبریٰ کی یہ دو خصوصیتیں متفق علیہ ہیں کہ وہ سب سے پہلی بی بی ہیں جن سے حضرت رسول خداؐ نے عقد فرمایا اور یہ کہ ان کی زندگی میں حضرتؐ نے کوئی دوسری شادی نہیں فرمائی۔ اس کا ابن ہشام نے ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:۔

كانت اول امراة تزوجها رسول الله و لم يزوج عليها غيرها حتى ماتت (سیرت صفحہ ۱۱۹)

ابوالفدا نے لکھا ہے :-

ھی اول امراۃ تزوجھا و لم یتزوج غیرھا حتی ماتت

یہی دیگر مورخین کی بھی تصریح ہے جس کے خلاف کوئی ضعیف سے ضعیف روایت بھی نہیں ہے۔ مگر ان کا بیوہ ہونا اور قبل میں کسی اور شوہر کے حبالہ عقد میں ہونا متفق علیہ نہیں ہے بلکہ ایک روایت اس کی موجود ہے کہ رسولؐ کے ساتھ خود ان کا بھی یہ پہلا ہی عقد تھا (مناقب ابن شہر آشوب)

مذکورہ بالا ان خصوصیت کی قدر و قیمت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ آل رسولؐ اور ورثہ داران تعلیمات رسول میں بادشاہوں کی بیٹیاں آئیں مگر ان کی یہ رعایت نہیں کی گئی کہ ان کی موجودگی میں کسی دوسری خاتون سے تعلقات ازدواجی قائم نہ کئے جائیں۔ یہاں تک کہ دختر مامون الرشید نے اس کی شکایت امام محمد تقی علیہ السلام کے خلاف اپنے باپ سے کی تو اس نے امام کے نقطہ نظر کو محسوس کرتے ہوئے جواب دیا کہ ”میں ان پر حلال خدا کو حرام تھوڑی کر سکتا ہوں“

مگر تاریخ اسلام میں ایک یہ خصوصیت حضرت سیدۃ النساء فاطمہ زہراؑ کی ملتی ہے کہ حضرت علیؑ بن ابی طالب علیہ السلام نے ان کی موجودگی میں کوئی دوسرا عقد نہیں فرمایا۔ اور ایک ان سے پہلے ان کی والدہ معظمہ حضرت خدیجہ کی، کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی حیات میں کوئی دوسری شادی نہیں فرمائی اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان حضرات کو اس حلال خدا کے ترک پر کوئی دنیوی جاہ و حشم آمادہ نہیں کر سکتا تھا مگر صرف صفات کی رفعت اور پیش خدا اعزاز کی بلندی وہ ہو سکتی تھی جو کسی خاتون کو اس خصوصیت کا حقدار بنا دے۔ اس سے بلا شک و شبہ یہ امر پایہ ثبوت تک پہنچتا ہے کہ جس طرح حضرت خاتون جنت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو حضرت علی علیہ السلام کے ازواج میں جو مرتبہ حاصل تھا، وہ کسی بیوی کو حاصل نہ تھا۔ اسی طرح جناب خدیجہ کبریٰ کا ازواج پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جو مرتبہ حاصل تھا وہ کسی دوسری خاتون کو حاصل نہ تھا۔

بنائے کعبہ

حضرت رسولؐ کی عمر ۳۵ سال کی تھی کہ قریش نے کعبہ کی نئی تعمیر کا کام انجام دیا۔ کہا جاتا ہے کہ پہاڑوں کی درمیانی وادی کے پانی کا بہاؤ کعبہ کی سمت تھا اور کعبہ میں اس وقت تک کوئی چھت نہ تھی۔ اس لئے جب سیلاب آتا تھا تو پانی کعبہ کی دیواروں کے اوپر سے عمارت کے اندر داخل ہو جاتا تھا اور اس میں شگاف پیدا کر دیتا تھا۔ اس لئے اس کے انہدام کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ کعبہ کا سامان چوری ہونے لگا اور اس وقت تک کعبہ سے متعلق ایک خزانہ محفوظ تھا جو جوف کعبہ میں ایک کنویں کے اندر تھا یہ دفینہ چوری ہو گیا۔

(ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۲۲)

ابن سعد نے اس کی تفصیل لکھی ہے کہ کچھ زیور اور سونے کا بنا ہوا ایک ہرن چوری ہو گیا لہٰذا قریش نے طے کیا کہ کعبہ کی عمارت کو گرا کر از سر نو اس کی تعمیر کی جائے اور اسے مسقف کر دیا جائے۔

(طبقات جلد ۱ صفحہ ۹۳)

اس کے لئے قریش کی ایک ممتاز شخصیت نے کھڑے ہو کر آواز دی کہ اے گروہ قریش اس کا خیال رکھنا کہ اس تعمیر میں تمہاری حلال کمائی کے سوا کوئی حرام کا پیسہ مثلاً زنا کاری کا معاوضہ ' سود کا روپیہ اور کسی سے خرد برد کیا ہوا مال لگنے نہ پائے۔

(ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۲۲)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قریش کے کچھ افراد میں شریعت ابراہیمی کے اثر سے کسب معاش میں حرام و حلال کا تصور موجود تھا۔یہ اور بات ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ عملی حیثیت سے اس کے پابند نہ رہ گئے ہوں۔

ابن اسحاق نے تصریح کی ہے کہ یہ اعلان کرنے والے حضرت پیغمبر خداؐ کی دادی کے بھائی تھے جن کا نام ابو وہب بن عمرو بن عائذ بن عمران بن مخزوم تھا۔

قریش نے اس غرض سے کہ یہ شرف کسی ایک خاندان سے مخصوص نہ ہو جائے یہ انتظام کیا کہ کعبہ کے حصے مقرر کر دیئے اور ان کے لحاظ سے تقسیم عمل کر لی۔ چنانچہ دروازے کا حصہ اولاد عبد مناف و زہرہ سے متعلق ہوا اور رکن اسود اور رکن یمانی کی درمیانی دیوار بنی مخزوم اور کچھ دوسرے قریشی خاندانوں سے اور پشت کی طرف کا حصہ بنی جمح و سہم سے اور اسی طرح ایک طرف کا پہلو بنی عبدالدار اور بنی اسد وغیرہ سے متعلق ہوا۔ اس طرح پورا کام تعمیر کا تو ہو گیا مگر جب اس حصہ کی تعمیر کا وقت آیا جس میں حجر اسود رکھا جائے گا تو تمام قریشی قبیلوں میں اختلاف پیدا ہو گیا اور ہر ایک چاہنے لگا کہ یہ شرف اس کے حصہ میں آئے۔ یہاں تک کہ تلوار چلنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ (ابن سعد جلد ۱ صفحہ ۹۳)

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ یہ قبائل آپس میں جنگ کرنے پر بالکل تل گئے۔ قسما قسمی ہونے لگی یہاں تک کہ بنی عبدالدار نے ایک پیالے میں خون بھر کر اپنے سامنے رکھا اور بنی عدی کے ساتھ مل کر جان دینے کا عہد کیا اور اس کی علامت کے طور پر اپنے ہاتھ اس خون میں ڈبو دیئے چنانچہ عرب میں ان کا نام "لعقة الدم" (خون چاٹنے والے) ہو گیا اور اس کی وجہ سے چار پانچ دن تعمیر کے کام میں تعطل پیدا ہو گیا۔

(سیرت ابن ہشام صفحہ ۱۲۴)

آخر ان سب نے قضیہ کو ختم کرنے کے لئے یہ طے کیا جس کا محرک ایک روایت کے مطابق قریش میں سب سے زیادہ معمر شخص ابو امیہ بن مغیرہ مخزومی تھا کہ جو شخص سب سے پہلے بنی شیبہ سے مسجد میں داخل ہوتے ہوئے نظر آئے اسے ثالث بنا دیا جائے اور جو فیصلہ وہ کرے، اسے سب منظور کر لیں۔ اس رائے پر سب نے اتفاق کر لیا۔

اب باب بنی شیبہ سے سب سے پہلے جو چہرہ نظر آیا وہ حضرت محمدؐ کا تھا۔ سب خوش ہو کر کہنے لگے کہ یہ تو امین ہیں ہم سب ان کے فیصلہ پر راضی ہیں اور پورا معاملہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ حضرت نے فرمایا' ایک کپڑا لاؤ۔ چنانچہ وہ لایا

گیا۔ (ابن ہشام صفحہ ۱۲۴) یا یہ کہ آپ نے خود اپنی عبا دوش سے اتاری اور اسے زمین پر بچھا دیا (ابن سعد جلد ۱ صفحہ ۹۳) اور حجر اسود کو اٹھا کر اس چادر یا عبا میں رکھ دیا اور فرمایا کہ تم میں سے ہر قبیلہ کا ایک آدمی اس کے کسی گوشے کو پکڑ لے اس طرح سب نے مل کر اس کو اٹھایا اور اس جگہ تک لائے جہاں اس کو رکھا جانا تھا۔ جب وہاں تک اسے لے آئے تو آپ نے بڑھ کر حجر اسود کو اپنے ہاتھ میں اٹھایا اور اس کی جگہ پر نصب کر دیا۔

اس طرح یہ مہم پایہ تکمیل تک پہنچی اور اس مہم کے ساتھ قریش بلکہ تمام عرب میں آپ کی شخصیت کی ایک خاص اہمیت محسوس کی جانے لگی۔

طلوع آفتاب رسالت
یعنی بعثت ختم المرسلینؐ

دنیا نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ کو ایک کامل انسان کی حیثیت سے پہچان لیا تھا مگر ابھی اس منصب کا آشکارا ہونا باقی تھا جس کے لئے رب العالمین نے اس جوہر فرد کو پیدا کیا تھا وہ منصب آپ کی ذات کے ساتھ بدو فطرت سے وابستہ تھا اور یہ آپ کی سیرت طیبہ جو دنیا کی آنکھوں کے سامنے نمودار تھی اسی منصب کی عملی تجلی تھی۔ وہ پیام جس کی تجدید و تکمیل اصلاح خلائق کے لئے آپ کو کرنا تھی۔ اب تک آپ کی خاموش زندگی اسی پیغام کا مرقع تھی اور اسی کی طرف آپ نے زبان سے دنیا کو دعوت دینا تھی۔

اصولی حیثیت سے توحید پروردگار کی حقیقت آپ کے لئے نئی نہیں تھی۔ وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی ودیعت تھی جو خود آپ کے آباؤ اجداد کے پاس وراثتاً چلی آرہی تھی اور آپ کی عقل کامل جو آپ کے بلند ترین انسانی نقطہ کمال کا لازمہ تھی آپ کو خالق کائنات کی صحیح معرفت کے حصول کی ضامن تھی جس کے لئے کسی غار میں بیٹھ کر سوچنے اور مراقبہ میں مصروف رہنے کی ضرورت نہ تھی مگر حکمت ربانی اس کی متقاضی تھی کہ آپ اپنا پیغام دنیا تک نمائندہ الٰہی ہونے کی حیثیت سے پہنچانے اس وقت تک کھڑے نہ ہوں جب تک کہ آپ کی کمال سیرت کا اثر پورے طور سے خلق پر نہ ہو جائے اور وہ آپ کے بلند اخلاقی اوصاف کے پورے قائل نہ ہو جائیں تاکہ آپ جب

دعوائے رسالت فرمائیں تو ان کا وہی اقرار و اعتراف نیک فطرتوں کے لئے آپ کی جانب رہنمائی اور بدسرشتوں کے خلاف آپ کی طرف سے حجت تمام ہونے کا ذریعہ بنے۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ اس وقت کے پہلے آپ سے کوئی قول یا فعل ایسا ظاہر نہ ہو جس سے انہیں محسوس ہو کہ آپ کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں یا کوئی وحشت محسوس کریں کہ یہ کسی خاص دین کے مبلغ ہیں۔

یہ وجہ تھی کہ آپ اس معبود حقیقی کے فرائض عبادت ادا کرنے کے لئے تنہائیوں کو پسند فرماتے تھے اور بعثت کے کئی سال پہلے سے آپ نے غار حرا کو اپنی عبادت کا مرکز بنا لیا تھا۔ اس طرح کے تصورات بھی بالکل غلط ہیں کہ اللہ کی طرف کا پیغمبر خود اپنی حقیقت سے واقف نہ ہو یا وہ پیغام ربانی یا صدائے آسمانی سے وحشت و دہشت محسوس کرے یا اسے وحی الٰہی کی شناخت میں دوسرے آدمیوں سے پوچھنے اور ان سے اطمینان حاصل کرنے کی ضرورت ہو۔

اس قسم کی باتیں جو مسلمانوں کی تاریخ میں نظر آئیں وہ یقیناً کچھ ایسے مخالفین اسلام کی کارستانی ہیں جو مسلمانوں کے لباس میں ہو کر مسلمانوں کے ساتھ گھل مل گئے تھے اور دنیوی اقتدار کے طلبگاروں نے اصل علمی مرکزوں سے نگاہوں کو ہٹانے کے لئے ان لوگوں کو علمی اہمیت دے دی جیسے عبداللہ بن سلام اور کعب الاحبار ایسے نو مسلم یہودی انہوں نے شان رسالت کے گھٹانے کے لئے اس قسم کی حکایتیں وضع کر دیں اور انہیں سلطنت کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے مورخین نے ہاتھوں ہاتھ لے لیا اور ان سے اپنی تاریخوں کے صفحات سیاہ کر دیئے۔

ہمارے نزدیک حضرتؐ کے مبعوث برسالت ہونے کے صرف یہ معنی ہیں کہ حکمت باری متقاضی ہوئی کہ ابھی تک جو کام صرف خاموش سیرت کے مظاہرے سے ہو رہا تھا وہ اب رفتہ رفتہ اعلان تولی کی شکل اختیار کر لے۔ چنانچہ اب آپ دعویٰ رسالت پر مامور ہو گئے۔ اس کو ہم "بعثت" کہتے ہیں۔

یہ امر متفق علیہ ہے کہ اس وقت حضرت کی عمر شریف چالیس سال کی تھی مگر تاریخ میں اختلاف ہے۔

مورخین اہل سنت لکھتے ہیں کہ پہلی وحی آپ پر ماہ رمضان المبارک میں(ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۴۹) سترھویں تاریخ ماہ مبارک کی (ابن سعد' جلد۱ صفحہ ۱۲۹) اور طریق اہل بیت رسول علیہم السلام سے یہ ثابت ہے کہ حضرت کی بعثت ۲۷ رجب کو ہوئی۔
(اعلام الوریٰ طبرسی رحمہ اللہ صفحہ ۲۹۳)

پہلی وحی

یہ وحی الہیٰ جو سب سے پہلے نازل ہوئی سورہ اقراء کی پانچ ابتدائی آیتیں تھیں۔ یعنی :۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقراء باسم ربکَ الذی خلق○ خلق الانسان من علق ○ اقراء و ربکَ الاکرم الذی علم بالقلم ○ علم الانسان ما لم یعلم○

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے ۔ پڑھیئے اپنے پروردگار کے نام کا سہارا لے کر جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو ایک منجمد خون سے۔ پڑھیئے اور آپ کا پروردگار سب سے بڑا صاحب کرم ہے جس نے قلم کو ذریعہ علم بنایا۔ انسان کو ان باتوں کا علم دیا جنہیں وہ نہیں جانتا۔

غور سے دیکھا جائے تو اس قوم اور ماحول میں کہ جہاں ان پڑھ ہونے پر فخر تھا اور قرات و کتابت سے عاری ہوتا قومی کردار کی حیثیت رکھتا تھا پہلا پیغام جو پہنچایا جارہا ہے وہ قرات اور کتابت کی طرف توجہ دلانے والا' یہ اسلام کی طرف سے عقل اور علم کے دروازوں کے کھولنے کی اہمیت کا ایک بڑا نمایاں ثبوت ہے۔

حالانکہ بہت بڑا مرض قوم میں شرک کا تھا اور شرک کے ماتحت کتنی خرابیاں تھیں جو پھیلی ہوئی تھیں۔ اس لئے سو رہ قل ہو اللہ کو پہلا سورہ ہونا چاہئے تھا جو باجماع مفسرین پہلا سورہ نہیں ہے بلکہ بعد کو اترا ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ شرک بڑی سے بڑی بیماری ضرور ہے مگر ہر بیماری کا ایک داخلی سبب ہوتا ہے۔ یہ شرک اور بد اخلاقیاں تو سب امراض کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک طبیب کی نگاہ تشخیص مرض کے بعد علاج کے سلسلہ میں سبب مرض پر جانا چاہئے اور وہ اصل سبب

شرک اور تمام بد اعمالیوں کا جہالت ہوتی ہے۔ اس لئے اسلام نے سب سے پہلے جہالت کے خلاف آواز بلند کی۔

وہ جنہوں نے تبلیغ اسلام میں تلوار کو نمایاں حیثیت دی ہے غور کریں کہ اسلام کی پہلی وحی جو آئی ہے اس میں تلوار کا نام نہیں ہے۔ قلم کا نام ہے مگر افسوس تو اس کا ہے کہ اس راز کو خود مسلمانوں ہی نے نہیں سمجھا ورنہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ کے بعد وہ تلوار ہاتھ میں لے کر اشاعت اسلام کے لئے آگے نہ بڑھتے بلکہ قلم ہاتھ میں لے کر تعلیم و تفہیم کے لئے میدان میں آتے۔ اس وقت مسلمانوں کی تاریخ کچھ اور ہوتی اور مسلمانوں کے ذریعے سے اسلام کے دامن پر جو غلط قسم کے دھبے لگا دیئے گئے وہ نہ لگائے جا سکتے۔

سابقین الی الاسلام

حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہٖ پر جو پہلا پیغام الٰہی آیا اور آپ دعوت رسالت پر مامور ہوئے تو فطری طور پر اور تربیت و تعلیم کے عقلی اصول پر اور حکمت تبلیغ کی بنا پر سب سے پہلے آپ کو اس پیغام کی اپنے گھر والوں کو اطلاع دینا چاہئے تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور آپ کی پاک زندگی پر اندرونی اطلاع اور دل پر اس کے قائم شدہ اثر کا نتیجہ تھا کہ گھر کے آدمیوں نے بلا توقف اس پر لبیک کہی۔

یہ گھر کے آدمی کون تھے؟ آپ کی شریک حیات جناب خدیجہ کبریٰ جنہوں نے آپ کے بلند اوصاف اور رفعت کردار ہی سے متاثر ہو کر آپ کو رفاقت زندگی کے لئے منتخب کیا تھا۔ آپ کے چچا زاد بھائی اور آپ کی آغوش تربیت میں مثل اولاد پرورش پانے والے حضرت علیؑ بن ابی طالب جنہوں نے آنکھ کھول کر سب سے پہلے اسی چہرہ مبارک پر نظر کی تھی اور پھر اسی گود میں پل کر دس برس کی عمر تک پہنچے تھے جو عربی اور ہاشمی اس دور کی نشوونما کے لحاظ سے شباب سے کچھ زیادہ دور کی عمر نہیں تھی آپ کو رسالت کے جاننے اور اس کے ماننے کے لئے کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں تھی اس لئے کہ وہ اس مسمی کو آنکھ سے دیکھ رہے

تھے جو وقت آنے پر رسالت کے اسم سے موسوم ہو گیا۔ وہ ہر وقت ساتھ تھے اور خدا کی دی ہوئی قوت ادراک سے ان کمالات کا مشاہدہ کر رہے تھے جس کا بعد میں اپنے بچپن کی روداد سناتے ہوئے آپ نے خود اظہار فرمایا ہے۔

کنت اتبعه اتباع الفصیل اثرامه یرفع لی کل یوم من اخلاقه علما۔

میں آپ کے پیچھے پیچھے چلتا تھا اس طرح جیسے ناقہ کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ آپ ہر دن میرے لئے اپنے اخلاق سے ایک منارہ نور بلند کرتے تھے۔

اس ذیل میں کہا ہے۔ کنت اری نور النبوة واشم ریح الرسالة

میں نبوت کی روشنی اپنی آنکھ سے دیکھتا تھا اور رسالت کی خوشبو سونگھتا تھا۔

(نہج البلاغہ جلد ۲ صفحہ ۱۸۳ طبع مصر)

ڈاکٹر اقبال کے الفاظ میں۔۔

مسلم اول شہ مرداں علیؑ عشق را سرمایہ ایمان علیؑ

قدیم ترین مورخ ابن اسحاق نے جو ترتیب بتائی ہے وہ یہ ہے کہ جناب خدیجہ بنت خویلد سب سے پہلی ایمان کا اقرار کرنے والی فرد ہیں اور صنف ذکور میں سب سے پہلے جنہوں نے ایمان کا اعلان کیا وہ علیؑ بن ابی طالبؑ تھے۔ پھر رسولؐ کے ساتھ مثل اولاد کے رہنے والے اور آپ کے بیٹے کہا جانے والے زید بن حارثہ تھے کہ یہ بھی گھر والوں میں محسوب تھے' ان کے علاوہ طبری رحمتہ اللہ علیہ کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ جو درایت کے مطابق ہے کہ اسی دور میں جناب علیؑ بن ابی طالبؑ کے ایک دوسرے بھائی حضرت جعفر بھی جنہیں ایک حدیث حضرت رسولؐ کی بناء پر جعفر طیار کہا جاتا ہے اس فہرست میں داخل ہو چکے تھے چنانچہ شروع میں جو نمازیں ہوتی تھیں اس میں رسولؐ کے پیچھے جو صف قائم ہوتی تھی وہ حسب ذیل افراد پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔

(۱) علیؑ (۲) جعفرؓ (۳) زیدؓ (۴) خدیجہؑ

(اعلام الوریٰ)

اس کے بعد جو اکا دکا آدمی دوستانہ حیثیت سے گھر پر آجایا کرتے تھے ان کے

سامنے ذکر آیا تو ان میں ایک قول کے مطابق سب سے پہلے قبیلہ بنی تیم میں کے جناب ابوبکر نے اسلام قبول کیا اور پھر عثمان' زبیر بن العوام عبدالرحمٰن بن عوف' سعد بن ابی وقاص اور طلحہ بن عبید اللہ' کچھ دنوں کے اندر مسلمان ہوئے۔

(ابن ہشام جلد ا صفحہ ۱۵۳-۱۵۸)

مگر دوسری روایت میں جسے طبری نے محمد بن سعید کی زبانی نقل کیا ہے یہ ہے کہ انہوں نے اپنے والد سے پوچھا کہ آپ لوگوں میں ابوبکر سب سے پہلے اسلام لائے؟ انہوں نے کہا' نہیں! ان سے قبل پچاس آدمی سے زیادہ اسلام لا چکے تھے۔

تقیہ پر عمل

آغاز رسالت سے تین برس تک قانون تقیہ پر عملدرآمد رہا اور دعوت اسلامی کا کام مخفی طریقہ پر انجام پاتا رہا۔ ابن سعد کے الفاظ ہیں۔

کان یدعو اول ما نزلت علیہ النبوۃ ثلث سنین مستخفیا الی ان امر بظھور الدعاء (طبقات صفحہ ۱۳۲)

وحی الٰہی نازل ہونے کے بعد شروع شروع میں تین برس تک حضرتؐ خفیہ تبلیغ فرماتے رہے یہاں تک کہ حکم الٰہی اظہار نبوت کا آیا۔

ابوالفداء وغیرہ کے بھی یہی الفاظ ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں۔

"تاسہ سال حال بر ایں منوال بود و مامور بود آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم با خفائے ایں امر و صبر بر آں پس آنحضرتؐ بخفیہ دعوت می کرد نازل شد ایں آیہ کریمہ فاصدع بما تومروا عرض عن المشرکین"

(مدارج النبوۃ)

مسٹر کے - اے حمید بی۔ اے (لنڈن) بیرسٹر لاہور نے لکھا ہے کہ "ابتداء میں حضورؐ پر معدودے چند لوگوں کے بجز عوام ایمان نہ لائے۔ اشاعت مذہب کی رفتار بالکل سست تھی۔ چار سال کے بعد مسلمانوں کی تعداد صرف انتالیس افراد تھی۔

مسلم عوام کے ڈر سے گھروں میں کواڑ بند کرکے قرآن کے آیات کی تلاوت کرتے اور اپنے مذہبی فرائض انجام دیتے تھے۔ چار سال کی عسرت و تنگی کے بعد سرکار نے علی الاعلان کعبہ کے سامنے توحید کا پرچار کیا"۔

(مسلمانان عالم جلد ا صفحہ ۴۰)

تین سال کو چار سال بنانا اور پھر درمیان کی منزلوں کو چھوڑ کر علی الاعلان کعبہ کے سامنے پرچار تک پہنچا دینا اس مصنف کی وہ رواداری اور غفلت ہے جس کی ارادی تحریفوں اور ادبی بدتمیزیوں کے علاوہ اس کی اس تاریخ میں شدت کے ساتھ بہ کثرت پائی جاتی ہے جس پر کہیں کہیں جہاں ضرورت محسوس ہوئی اس کتاب میں تنبیہہ کی جائے گی۔

دعوت عشیرہ

ایک محدود مجمع میں پہلی علانیہ تبلیغ

گھر کے بعد تدرتاً" گھرانے کی باری آنا ہی چاہئے تھی اور گھرانے کے بعد عوام کی۔ رسولؐ کا پیغام گھر والوں کو تو اپنا بنا ہی چکا تھا اب تین برس تک رازداری کے ساتھ فرض تبلیغ ادا ہونے کے بعد یہ حکم آیا۔

و انذر عشیر تلئ الاقربین (شعرا آیت ۲۱۴)

اپنے قریبی رشتہ داروں کو تبلیغ کیجئے۔

یہ گھرانے کی تبلیغ کا فرمان تھا جس کے بغیر عوام کو تبلیغ کی آیت نہیں آ سکتی تھی۔ اس حکم کی تعمیل میں دعوت کا انتظام کیا گیا۔ پہلے دن سب جمع ہوئے۔ کھانا کھایا مگر حضرت کو کچھ کہنے کا موقع نہ دیا۔ دوسرے دن آپ نے پھر دعوت کی اور تمام اولاد عبدالمطلب کو جمع کر کے اپنی رسالت کا اعلان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ "میں تمہارے پاس دنیا و آخرت کی نیکی لایا ہوں اور اللہ نے مجھے اس پر مامور کیا ہے کہ تمہیں اس کی طرف بلاؤں" پھر فرمایا کہ "تم میں کون شخص اس دین کی اشاعت میں میرا دست و بازو بننے کے لئے تیار ہے اور وہی میرا بھائی' میرا وصی اور میرا جانشین قرار پائے گا۔"

اس اعلان سے یہ ظاہر تھا کہ آئین اسلام میں رسولؐ کی جانشینی میں عوام کی رائے کو دخل نہیں ہے بلکہ وہ خدا و رسولؐ کے اختیار تمیزی سے متعلق ہے جس

کے لئے اس وقت بطور علامت اس وقت کے عہد نصرت و وفاداری اور اس کی تکمیل کو قرار دیا گیا تھا۔

مجمع تمام خاموش رہا اور صرف حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ تھے جو اگرچہ سب سے زیادہ کمسن تھے مگر کھڑے ہو گئے اور کہا' میں اپ کا اس مہم میں ہر طرح سے مددگار ہوں گا۔ حضرت رسولؐ خدا نے علیؑ کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا' بس یہ میرا بھائی ہے' میرا وصی اور میرا جانشین ہے۔ تم سب کو اس کی اطاعت لازم ہے۔
(طبری جلد۲ صفحہ ۲۱۷)

یہ واقعہ اتنا مسلم ہے کہ تاریخ کے علاوہ حدیث کا جز بھی بن گیا ہے اور تفسیر کا بھی۔ ملاحظہ ہو تواریخ میں علاوہ طبری کے ابن اثیر اور ابوالفداء اور تفاسیر میں معالم التنزیل بغوی' تفسیر خازن بغدادی اور جمع الجوامع سیوطی وغیرہ اور جوامع حدیث میں کنزل العمال ملا علی متقی اور سیر میں دلائل النبوۃ بیہقی وغیرہ۔

اس کے علاوہ انگریزی مورخین نے بھی بڑے موثر الفاظ میں اسے اپنی تاریخوں میں درج کیا ہے۔

فاضل ہمعصر مولوی امام الدین صاحب رام نگری اپنے مقالہ "رسالت محمدی کا تحقیقی ثبوت" میں. جو مولوی دہلی کے ستمبر ۱۹۵۹ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے لکھتے ہیں کہ۔

"حضرت علیؑ کے علاوہ جو کمسن بھی تھے اور پہلے سے مسلمان بھی کسی نے ندا کے رسولؐ کی پیشکش کا جواب نہ دیا۔ حضرت علیؑ نے کھڑے ہو کر فریضہ تائید ادا کیا تو تمام اکابران کی تائید کو ایک طفلانہ حرکت سمجھ کر ہنس پڑے لیکن آنے والے حالات نے بتایا کہ خدا کا رسولؐ بھی سچا تھا' اس کی دعوت بھی سچی تھی اور وہ مرد حق بھی سچا تھا جس نے تنہا اسکی تائید کی تھی"۔

(مولوی ' ستمبر ۵۹ء صفحہ ۱۰)

مجمع عام میں پہلی تبلیغ

جب اس محدود مجمع میں تبلیغ کا مرحلہ طے ہو گیا تو اب حکم آیا کہ۔

فاصدع بما تؤمرو اعرض عن المشرکین
آپ جس دعوت پر مامور کئے گئے ہیں اسے برملا پیش کیجئے اور مشرکین کی طرف سے اعتناء نہ کیجئے۔

اب ایک دن جب کعبہ کے سامنے دور تک مشرکین اکٹھا تھے آپ کوہ صفا پر تشریف لے گئے اور حد نظر تک کے لوگوں کو پکار کر مخاطب کیا اور کہا۔ "بتاؤ کہ اگر میں تم لوگوں کو اطلاع دوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے غنیم کا لشکر حملہ کے لئے آرہا ہے تو تم میرے کہنے سے اسے باور کرو گے یا نہیں؟

اس سوال پر سامنے کے لوگوں میں سے بہت سی آوازیں بلند ہوئیں کو ضرور باور کریں گے۔ اس لئے کہ اس زبان سے ہم نے سوا سچ کے کبھی جھوٹ سنا ہی نہیں ہے۔ جب آپ نے یہ اقرار لے لیا تو فرمایا کہ اچھا' پھر سنو کہ مجھے اللہ نے اپنا رسولؐ بنایا ہے اور مجھے اس پر مامور کیا ہے کہ میں تمہیں ہدایت کر دوں اور بتلاؤں کہ یہ جو تم بت پرستی کرتے ہو' اور بد اعمالیوں میں مبتلا ہو اس کے نتیجہ میں آتش جہنم کے شعلے ہیں"۔

اب یہ پوری زندگی کے انقلاب کا پیغام تھا۔ اس لئے لوگ ہنستے اور قہقہے لگانے لگے اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ آپ اپنی بات کہہ کر پہاڑ سے نیچے اتر آئے مگر آج سے آپ کے اور مشرکین کے درمیان حق اور باطل کے مقابلہ کی کشمکش شروع ہو گئی جس میں آپ کو سخت مشکلات سے دو چار ہونا پڑا' جن کا بیان آئندہ نذر ناظرین ہوگا۔

اسلام کا پیغام انقلاب
اور مخالف طاقتوں سے تصادم

چونکہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم عرب میں پیدا ہوئے تھے اور ابتدائی مخاطب آپ کے زیادہ تر عرب ہوئے اس لئے تاریخ اسلام میں تاریخ عرب اور ان کے ماضی و حال کی کیفیت کو خاص اہمیت حاصل ہے اور چونکہ آپ کا پیغام خاص عربوں کے لئے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لئے آیا تھا اس لئے تمام دنیا کے حالات پر بھی نظر ڈالنا ہوگی کہ اس وقت تمام دنیا کی کیا کیفیت تھی؟

جہاں تک عرب کے حالات کا تعلق ہے جیسا کہ ہمارے بزرگ دوست خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری نے "اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ" جلد اول میں لکھا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے مطالعہ سے پہلے اس سرزمین کے جغرافیائی حالات کا جاننا نہایت ضروری ہے کیونکہ جغرافیہ کا تاریخ پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

حدود اربعہ

عرب کے شمال میں صحرائے شام ہے۔ مشرق میں خلیج فارس اور خلیج عمان ہیں۔ جنوب میں بحیرہ عرب اور مغرب میں بحیرہ قلزم یا بحیرہ احمر (REDSEA) واقع ہیں۔ اس کے تین طرف سمندر ہیں اور جانب شمال خشکی یعنی شام کا ملک ہے۔ عرب کا صحرائی ملک براعظم ایشیا کا ایک جزیرہ نما ہے جو دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ نما اور وسعت میں فرانس سے دگنا ہے۔ عرب کے باشندے اسے "جزیرۃ العرب" کہتے

ہیں۔ حقیقت میں یہ جزیرہ نہیں بلکہ جزیرہ نما ہے۔ مگر عملی طور پر یہ جزیرہ ہی ہے چونکہ اس کے شمال میں نفوذ کا نہایت گرم صحرا ہے۔

اس سے زیادہ جغرافیائی تفصیلات ہمارے نزدیک اصل موضوع کے لحاظ سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔

وہ دور جس سے بعثت رسولؐ سے قبل عرب گزر رہے تھے "زمانہ جاہلیت" کہلاتا ہے جیسا کہ ہم نے "شہید انسانیت" میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عرب لوگ جنگلی قبائل کی طرح تہذیب و تمدن سے بالکل اجنبی تھے اور دور وحشت میں زندگی گزار رہے تھے۔ بلکہ عرب کی جاہلیت کا زمانہ علم و تمدن و تہذیب کے بعد والے تنزل کا دور تھا۔ جس میں عقل کے پہلے چراغ بجھ گئے تھے اور بری عادتوں نے ان پر غلبہ کر لیا تھا۔

یہی وہ صورت حال ہے جس کی اصلاح مشکل ہوتی ہے اس لئے کہ وحشی قبائل وغیرہ کی فطرت کا ورق تو سادہ ہوتا ہے۔ وہ ہر اصلاح کے نقش کو آسانی سے قبول کر لیتا ہے مگر اس طرح کی جاہلیت وہ ہوتی ہے جس میں بری عادتوں کو انسان کچھ اچھے تصورات کا لباس پہنا کر اختیار کرتا ہے اور ان برائیوں پر شرمندہ ہونے کے بجائے ان پر نازاں ہوتا ہے جس طرح یورپ کا یہ دور تمدن ہے جس میں ہر قسم کی خونریزی و خون آشامی بنام قیام امن ہوتی ہے اور بد اخلاقی کی اشاعت کلچر کے نام پہ ہوتی ہے۔ یہی صورت عرب کی تھی۔ وہ بت پرستی سادگی کے ساتھ نہ کرتے تھے۔ یہ تصور کرکے کہ یہی اصنام ہماری ضرورتوں کو پورا کرنے والے ہیں بلکہ وہ اس کا فلسفہ بیان کرتے تھے' وہی جو آج چودہ سو برس بعد انتہائی روشن خیالی کے بعد بھی بت پرستی کی معقولیت میں پیش کیا جاتا ہے کہ ما نعبدھم الا لیقربو نا الی اللّٰہ زلفٰی۔ یعنی یہ انکی پرستش معبود حقیقی کی طرف توجہ حاصل کرنے کے لئے ہے۔ شراب خواری اور قمار بازی کو وہ فیاضی کی دلیل سمجھتے تھے لڑکیوں کے زندہ درگور کرنے کی ایسی قبیح رسم تک کو وہ غیرت و شرافت کے احساس کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ دوسرے پر ظلم کرنے کو وہ بہادری سمجھتے تھے اور حلم و عفو

کو بزدلی قرار دیتے تھے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی جاہلیت خالص جہالت نہیں بلکہ "جہل مرکب" کی حیثیت رکھتی تھی۔ جسے علمائے اخلاق نے لا علاج مرض کہہ کر اس کی اصلاح میں اپنی عاجزی کا اعتراف کیا ہے۔

احساس برتری نے ان میں قومی خودداری ایسی ضروری پیدا کی تھی کہ کسی دوسری قوم کے اقتدار کے سامنے سرخم کرنا ان کے لئے مشکل تھا۔ مگر اس خود داری نے قومیت سے آگے بڑھ کر قبیلوں کے افراد میں بھی انانیت پیدا کر دی تھی جس کا نتیجہ تھا باہمی رقابت اور آپس کی خانہ جنگی اور پھر اس میں طبقہ واری برتری نے پیدا ہو کر مساوات انسانی کا خاتمہ کر دیا تھا اور اونچ نیچ کا تصور پیدا کر کے وحدت انسانی کے پرخچے اڑا دیئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک بڑے آدمی کے قتل ہو جانے پر صرف اس کے قاتل کو قتل نہ کیا جاتا تھا بلکہ اس کے قبیلہ کے سینکڑوں بے گناہ آدمیوں کو مار ڈالا جاتا تب کہیں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کے خون کا بدلہ ہوا۔ اس کے برخلاف اگر بڑے آدمی کے ہاتھ سے کوئی چھوٹا آدمی قتل ہوتا تھا تو اس کا خون قصاص کا مستحق سمجھا نہ جاتا تھا۔

مذہبی حیثیت سے وہ نہایت پستی میں تھے۔ ان میں کوئی ایک مذہب مشترک نہ تھا۔ بلکہ بڑی جماعت بت پرستی میں مبتلا تھی۔ چنانچہ خانہ کعبہ جو کہ حضرت ابراہیمؑ نے خدائے واحد کی عبادت کے لئے بنایا تھا ان کے ہاتھوں ایک بت خانہ کی شکل اختیار کر چکا تھا جس میں ان کے سال کے دنوں کے لحاظ سے تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے کہ ایک دن ہر بت کی عبادت کی جائے۔

کچھ لوگ صابئین یعنی ستارہ پرست تھے۔ ان کے علاوہ کچھ یہود مجوس اور نصرانی بھی تھے۔ مگر یہ سب نام کے لحاظ سے نہ سہی حقیقت کے لحاظ سے شرک میں گھر چکے تھے۔ یہود عزیزؑ کو خدا کا بیٹا کہہ رہے تھے اور عیسائی مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کہنے کے علاوہ تثلیث کا گورکھ دھندا بنا کر ایک کے بجائے باپ' بیٹے اور روح القدس تین تین کی پرستش کرنے لگے تھے۔ اس طرح نہ یہود نہ موسیٰ کے تعلیمات پر

قائم تھے اور نہ نصاریٰ۔ حضرت مسیحؑ کی تعلیم پر اور مجوس کے لئے تو یہی بات مشکوک ہے کہ وہ دراصل کسی سچے پیغمبر کی طرف نسبت بھی رکھتے تھے یا نہیں اور اب تو ان کے بنیادی عقائد میں شرک یعنی یزدان و اہرمن دو خداؤں کا عقیدہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ کچھ منکر خدا یعنی دہریے بھی موجود تھے جو ما یھلکنا الا الدھر کے نعرے لگا رہے تھے جنہیں اصطلاح حال میں نیچری کہنا چاہئے۔

اس تمام اکثری بلکہ ہمہ گیر ضلالت کی تاریکی میں معدودے چند آل خابراہیم یعنی اسلاف حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ تھے جو توحید اور صحیح اخلاق کی امانت کو سینہ سے لگائے بیٹھے تھے مگر ان کی کوئی آواز نہ تھی اور وہ اوصاف ان کی انفرادی شخصیتوں میں محدود ہو کر رہ گئے تھے۔

جو حالت عرب کی تھی یہی تقریباً" تمام دنیا کی تھی۔

مادی حیثیت سے دو شہنشاہیتیں اس وقت با اقتدار تھیں۔ ایک سلطنت روم جس کے تحت میں عرب کا شام کا علاقہ چلا گیا تھا اور دوسرے سلطنت فارس جس کے قبضہ میں عراق آ گیا تھا۔ رومی سلطنت کا مذہب عیسائی تھا مگر وہ عرصہ دراز سے علم و حکمت کے چراغ کو گل کر کے اعتقاد کو عقل کے ماوراء قرار دے چکا تھا اور یونانی مفکرین کا قلع قمع کر کے ایمان کو "تقلید کو رانہ" کا مترادف قرار دیئے ہوئے تھا۔ ایران زر دشتی مذہب کا پیرو ہو کر آگ کی پرستش میں گرفتار تھا اور خدا پرستی سے بے نصیب ہو چکا تھا۔ تمدنی حیثیت سے دونوں پر مادیت مسلط تھی اور عیش و عشرت کی گرم بازاری نے اخلاق و فرائض کو زینت طاق نسیاں بنا رکھا تھا۔ اس طرح دونوں ملک خود غرضیوں اور ستم رانیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے جو تمدن و تہذیب کے زوال کی علامت ہیں۔

یورپ تو اس وقت کوئی قابل ذکر حیثیت ہی نہیں رکھتا تھا بلکہ وہ اس وقت دور وحشت سے گزر رہا تھا اور تمدن سے دور تھا اور ہندوستان بھی اپنے ابتدائی رہبروں کی توحید کی تعلیم کو فراموش کر کے مشرکانہ ظلمت میں گرفتار تھا اور اپنے قدیم باشندوں پر بیرونی آریائی حملہ آوروں کی سیاسی اقتدار پسندی کی بدولت اس اونچ

نچ اور ذات پات کی تفریق میں مبتلا ہو چکا تھا جس سے نکلنے کے لئے وہ اب تک ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ مگر اس کی گرفت اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ عملی طور پر اس سے نکلنے میں کامیابی نہیں ہو رہی ہے۔

اس عالم ظلمات میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا کے لئے مشعل نور لے کر کھڑے ہوئے۔ آپ نے اپنے پیغام میں شروع ہی سے جب خطاب کیا تو "ایھا العرب" "اے قوم عرب" نہیں کہا بلکہ "ایھا الناس" کہا۔ "اے انسانو!" بلکہ پہلی ہی وحی میں خالق نے ان کی زبانی جو اللہ کا احسان یاد دلایا اس میں عرب کا نام نہیں لیا بلکہ انسان کا نام لیا۔ یاد کر لیجئے اس وحی کو۔ اقراء باسم ربك الذی خلق ○ خلق الانسان من علق - اقراء و ربك الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان ما لم یعلم

اس طرح ان کے پیغام کا پرچم شروع سے قبائلی اور قومی حد بندیوں سے آزاد ہو کر آفاقی سطح پر فضائے انسانیت میں بلند ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ اس پیغام کے سننے والوں کا دائرہ تدریجی طور پر آگے بڑھا۔ ابتداء میں اس کے سننے والے عرب تھے اور اہل مکہ جو زیادہ تر مشرکین یعنی بت پرست تھے اور پھر یمن تک آواز پہنچی جہاں عیسائی رہتے تھے اور پھر وفود اور خطوط کے ذریعہ سے روم' فارس' مصر اور حبش وغیرہ تک پیغام پہنچایا گیا جس کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ اجزائے کتاب میں آئے گی۔

بہرحال چونکہ ابتدائی مخاطبین کا حلقہ آپ کا عربوں ہی کا تھا اس لئے آپ کی انقلابی مہم میں رکاوٹیں ڈالنے کے لئے جو کھڑے ہوئے وہ بھی وہی تھے جن میں بھی قریش یعنی وہی قبیلہ جس میں آپ پیدا ہوئے تھے آگے آگے تھا اس لئے کہ آپ کا پیغام بہت سی ان عادتوں ہی سے نہیں بلکہ ان کے نظریات سے بھی متصادم تھا۔

ڈاکٹر وحید مرزا صاحب سابق صدر شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی کے لفظوں میں۔
رسولؐ ان لوگوں کو بردباری' خاکساری' پاکبازی اور عفو کا سبق پڑھا رہے تھے'

جن کے نزدیک معاف کر دینا کمزوری کی دلیل اور انتقام نہ لینا ذلت اور بزدلی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ رسولؐ ان لوگوں کو مساوات اور اخوت کی تعلیم دینا چاہتے تھے جو کہ اپنی خاندانی شرافت پر فخر کیا کرتے تھے اور اپنے آباء و اجداد کے پورے شجرہ کو نہایت سختی کے ساتھ محفوظ رکھا کرتے تھے ان چیزوں کے علاوہ اسلام کو عربوں کے اور بہت سے دوسرے رجحانات سے برسرپیکار ہونا پڑا۔ عرب اس بات کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ سب سے زیادہ مقدس انسان کیونکر خدا کی بارگاہ میں سب سے زیادہ معزز ہو سکتا ہے۔ یا اسلام قبول کرنے کے بعد کوئی پست انسان کیونکر عرب کے شریف ترین خاندانوں کے اشخاص سے برتری کا دعویٰ کر سکتا ہے"۔

یہ ایک پورا تمدنی انقلاب' معاشرتی انقلاب' سیاسی انقلاب اور معاشی انقلاب تھا جو ایک مختصر جملہ لا الہ الا اللہ میں مضمر تھا جس کی طرف رسولؐ دنیا کو دعوت دے رہے تھے اور عرب سادہ لوح جاہل یعنی وہی دور وحشت سے گزرنیوالا گروہ ہوتا تو وہ اس جملہ کو واقعی ایک سادہ سا جملہ سمجھ کر برداشت کر لیتا مگر عرب باوجود اپنی جہالت کے بڑا نکتہ رس تھا کہ وہ اس سادے سے جملے کے مضمرات کو بڑی حد تک پہلی ہی آواز پر سمجھ گیا اس لئے وہ اپنے معبودان باطل کے تحفظ کے لئے جو فقط سونے چاندی' پتھر کے بت نہ تھے بلکہ اپنے تشخص و اقتدار' اپنے اوہام و تصورات اور اپنے رسوم و عادات کے بھی اصنام تھے کھڑا ہو گیا اور ایک اکیلے پیغمبر خداؐ کے سامنے پوری قوم صف بستہ ہو کر آ گئی ۔ خصوصیت کے ساتھ بنی امیہ جو خود رسولؐ سے موروثی عداوت رکھتے تھے مولانا شبلی لکھتے ہیں۔

"آنحضرتؐ کی نبوت کو خاندان بنی امیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا۔ اس لئے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرتؐ کی مخالفت کی"۔

(سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۱۵۸)

ان کے علاوہ بنی مغیرہ اور بنی مخزوم۔ ان میں ابوجہل کا چچا ولید بن مغیرہ جو خالد بن ولید کا باپ تھا بہت پیش پیش تھا۔ خود رسولؐ فرماتے تھے کہ۔

"ہم سے سب سے زیادہ بغض و عداوت رکھنے والی قومیں بنو امیہ' بنو مغیرہ اور

بنی مخزوم ہیں"۔

(تطہیر الجنان۔ ابن حجر مکی صفحہ ۱۴۴)

جناب ابو طالبؑ سے گفت و شنید

مشرکین اب کسی نہ کسی طرح پیغمبر خداؐ کی زبان بندی کرنا چاہتے تھے اس کے لئے ان میں کے جہاں دیدہ افراد نے پہلے پرامن ذرائع اختیار کرنا مناسب سمجھے۔ اس کے لئے ان کو پہلے سب سے اچھا ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ جناب ابوطالبؑ سے کام نکالا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان میں کے بہت سے بڑے لوگوں کا جناب ابوطالب سے بچپن کا دوستانہ تھا۔ بہت سے لوگوں نے ان سے تجارتی تعلقات تھے اور قرابتی سلسلہ نزدیک یا دور کا تقریباً" ان سب ہی سے تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس مادی دنیا میں حضرت محمد مصطفیؐ کا سہارا سوا ان کے اور کوئی نہیں ہے۔ اس لئے ناممکن ہے کہ ان کی بات کا ان پر اثر نہ ہو۔ اس لئے یا تو ان کے سمجھانے سے وہ مان جائیں گے اور جو مہم انہوں نے شروع کی ہے اسے ترک کر دیں گے تو جو مطلب ہے وہ حاصل ہی ہو جائے گا اور یا وہ انکار کر دیں گے اور اپنی روش پر قائم رہیں گے تو جناب ابوطالبؑ کی ہمدردی ان سے سلب ہو جائے گا اور ان کے ساتھ ساتھ تمام بنی ہاشم جو حضرت ابوطالبؑ کے زیر اثر ہیں وہ بھی کنارہ کشی اختیار کر لیں گے۔ اس طرح محمدؐ اکیلے رہ جائیں گے اور پھر ان کے خلاف جو بھی مناسب سمجھا جائے وہ رویہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ یہ سوچ کر ان کا ایک وفد جناب ابو طالب کے پاس آیا۔

جہاں تک ہم نے غور کیا ہے یہاں پر اکثر مورخین نے کئی مرتبہ کی گفتگوؤں کو یکجا کرکے بیان کر دیا ہے۔ یہ سب باتیں ایک دفعہ نہیں بلکہ مختلف دفعات میں ترتیب کے ساتھ ہوئی ہوں گی۔

پہلی دفعہ انھوں نے ملائم آواز میں کہا۔

انت سیدنا و افضلنا فی انفسنا و قد رایت الذی فعل ھولاء السفھآء مع ابن اخیکَ من ترکھم الھتنا و طعنھم علینا و تسفیھھم لعلامنا

آپ ہمارے سردار ہیں اور ہم سب آپ کو اپنے سے بہتر جانتے ہیں۔ آپ دیکھ

رہے ہیں کہ ان بیوقوفوں نے آپ کے بھتیجے کو ساتھ ملا کر کیا کر رکھا ہے کہ انہوں نے ہمارے خداؤں کو چھوڑ دیا ہے۔ ہم پر اعتراض کرتے ہیں اور ہمیں احمق بنا رہے ہیں۔

(طبقات ابن سعد جلد ا صفحہ ۱۳۴)

اس وقت مطلب اتنا ہی ہوتا کہ آپ اپنے بھتیجے کو سمجھایئے کہ وہ ایسا نہ کریں اور اس سے باز آجائیں اور اس وقت جناب ابو طالبؑ نے بھی دفع الوقتی والا کوئی جواب دے دیا ہو گا جس کے بعد وہ نتیجہ کے منتظر ہو گئے ہوں گے کہ دیکھیں اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے اس کے بعد جب انہوں نے دیکھا کہ کوئی اثر نہیں ہوا اور جناب رسالت مابؐ کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تو اس کے بعد انہیں آپ کی طرف سے مایوسی ہو گئی کہ ان کی اصلاح ممکن نہیں ہے اور اس کے ساتھ اپنی جگہ پر زعم ناقص انہیں پیدا ہوا کہ یقیناً اب ابوطالبؑ اپنے بھتیجے سے کچھ بددل ضرور ہو گئے ہوں گے کہ انہوں نے ان کی فرمائش پر عمل نہیں کیا مگر انہوں نے محمدؐ کو مثل اولاد کے پالا ہے اور پالنے کی محبت بہت ہوتی ہے لہذا اگر انہیں ان کا کوئی نعم البدل دے دیا جائے تو شاید وہ تیار ہو جائیں کہ محمدؐ کو ہمارے سپرد کر دیں کہ ہم ان کے ساتھ جو چاہیں سلوک کریں۔ یہ سوچ کر انہوں نے ولید بن مغیرہ کے بیٹے عمارہ کو جو بڑا حسین شکیل جوان تھا لا کر جناب ابوطالبؑ کے سامنے پیش کیا اور کہا۔

قد جئناك بفتی قریش جمالا و نسباونهادة و شعرا اندفعه فیکون لك نصره و میراثه و تدفع الینا ابن اخیك فنقتله فان ذلك اجمع للعشیرة و افضل فی عواقب الامور مغبة

ہم آپ کے پاس قریش کے اس جوان کو لے کر آئے ہیں جو حسن و جمال' خاندانی شرافت قد و قامت اور گیسو و رخ میں فرد فرید ہے' اسے آپ لے لیجئے۔ یہ آپ کا مدد گار رہے گا اور اس کی میراث کے بھی آپ حقدار ہوں گے اور اپنے بھتیجے کو ہمیں دے دیجئے۔ ہم اسے قتل کر ڈالیں کہ نظم قبیلہ اسی صورت سے درست ہو

سکتا ہے اور نتائج کے لحاظ سے یہ صورت نہایت مناسب ہے۔

جناب ابوطالبؑ نے اس کا انتہائی پیار اور مسکت جواب دیا۔ کہا۔

"واہ سبحان اللہ! کیا خوب تم لوگوں نے میرے ساتھ انصاف کیا ہے یعنی میں تو تمہارے بچے کو لے کر پالوں اور اسے کھلاؤں پلاؤں اور تم میرے بچے کو مجھ سے لے کر قتل کر ڈالو۔ یہ انصاف تو نہ ہوا ہاں طاقت کے بل پر کسی کمزور کو دبانا ہوا"۔

(ابن سعد جلد ۱ صفحہ ۱۳۴)

اس جواب کو سن کر وہ جناب ابو طالبؑ کی طرف سے بھی مایوس ہو گئے اور سمجھ گئے کہ ان میں اپنے بھتیجے کی طرف سے کوئی بددلی پیدا نہیں ہوئی ہے اور یہی وہ منزل ہو سکتی ہے جس کے بعد جناب ابوطالب کو رسولؐ کی زندگی کے متعلق خطرہ محسوس ہونے لگا اور اس احساس میں اتنی شدت ہوئی کہ ایک شام کو انہوں نے رسالت مآبؐ کو گھر پر نہیں پایا تو فقط تردد نہیں ہوا بلکہ جیسے یقین ہو گیا کہ رسولؐ کو کچھ گزند پہنچا دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے اولاد ہاشم و مطلب کے کچھ جوانوں کو جمع کرکے انہیں ہدایت کی کہ ہر ایک تم میں سے کوئی کاٹدار لوہے کا ہتھیار لے آئے اور جب میں مسجد میں داخل ہوں تو تم میں سے ایک ایک آدمی ان میں کے ایک ایک بڑے لیڈر کے پہلو سے پہلو ملا کر بیٹھ جائے اور خصوصیت کے ساتھ ابوجہل کو نہ چھوڑنا اور جونہی یہ معلوم ہو کہ محمدؐ قتل ہو گئے فوراً ہر ایک تم میں کا اپنے پاس والے کا خاتمہ کر دے پھر اس کے بعد دیکھا جائے گا۔

سب نے اقرار کیا کہ اطمینان رکھیے ایسا ہی ہوگا۔ اتنی دیر میں جناب زید بن حارثہ نظر آ گئے۔ ان پر نظر پڑتے ہی آپ نے پوچھا ارے تم نے میرے بچے کو دیکھا ہے؟ انہوں نے کہا، جی ہاں۔ ابھی تو میں ان کے ساتھ تھا۔

جناب ابوطالبؑ کے جذبات کی شدت اس حد پر تھی کہ کہا میں گھر کے اندر جاؤں گا نہیں جب تک اپنی آنکھ سے اسے نہ دیکھ لوں۔

زیدؓ تیزی کے ساتھ رسول خداؐ کے پاس گئے۔ اس وقت آپ کوہ صفا کے پاس

بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ زیدؓ نے پہنچ کر جلدی جلدی واقعہ کہہ سنایا جسے سن کر فوراً پیغمبر خداؐ اٹھے اور جناب ابوطالبؑ کے پاس آئے۔ انہوں نے کہا' "بیٹا! کہاں تھے؟ خیریت سے تو تھے؟" حضرتؐ نے فرمایا۔ "جی ہاں! خیریت سے تھا۔" کہا۔ "اچھا ۔ بس اندر جاؤ' گھر میں بیٹھو"۔

ظاہر ہے کہ اتنا ہی واقعہ جناب ابوطالبؑ کے عزم و ہمت کے اظہار کے لئے کافی تھا اور نفسیاتی طور پر اس سے خود پیغمبر خداؐ کو جتنی ڈھارس بندھ سکتی تھی اور چچا کی وفاداری پر اعتماد پیدا ہو سکتا تھا۔ وہ بھی ظاہر ہے مگر اس پیرانہ سال مرد خدا کی جواں مردانہ ہمت کی انتہا یہ ہے کہ اس واقعہ کو اتنے ہی پر ختم نہیں ہونے دیا بلکہ جب صبح ہوئی تو انہوں نے پیغمبر خداؐ کا ہاتھ پکڑا اور ان سب ہاشمی و مطلبی جوانوں کے ساتھ ساتھ انہیں لیے ہوئے اس جگہ آئے جہاں تمام بزرگان قریش جمع تھے اور کہا "اے قریش والو! جانتے ہو میں نے رات کو کیا منصوبہ بنا لیا تھا؟" انہوں نے کہا' "نہیں ہمیں نہیں معلوم"۔ کہا۔ اچھا تو سن لو' پورا واقعہ بیان کر دیا اور اپنے ساتھ والوں سے کہا کہ تم ہاتھ میں جو ہتھیار لئے ہوئے تھے وہ بھی دکھلا دو۔ سب نے دیکھا کہ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک مہلک ہتھیار تھا۔ جناب ابوطالب نے کہا "خدا کی قسم اگر محمدؐ کا بال بیکا ہوا ہوتا تو میں تم میں سے کسی کو نہ چھوڑتا۔ پھر ہم تم سب ہی ختم ہو جاتے۔"

تمام مجمع پر ایک سناٹا چھا گیا اور ابو طالب رسولؐ کو لے کر واپس آ گئے۔ تاریخ کا بیان ہے۔

وانکسر القوم و کان اشدھم انکساراً ابوجہل

پوری قوم پر ایک شکستگی طاری ہو گئی اور سب سے زیادہ شکستہ دلی کا اثر ابوجہل پر تھا۔

(ابن سعد' جلد۱' صفحہ ۱۳۴)

اس کے کچھ عرصہ تک مشرکین نے پھر بے چینی کے ساتھ صورت حال پر غور کیا ہوگا۔ محمدؐ مانتے نہیں۔ ابو طالبؑ انہیں چھوڑتے نہیں۔ اب کیا ہو؟ اس کے

بعد کی یہ منزل ہو گی کہ انہوں نے طے کیا ہو گا کہ پھر ابو طالب سے بھی نپٹ ہی لیا جائے۔ مگر سوچا ہو گا کہ ایک دفعہ تو اور اتمام حجت کر لیا جائے یا یوں کہا جائے کہ انہیں مقابلہ کا چیلنج دے دیا جائے۔ ممکن ہے وہ بعد سے عرب کی مخالفت سے مرعوب ہو جائیں اور یا محمدؐ کو روک دیں یا ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔

یہ سوچ کر اب کی ذرا کڑے تیوروں کے ساتھ وہ جناب ابوطالبؑ کے پاس آئے اور اب انہوں نے یہ سخت قسم کا انداز گفتگو اختیار کیا' جو امام الدین صاحب رام نگری کے الفاظ میں یوں تھا کہ۔

"ابو طالب! تمہارا بھیتجا ہمارے معبودوں کی توہین کرتا' ہمارے باپ دادا کو گمراہ کہتا اور ہمیں احمق ٹھہراتا ہے۔ اب ہم اس ہتک کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لئے تم یا تو درمیان سے الگ ہو جاؤ اور یا کھل کر سامنے آجاؤ کہ ہم میں فیصلہ ہو جائے"۔

(رسالہ مولوی دہلی' ستمبر ۱۹۵۹ء)

جیسا کہ آئندہ ہم پھر مناسب موقع پر روشنی ڈالیں گے' جناب ابوطالبؑ کا موقف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شروع سے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام کو درست مانے ہوئے تھے۔توحید کے مثل اپنے آباؤ اجداد کے وہ ہمیشہ ہی سے قائل تھے اور رسولؐ کو سچا اور امانتدار جب اغیار تک سمجھتے تھے تو وہ کیونکر نہ سمجھتے۔ قوت احساس اور جرات اظہار کی ان میں کمی نہ تھی جس پر حمایت رسولؐ میں ان کے مجاہدات گواہ ہیں اور ماحول اور سماج کا کوئی دباؤ ان پر اثرانداز نہیں تھا۔ اس سب کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جب سے حضرت رسول خداؐ نے کھل کر اپنی رسالت کا گھر والوں پر اظہار فرمایا پہلے ہی دن سے ابوطالبؑ انہیں اللہ کا رسولؐ تسلیم کرنے لگے۔ مگر ان کی مصلحت یہ تھی جو حکمت ربانی کے بھی بالکل مطابق تھی کہ اگر وہ لفظی طور پر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیں گے تو حفاظت رسولؐ کا کام جس طرح وہ انجام دے رہے ہیں اس طرح انجام نہ دے سکیں گے۔ اس لئے وہ اپنے بچوں کو ہدایت کرتے تھے کہ محمدؐ کے پیچھے نماز میں شریک ہوا کرو

مگر خود علانیہ اس صف جماعت میں کھڑے نہیں ہوتے تھے جو رسولؐ کے پیچھے قائم ہوتی تھی۔ اشعار میں رسالت پیغمبرؐ کا اظہار کر دیتے جو سوچنے والوں کی ذہنیت پر اثرانداز ہو سکے۔ مگر رسمی الفاظ شہادتین کے ظاہر بظاہر زبان پر نہیں لاتے تھے۔ کہتے اور کرتے وہی تھے جو اسلام کا صحیح تقاضا ہے مگر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان نہیں کرتے تھے۔ ان کے اس طرز عمل کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ سوا ایک ابولہب کے جو اپنی سسرال (بنی امیہ) کے اثر میں آگیا باقی تمام بنی ہاشم کو بلا تفریق مسلم و کافر پیغمبر خداؐ کی حمایت پر متفق رکھ سکے اور ان کے اسی عمل کے نتیجہ میں مشرکین اتنی مدت تک کھل کر رسولؐ کی مخالفت سے باز رہے مگر اب مشرکین کے برداشت و تحمل کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اور اب وہ "کرو یا مرو" والا انداز اختیار کرکے جناب ابوطالبؑ کے پاس آئے تھے تو جناب ابوطالبؑ نے مناسب سمجھا کہ ان کی اس جوشیلی تقریر کے جواب میں وہ کوئی پرجوش انداز اختیار نہ کریں بلکہ انہوں نے ملائم انداز میں ان سے وعدہ کر لیا کہ اطمینان رکھو' میں پھر اس بارے میں محمدؐ سے ضرور بات کروں گا اور تمہارے خیالات و جذبات سے انہیں مطلع کروں گا۔ اس کے نتیجہ میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مشرکین کچھ مطمئن ہو کر جناب ابوطالبؑ کے پاس سے واپس ہوئے اور کم از کم اس وقت ان کا وہ اشتعال فرو ہو گیا جو انسان کے ہوش و خرد سے کام لینے سے بالکل معذور بنا دیتا ہے۔

نتیجہ بھی معلوم تھا اور جو کچھ اس کے بعد خود کرنا ہے وہ بھی طے تھا۔ مگر اپنے وعدے کا احترام تھا کہ جناب ابوطالبؑ نے حضرت پیغمبر خداؐ کے سامنے قوم والوں کی اس تازہ گفتگو اور موقع کی نزاکت کا تذکرہ ضروری سمجھا۔

رسول اللہؐ نے اس کا وہ تاریخی جواب دیا جو ایک بشر کے کردار کی عالم ظاہر میں انتہائی معراج ہو سکتی ہے۔ دیکھنے کی بات ہے کہ بے ماں باپ کا یتیم جس کی پرورش اس چچا نے کی کلمہ حق کے زبان پر آتے ہی تمام قوم خون کی پیاسی پہلے سے ہے۔ دنیائے آب و گل میں بس ایک یہ چچا ہی ہے جو اب تک پشت و پناہ رہا ہے۔ اب وقت اتنا نازک آگیا ہے کہ اگر یہ چچا بھی دنیا کے چچاؤں کا ایسا ہو تو اس

صورت حال میں یہ بھی ساتھ نہیں دے سکتا۔ وہ اس وقت اپنی گفتگو میں دشمنوں کی کثرت و طاقت اور اپنی پیرانہ سالی وضعف و قلت کے احساس کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اب اس کے بعد کے خطرات میں آپ کی حفاظت سے اپنے کو قاصر محسوس کر رہا ہے جس سے انتہائی پریشان و مضطرب ہے۔ مگر پیغمبرؐ کیا جواب دیتے ہیں؟ وہ چند جملے جن میں آدم سے لے کر اب تک کے تمام انبیاء و مرسلین کے عزم و استقلال کی روح سمٹ کر آ گئی ہے۔

"خدا کی قسم! یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند رکھ دیں جب بھی اس دعوت حق سے باز نہیں آ سکتا۔ یا تو خدا اسے غالب کرے گا۔ یا میں اسی سعی میں کام آجاؤں گا"۔

(ابن ہشام جلد ا صفحہ ۸۹)

کے۔ اے حمید بی۔ اے (لنڈن) بیرسٹرایٹ لاء لاہور نے باوجودیکہ اپنی کتاب "مسلمانان عالم" میں جس پر مولانا سید سلیمان ندوی کا مقدمہ بھی ہے۔ اموی رجحانات کی پوری پوری نمائندگی کرتے ہوئے انتہائی گستاخانہ انداز میں ہر مقام پر جناب ابوطالب رضوان اللہ علیہ کا استخفاف کیا ہے مگر یہاں حقانیت کے دباؤ سے انہوں نے بھی جو جواب جناب ابوطالب کا درج کیا ہے وہ وہی سب کچھ بتا دینے کے لئے کافی ہے جو ہم نے جناب ابوطالب کے موقف کی کسی حد تک تشریح کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"بڈھے چچا کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ کہا' میں یہاں آنے سے پیشتر ہی تمہارے جواب سے واقف تھا۔ خیر جب تک میں زندہ ہوں تمہاری مدد کروں گا"۔ ابوطالبؑ نے قریش کے لوگوں سے کہا۔ "تم محمدؐ کو جانتے ہو۔ وہ ایک شریف اور معزز انسان ہے۔ تم نے خود ہی اسے "امین" کا خطاب پیش کیا تھا۔ اس کا زاویہ نگاہ تم سے علیحدہ ہے۔ وہ ایک خدا کی پرستش کرتا ہے۔ تم اسے خدا کی پرستش سے کیوں روکتے ہو؟ اور اس کے لئے اس کی جان پر مصیبتیں کیوں ڈھا رہے ہو"۔

(مسلمانان عالم جلد ا صفحہ ۴۵' ۴۶)

اگر جناب ابوطالبؑ مسلک میں رسولؐ سے متحد نہ تھے تو رسولؐ کے جواب پر غصہ آنے کے بجائے ان کی آنکھوں سے آنسو کیوں نکل آئے؟ وہ اگر واقعی رسولؐ کو منع کرنے ہی کے لئے آئے تھے تو آپ کے جواب پر یہ کیوں کہا کہ "میں یہاں آنے سے پیشتر ہی تمہارے جواب سے واقف تھا"۔

صاف وہی بات ظاہر ہے جو ہم نے بیان کی ہے کہ یہ سب حکمت عملی تھی۔ ورنہ وہ جانتے تھے کہ ہزار مصیبتیں آئیں۔ رسولؐ کو اپنے مشن کو ترک نہیں کرنا چاہئے اور نہ وہ ترک کریں گے اور مجھے بھی آخر دم تک ان کا ساتھ دینا ہے چاہے اس سلسلہ میں مجھے بھی اپنی اولاد تک کی قربانی پیش کر دینا پڑے جس کا عملی مظاہرہ اس کے بعد وقت آنے پر ہو جائے گا۔

براہ راست معاملت کی کوشش

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ تاریخ میں جو واقعات کا سلسلہ ہے وہ ترتیب واقعات کے بظاہر مطابق نہیں ہے چنانچہ گذشتہ تمام واقعات کے بعد یہ ذکر آتا ہے کہ جب تخویف کی تمام صورتیں بیکار ثابت ہوئیں اور جناب ابوطالبؑ کے ذریعے سے کار براری ہوتے نظر نہ آئی تو اب وہ سوچے کہ ترغیب کی صورت اختیار کی جائے اور براہ راست محمدؐ سے گفتگو کی جائے۔ اس کے لئے عتبہ بن ربیعہ کو جو ان کا ایک موقر سردار تھا رسولؐ کے پاس بھیجا یہ عتبہ کون؟ وہی جس کی بیٹی ہند بنت عتبہ ہندۂ جگر خوارہ مشہور ہے جو ابو سفیان کی بیوی اور امیر شام معاویہ کی ماں ہے۔

عتبہ نے حضرتؐ سے مل کر کہا۔

" اے محمدؐ! قوم میں پھوٹ ڈالنے سے کیا فائدہ؟ اگر تمہیں سرداری حاصل کرنا ہے تو ہم سب مل کر تمہیں سردار تسلیم کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ اگر کسی بڑے گھرانے کی کسی حسین سے حسین لڑکی سے نکاح کرنا چاہتے ہو تو بتا دو کہ ہم اس کا انتظام کر دیں گے۔ اگر دولت کی فکر ہے تو جتنی کہو دولت تمہارے قدموں پر ڈال دی جائے۔"

اس کے جواب میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی گفتگو کرنا نہیں چاہی بلکہ قرآن مجید کی کچھ آیتیں پڑھ پڑھ کر عتبہ کو سنانے لگے جس پر وہ حیران ہو کر واپس آگیا اور قریش سے کہا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔

ہمارے نزدیک گذشتہ غیظ و غضب اور اشتعال کے واقعات سے اس گفتگو کا کوئی تناسب نہیں ہے بلکہ ترغیب کا درجہ تخویف سے مقدم ہوتا ہے اس لئے یہ سابق کے بیان شدہ بہت سے واقعات کے پہلے کی بات ہوگی۔ جس کے صحیح وقت کا تعین ہم نہیں کر سکے ہیں۔

بہرحال یہی دو حربے ہو سکتے ہیں جو کسی شخص کو جو حق کے راستے سے ہٹ سکتا ہو اس کے اصول اور حقانیت سے ہٹا سکتے ہیں۔ یکے بعد دیگرے وہ دونوں آزمائے گئے اور ناکام ہوئے۔ معلوم ہو گیا کہ نہ یہ طمع کی وجہ سے راہ حق کو چھوڑ دیں گے اور نہ خوف کی بنا پر۔ اس طرح مشرکین کو بالکل مایوسی ہو گئی اور اس کے بعد اب یہی ایک صورت ہو سکتی تھی کہ خود ان کے وجود کو راستے سے ہٹایا جائے۔ یہی یہ اہل باطل کی آخری ترکیب ہوتی ہے مگر اس کے اختیار کرنے میں بھی جناب ابوطالبؑ کی شخصیت و وجاہت کی وجہ سے انہیں بڑی پیچیدگی محسوس ہو رہی تھی۔

مسلمانوں پر تشدد

اب مشرکین کا غم و غصہ بہت بڑھ گیا تھا ایک طرف تو اپنے اختیار کردہ ہر قسم کے تدابیر کا رسولؐ کو ان کے موقف سے ہٹانے میں ناکام ہونا۔ پھر یہ کہ اسلام کی جاذبیت سے روز بروز اس کے حلقے کا وسیع ہونا جس میں ان بڑے بڑے رؤسا کو چھوڑ کر ہر قبیلے کے دبے اور پسے ہوئے اشخاص اور خود ان رئیسوں کے نوکر چاکر اور حاشیہ بردار تک شامل ہوتے جاتے تھے۔ اب جناب ابوطالبؑ کی وجہ سے انہیں براہ راست خود حضرت رسولؐ کو کوئی آزار پہنچانے کی تو ابھی ہمت نہیں ہوئی۔ علامہ سید محسن امین کے الفاظ ہیں۔

منع اللّٰہ رسول اللّٰہ منهم بعمه ابی طالب

خداوند عالم اپنے رسولؐ کو ان کے چچا ابوطالبؓ کے ذریعے سے حفاظت کر رہا تھا۔
مگر انہوں نے ان کمزور مسلمانوں کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اور انہیں سخت سے سخت ایذائیں دینے لگے۔ ابن سعد لکھتا ہے۔

لما کثرالمسلمون و ظهر الایمان و تحدث به ثارناس کثیر من المشرکین بمن امن من قبائلهم فعذبوهم و سجنو هم وادا روافتننتهم عن دینهم

جب مسلمانوں کی تعداد کافی بڑھ گئی اور ایمان نمایاں ہو گیا اور اس کا چرچا ہونے لگا تو کفار قریش میں بت پرستوں نے اپنے قبیلوں میں کے ایمان لانے والے اشخاص پر یورش کر دی۔ انہیں سخت تکلیفیں پہنچائیں۔ انہیں قید کیا اور کوشش کی کہ کسی طرح ان کے دین سے ان کو منحرف کریں۔

(طبقات جلدا ' صفحہ ۱۳۶)

ان مظالم میں سے کچھ کو ہمارے محترم بزرگ دوست خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری کے قلم سے دیکھیے جن کی کتاب "اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ" جلد اول رضا کار بکڈپو لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

حضرت یاسر جو کہ ایک مفلس مسلمان تھے ان مظالم آکو برداشت کرتے کرتے دنیا سے چل بسے۔ ان کی بیوی حضرت سمیہ کو ابوجہل نے برچھی مار کر شہید کر دیا۔ ان کے بیٹے عمار اسی قسم کے مظالم کا تختہ مشق بنے۔ حضرت خباب بن الارت پر بھی انتہائی سختیاں کیں ایک روز انہیں دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹا دیا اور جب تک وہ ٹھنڈے نہ ہو گئے انہیں نہ چھوڑا۔ حضرت بلال حبشی موذن اور حضرت صہیب رومی کو عرب کی جلتی ہوئی ریت پر لٹا دیتے تھے اور ان کی چھاتی پر تپتے ہوئے پتھر رکھ دیتے تھے۔ اس پر ان کی زبان پر احد' احد کے کلمات جاری رہتے تھے۔ حضرت زنیرہ جو کہ ایک مسلمان کنیز تھیں ابوجہل نے ان کی آنکھیں نکال دیں ان سختیوں پر رسول اللہؐ ہمیشہ انہیں تسلی دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ تم لوگ اللہ کی رحمت کے منتظر رہو"۔

(اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد اول صفحہ ۵۸ ' ۵۹)

ملک حبشہ کی طرف ہجرت

حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خود اپنے جسم کے زخموں سے اتنی تکلیف نہ پہنچتی تھی جتنی ان بے چارے مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر اور معلوم کر کے آپ کو تکلیف پہنچتی تھی۔ چنانچہ جب یہ شدائد بہت بڑھ گئے تو آپ نے ان کو رائے دی کہ تم لوگ اب یہاں سے نکل کر ادھر ادھر منتشر ہو جاؤ۔ انہوں نے کہا۔ "کہاں جائیں"؟ آپؐ نے فرمایا حبش چلے جاؤ۔ وہاں عیسائیوں کی حکومت تھی جو اس وقت تک قائم ہے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں یہ لوگ ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ نکلنا شروع ہوئے اور آگے جا کر کہیں اکٹھا ہو کر پہلی مرتبہ یہ گیارہ مردوں اور چار عورتوں کا قافلہ تھا جو حبش پہنچا۔ یہ نبوت کے پانچویں سال ماہ رجب کا واقعہ ہے۔ (طبقات ابن سعد جلد ا صفحہ ۱۳۶)

رجب کے بعد شعبان اور ماہ رمضان یعنی دو مہینے کچھ دن ان لوگوں نے وہاں قیام کیا پھر خواہ وطن کی محبت میں جوش آیا ہو یا پردیس کی زندگی کے مشکلات نے پریشان کیا ہو یا یہ خیال ہوا کہ اتنے دن کی دوری سے ممکن ہے کفار قریش نے محسوس کر لیا ہو کہ یہ لوگ سخت گیری وغیرہ سے دین نہیں چھوڑ سکتے۔ لہٰذا اپنے رویہ میں تبدیلی پیدا کریں ار ایک ضعیف روایت یہ ہے کہ انہیں یہ اطلاع ملی کہ اہل مکہ مسلمان ہو گئے بہرحال کچھ ایسا ہوا کہ یہ لوگ واپس آئے مگر واپسی پر ان کی امید کے برعکس یہ صورت پیدا ہوئی کہ مشرکین نے اور زیادہ تشدد سے کام لیا اور پہلے سے زیادہ سخت۔ مظالم شروع کر دیئے۔ ادھر ان واپس آنے والوں نے عیسائیوں کے اخلاق اور اہل حبش کے اپنے ساتھ حسن سلوک کا بھی چرچا کیا جس پر مشرکین کو اور زیادہ برہمی پیدا ہوئی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جناب رسالت مابؐ نے بعثت کے ساتویں سال دوبارہ حکم ہجرت دیا اور اب کی پہلے سے زیادہ تعداد سے تراسی مرد' گیارہ قریشی خواتین اور سات عورتیں باہر کی سب ایک سو ایک آدمی جناب جعفر طیار کی سرکردگی میں حبش کی طرف روانہ ہوئے۔

(طبقات ابن سعد جلدا ' صفحہ ۱۳۸)

علامہ طبری نے لکھا ہے کہ جناب جعفر کے ساتھ ستر آدمی سمندر کے راستے سے روانہ ہوئے۔

(اعلام الوریٰ)

علامہ سید محسن امین عاملی لکھتے ہیں۔ اسی مرد اور اٹھارہ عورتیں ان میں جناب جعفر بن ابی طالب تھے اور ان کی شریک حیات جناب اسماء بنت عمیس۔

(اعیان الشیعہ جلد ۱ صفحہ ۹۴)

شہنشاہ حبش کا دربار
اور جعفر کا تبلیغی کارنامہ

مشرکین قریش کو ان اشخاص سے تو کوئی ذاتی عداوت تھی نہیں کہ وہ ان کے یہاں سے چلے جانے پر سکون محسوس کرتے اور اطمینان کی سانس لیتے۔ انہیں تو اس تحریک سے عداوت تھی جو ان کے باطل راستے کے خلاف پھیلتی جا رہی تھی اور حبش میں پہلی دفعہ کے وہاں کے حالات سن کر اب انہیں یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں وہاں اس تحریک کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ مل جائے اس لئے انہوں نے ان مہاجرین کا جو حبش جا رہے تھے تعاقب کیا مگر کفار کے پہنچنے سے پہلے یہ لوگ کشتیوں میں سوار ہو چکے تھے اور کشتیاں روانہ ہو گئی تھیں اس لئے وہ کفار کے پنجے سے نکل کر محفوظ طور پر حبشہ میں پہنچ گئے۔

اب یہاں کی صورت حال خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

.حبشہ میں انہیں امن ملا' آزادی نصیب ہوئی اور یہ اچھی فضا میں اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے لیکن مسلمان مہاجرین کے اس اطمینان کو کفار قریش برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ کو تحفے تحائف دے کر نجاشی کے دربار میں بھیجا اس وفد نے نجاشی کے دربار میں حاضر ہو کر تحفہ تحائف پیش کرنے کے بعد اپنے معروضات پیش کیے اور کہا کہ مکہ کے کچھ شریر

لوگ بھاگ کر آپ کے ملک میں پناہ لے چکے ہیں۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ انہیں ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ نجاشی نے کہا۔ جب تک ہم دوسرے فریق کی بات نہ سن لیں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ حضرت علیؓ کے بھائی اور مہاجرین کے سالار حضرت جعفر بن ابی طالب دربار میں بلائے گئے جب حضرت جعفر مع جماعت مہاجرین حاضر دربار ہوئے تو نجاشی نے دریافت کیا کہ آپ لوگوں کے اصول و قواعد کیا ہیں؟ اور آپ کے ملک والے آپ کے خلاف کیوں ہیں؟ حضرت جعفر نے اپنی تقریر اس طرح شروع کی۔

"اے بادشاہ! ہمارے ملک کے لوگ جاہل تھے' مردار کھاتے تھے اور بیہودہ بکا کرتے تھے۔ ان میں انسانیت نہ تھی اور یہ سچی ہمدردی مہمان داری اور ہمسایہ کے حقوق سے ناآشنا تھے' کسی قانون و قاعدہ کے پابند نہیں تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انتہائی فضل و کرم سے ہم میں ایک رسولؐ بھیجا جس کی امانت و دیانت' صدق و صفا' حسب و نسب اور زہد و تقویٰ سے ہم اچھی طرح واقف تھے۔ اس نے ہمیں توحید کی دعوت کی اور شرک اور بت پرستی کی گمراہی سے نکالا۔ اس نے ہمیں سچ بولنے' وعدہ وفا کرنے' گناہوں سے بچنے' نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کی تلقین فرمائی۔ ہمارا قصور صرف یہی ہے کہ ہم اس خدا کے سچے نبی پر ایمان لائے ہیں۔ اس جرم میں ہماری قوم ہم پر سختی اور تشدد کرنے پر تل گئی ہے۔ ہماری قوم چاہتی ہے کہ ہم خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت ترک کرکے پتھر' مٹی اور لکڑی کے بنے ہوئے بتوں کی پرستش شروع کر دیں۔ ان کے جور و جفا سے بچنے کے لئے ہم نے آپ کے ملک میں پناہ لی ہے"۔

اس تقریر کا نجاشی پر بہت اثر ہوا اور اس نے اس کلام خدا کے سننے کی تمنا کا اظہار کیا جو رسول اللہؐ پر نازل ہوا تھا۔ حضرت جعفر نے سورہ مریم کی تلاوت فرمائی۔ نجاشی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے رسول اللہؐ کی صداقت کا اعتراف کیا اور کہا "بے شک حضرت محمدؐ وہی رسول ہیں جن کے تشریف لانے کی یسوع مسیحؑ نے خبر دی تھی اللہ کا شکر ہے کہ میں ان کے زمانے میں ہوں"۔

اس پر کفار مکہ کو نہایت مایوسی سے واپس جانا پڑا۔ مسلمان ایک عرصہ تک حبشہ میں آباد رہے اور نہایت امن و اطمینان کی زندگی بسر کرتے رہے"۔
(اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد اول صفحہ ۶۱-۶۳)

اسلام کی رفتار ترقی

مشرکین کے لئے یہ امر نہایت پریشان کن بنا ہوا تھا کہ وہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے روکنے کی ہر طرح ترکیبیں کر رہے ہیں اور وہاں اسلام کے دائرہ میں وسعت ہی پیدا ہوتی جاتی ہے۔

جناب ابوطالب کے اثر سے بنی ہاشم تو تمام ہی حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہے اور سوا ایک ابولہب کے جو اولاد عبدالمطلب میں تھا مگر اس کی شادی بنو امیہ میں ہو گئی تھی اور معاویہ کی پھوپھی ام جمیل اس کے حبلہ عقد میں تھی اس طرح بیوی کے اثر میں آکر وہ اپنے خاندان سے الگ ہو گیا تھا اور اب دوسرے مشرکین تو جناب ابوطالب اور دوسرے بنی ہاشم کا خیال کرکے ذرا پیغبر خداؐ کی شان میں گستاخیوں سے ہچکچاتے بھی تھے مگر وہ اس کو لگا دیتے تھے اور یہ میاں بیوی آپ کو تکلیف پہنچانے میں سب سے آگے رہتے تھے جس کے لئے قرآن مجید میں ایک پورا سورہ موجود ہے جس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ابولہب یہ سب کچھ مال و دولت کی طمع میں کرتا تھا کیونکہ کہا جارہا ہے۔

تبت یدا ابی لھب و تب ما اغنی عنہ مالہ و ما کسب

ٹوٹیں ہاتھ اس ابولہب کے اور وہ تباہ ہو۔ اسے اس کے مال اور اس کمائی سے کچھ فائدہ نہ پہنچ سکے گا۔

اور صراحت کے ساتھ اس کی بیوی کے کردار کا بھی ذکر کیا ہے جو پیغبر خداؐ کے راستے میں خار دار لکڑیاں پھیلا دیا کرتی تھی کہ آپ اندھیرے میں ان سے الجھ کر تکلیف اٹھائیں۔ باقی تمام بنی ہاشم رسولؐ کے ساتھ رہے۔ انہی میں جناب حمزہ بھی تھے۔ جن کی قوت و جرات قریش میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی تھی مگر انہوں نے بھی اعلان اپنے اسلام کا نہ کیا تھا۔ خاموش رہا کیے تھے لیکن مشرکین کی ایذا

رسائی اور خصوصیت کے ساتھ ابولہب کی بدتمیزیوں سے متاثر ہو کر انہوں نے علانیہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت و تائید اور اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔

عام مورخین نے اسی سلسلہ میں جناب عمر بن الخطابؓ کے اسلام کو بھی بڑی اہمیت دی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ بڑے ہی سخت قسم کے رسولؐ کے دشمن تھے اور حضرت کے قتل کرنے کا منصوبہ بنا کر آپ کے پاس آئے تھے مگر حضرت کے پاس پہنچ کر کچھ ایسی تبدیلی ہوئی کہ فوراً اسلام قبول کر لیا۔

ہمارے مستند احادیث اس کی نوعیت کے اظہار سے خاموش ہیں مگر یہ حیرت کی بات ضرور ہے کہ اس اسلام لانے کے موقع سے پہلے تبلیغ اسلام کے آٹھ نو برس کے حالات میں آپ کا نام مخالفتوں کے ذیل میں کسی تاریخ میں نمایاں ہو کر سامنے نہیں آیا۔ نہ کسی کانفرنس کے شرکاء میں جو رسولؐ کی مخالفت میں ہوئی تھی نہ کسی وفد میں جو جناب ابوطالب کے پاس آیا تھا۔ نہ کسی تصادم کے موقع پر جس کا ذکر تاریخ میں آیا ہے۔ مگر جب اسلام لائے تو اب یہ سن رہے ہیں کہ آپ کو مخالفین کے طبقہ میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ اب اس دور میں آپ بھی اسلامی جماعت کے حلقے میں داخل ہو گئے تھے۔ مگر ایک عجیب بات اور محسوس ہوتی ہے کہ مورخین آنکھ بند کرکے مجمل طور پر جب تبصرہ کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ آپ کے اسلام سے اسلام کی شان و شوکت میں بہت اضافہ ہو گیا تھا مگر جب تفصیلی واقعات سامنے آتے ہیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ کفار و مشرکین کے ہاتھوں رسولؐ اور بنی ہاشم کے خلاف اس کے بعد سے جو سختی و تشدد کا دور شروع ہوا ہے اس کی نظیر اس کے پہلے تک تاریخ اسلام میں نظر نہیں آتی جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آئے گی۔

شعب ابو طالب میں محصوری

مشرکین کی سب تدبیریں ختم ہو چکی تھیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اسلام کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ حبشہ میں جناب جعفر اور دوسرے لفظوں میں

اسلام کو جو کامیابی ہوئی اس نے اور زیادہ ان کو پریشان کر دیا۔ وہ یقینی طور پر محسوس کر چکے تھے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ان کی سرگرمی سے باز نہیں رکھا جا سکتا اور یہ بھی کہ ابوطالب کو آپ کی نصرت و حمایت سے ہاتھ اٹھانے پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ساتھ صورت حال یہ ہے کہ جناب ابوطالبؑ کے اثر سے دوسرے بنی ہاشم یہاں تک کہ جنہوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا ہے وہ بھی رسولؐ کی تائید و حمایت پر آمادہ رہتے ہیں۔ لہٰذا اب انہوں نے تمام بنی ہاشم پر سماجی، کاروباری اور معاشی دباؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ کہ جب یہ سب غیر معمولی پریشانی میں مبتلا ہوں گے کہ وہ اپنے رویہ میں تبدیلی پیدا کریں اور یا یہ سب ان سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ کم از کم ان میں پھوٹ تو پڑ جائے گی پھر اگر ابوطالب اپنی ذات سے یا تھوڑے آدمی اور رسولؐ کے ساتھ رہ بھی گئے تو وہ کیا کر سکتے ہیں اس لئے انہوں نے بنی ہاشم کے سوا دوسرے تمام قبائل کو جمع کر کے آپس میں یہ معاہدہ کیا کہ تمام بنی ہاشم کا بائیکاٹ کیا جائے۔ اس طرح کہ نہ ان سے شادی بیاہ کیا جائے ور نہ خرید و فروخت نہ کسی قسم کا میل جول رکھا جائے اور جس طرح ممکن ہو محمد مصطفٰےؐ کی زندگی کا خاتمہ کیا جائے۔ چنانچہ اس معاہدہ کو ایک دستاویز کی شکل میں لکھ کر سب قبیلوں کے نمائندوں کے دستخط لئے گئے اور اسے ”جوف کعبہ“ میں آویزاں کر دیا گیا اور بعثت رسولؐ کے ساتویں برس محرم کی پہلی تاریخ اس محاصرہ کا آغاز ہو گیا۔

(طبقات ابن سعد جلد ا، صفحہ ۱۳۹، ۱۴۰)

جناب ابو طالب نے تمام بنی ہاشم کو جمع کیا اور اپنے ایک مکان میں جو پہاڑ کی گھاٹی میں ایک محفوظ قلعہ کی شکل میں تھا اور ”شعب ابی طالب“ کے نام سے مشہور تھا، ان سب کو محفوظ کر دیا۔

علامہ طبری لکھتے ہیں کہ یہ سب چالیس آدمی تھے اور جناب ابوطالب نے کعبہ و حرم اور رکن و مقام کی قسم کھا کر کہا کہ اے بنی ہاشم سن لو کہ اگر محمدؐ کا بال بیکا ہوا تو میں سب کو موت کے منہ میں دے دوں گا۔

(اعلام الوریٰ)

صرف ابولہب تھا جو بنی ہاشم سے کٹ کر الگ ہو گیا اور اس نے باقی قبائل قریش کا ساتھ دیا۔

(ابن سعد، جلد ا، صفحہ ۱۴۰)

مشرکین نے اس محصور جماعت پر آب و دانہ بند کر رکھا تھا اس لئے کہ مکہ کے تو سب آدمی خود یہ عہد کیے ہوئے تھے کہ ان کے ہاتھ کوئی چیز فروخت نہ کریں گے اور جو باہر کے آدمی تھے وہ ان کے خوف سے بنی ہاشم کے ہاتھ کوئی چیز فروخت نہ کرتے تھے اور اگر کوئی کچھ فروخت کر دیتا تھا تو مکہ والے اس کا مال و متاع لوٹ لیتے تھے اور اس میں اتنی زبردست سرگرمی سے کام ہو رہا تھا کہ ابوجہل، عاص بن وائل، نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط ایسے بڑے سرغنہ لوگ خود ان راستوں پر جو مکہ معظمہ میں داخل ہوتے ہیں گشت کرتے تھے اور جسے دیکھتے تھے کہ اس کے پاس کوئی غلہ وغیرہ تجارتی ہے اسے کہہ دیتے تھے کہ وہ بنی ہاشم کے ہاتھ کوئی چیز فروخت نہ کرے ورنہ نقصان اٹھائے گا۔

(ا ام الوریٰ)

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کئی کئی وقت کھانا پانی نہیں ملتا تھا اور بعض وقت بھوک پیاس سے چھوٹے بچوں کے رونے اور بلبلانے کی آواز گھاٹی کے باہر تک سنائی دیتی تھی۔

(ابن سعد جلد ا، صفحہ ۱۴۰)

پھر یہ کہ ہر شب کو یہ خطرہ تھا کہ کہیں مشرکین رسالت مآبؐ کی زندگی کا خاتمہ نہ کر دیں اس لئے جناب ابوطالب پوری رات جاگ کر بسر کرتے تھے اور جب رسولؐ آرام فرماتے تھے تو وہ تلوار لئے ہوئے پیغمبرؐ کے بستر کے پاس کھڑے رہتے تھے۔ پھر یہ رات میں کئی دفعہ حفاظت کے لئے جگہ بدل بدل کر آپ کو لٹاتے تھے اور دن کو اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کو آپ کے پاس رکھتے تھے۔

یہ عالم دو چار مہینے نہیں بلکہ تین سال تک برقرار رہا۔ درمیان میں صرف

موسم حج میں جب کہ خونریزی سے پرہیز کرنے کی پابندی رہتی تھی رسول خداؐ شعب سے باہر نکلتے تھے اور مختلف قبیلوں میں دورہ کرکے انہیں پیغام الٰہی قبول کرنے پر آمادہ فرماتے تھے مگر ابولہب ساتھ لگا رہتا تھا۔ وہ کہتا جاتا تھا کہ یہ میرا بھتیجا ہے، اس کی بات نہ ماننا یہ (معاذ اللہ) غلط گو اور جادوگر ہے۔ موسم حج گزرنے کے ساتھ ہی پھر رسولؐ اور تمام بنی ہاشم مکان میں بند ہو جاتے تھے۔

اس سختی و صعوبت نے ایک طرف ان محصورین کو جسمانی طور پر انتہائی بے تاب وتواں بنا دیا اور دوسری طرف مالی مشکلات کی حد نہ رہی جناب خدیجہؓ جو ملکۃ التجار عرب تھیں ان کی پوری دولت اسی تین برس کے محاصرے میں اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے کام آ گئی کیونکہ کئی کئی وقت کے بعد آب و غذا جو ممکن ہوتا تھا وہ بسا اوقات بڑی زیادہ قیمت پر۔

اس دوران مشرکین نے یہ جانچ کی کہ بنی ہاشم اور بالخصوص جناب ابوطالب کی اخلاقی قوت میں کوئی کمزوری پیدا ہوئی یا نہیں مگر کیا کہنا اس پیر جواں ہمت کے استقلال کا جس نے ہمیشہ کی طرح اب بھی انہیں مایوس کن ہی جواب دیا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس ابتلا میں صرف بنی ہاشم تھے اور باقی مسلمان جو دوسرے قبائل کے تھے ان سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اور یہ انتہائی حیرت کی بات ہے کہ ان لوگوں نے اس طویل عرصہ میں جو تین برس کا ہے کسی قسم کی ہمدردی کا بھی حضرت پیغمبر اسلامؐ سے ثبوت نہیں دیا۔ یہاں تک کہ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ انہوں نے مخفی ذرائع سے رسولؐ تک آب و غذا پہنچانے کا کبھی بندوبست کیا ہوتا یا یہ بھی نہیں ملتا کہ انہوں نے اپنے اثرات یا تعلقات سے جو ان کے اور رؤسائے مشرکین کے درمیان تھے گفت و شنید ہی کرکے ان کو اس محاصرہ کے اٹھانے یا اس کے نرم کرنے پر آمادہ کیا ہوتا۔ ایسی کوئی روایت نہیں ملتی جب کہ ابوالعاص بن ربیع کے متعلق جو کافر تھا، یہ بیان صحیح ہو یا نہ ہو مگر یہ مل جاتا ہے کہ چونکہ عام مورخین کی زبان میں جناب خدیجہ کی بیٹی اور بعض کے بیان کے مطابق بھانجی اسے منسوب تھیں تو اس رشتے کا حق وہ ادا کر رہا تھا کہ کبھی راتوں کو آب و طعام کے

پہنچانے کا انتظام کر دیتا تھا (اعلام الوریٰ) مگر بڑے دعویداران وفاداری و جان نثاری کا کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی نام نہ آنا کہ انہوں نے کوئی اس طرح کی غمگساری کی ہو۔ ہزار در ہزار عبرتوں کا سرمایہ ہے اور یہ معمہ ہے جو کسی صورت سے تاریخ و حدیث کے مطالعہ سے حل نہیں ہوتا۔

آخر قدرت کا کرشمہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد نامے کی دستاویز کو جو کہ رؤسائے قریش کی مہر کردہ کعبہ کے اندر آویزاں تھی دیمک نے کھا لیا اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ بس اتنا حصہ چھوڑ دیا جس میں اللہ کا نام اور اس کی ثنا و صفت تھی اور پھر اس سے زیادہ قدرت ربانی کا ظہور یہ تھا کہ اس کی اطلاع حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہو گئی جو کہ قلعہ کے اندر محصور تھے اور جن کے روابط بھی باہر سے منقطع تھے اس کی کوئی توجیہ مادی اسباب سے ہونا ناممکن ہے۔ یہ اور بات ہے کہ موجودہ زمانہ کے مذاق کو پیش نظر رکھ کر معجزات وغیرہ کے تذکرے سے پرہیز کرنے والے مورخین ایسے لفظوں میں اس کا ذکر کریں جو کسی اعجاز کا اظہار نہ کرتی ہوں۔ جیسے "مسلمانان عالم" کے مصنف نے لکھا ہے۔

"اتفاق کہئے یا قدرت کا ہاتھ اس حکمنامہ کو دیمک چاٹ گئی۔ جب رسول خداؐ کو اس کی خبر پہنچی تو ابو طالب سے مخاطب ہوئے" چچا! خدا کے ایک ناتواں کیڑے نے قریش کے حکمنامہ کا خاتمہ کر دیا ہے وہ حکمنامہ جو مجسم ناانصافی، ظلم و تعدی کی ایک شہادت تھی کیڑا چاٹ گیا ہے اور سوائے اللہ کے نام کے وہاں کچھ بھی نہیں رہا"۔

اب اصل واقعہ کو خواہ اتفاق کہئے یا قدرت کا ہاتھ" مگر رسول خداؐ کی اطلاع کو یوں کہنا کہ جب رسول خداؐ کو اس کی خبر پہنچی۔ کہاں تک حقیقت کے مطابق ہو سکتا ہے جب کہ صورتحال یہ بتاتی ہے جس کا حال خود اس مصنف کے بعد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک اس لپٹی ہوئی دستاویز کو کعبہ کے اندر جا کر کسی نے دیکھا ہی نہ تھا کہ اس کا کیا حال ہے اور اس لئے خود مشرکین کو اس کی اطلاع نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ سوا غیبی ذریعہ کے رسولؐ کو اس واقعہ کے معلوم ہونے

کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ آپ نے جناب ابوطالب سے بلا کر اس واقعہ کا اظہار کیا تو اگر کوئی اور چچا ہوتا جس کے ایمان بالرسول میں ذرہ بھی نقص ہوتا تو وہ بھتیجے سے جرح کرتا کہ آخر اس کی اطلاع تمہیں کیونکر ہوئی مگر یہ تو حضرت ابوطالب رضوان اللہ علیہ تھے جن کا ایمان رسولؐ کی رسالت پر پہاڑوں سے زیادہ مستحکم تھا کہ اسی "تاریخ مسلمانان عالم" کے الفاظ میں۔

"ابو طالب فوراً قریش کے سرداروں کے پاس پہنچے اور کہا کہ یہ بات جو محمدؐ بتاتا ہے درست ہے؟ اگر یہ ٹھیک ہے تو تمہیں فوراً اس کی مخالفت چھوڑ دینی چاہئے مگر برعکس اس کے اگر یہ غلط ہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں محمدؐ کو تمہارے حوالہ کر دوں گا"۔

اس گفتگو سے بھی ظاہر ہے کہ یہ خبر کسی مادی ذریعہ سے پہنچی ہوئی نہ تھی ورنہ اس کی صحت معیار حقانیت کیونکر ہو سکتی تھی نیز یہ بھی اس سے ظاہر ہے کہ جناب ابوطالبؑ جو رسولؐ کا ساتھ دے رہے تھے وہ فقط بھتیجے کی محبت میں نہیں بلکہ سچا رسول سمجھنے کی وجہ سے، ورنہ اس اطلاع کے غلط ہونے کے مفروضہ پر جو ان کے نزدیک فرض محال کی حیثیت رکھتا تھا وہ یہ نہ کہتے کہ پھر میں بھی ساتھ چھوڑ دوں گا اور انہیں تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

اب کیا ہوا؟ اسی مورخ کی زبانی سنئے کہ۔

"ابوطالبؑ مع سرداران قریش کعبہ میں پہنچے۔ وہاں عوام کثرت سے حکمنامہ دیکھنے کے لئے جوق در جوق جمع تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ واقعہ عین درست تھا اور سوائے اللہ کے نام کے حکمنامہ کا نام و نشان تک باقی نہ رہا تھا۔"

(مسلمانان عالم جلد ۱ صفحہ ۵۵، ۵۶)

قدیم ترین مورخ ابن سعد نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

ثم اطلع اللّٰہ رسولہ علی امر صحیفتھم و ان الارضۃ قد اکلت ما کان فیھا من جورو ظلم و بقی ما کان فیھا من ذکر اللّٰہ فذکر ذلک رسول اللّٰہ صلعم لا بی طالب فذکر ذالک ابوطالب لا خوتہ و خرجوا الی

المسجد فقال ابوطالب لکفار قریش ان ابن اخی قد اخبر نی ولم یکذبنی قط ان اللّٰہ قد سلط علٰی صحیفتکم الارضة فلحست ما کان فیہا من جورا و ظلم اوقطیعة رحم و بقی فیہا کل ما ذکر بہ اللّٰہ فان کان ابن اخی صادقا نزعتم عن سوء رایکم و ان کان کاذبا دفعتہ الیکم فقتلتموہ اواستحییتموہ قالوا قد انصفتنا فارسلوا الی الصحیفة ففتحو ھا فاذا ھی کما قال رسول اللّٰہ صلعم فسقط فی ایدیھم ونکسوا علٰی رؤسھم فقال ابو طالب علام نحبس و نحصر و قد بان الامرثم دخل ھو و اصحابہ بین استار الکعبة والکعبة فقال اللھم انصر نا ممن ظلمنا وقطع ارحامنا و استحل ما یحرم علیہ منا۔

(طبقات جلد ۱ صفحہ ۱۳۰)

پھر اللہ نے اپنے پیغمبرؐ کو ان کی دستاویز کے واقعہ کی اطلاع دی اور یہ کہ دیمک نے وہ تمام تحریر جس میں ظلم و ستم کی باتیں تھیں کھالی ہے اور جتنا حصہ ذکر الٰہی کا اس میں تھا وہ باقی رہ گیا ہے، رسولؐ نے اس کا ابوطالب سے ذکر کیا۔ انہوں نے فوراً اپنے بھائیوں کو بلا کر ان سے کہا اور یہ لوگ وہاں سے نکل کر مسجد میں آئے اور ابوطالب نے کفار قریش سے کہا کہ میرے بھتیجے نے مجھے اطلاع دی ہے کہ اس نے کبھی مجھ سے کوئی جھوٹ بات نہیں کہی ہے کہ اللہ نے تمہاری دستاویز پر دیمک کو مقرر کیا اور اس نے جو کچھ اس میں ظلم و جور اور قطع رحم کی باتیں تھیں سب کو کھا لیا ہے اور بس جو ذکر الٰہی کا حصہ تھا وہ رہ گیا ہے۔ اب اگر میرا بھتیجا سچا ہے تو تمہیں اپنے غلط خیالات سے باز آنا چاہئے اور اگر اس کی بات غلط نکلے تو میں تیار ہوں کہ اسے تمہارے سپرد کر دوں پھر چاہو تو اسے قتل کر دو یا زندہ رکھو۔ ان سب نے کہا یہ آپ نے بالکل انصاف کی بات کہی۔ چنانچہ اس دستاویز کے معائنہ کو آدمی بھیجے جنہوں نے جا کر اس کو کھولا تو دیکھا کہ بالکل اس کی وہی کیفیت ہے جو رسالت مابؐ نے بتائی تھی۔ اب تو وہ بالکل درماندہ ہو گئے اور ان کی گردنیں جھک گئیں۔ جناب ابوطالب نے کہا کہ آخر کس جرم پر ہمیں قید و

بند میں رکھا جا رہا ہے جب کہ حقیقت بالکل کھل گئی ہے اس کے بعد آپ اور آپ کے ساتھ کے آدمی کعبہ کے پردوں کے پیچھے جا کر کعبہ کی دیوار سے لپٹ گئے اور کہا' خداوندا ہماری مدد کر ان کے مقابلہ میں جنہوں نے ہم پر ظلم کیا۔ ہماری قرابت کے حقوق کو ضائع کیا اور جو سلوک ہمارے ساتھ انہیں روا نہ تھا اسے روا رکھا۔

علامہ طبری لکھتے ہیں کہ وہ چالیسوں آدمی جن کی مہریں اس لپٹی ہوئی دستاویز کو بند کر کے اس پر لگائی گئی تھیں جمع ہوئے اور وہ دستاویز منگوائی گئی تو ان میں سے ہر ہر شخص نے اپنی مہر کو دیکھا' وہ بالکل سالم تھی' ٹوٹی ہوئی نہ تھی اس کے معنی یہ تھے کہ کسی شخص نے ان کے پہلے اسے کھول کر دیکھ نہیں لیا ہے۔ پھر ان مہروں کو توڑا گیا تو یہ دیکھا کہ سوا اسم و ذکر الٰہی کے اس کے اندر کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے۔ اب جناب ابوطالبؑ نے سب کو پکار کر کہا کہ ارے اللہ کا خوف کرو اور اب تو اس ظلم و ستم سے باز آجاؤ۔ سب خاموش رہے کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس اتمام حجت کے بعد جناب ابوطالب مع اپنے ساتھیوں کے پھر اپنے قلعہ میں واپس گئے۔

(اعلام الوریٰ)

ابن سعد لکھتا ہے کہ اب خود ان میں پھوٹ پڑ گئی۔ ایک جماعت جن میں سے مطعم بن عدی' عدی بن قیس' زمعہ بن اسود' ابو البختری ابن ہاشم اور زبیر بن ابی امیہ تھے کھڑی ہو گئی اور انہوں نے اس ظلم و ستم پر لعنت و ملامت شروع کر دی اور خود شعب ابی طالب میں جا کر بنی ہاشم و بنی مطلب سے کہا کہ بس اب تم لوگ باہر نکلو اور اپنے گھروں میں چل کر رہو چنانچہ یہ حضرات اس محاصرہ سے نکلے اور اپنے مکانوں پر آئے۔ اس وقت بعثت رسولؐ کا دسواں سال تھا۔

(طبقات جلد ا' صفحہ ۱۴۰)

خانقاہ منعمیہ قمریہ
ملا میتن گھاٹ، پٹنہ سیٹی۔ ۸

وفات ابوطالب

شعب ابی طالب کے شدائد سے نکل کر ابھی اچھی طرح اطمینان کی سانس لینے کا موقع نہ ملا تھا کہ غالباً" انہی سختیوں اور زحمتوں کے نتیجہ میں جو تین سال تک ان محصورین نے برداشت کی تھیں صرف دو ہی مہینے کے بعد (اعلام الوریٰ طبری رحمۃ اللہ) بعثت سے دسویں سال ۱۵ شوال (ابن سعد' جلد ۱ صفحہ ۷۹) کو حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتہائی شفیق اور جان نثار چچا جناب ابوطالب رضوان اللہ علیہ نے دنیا سے رحلت فرمائی۔ آپ کی عمر اس وقت کچھ اوپر اسی برس تھی۔

(اسد الغابہ جلد ا' صفحہ ۱۹)

تاریخ اسلام کے اس دس برس کے کافی طویل دور کا مطالعہ کرنے والوں کو جنہیں اس دور میں اسلام' حضرت محمد مصطفیٰؐ اور جناب ابوطالب سب کا نام ہر ہر منزل پر ساتھ ساتھ نظر آیا ہے کیا یہ تصور بھی ذہن میں آنا چاہئے کہ اب جب جناب ابوطالب دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں تو اسلامی تاریخ میں کوئی مواد ایسا آجائے گا جو اس حامی و محافظ اسلام کو اسلام کے احاطے سے ابدالاباد تک کے لئے خارج کر دے مگر براہو سیاست ملوکانہ کے اس تقاضے کا جس نے جمہور امت اسلامی کی تاریخ' حدیث اور تفسیر سب ہی کو متاثر بنا کر رکھ دیا ہے جس کے ماتحت حضرت

علیؑ بن ابی طالب علیہ السلام کی سبقت ایمانی اور جناب ابو طالبؑ کے خدمات اسلامی کے اثر کو ختم کرنے کے لئے جناب ابو طالب کے دنیا سے اٹھنے کے موقع کے لئے یہ حدیث وضع کرائی کہ جناب رسالت مابؐ ان کے پاس تشریف لائے اور ان سے فرمایا کہ وہ کلمہ پڑھ لیں مگر انہوں نے اس سے انکار کر دیا"۔

اب اس کے بعد پھر بنی امیہ کے کاسہ لیس وضاعین و کذابین نے اس میں کیا کیا شاخسانے پیدا کئے ہیں کہ رسولؐ اس کے بعد ابو طالب کے لئے عرصہ تک استغفار کرتے رہے مگر خدا نے آپ کو اس سے منع فرمایا اور رسولؐ نے معاذ اللہ مسلمانوں کو ان کے دوزخ میں ہونے کی اطلاع دی۔

یہ سب احسان فراموش روایتیں اب اس دور کے لئے ہیں جب کہ جناب ابوطالب کی پوری زندگی اسلام کی خدمت میں بسر ہو چکی حالانہ خود اہل سنت کے محدثین نے اس موقع پر عم رسولؐ جناب عباسؓ کی شہادت نقل کی ہے جسے شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے ان الفاظ میں لکھا ہے۔

می آرند کہ عباس سر خود را نزد او برد و شنید از وے کلمہ شہادت را و بحضرت برسانید پس گفت اسلم عمکٗ یا رسول اللہ پس خوشحال شد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم"۔

(مدارج النبوۃ)

مگر ہمارے نزدیک روایتی طور پر یہ رسولؐ کی دعوت و تبلیغ کی پوری حکایت سیاست بنی امیہ کی پیداوار ہے۔

جب کہ عام اصول تبلیغ و دعوت کی بنا پر عقلا" بھی اور نص قرآنی کی بناء پر نقلا" بھی جناب رسالت مابؐ کا فریضہ یہ تھا کہ آپ پہلے گھر والوں کو تبلیغ فرماتے۔ پھر گھرانے والوں کو، پھر تمام دنیا کو، تو آخر آپ نے اپنے چچا کو کلمہ پڑھوانے کے لئے یہ دس برس کا کیوں انتظار فرمایا کہ جب وہ دنیا سے جانے لگیں اس وقت حضرتؐ ان کے سامنے اس پیغام کو پیش فرمائیں۔

کیا معاذ اللہ وہ رسولؐ جسے کافر تک صادق و امین سمجھتے تھے ان محدثین کے

زعم میں معاذ اللہ ابن الوقت سیاست دانوں کی طرح تھا کہ آپ نے خیال فرمایا کہ ابھی ان سے رشتہ داری وغیرہ کی محبت میں جتنا کام نکلتا ہے وہ نکالا جائے اور کلمہ پڑھنے کی بات نہ لائی جائے ورنہ کہیں یہ بھڑک نہ جائیں اور یہ رہی سہی امداد جو مل رہی ہے چلی نہ جائے تو مصیبت ہو گی۔ اس لئے ان کے بچوں کو کلمہ پڑھوا دیا' اپنی چچی جناب فاطمہ بنت اسد کو کلمہ پڑھوا دیا' دوسرے عزیزوں کو تبلیغ کر دی مگر ان سے کہنے کی معاذ اللہ ہمت نہ ہوئی کہ چچا آپ بھی کلمہ پڑھ لیجئے یہاں تک کہ اب جبکہ ان سے جو کچھ امداد ملنا تھی وہ مل چکی اور ان کا دم واپسیں ہوا تو اب آپ نے کھل کر ان کے سامنے اسلام کا پیغام پیش کیا اور اب انہوں نے اسے قبول نہ کیا تو آپ نے اب خفا ہو کر معاذاللہ ان کے دوزخی ہونے کی خبریں سنانا شروع کر دیں؟ کیا مسلمان اپنے رسولؐ کے کردار کو ایسا ہی سمجھنے اور سمجھانے پر آمادہ ہیں؟

اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً ایسا نہیں ہے تو پھر کسی ضعیف سے ضعیف ہی روایت میں سہی ہمیں ملنا چاہئے کہ جناب رسالت مابؐ نے اس کے پہلے کبھی اپنے چچا کو دعوت دی ہو کہ وہ کلمہ اسلام زبان پر جاری کریں۔

ایسا نہیں ہے اور جہاں تک ہمارا مطالعہ ہے یقیناً ایسا نہیں ہے اور درایتہ" بھی ایسا نہیں ہوا' اس لئے کہ ایسا ہوا ہوتا تو پھر جناب رسالت مابؐ کو اپنے چچا کی طرف سے البغض فی اللہ کے ماتحت بھی جو حق پرستی کا لازمی نتیجہ ہے اور ایک ایسے مربی اور قریب ترین محبت کا رشتہ رکھنے والے کی طرف سے ایک ایسے دلشکن جواب کو سن کر نفسیاتی طور سے جو قلب پر اثر ہونا چاہئے اس کی بناء پر بھی اتنا صدمہ پہنچنا چاہئے تھا کہ آپ پھر ان کی ہر قسم کی امداد اور تعاون کی پیشکش اور ان کی سرپرستی کی پناہ کو ترک کرنے پر آمادہ ہو جاتے - کم از کم اس کی وجہ سے گھر کے اندر کسی خلفشار کا پتہ چلنا چاہئے تھا۔ اور کچھ آپس میں تعلقات میں کشیدگی ظاہر ہونا لازم تھی مگر دس برس تمام تبلیغ اسلام کے کٹھن سے کٹھن مراحل پوری یکجہتی اور تعاون کے ساتھ گزرے اور کسی قسم کی باہمی رنجش کا اثر ذرہ بھر بھی پیدا نہیں

ہوا۔ یہ خود اس کا ثبوت ہے کہ رسولؐ ان کے طرز زندگی سے مطمئن تھے اور جو کچھ وہ کہتے اور کرتے تھے اسے حضرت ان کے اسلام و ایمان کے ثبوت کے لئے کافی سمجھتے تھے پھر اب ایک دم ان کے عالم احتضار میں یہ کیا ہو گیا کہ حضرت کو انہیں کلمہ پڑھوانے کی فکر پیدا ہو گئی اور اس کے بعد سے ان محدثین اور مورخین کو وہ ان کے معاذ اللہ دوزخی ہونے کی بشارتیں سنانے لگے۔

شہد اللہ و رسولہ کہ یہ ان اخلاف سوء کا افتراء و بہتان ہے جنہیں اپنے اسلاف کے دوزخی ہونے کے یقین نے اس پر آمادہ کیا ہے کہ وہ اولاد علیؑ و فاطمہؑ کو بھی ان کے مورث اعلیٰ کے حسن انجام کے فخر سے ان موضوعہ حدیثوں کے سہارے سے محروم کر دیں۔ اس طرح کم سے کم اس منزل میں ان کو اپنے برابر لے آئیں۔

حقیقت امر وہ ہے جس پر پہلے بھی جناب ابوطالبؑ کے موقف کی تشریح میں تبصرہ ہو چکا ہے کہ ان کا ایمان مابین خود و خدا مسلم تھا جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس سے واقف تھے۔ گھر کے سب آدمی اسے جانتے تھے۔ اسی لئے باہم کوئی کشمکش نہ تھی۔ کوئی اقرار و انکار کی صورت نہ تھی۔ کوئی رنجش اور کشیدگی نہ تھی۔ جو ان کا طرز عمل تھا وہی خدا و رسولؐ کی طرف سے ان کا فریضہ تھا جسے انہوں نے باحسن وجوہ پایہ تکمیل تک پہنچایا اور اسی راہ پر دنیا سے رخصت ہوئے جس کے بعد ان کے سامنے کسی منزل پر بھی اب اسلام کو پیش کرنے اور ان سے اقرار لینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور واقعہ یہ ہے کہ جناب ابوطالب کچھ بیمار نہ تھے کہ جناب رسالت مآبؐ کو ان کی بیماری کی اطلاع دی جاتی' وہ تو محاصرہ کے شدائد سے اب ضعیف اتنے ہوگئے تھے کہ ان کی زندگی نے ایک دم ساتھ چھوڑ دیا۔

قدیم ترین مورخ ابن سعد کاتب و اقدی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت جناب رسالت مآبؐ ان کے پاس موجود نہ تھے۔ انہوں نے اس وقت جو اعزہ موجود تھے انہیں پاس جمع کیا اور حضرت پیغمبر خداؐ کے اتباع و نصرت کی وصیت کی۔

ابن سعد کے الفاظ ہیں۔

ان ابا طالب دعا بنی عبدالمطلب فقال لن تزالوا بخیر ما سمعتم من محمد وما اتبعتم امرہ فاتبعوہ واعینوہ ترشدوا

اس وقت ابو طالب نے اولاد عبدالمطلب کو بلایا اور کہا تمہارے لئے ہمیشہ بھلائی ہی بھلائی رہے گی جب تک محمدؐ کی بات مانتے رہو گے اور جب تک ان کے دین کی پیروی کرتے رہو گے۔ ان کی پیروی اور ان کی مدد کرتے رہنا تو تم کامیاب و کامران رہو گے۔

حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کا بیان ہے کہ۔

اخبرت رسول اللہ یموت ابی ابو طالب فبکٰی ثم قال اذھب فاغسلہ و کفنہ و وارہ غفر اللہ لہ و رحمہ

میں نے جا کر رسول خداؐ کو ابوطالبؑ کی وفات کی اطلاع دی تو حضرتؐ نے گریہ فرمایا پھر کہا کہ جاؤ انہیں غسل و کفن پہناؤ اور دفن کرو۔ اللہ ان کی مغفرت کرے اور اپنی رحمت شامل حال فرمائے۔

یہی موقع ہے کہ غسل میت کا حکم بھی جو فقہ جعفری میں آج تک قائم ہے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک پر آیا۔

چنانچہ ابن سعد نے لکھا ہے۔

قال علی و امرنی رسول اللہ فاغتسلت

(طبقات ابن سعد جلد ا صفحہ ۷۸)

حضرت علیؑ کا بیان ہے کہ پھر حضرتؐ نے مجھ کو حکم دیا اور میں نے غسل کیا۔

ایک غلط فہمی جو یہاں پر ہو سکتی ہے اسے علامہ ابن اثیر جزری نے اس واقعہ کے تذکرہ کے بعد دور کر دیا ہے اسے علامہ ابن اثیر جزری نے اس واقعہ کے تذکرہ کے بعد دور کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

توفی ابوطالب و کان عمرہ بضعا و ثمانین سنۃ ثم توفیت بعدہ خدیجۃ ولم تکن الصلواۃ علی الجنائز یومئذ

(اسد الغابہ جلد ا صفحہ ۱۹)

جناب ابوطالب کی وفات ہو گئی۔ اس وقت ان کی عمر کچھ اوپر اسی برس کی تھی۔ پھر ان کے بعد جناب خدیجہ کی وفات ہوئی۔ اس وقت تک شریعت اسلام میں نماز جنازہ کا قاعدہ جاری نہیں ہوا تھا۔

علامہ طبرسی نے تحریر فرمایا ہے کہ جناب رسالت مابؐ نے حضرت علیؑ کو غسل و کفن کا حکم دینے کے بعد فرمایا۔

فاذا رفعتہ علی سریرہ فاعلمنی ففعل ذالکؑ فلما رفعہ علی السریر اعترضہ النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

(اعلام الوریٰ)

غسل و کفن کے بعد جب جنازہ اٹھانے لگنا تو مجھے اطلاع کر دینا چنانچہ حضرت علیؑ نے اس کی تعمیل کی اور جب جنازہ اٹھایا گیا تو جناب رسالت مابؐ تشریف لا کر مشایعت جنازہ میں شریک ہوئے۔

جناب ابوطالبؑ کو مکہ معظمہ کے قبرستان میں جو جنتہ المعلی کہلاتا ہے حضرت عبدالمطلب وغیرہ کے قبور کے قریب دفن کیا گیا۔

ابن سعود نے مدینہ کی جنت البقیع ہی کی طرح اس جنت المعلی کو بھی مسمار کر دیا۔ اس کے پہلے تک یہ مقابر اہل اسلام کی زیارتگاہ تھے۔

وفات خدیجہ کبریٰؑ

ابھی جناب ابوطالبؑ کا غم بالکل تازہ ہی تھا کہ دوسرا سانحہ رونما ہوا کہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انتہائی وفادار شریکہ حیات جناب خدیجہ کبریٰؑ نے بھی کہ جنہوں نے آپ کے مشن کی خاطر اپنی پوری دولت قربان کر دی اور طرح طرح کی سختیاں اور مصیبتیں جھیلیں دنیا سے رحلت فرمائی۔

ایک ضعیف روایت تو یہ ہے کہ ان کی وفات شعب ابی طالب سے نکلنے کے بعد پہلے ہوئی اور پھر ایک سال کے بعد جناب ابوطالبؑ کی رحلت ہوئی۔

(اعیان الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۱۰۲)

مگر زیادہ تر روایات یہی بتاتے ہیں کہ جناب ابوطالب کے بعد جناب خدیجہؓ کا انتقال ہوا۔ مگر کتنا بعد؟ اس میں پھر اختلاف ہے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ جناب ابوطالب کی وفات ۱۵ شوال کو ہوئی اور جناب خدیجہؓ اس کے ایک مہینے پانچ دن بعد دنیا سے اٹھیں۔

(طبقات جلد ا صفحہ ۱۴۱)

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ۲۰ ذیقعدہ کو ان کی وفات ہوئی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ وہ جناب ابوطالب کے بعد صرف تین دن زندہ رہیں اور تین دن کے بعد ان کی وفات ہو گئی۔ (اعلام الوریٰ طبرسی رحمہ اللہ)

زیادہ تر مورخین کی اس تعبیر سے کہ "توفیا فی عام واحد" "ان دونوں آدمیوں کی وفات ایک ہی سال میں ہوئی"۔ پہلے قول کو زیادہ قوت حاصل ہوتی ہے۔اس لئے کہ اگر ان کی وفات صرف تین دن بعد ہوئی ہوتی تو اس کے لئے ایک سال کے اندر" نہ کہا جاتا بلکہ "ایک ہفتہ" کے اندر کہا گیا ہوتا۔ "ایک سال کے اندر" کہنا بتلاتا ہے کہ ہفتہ بھی ایک نہ تھا اور مہینہ بھی ایک نہ تھا بلکہ سال ایک ہی تھا۔ یہ پہلے قول پر منطبق ہوتا ہے دوسرے پر نہیں۔

ابوالفرج اصفہانی نے لکھا ہے کہ جناب خدیجہ مقام "حجون" میں دفن ہوئیں۔

(مقاتل الطالبین صفحہ ۳۲)

عربی ادب سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقام حجون صفا کے مقابل میں مکہ کی آبادی کا دوسرا سرا تھا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔

کان لم یکن بین الحجون الی الصفا
انیس و لم یسمر بمکۃ سامر

فعلاً" مزار جناب خدیجہ' جنت المعلیٰ سے ذرا فاصلہ پر موجود ہے جسے ابن سعود کی حکومت نے مثل اور مزارات کے ویران بنا رکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حجون کا مقام انہی اطراف میں تھا کہ جہاں جنۃ المعلیٰ کا مقبرہ تھا۔

ان سانحوں کا اثر

جناب ابوطالب اور جناب خدیجہ رضوان اللہ علیہما ان دونوں بزرگواروں کی وفات کا جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کیا اثر پڑا؟ وہ اس سے ظاہر ہے کہ

سمّٰی رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ذلک العام عام الحزن (اعلام الوریٰ)

جناب رسالت مآبؐ نے اس سال کا نام "عام الحزن" (غم و رنج کا سال) رکھ دیا۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ۔

اجتمعت علی رسول اللّٰہ صلعم مصیبتان فلزم بیتہ و اقل الخروج و نالت منہ قریش مالم تکن تنال ولا تطمع بہ

(طبقات جلد ۱ صفحہ ۱۴۱)

پیغمبر خداؐ پر دو مصیبتیں جمع ہو گئیں جس کے بعد آپ گوشہ نشین ہو گئے گھر سے نکلنا بہت کم کر دیا اور اب قریش آپ کو وہ ایذائیں پہنچانے لگے جو اس کے پہلے نہ پہنچاتے تھے اور جن کا وہ تصور بھی نہ کرتے تھے۔

سفر طائف

جناب ابوطالب کے بعد مکہ کی سرزمین کا ہر چپہ پیغمبر خداؐ کے لئے خار زار بن گیا تھا اور مشرکین کی ایذا رسانی میں ایک دم انتہائی شدت ہو گئی تھی آپ نے چاہا کہ کچھ دن کے لئے ان کی نظر سے اوجھل ہو جائیں جس سے یہ ان کا وقتی جوش مخالفت کچھ کم ہو جائے اور کچھ اسلامی پیغام کی تبلیغ کے حلقہ ملیں وسعت بھی پیدا ہو جائے۔ کہیں تو ایسے آدمی ملیں گے جن میں قبول حق کی صلاحیت ہو اور جو ایسے نہ ہوں گے ان پر بھی حجت تو تمام ہو جائے گی۔ چنانچہ آپ جناب زید بن حارثہ کو اپنے ساتھ لے کر طائف کی طرف روانہ ہوئے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ

ذالک فی لیال بقین من شوال سنة عشر من حین نبی رسول اللّٰہ صلعم

ماہ شوال کی آخری تاریخوں میں بعثت سے دسویں برس کا یہ واقعہ ہے۔

اب جیسا کہ پہلے بیان ہوا جناب ابوطالب کی وفات چونکہ ۱۵ شوال کو ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی وفات کے ایک ہی ہفتہ کے بعد حضرت نے یہ سفر اختیار فرمایا ہے اور اگر وہی روایت درست سمجھی جائے جسے ہم ترجیح دے چکے ہیں کہ جناب خدیجہؑ کی وفات جناب ابوطالب سے ایک مہینے پانچ دن کے بعد ہوئی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سفر طائف کے موقع تک جناب خدیجہ کبریٰ بقید حیات تھیں اور ظاہر ہے کہ آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہراؑ بھی موجود تھیں تو اس سے یہ راز سمجھ میں آجاتا ہے کہ آپ اس سفر میں حضرت علیؑ بن ابی طالب کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئے اور جناب زید بن حارثہ ہی کو کیوں لے گئے؟ حضرت علیؑ کو حرم نبوت اور حریم رسالت کی حفاظت کے لئے گھر پر چھوڑنا ضروری تھا۔ اس کے بعد زید بن حارثہ ہی وہ وفادار بیٹے کی طرح پلے ہوئے غلام خاص تھے جنہیں آپ اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے اور لے گئے۔

پھر یاد کر لیجئے کہ جس طرح شعب ابی طالب کے تین برس کے محاصرہ میں سابقین الی الاسلام کی فہرست میں بڑے بڑے داخل کئے جانے والوں میں سے ایک فرد کا نام بھی نظر نہیں آیا ہے۔ اسی طرح اب محاصرہ سے نکلنے کے بعد اس شدت مصیبت و ابتلاء کے ہنگام میں بھی تاریخ اسلام میں دور دور تک چاہے کسی کے قلم کی لکھی ہوئی تاریخ ہو، کسی بزرگوار دوست اور وفادار یا جان نثار کا نام نظر نہیں آتا ہے۔ یہ سب نام تو آپ کو اس وقت سے دکھائی دیں گے جب سے حالات سازگار ہونا شروع ہوں گے اور ذرا غلبہ و اقتدار کی امیدیں پیدا ہوں گی۔ اب اپنی قدامت کے بلند بانگ دعوے کرنے والے بہت سے آگے بڑھ کر سامنے آجائیں گے مگر ابھی تو پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کے انبار ہیں سونے چاندی کے سکے نہیں آگ کے انگارے ہیں۔ اس وقت تو اسلام صرف "داشتہ آید بکار" کے طور پر اختیار کر لیا گیا ہے مگر ابھی جانبازی و جانثاری ہی کے ساتھ اس کے تقاضوں کو پورا کرنے

کا موقع تھوڑی ہے۔

طائف مکہ معظمہ کے قریب اس وقت اور آج بھی ایک سرسبز خطہ ہے جہاں کے میوے مشہور ہیں۔ "تاریخ مسلمانان عالم" میں ہے۔

"طائف مکہ سے تقریباً" ساٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے یہاں کے باشندے جفاکش اور محنتی واقع ہوئے تھے"

جناب خواجہ محمد لطیف صاحب لکھتے ہیں کہ

"طائف مکہ سے چالیس میل کے فاصلہ پر ایک با رونق اور زرخیز بستی ہے"۔

(اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد اول صفحہ ۶۶)

علامہ طبری کا بیان ہے کہ وہاں قبیلہ ثقیف کا مستقر تھا۔

(اعلام الوریٰ)

طائف میں حضرت نے دس دن قیام فرمایا اور فرداً" فرداً" وہاں کے ہر خاص آدمی سے بات کی۔ مگر وہ لوگ پیغام حق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ بلکہ انہوں نے اس اندیشہ سے کہ کہیں ہمارے نوجوانوں کے دل و دماغ پر ان کے خیالات کا اثر نہ ہو جائے صاف صاف آپ سے کہا کہ آپ ہمارے ملک سے چلے جائیں اور کہیں اور جا کر قیام کریں اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے جاہلوں اور اوباشوں کو آپ کی ایذا رسانی کے لئے ابھار دیا اور وہ لوگ آپ کو پتھر مارنے لگے۔ زید بن حارثہ اکیلے ان پتھروں سے آپ کی سپر بنتے تھے۔ چنانچہ ان کے سر میں بہت سے زخم آ گئے اور حضرت رسول خداؐ کی ٹانگوں سے خون جاری ہو گیا۔

اس حالت میں آپ طائف سے رخصت ہو کر مکہ کی جانب واپس ہوئے مگر عالم یہ تھا کہ اب حرم خدا میں بھی آپ کے لئے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ آپ کوہ حرا تک پہنچے تو آپ نے عرب کے دستور کے مطابق مطعم بن عدی کو جو جناب ابوطالبؑ کے قدیم دوستوں میں سے تھا پیغام بھیجا کہ میں تمہاری پناہ میں آنا چاہتا ہوں۔ مطعم کو پرانے تعلقات کی مروت آئی۔ اس نے اقرار کر لیا اور اپنے اولاد و اعزائے خاص سے کہا کہ تم سب ہتھیار لگا لو۔ میں نے محمد کو اپنی پناہ میں لے لیا

ہے۔ چنانچہ وہ سب خانہ کعبہ کے آس پاس آ گئے جس کے بعد حضرت مع زید بن حارثہ کے مسجد حرام میں داخل ہوئے۔ مطعم بن عدی نے کھڑے ہو کر رؤساء ے قریش کو آگاہ کیا کہ خبردار محمدؐ کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا۔ وہ اس وقت میری پناہ میں ہیں۔ سب کی نظروں کے سامنے حضرت رکن کے پاس تشریف لائے۔ اس کا استلام کیا۔ دو رکعت نماز پڑھی اور پھر مطعم بن عدی اور اس کی اولاد و اعز۔ کر حلقے میں اپنے گھر کے دروازہ تک آئے اور اندر داخل ہوئے۔

(طبقات ابن سعد، جلدا، صفحہ ۱۴۲)

مصائب کی شدت اور دائرہ اسلام کی وسعت

حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جسمانی آزار رسانیوں کے جتنے واقعات ہیں جیسے پتھروں کی بارش اور سر مبارک پر خس و خاشاک کا پھینکا جانا، یہ سب اسی دور سے متعلق ہیں جب کہ جناب ابوطالب کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔ مگر یہ اس بزرگ مرتبہ داعی حق کا صبر و استقلال تھا کہ چچا کی وفات کے بعد سے چند روز گوشہ نشینی اختیار کی۔ پھر طائف کے سفر کا تلخ تجربہ کیا۔ جس ۔ کے بعد مطعم بن عدی سے پناہ حاصل کرکے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ اس غرض سے کہ اپنے خالق کے گھر کے پاس دو رکعت نماز آزادی سے پڑھ لیں مگر جانتے تھے کہ میں پناہ لینے کے ملئے دنیا میں نہیں ہوں بلکہ گمراہیوں کے سیلاب میں ڈوبتی ہوئی دنیا کو اپنے سایہ رحمت میں پناہ دینے کے لئے ہوں۔ مطعم بن عدی کی پناہ اگر قائم رہی تو میری زندگی تو محفوظ ہو جائے گی مگر میں کام نہیں کر سکوں گا۔ یہ پناہ میرے لئے سنگ راہ ثابت ہو گی۔ اس لئے آپ نے مکان پر پہنچ کر مطعم بن عدی کا شکریہ ادا کیا اور کہا بس اب آپ کی ذمہ داری ختم ہوئی۔ اب آپ مجھے اپنی پناہ کے بارے میں سبکدوش کیجئے۔ اس کے بعد آپ مکہ کی گلیوں میں جب نکلتے تھے تو جہاں تک موقع ملتا تھا علیؑ ابن ابی طالب آپ کے ساتھ رہتے تھے مگر علیؑ بھی کرتے کیا؟ ابھی حضرت رسول خداؐ کے لئے یہ مصلحت پروردگار تو تھی ہی نہیں کہ

یہ ذرہ بھر بھی مادی طاقت کو کام میں لا کر کسی کا مقابلہ کریں یہ خون شباب کے روز افزوں جوش و خروش کے عالم میں علیؓ کے صبر و ضبط کا بڑا امتحان تھا مگر وہ جانتے تھے اس وقت انکا جہاد اسی میں ہے کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے کہ کافر ہم پر بدامنی پیدا کرنے کا الزام عائد کر سکیں اور اکثر حضرت علیؓ بن ابی طالب اور زید بن حارثہ کا بھی گھر کے ضروریات کی بناء پر آپ کے ساتھ ہونا ممکن نہ ہوتا تھا۔ آپ تن تنہا راستوں سے گزرتے تھے۔ اس وقت مشرکین کی ہمت اور زیادہ ہوتی تھی اور دل کھول کر تکلیفیں پہنچاتے تھے مگر آپ کا یہ عالم کہ اکثر سر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے مڑ کر نظر بھی نہ کرتے اور کسی مقابلہ کا ذکر کیا کسی کے لئے کوئی سخت کلمہ بھی نہ کہتے اور بد دعا بھی نہ کرتے تھے مگر جب موقع ملتا تو پیغام حق کے سنانے سے لب پھر بھی خاموش نہ کرتے۔

خصوصیت کے ساتھ جب موسم حج آتا تھا اور لوگوں کے ہتھیار نیاموں میں چلے جاتے تھے تو آپ ادھر ادھر سے آنے والے قبائل کے خیموں میں جاتے اور ہر ایک کو دعوت حق دیتے اور اپنی نصرت و حمایت پر آمادہ کرتے مگر نتیجہ کیا تھا اس کے متعلق ابن سعد کے الفاظ ہیں۔

فلیست قبیلة من العرب تستجیب له و یوذی ویشتم

عرب کا کوئی قبیلہ آپکی دعوت پر لبیک نہیں کہتا تھا بلکہ آپؐ کو آزار پہنچایا جاتا تھا اور گالیاں دی جاتی تھیں۔

مگر آخر اس حسن کردار، اس ثبات قدم، اس صبر و استقلال کا اثر کہاں تک نہ ہوتا۔ ایک طرف خود مکہ والوں میں بہت سوں کے ضمیر میں یہ احساس پیدا ہونا لازمی تھا کہ ایک تن تنہا شخص جس سے اب اپنے چچا کا بھی سہارا قطع ہو گیا ہے اسے ہر طرح کی تکلیفیں پہنچائی جاتی ہیں اور وہ اپنی بات سے نہیں ہٹتا۔ اس بات میں تو کوئی وزن ہے ہی۔۔ ان میں سے بہت سوں کے اندرونی احساسات کا کچھ تجزیہ ایک صاحب قلم نے اچھے الفاظ میں اس طرح کیا ہے کہ۔

"ان میں سے اکثر دل ہی دل میں کہتے تھے کہ اس شخص کے خیالات خواہ کیسے

ہی کیوں نہ ہوں اس کے اصول جو بھی ہوں' ہوں - وہ پاکباز' راست باز اور مخلص ضرور ہے- بچپن سے اس نے ایسا کوئی فعل نہیں کیا جو قابل اعتراض ہو- وہ زندگی کے اسرار کو خوب جانتا ہے- وہ حیات بعد الممات سے کماحقہ' واقف ہے"-

کہا جاتا ہے کہ خیالات کا اثر طبیعت پر ضرور پڑتا ہے لوگوں میں جب یہ خیالات پیدا ہوئے تو انہوں نے رسول خداؐ کی تقریروں کو غور سے سنا' جوں جوں وہ خدا کا پیغام سنتے ان کی تڑپ زیادہ بڑھتی- وہ جو جابر' ظالم اور مفسد تھے ان کے دل نرم پڑ گئے اور وہ جو مایوس اور مفلوک الحال تھے' ان کے قلب کو بہت زیادہ تسکین ہو گئی"-

(مسلمانان عالم جلد اول صفحہ ۵۶ - ۶۰)

مگر عوام کے یہ بڑھتے ہوئے احساسات اور تصورات بھی ان خاص بااقتدار اشخاص کو جنہیں آپ کے مشن کی کامیابی سے اپنے مفادات کو خطرہ محسوس ہوتا تھا آپ کے خلاف عناد میں اور شدت پیدا کرنے کے باعث بنتے تھے-

یثرب کے نصیب کی بیداری

"جوئندہ یابندہ" وہ داعی حق جو طلبگاران حق کی تلاش میں تھا- وہ ابر بہاراں جو پیاسوں کی جستجو میں ہر طرف حیران و پریشان پھر رہا تھا اور وہ ہاتھ تھامنے والا جو اس فکر میں سرگرداں تھا کہ کوئی اس کا سہارا لینے پر تیار ہو جائے آخر کچھ ایسے طلبگار' ایسے پیاسے اور ایسا سہارا لینے والے پا ہی گیا-

ابن سعد کے الفاظ یہ ہیں-

حتی اراداللّٰہ اظہار دینہ و نصر نبیہ وانجازما وعدہ فساقہ الی ھذا الحی من الانصار لما اراداللّٰہ لھم من الکرامۃ

(طبقات ابن سعد' جلد اول صفحہ ۱۴۶)

وہ وقت آگیا کہ اللہ کی مشیت مقتضی ہوئی کہ وہ اپنے دین کو نمایاں کرے اپنے رسولؐ کی امداد کرے اور اپنے وعدے کو پورا کرے تو اس نے آپ کو انصار

کے اس گروہ تک پہنچا دیا جسے اس عزت سے سرفرازی عطا کرنا اس نے نصیب میں لکھ دیا تھا۔

اب کا "مدینہ منورہ" اس وقت یثرب کہلاتا تھا اور یہاں حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ننھیال تھی۔ یہاں کے دو طاقتور قبیلے اوس و خزرج تھے جو بت پرستی میں مصروف تھے اور آپس میں سخت جنگ و جدال بھی کرتے رہتے تھے۔ بہت سے یہودی یہاں مدت دراز سے بسے ہوئے تھے جنہوں نے اپنے بزرگوں سے جو توریت کے مندرجات سے واقف تھے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظاہر ہونے اور اس سرزمین پر آکر قیام فرمانے کی بشارتیں سنی تھیں اور وہ ان قبائل اوس و خزرج کے سامنے اس کا تذکرہ کرتے رہتے تھے کہ دیکھو آخری رسول جب اس شہر میں آئے گا۔تو تمہاری سب بت پرستی ختم ہو جائے گی اور تمہیں ہمارے سامنے سر اطاعت خم کرنا پڑے گا ان لوگوں کی ان خبروں سے اہل مدینہ کے ذہن میں بھی اس رسولؐ کی آمد کا ایک تصور پیدا ہو گیا تھا۔

حضرت پیغمبر خداؐ تو موسم حج میں ہر ایک نو وارد قبیلہ کے پاس پہنچنے کی کوشش فرماتے ہی رہتے تھے۔ اس ذیل میں کچھ یثرب سے آنے والے افراد کی طرف بھی پہنچ گئے جو اس وقت اپنے سر منڈوا رہے تھے۔ ابن سعد لکھتا ہے۔

فجلس الیھم فدعا ھم الی اللّٰہ وقرا علیھم القرآن فاستجابوا للّٰہ و لرسولہ و اسرعوا و آمنوا و صدقوا

آپ ان کے پاس بیٹھ گئے اور انہیں اللہ کی طرف دعوت دی اور قرآن پڑھ کر سنایا جس پر ان سب نے اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہی اور فوراً ایمان لائے اور تصدیق پر آمادہ ہو گئے۔

(طبقات ابن سعد)

پھر یہی لوگ مدینہ گئے اور اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دی' جسے بہت سوں نے قبول کر لیا یہاں تک کہ انصار کا کوئی گھر ایسا نہ رہا جس میں حضرت رسول خداؐ کا چرچا نہ ہو۔

مورخ ابن سعد نے "قالوا" کے لفظ سے کچھ لا معلوم مورخین کی طرف نسبت دے کر لکھا ہے اور اہل مدینہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والے اسعد بن زرارہ اور ذکوان بن عبد قیس تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ یہ اسعد بن زرارہ اور ابو الہثیم بن تیہان یثرب میں دو ایسے شخص تھے جو اپنی عقل سلیم کی رہنمائی سے خدا کے لا شریک ہونے کے متعلق آپس میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ اب یہ دونوں ایک باہمی جھگڑے کے سلسلے میں مکہ میں عتبہ بن ربیعہ کے پاس گئے تو عتبہ نے کہا کہ آج کل تو ہمارے لئے یہ شخص جو ادھر نماز پڑھ رہا ہے ایک مصیبت بن گیا ہے جس کی وجہ سے کسی اور بات کی فرصت ہی نہیں ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ اللہ کا رسولؐ ہے اور اس طرح کی باتیں کرتا ہے۔ عتبہ سے یہ ذکر سن کر یہ لوگ اٹھے تو ذکوان نے اسعد سے کہا کہ لو یہ تو وہی دین ہے جس کے متعلق تم اپنا خیال ظاہر کیا کرتے ہو اور اس طرح یہ دونوں رسولؐ کی خدمت میں گئے۔ آپ نے ان کے سامنے اصول اسلام کو پیش فرمایا اور دونوں نے اسلام قبول کیا۔ پھر یہ دونوں مدینہ واپس ہوئے تو اسعد نے ابوالہثیم بن تیہان سے ملاقات کی اور پورا واقعہ بیان کیا۔ جسے سن کر ابو الہثیم نے کہا کہ میں بھی تمہارے ساتھ یہ گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ اس طرح وہ بھی اسلام لائے۔

یہ ابو الہثیم وہی حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے بڑے مخلص دوست ہیں جنہیں یاد کرکے آخر عمر میں حضرت زار و قطار روتے تھے جس کا ذکر نہج البلاغہ کے خطب میں موجود ہے۔

علامہ طبرسی نے اعلام الوریٰ میں اعلوث اہل بیت کے ترجمان مفسر قرآن علی بن ابراہیم علیہ الرحمہ کا حوالہ دے کر اس واقعہ کا پس منظر بڑی مکمل تفصیل و تشریح کے ساتھ درک کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اوس و خزرج میں مدت دراز سے ایسی سخت جنگ تھی کہ دن رات میں کسی وقت یہ لوگ جسم سے ہتھیار نہیں اتارتے تھے۔ چنانچہ آخری معرکہ ان میں جو ہوا تھا وہ بعاث کا تھا جس میں اوس' خزرج کے مقابلہ میں فتحیاب رہے تھے۔ اسعد بن زرارہ اور ذکوان بن قیس دونوں خزرج

میں سے تھے۔ یہ دونوں ماہ رجب کے عمرہ میں مکہ گئے تھے تاکہ اہل مکہ کو اوس کے خلاف حلیف بنائیں۔ اسعد بن زرراہ اور عتبہ بن ربیعہ میں پرانی دوستی تھی۔ اس لئے اسعد نے عتبہ ہی کے یہاں قیام کیا اور اپنا مطلب بیان کیا۔ عتبہ نے کہا، ایک تو ہمارا شہر تم سے دور ہے، پھر یہ کہ آج کل ہمیں ایک فکر ایسی ہے جس کی وجہ سے کسی دوسری مہم میں ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ اس پر اسعد نے تفصیل پوچھی تو عتبہ نے جناب رسالت مآبؐ اور ان کی دعوت اسلامی کا حال بیان کیا۔

یہ لوگ یہود کی زبان سے آخری رسول اور اس کی دعوت توحید کا حال تو سنے ہوئے تھے ہی۔ انہوں نے پوچھا کہ وہ اس وقت کہاں ہیں؟ کہا حجر اسماعیل میں بیٹھے ہیں۔ مگر میں کہے دیتا ہوں کہ ان کے پاس نہ جانا اور ان سے کوئی ایک لفظ بھی نہ سننا، ورنہ وہ جادوگر ہے اپنے کلام سے تم پر سحر کر دے گا۔ اسعد نے کہا میں عمرہ کا احرام باندھے ہوئے ہوں، مجھے طواف کے لئے ادھر جانا تو ضروری ہے۔ عتبہ نے کہا، خیر جاؤ مگر اپنے کانوں میں روئی دے لو کہ اس کی باتیں تمہارے کان میں نہ پڑیں۔

یہ اہل باطل کی کوشش کہ لوگ داعی حق کی تقریر سننے نہ پائیں بے لوث طالبان حق کے لئے مزید جذب کا باعث بن جایا کرتی ہے۔ اس وقت تو اسعد نے اپنے میزبان کے کہنے سے اس پر عمل کر لیا اور کانوں میں روئی رکھ لی مگر اثنائے طواف میں خیال آیا کہ مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی جاہل ہو سکتا ہے کہ میں مکہ سے اپنے شہر واپس جاؤں اور اتنا اہم واقعہ جو مکہ میں رونما ہوا ہے اس کے متعلق براہ راست کچھ معلومات حاصل کر کے نہ جاؤں کہ اپنے شہر والوں سے جا کر بیان کروں۔ یہ انتہائی حماقت ہی قرار پا سکتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی روئی کان سے نکال کر پھینک دی اور رسول خداؐ کے پاس جا کر عرب کے طریقہ کے مطابق سلام کیا۔

انعم صباحا"

"صبح بخیر" حضرتؐ نے سر اٹھایا اور فرمایا۔ اللہ نے ہم کو اس سے بہتر سلام کا طریقہ عنایت کر دیا ہے جو اہل بہشت کا سلام ہے۔ سلام علیکم

اسعد نے کہا اور کیا چیزیں ہیں جن کی طرف آپ دعوت دیتے ہیں۔ فرمایا۔
الی شهادة ان لا اله الا اللّٰه و انی رسول اللّٰه وادعو کم الی ان لا تشرکوا به شیئا و بالوالدین احسانا ولا تقتلوا اولاد کم من املاق نحن نرزقکم و ایا هم ولا تقربوا الفواحش ما ظهر منها و ما بطن ولا تقتلوا النفس التی حرم اللّٰه الا بالحق ذالکم و صاکم به لعلکم تعقلون ولا تقربوا مال الیتیم الا بالتی هی احسن حتی یبلغ اشده و اوفوا الکیل والمیزان بالقسط لا تکلف نفسا الا وسعها واذا قلتم فاعدلوا و لو کان ذا قربٰی و بعهدا اللّٰه اوفوا ذالکم وصاکم به لعلکم تذکرون
اس کی گواہی کہ سوا اللہ کے کوئی خدا نہیں ہیں اور یہ کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں اور میں اس کی دعوت دیتا ہوں کہ کسی چیز کو اللہ کے ساتھ شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور فقر و فاقہ کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو (پروردگار کا ارشاد ہے کہ) ہم تمہیں اور انہیں رزق پہنچانے والے ہیں اور فحش کاموں کے پاس نہ پھٹکو چاہے وہ کھلم کھلا ہوں اور چاہے خفیہ اور کسی بیگناہ کو ناحق قتل نہ کرو۔ یہ تمہیں اللہ کی ہدایتیں ہیں کہ شاید تم عقل سے کام لو اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسی صورت سے جو اس کے حق میں بہتر سے بہتر ہو یہاں تک کہ وہ بلوغ کی حد تک پہنچے اور ناپ تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو کسی پر اس کی قدرت سے زیادہ پابندی عائد نہیں ہوتی اور جب بات کہو انصاف کے ساتھ کہو، چاہے کسی رشتہ دار کا معاملہ ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ سب ہدایتیں ہیں تمہارے لئے شاید تم اثر قبول کرو۔

آپ کی تقریر آگے بڑھ رہی تھی اور سننے والے کے دل و دماغ کے ایک ایک گوشے میں روشنی پیدا ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ ادھر آپ نے سلسلہ تقریر ختم کیا اور ادھر بلا توقف وہ کہنے لگا۔ اشهد ان لا اله الا اللّٰه وانکَ رسول اللّٰه
"میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور آپ اللہ کے پیغمبر ہیں"۔

اسعد نے کہا' یا رسول اللہؐ میں یثرب کے قبیلہ خزرج سے ہوں اور ہمارے درمیان اور ہمارے قبیلہ اوس والے بھائیوں کے درمیان تعلقات برادری منقطع ہیں۔ اگر آپ کی وجہ سے یہ تعلقات استوار ہو جائیں تو پھر آپ سے بڑھ کر ہمارے نزدیک کوئی نہیں ہو سکتا یا رسول اللہؐ ہم یہودیوں سے آپ کے آنے کی خبر سنتے رہے ہیں اور وہ ہمیں بتا چکے ہیں کہ آپ ظاہر ہوں گے اور ایک وقت میں آپ مدینہ تشریف لائیں گے اور اسے اپنا وطن قرار دیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے آپ تک پہنچا دیا اور میں تو قبیلہ اوس کے خلاف رؤسائے قریش کو حلیف بنانے کے لئے آیا تھا۔ اب اگر آپ کی وجہ سے جنگ ہی ختم ہو جائے تو اس سے بڑھ کر کیا ہے؟

اس گفتگو کے بعد اسعد رخصت ہوئے اور انہوں نے جا کر اپنے دوسرے ساتھی ذکوان کو بتایا کہ یہ وہ آخری رسول ہیں جن کے متعلق علمائے یہود ہمیں اطلاع دیا کرتے تھے اور ان کے اوصاف بیان کرتے تھے چلو تم بھی اسلام قبول کرو چنانچہ ذکوان نے بھی آکر اسلام قبول کیا اور پھر ان دونوں نے یثرب جا کر اسلام کی تبلیغ کی جس کے قبول کرنے کی بہت سے نیک نفوس نے سعادت حاصل کی (اعلام الوریٰ) لیکن اکثر مورخین اس پہلی جماعت کو جس کے ذریعہ سے مدینہ میں اسلام پہنچا چھ افراد پر مشتمل بتاتے ہیں۔

عقبہ اولیٰ اور
اسلام کے پہلے مبلغ و معلم کا تقرر

ابن سعد کا بیان ہے کہ دوسرے سال پھر موسم حج میں یثرب سے بارہ آدمی مکہ معظمہ گئے اور انہوں نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جا کر اسلام اختیار کیا اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ پھر یہ لوگ مدینہ واپس ہوئے اور اب اسلام مدینہ میں ہر طرف پھیل گیا۔ ابھی تک اسعد بن زرارہ مسلمانوں کو نماز جماعت پڑھاتے تھے۔ اس کے بعد اوس و خزرج نے مل کر حضرت کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ ہماری طرف ایک حافظ قرآن کو بھیج دیجئے جو ہمیں قرآن حفظ کرائے۔ چنانچہ آپ نے ان کی درخواست پر مصعبؓ بن عمیر کو روانہ فرمایا۔ یہ اسعد بن زرارہ کے مکان پر فروکش ہوئے۔ انہیں قرآن کی تعلیم دینے لگے اور نماز جماعت پڑھانے لگے۔

(طبقات ابن سعد، جلد اول صفحہ ۱۴۸)

مگر علامہ طبرسی کی روایت یہ ہے کہ اسعد اور ذکوان پہلے ہی دو آدمی جو شروع شروع رسولؐ کی ملاقات سے شرفیاب ہوئے تھے انہوں نے ہی رسولؐ سے عرض کیا تھا کہ ہمارے ساتھ ایک آدمی بھیج دیجئے جو ہمیں قرآن کی تعلیم دے اور اسلام کی تبلیغ کرے۔ حضرتؐ نے مصعب بن عمیر کو بلایا۔

مصعب ایک کم عمر نوجوان تھے جنہوں نے اپنے دولت مند ماں باپ کے یہاں

بڑے ناز و نعمت سے پرورش پائی تھی اور اپنے تمام بھائی بہنوں میں سب سے زیادہ اپنے والدین کے چہیتے تھے اور کبھی مکہ سے باہر قدم نہ نکالا تھا مگر انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو ماں باپ نے سختی کی اور جب اس کا اثر نہ ہوا تو انہوں نے گھر سے نکال دیا۔ اب یہ رسولؐ کے پاس آ گئے چنانچہ شعب ابی طالب کے محاصرہ کی سختیاں بھی انہوں نے آپ کے ساتھ جھیلیں۔ اس دوران میں جتنا قرآن نازل ہوا تھا وہ تقریباً سب رسولؐ کے ساتھ رہ کر انہوں نے حفظ کر لیا تھا اور مسائل شرعیہ سے واقف ہو گئے تھے۔ پیغمبرؐ نے انہیں حکم دیا کہ وہ اسعد اور ذکوان کے ساتھ جائیں۔ یہ ان کے ساتھ مدینہ پہنچے اور اسعد کے یہاں قیام کیا۔ ہر روز یہ قبیلہ خزرج کے مجمعوں میں جاتے تھے اور اسلام کی طرف دعوت دیتے تھے اور زیادہ تر نوجوان ان کی تبلیغ سے متاثر ہوئے تھے اور اسلامی پیغام کو قبول کرنے پر آمادہ ہوتے تھے (اعلام الوریٰ)

ان بارہ آدمیوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جس مقام پر آکر ملاقات کی تھی وہ عقبہ یعنی پہاڑ کی ایک گھاٹی تھی یا اس مقام کا نام ہی عقبہ تھا اس لئے یہ واقعہ بیعت عقبہ اولیٰ کے نام سے مشہور ہے۔

مدینہ میں اسلام کی کامیابی

اور سعد بن معاذ کا قبول اسلام

عصبیت اور عناد کی اس بد نصیبی کو کیا کہئے کہ علمائے جمہور نے مشترک اسلامی واقعات اور حالات صحابہ کرام میں بھی ان اجزاء کو خبر و تاریخ نہیں بنایا جو اہل بیت رسولؐ کے ذریعہ سے بیان ہوئے ہیں مگر غنیمت ہے کہ اس خزانے کے دستبرد زمانہ سے تاراج ہوتے رہنے کے باوجود بھی کچھ جواہر ریزے ابھی تک ہمارے پاس محفوظ ہیں چنانچہ مذکورہ بالا عنوان کے ماتحت ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں علامہ طبرسی کے محفوظ کردہ ذخیرہ کا اقتباس ہے جو بطریق اہل بیت علیہم السلام پہنچا ہے اور جس سے عام تاریخوں کا دامن خالی ہے۔

علامہ موصوف رقم طراز ہیں۔

عبداللہ بن ابی قبیلہ خزرج کا رئیس تھا اور چونکہ جنگ بعاث میں اس نے قبیلہ اوس کے مقابلہ میں اپنے قبیلہ والوں کا ساتھ نہیں دیا تھا یہ کہہ کر کہ تم ناحق پر ہو اور اوس والے مظلوم ہیں۔ میں اس ظلم میں تمہارے ساتھ شریک نہیں ہوں گا۔ اس بے لوث کردار اور غیر جانبداری کا اثر یہ تھا کہ جب خزرج والوں کو شکست ہوئی اور اوس غالب ہوئے تو اوس و خزرج سب نے متفق ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ ہم عبداللہ بن ابی کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلیں اور اس مقصد سے ایک تاج بنوایا گیا جس کے درمیان میں جڑنے کے لئے بس ایک شایان شان گوہر آبدار کی تلاش تھی جس کی فکر کی جارہی تھی۔ اسی درمیان میں اسعد بن زرارہ اور ذکوان بن قیس اپنے ساتھ مصعب بن عمیر کو لے کر آئے اور اسلام کا پیغام پہنچایا جس کے نتیجہ میں عبداللہ بن ابی کی بادشاہت کا منصوبہ درہم برہم ہو گیا۔ اس لئے عبداللہ بن ابی نے اسعد کی اس تحریک کو ناپسند کیا اور ان کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے لگا۔ اسعد کے لئے عبداللہ بن ابی کی شخصیت کا اثر ذرا پریشان کن محسوس ہوتا تھا اس لئے انہیں فکر تھی کہ کوئی بااثر شخصیت ہمارے ساتھ بھی ہو جائے جو وجاہت میں عبداللہ بن ابی کی مدمقابل یا اس سے طاقتور ثابت ہو۔ آخر وہ سوچے اور انہوں نے مصعب بن عمیر سے کہا کہ میرے ماموں سعد بن معاذ قبیلہ اوس کے رؤسا میں سے ہیں اور بڑے سنجیدہ صاحب کردار آدمی اور تمام بنی عمرو بن عوف کا مرکز اطاعت ہیں۔ اگر وہ اس تحریک میں شامل ہو جائیں تو پھر ہماری بڑی کامیابی ہے لہذا چلئے ان کے محلہ میں چلیں ممکن ہے اللہ ہمیں کامیاب کر دے۔ چنانچہ مصعب' اسعد بن زرارہ کے ساتھ سعد بن معاذ کے محلّہ میں آئے اور ایک کنویں کی جگہ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

بچوں لور نوجوانوں نے جو اسعد کے ساتھ ایک نئے آدمی کو دیکھا تو آکر چاروں طرف سے گھیر کر کھڑے ہو گئے اور جناب مصعب نے قرآن مجید کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنانا شروع کر دیں۔ یہ خبر سعد بن معاذ کو پہنچی وہ پریشان ہو گئے اور

انہوں نے اسید بن حصین سے جو اشراف قبیلہ میں سے تھے اور اس وقت ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہا کہ یہ تو بڑی خرابی کی بات ہے کہ ابو امامہ اسعد بن زرارہ اس قرشی جوان کو لے کر ہمارے محلہ میں آ گئے ہیں اور وہ ہمارے نوجوانوں کو بیٹھا ہوا بہکا رہا ہے کہیں ان پر کوئی خراب اثر نہ پڑ جائے۔ تم جاؤ اور انہیں منع کرو کہ وہ اس محلہ میں نہ بیٹھیں۔ اسید بن حصین اس مقصد سے چلے اسعد نے انہیں آتا ہوا دیکھا تو جناب معصب سے کہا کہ یہ ایک معزز آدمی ہے جو آرہا ہے۔ یہی اگر ہمارے پیغام کو قبول کرے تو بھی کوئی کم کامیابی نہیں ہے۔ جب اسید قریب آئے تو انہوں نے اسعد سے کہا کہ اے ابو امامہ تمہارے ماموں نے مجھے بھیجا ہے کہ تم ہمارے مجمع میں نہ ٹھہرو۔ اور ہمارے نوجوانوں کو خراب نہ کرو' ورنہ ڈر ہے کہ کہیں قبیلہ اوس کے آدمیوں سے تمہیں کچھ نقصان نہ پہنچ جائے۔ جناب معصب نے کہا کہ آپ ذرا دیر ہمارے پاس بیٹھ جائیے اور ہم جو چیز پیش کرتے ہیں وہ سن لیجئے۔ پھر آپ کو اختیار ہے اگر آپ اسے پسند نہ کریں گے تو ہم بلا تکلف رخصت ہو جائیں گے۔ یہ سن کر اسید بیٹھ گئے اور جناب معصب نے قرآن کے ایک سورہ کی تلاوت کی جسے سنتے ہی اسید متاثر ہو گئے۔ کہا جب کوئی آپ کے حلقہ میں داخل ہوتا ہے تو اسے کیا کرنا پڑتا ہے؟ معصب نے کہا کہ بس غسل کرتے ہیں۔ پاک کپڑے پہنتے ہیں' شہادتین زبان پر جاری کرتے ہیں اور دو رکعت نماز پڑھ لیتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ اسید بے تحاشا کپڑوں سمیت اسی کنویں میں کود پڑے۔ پھر نکل کر اپنے کپڑے نچوڑے اور کہا اب مجھے شہادتین کی تعلیم دیجئے۔ جب معصب نے کلمہ کی تلقین کی انہوں نے کلمہ پڑھا اور دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر اسید نے کہا کہ اب میں تمہارے ماموں صاحب کے پاس جاتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ وہ خود یہاں تک آجائیں۔ اسید کافی دیر کے بعد واپس ہوئے تھے اس لئے وہاں ان کا انتظار ہو ہی رہا تھا۔ سعد بن معاذ نے انہیں دور ہی سے دیکھ کر دوسرے حاضرین سے کہا کہ خدا کی قسم اسید بدلے ہوئے آ رہے ہیں چنانچہ اسید آئے تو اس کی تصدیق ہو گئی اور اب خود سعد بن معاذ اس مقام پر آئے۔ جناب معصب نے حم

تنزیل من الرحمٰن الرحیم شروع کر کے سنانے کا آغاز کیا۔ خود معصب کا بیان ہے۔

واللّٰہ لقد راینا الاسلام فی وجھہ من قبل ان یتکلم

بخدا کوئی بات کرنے سے پہلے اسلام کا جلوہ سعد کے چہرہ میں نظر آنے لگا۔

وہ اسید سے سن ہی چکے تھے کہ کیا کیا کرنا ہوتا ہے اس لئے انہوں نے بغیر کوئی حرف بھی زبان سے کہے ہوئے اپنے ساتھ کے آدمی سے کہا کہ ہمارے گھر سے جا کر صاف کپڑے لے آؤ۔ پھر انہوں نے غسل کیا۔ کلمہ شہادتین زبان پر جاری کیا اور دو رکعت نماز پڑھی۔ اس کے بعد معصب کا ہاتھ پکڑا اور کہا' اب آپ میرے ساتھ چلئے اور بس اب بے تکلف اپنے پیغام کی اشاعت کیجئے اور کسی سے اندیشہ نہ کیجئے۔ اس کے بعد سعد بن معاذ' بنی عمرو بن عوف کے مجمع میں آئے اور کہا' سب مرد عورت' چھوٹے بڑے میرے پاس آکر جمع ہوں۔ جب سب آ گئے تو انہوں نے پوچھا بتاؤ۔ میری تم کیا حیثیت سمجھتے ہو۔ سب نے کہا' آپ ہمارے واجب الاطاعت سردار ہیں۔ آپ جو حکم دیں ہم اس کی تعمیل کے لئے حاضر ہیں۔ انہوں نے کہا اچھا تو پھر تم میں سے کسی مرد اور عورت کو کوئی لفظ بھی زبان سے نکالنا حرام ہے جب تک وہ اس کلمہ شہادتین کا اقرار نہ کر لے۔ ہم سب کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے ہمیں عزت سے سرفراز کیا اور اس کی تو ہمیں علمائے یہود برابر خبردیا کرتے تھے چنانچہ پورے قبیلے کے آدمی جو اس وقت موجود تھے سب نے اسلام قبول کیا اور کوئی گھر ایسا نہ رہا جس میں کوئی ایک مسلمان مرد یا عورت موجود نہ ہو۔

اور اب اوس اور خزرج دونوں قبیلوں میں کے جتنے ممتاز آدمی تھے سب نے اسلام قبول کر لیا۔ اس لئے کہ وہ اس کی اطلاع علمائے یہود کی، زبان سے برابر سنتے رہے تھے۔

(اعلام الوریٰ)

بیعت عقبہ ثانیہ اور قرار داد ہجرت

اب ان نومسلموں کو جنہوں نے غائبانہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم پر ایمان اختیار کیا تھا خود آپ کی خدمت میں پہنچنے اور آپ کی زبان سے آپ کے ارشادات کو سننے کا بڑا اشتیاق تھا۔ اور منتظر تھے کہ پھر موسم حج آئے تو مکہ جائیں۔

اب جو موسم حج قریب آیا تو آپس میں وعدے وعید ہونے لگے کہ ہم بھی چلیں گے۔ ہم بھی چلیں گے۔ چنانچہ وقت آنے پر کم و بیش ستر آدمی اوس و خزرج میں کے مکہ معظمہ آئے اور رسالت مابؐ کی خدمت میں آکر تسلیمات بجا لائے اور غالباً" مدینہ کی طرف تشریف آوری کی درخواست بھی پیش کر دی۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ حج سے فراغت کے بعد وسط ایام تشریق' نفر اول والے دن (۱۲ ذی الحجہ) مقام عقبہ کے نیچے کے حصہ میں رات کو جب سناٹا ہو جائے تو خاموشی کے ساتھ میرے پاس آ کے جمع ہونا تو تفصیل سے گفتگو ہوگی۔ چنانچہ وقت آنے پر حضرتؐ جناب عباسؓ بن عبدالمطلب کے ساتھ وہاں پہلے پہنچ گئے اور پھر یہ لوگ ایک ایک کرکے آپ کے پاس پہنچتے گئے جن میں سب سے پہلے حضرتؐ کے پاس آنے والے رافع بن مالک زرقی تھے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ ستر آدمی سب جمع ہو گئے۔ جناب عباسؓ بن عبدالمطلب نے جو غالباً" اسی غرض سے رسول خدا صلی

اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ آئے تھے بڑے پروقار بزرگانہ انداز میں ایک تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ۔

" تم نے محمدؐ کو جو دعوت دی ہے اس کا حال معلوم ہوا تمہیں غلط فہمی نہ ہونا چاہئے کہ محمدؐ کوئی بے گھر بے در انسان کی حیثیت سے کسی ٹھکانے کے محتاج ہیں۔ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ وہ اپنے گھرانے کے چشم و چراغ اور اپنے قبیلہ کی نہایت ہردلعزیز شخصیت ہیں اور ہم میں سے ہر شخص ان کے پسینے پر خون بہانے کے لئے تیار رہا ہے جسے ہم ایک دو دن نہیں تیرہ برس سے استقلال کے ساتھ نباہ رہے ہیں۔ مگر اپنے مقصد کی خاطر خود ان کا رجحان ہے کہ وہ تم لوگوں کی دعوت کو قبول کرلیں تو میں تم سے یہ بات معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم میں اگر اتنی طاقت فن حرب و ضرب سے واقفیت' زحمات و مصائب کے برداشت کی قوت اور یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید عرب کے قبائل ایک دم سب تمہارے خلاف صف آرا ہو جائیں پھر بھی اتنی ہمت ہو کہ تم ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ اپنی بات پر قائم رہو گے تو ابھی آپس میں خوب مشورہ کرلو۔ سوچ سمجھ لو۔ سب پہلوؤں پر غور کرلو اور پھر سچائی کے ساتھ از سر نو وفاداری کا عہد کرو اور بسم اللہ ان کو لے جاؤ اور اگر ذرا بھی کمزوری کا اندیشہ ہو تو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تیرہ برس سے جس طرح بن رہا ہے ان کی حفاظت کر رہے ہیں اب بھی جب تک دم میں دم ہے ان کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے اور یہیں خدا ان کو کامیاب و کامران کرے گا۔

(طبقات ابن سعد' جلد ا صفحہ ۱۴۹)

علامہ طبرسی کی روایت ہے کہ حضرت نے عقبہ کے مقام پر تفصیلی گفتگو کو مناسب نہ سمجھتے ہوئے انہیں وہاں سے خانہ عبدالمطلب میں جا کر جمع ہونے کا حکم دیا اور پوری بات چیت وہاں ہوئی۔ اس موقع پر جناب رسالت ماٰب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ جناب عباسؓ' جناب حمزہؓ اور حضرت علیؑ بھی موجود تھے اور اہل مدینہ جو آئے تھے ان میں کچھ وہ تھے جو اسلام قبول کر چکے تھے اور بہت سے ابھی وہ تھے جو دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے چنانچہ عبداللہ بن ابی بھی اس

جماعت کے ساتھ موجود تھا۔

(اعلام الوریٰ)

جناب عباسؓ کی تقریر اپنی سنجیدگی کے ساتھ پورے مجمع پر چھا گئی تھی اس کے ختم کے بعد بس تھوڑی دیر سکوت رہا اور پھر اہل مدینہ میں سے براء بن معرور کھڑے ہوئے اور کہنے لگے۔

" جو کچھ آپ نے فرمایا وہ ہم نے سنا مگر ہم آپ کو اطمینان دلاتے ہیں کہ اگر ہمارے دلوں میں ذرا بھی دغدغہ ہوتا تو ہم یہ پیشکش کرتے ہی نہ ہم نے خوب سوچ سمجھ لیا ہے اور طے کر لیا ہے کہ سچائی اور وفاداری میں ذرہ بھر بھی کمی نہ کریں گے اور پیغمبر خداؐ کی نصرت میں اپنی جانیں دینے میں دریغ نہ کریں گے"۔

یہ سن کر حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ آیات قرآنی کی تلاوت فرمائی اور بیعت کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ جس پر سب سے پہلے براء بن معرور اور بقولے ابو الہیثم بن تیہان یا اسعد بن زرارہ نے بیعت کی اور پھر ستر آدمیوں نے سب نے بیعت کی اور جو ان میں سے مسلمان نہ تھے انہوں نے اسی وقت اسلام قبول کیا۔

(طبقات ابن سعد، جلد ۱ صفحہ ۱۴۹)

علامہ طبری کی روایت ہے کہ حضرت رسول خداؐ نے ان سے فرمایا کہ تم لوگ اپنے میں سے بارہ نقیبوں (ذمہ دار نمائندوں) کو منتخب کرکے ان کے نام بتاؤ جو تمہاری طرف سے جوابدہی کے ذمہ دار ہوں چنانچہ نو آدمی خزرج میں سے اور تین اوس میں سے اسی وقت مقرر ہوگئے۔ خزرج کے نو آدمی یہ تھے۔

(۱) اسعد بن زرارہ (۲) براء بن معرور (۳) عبداللہ بن حزام (جناب جابر بن عبداللہ کے والد) (۴) رافع بن مالک (۵) سعد بن عبادہ (۶) منذر بن عمرو (۷) عبداللہ بن رواحہ (۸) سعد بن ربیع (۹) عبادہ بن صامت اور اوس میں سے۔

(۱) ابوالہیثم بن تیہان (۲) اسید بن حضیر (۳) اسعد بن خشیمہ

اس سب کے بعد ان لوگوں نے کہا۔ " یا رسول اللہؐ پھر اب بس تشریف لے

چلیئے۔ حضرت نے فرمایا' ابھی حکم الہیٰ کا انتظار ہے۔ (اعلام الوریٰ)

اصحاب کی روانگی

جان بچانے کے لئے گھبراہٹ میں مرکز چھوڑنا فرار ہوتا ہے اور فرار کرنے والا یہ نہیں سوچتا کہ دوسروں پر کیا گزرے گی مگر مقصد کی خاطر کسی مناسب مرکز کی تلاش کر کے اپنی جگہ سے حرکت کرنا' ہجرت ہے۔ ہجرت کرنے والا پورے انتظام کے ساتھ روانہ ہوتا ہے اس کے سامنے فقط اپنی جان کا مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ پوری جماعت کے مفاد کا مسئلہ ہوتا ہے اور اصول کے تحفظ کا منصوبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر رسولؐ کو فقط اپنی جان بچا کر نکلنا ہوتا تو یہ موقع بہت اچھا تھا کہ مدینہ والوں کی اتنی بڑی جماعت موجود تھی جو پورے تحفظ کے ساتھ اپنی معیت میں آپ کو لے جانا چاہ رہی تھی مگر آپ نے ان کی درخواست کو قبول نہیں کیا اور فرما دیا۔ "ابھی حکم الہیٰ کا انتظار ہے"۔

"یہ حکم الہیٰ" کیا تھا؟ ان تمام انتظامات کی تکمیل جو جماعت کے تحفظ اور اخلاقی ذمہ داریوں کے پورا کرنے کے لئے ضروری تھا۔

چنانچہ اہل مدینہ تو اس قول و قرار کے بعد اپنے شہر کی طرف واپس گئے اور یہاں مشرکین کو اس کا حال معلوم ہوا کہ اب مدینہ جانے کا منصوبہ بن گیا ہے تو انہوں نے مسلمانوں پر از سر نو مظالم کے پہاڑ توڑنا شروع کر دیئے۔ اس لئے حضرت پیغمبر خداؐ نے اب ان مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ رفتہ رفتہ مدینہ کی طرف روانہ ہوں۔

یہ ہوتا ہے ایک صاحب کردار سردار کا عمل کہ وہ جماعت کو ناخوشگوار ماحول میں بے یارو مدد گار چھوڑ کر خود نہیں جاتا بلکہ پہلے ان کے تحفظ کا سامان کرتا ہے۔

تاریخ کی تصریح ہے کہ رسولؐ کے علاوہ دو تین آدمیوں کے سوا اصحاب میں سے اب مکہ میں کوئی رہ نہیں گیا تھا یا پھر ایسے بیمار' مقید یا درماندہ افراد رہ گئے تھے جن کا جانا کسی طرح ممکن ہی نہ تھا۔

(طبقات ابن سعد' جلد ۱' صفحہ ۱۵۲)

منصوبہ قتل اور ہجرت رسولؐ

عام طور سے ہجرت رسولؐ کا پس منظریوں سمجھا جاتا ہے کہ مشرکین نے آپؐ کے قتل کا ارادہ کر لیا تو آپؐ نے مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی۔ اس طرح ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہجرت صرف خوف جان سے تھی مگر ہمارے گزشتہ بیانات اور تاریخ کے تصریحات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہجرت کا منصوبہ پہلے سے قائم تھا اور اس کی تکمیل ہو رہی تھی جیسا کہ ہجرت حبشہ میں لکھا جا چکا ہے۔ مشرکین کو اگر ان افراد سے ذاتی عداوت ہوتی تو وہ اس پر کہ یہ ان کے ملک سے چلے جا رہے ہیں خوش ہوتے مگر انہیں تو اس مقصد سے دشمنی تھی جس کی ترقی کے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت میں امکانات بعید محسوس ہو رہے تھے اور اب مدینہ کی طرف ہجرت میں امکانات بہت قریب نظر آ رہے تھے اس لئے وہ اس ہجرت سے نعل در آتش تھے اور انہوں نے جب دیکھا کہ اصحاب تقریباً" سب چلے گئے اور اب صرف رسولؐ رہ گئے ہیں اور یہ بھی بس جانے ہی والے ہیں تو انہوں نے اب یہ طے کر لیا کہ وہ آپ کا وہاں پہنچنے سے پہلے ہی خاتمہ کر دیں اور اس طرح آپ کی جان لینے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہجرت اندیشہ قتل کی بنا پر نہیں ہوئی بلکہ سامان قتل ارادہ ہجرت کی بناء پر پیدا ہوا۔

تاریخ کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

لما رای المشرکون اصحاب رسول اللّٰه قد اوصلوا النراری والاطفال الی الاوس والخزرج عرفوا انهادلر منعة و قوم اهل حلقة و باس فخافوا خروج رسول اللّٰه فاجتمعوا فی دارالندوة و لم یتخلف احد من اهل الرای والحجیٰ منهم لیتشاورو فی امره

(طبقات ابن سعد' جلد ا صفحہ ۱۵۳)

جب مشرکین نے دیکھا کہ اصحاب پیغمبر خداؐ اپنے ساتھ عورتوں اور بچوں کو بھی اوس و خزرج کی طرف لے گئے ہیں تو وہ سمجھے کہ وہ ان کے لئے قابل اطمینان و

محفوظ مقام ہے اور وہ ایک طاقتور جماعت ہے تو اب انہیں یہ اندیشہ ہوا کہ رسولؐ بھی وہاں پہنچ جائیں گے' لہٰذا یہ لوگ دارالندوہ میں جمع ہوئے اور ان میں کوئی صاحب عقل ورائے شخص ایسا نہ تھا۔ جو اس جلسہ میں شریک نہ ہوا ہو تاکہ آپ کے بارے میں وہ باہم رائے مشورہ کریں۔

علامہ طبرسی کا بیان ہے کہ دارالندوہ میں اشراف قریش میں سے چالیس اشخاص کا مجمع تھا اور یہاں کے شرکاء میں یہ قید رکھی گئی تھی کہ چالیس برس سے کم عمر کا کوئی آدمی شریک نہ ہو۔ صرف ایک عتبہ بن ربیعہ (امیر شام معاویہ کا نانا) ایسا تھا جس کی عمر چالیس سال سے کچھ کم تھی۔ (اعلام الوریٰ)

جب سب جمع ہو گئے تو قتل رسولؐ کے تدابیر پر غور کیا جانے لگا۔ خاص پہلو جو پیش نظر تھا وہ یہ کہ اگر رسولؐ کو شہید کر دیا جائے تو بنی ہاشم خون کا بدلہ ضرور لیں گے اس طرح ایک عرصہ تک انتقام اور انتقام در انتقام کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

ابوجہل نے یہ رائے دی کہ کوئی ایک آدمی اس کا ذمہ دار نہ ہو بلکہ تمام قبائل قریش میں سے ہر ہر قبیلہ کا ایک آدمی چنا جائے اور وہ سب مل کر آپ کو قتل کریں تاکہ آپ کا خون تمام قبائل میں تقسیم ہو جائے اور اولاد عبد مناف کی سمجھ میں نہ آئے کہ وہ کس کس سے اس کا خون کا بدلہ لیں۔

(طبقات ابن سعد' جلد ا' صفحہ ۱۵۴)

چنانچہ پندرہ آدمی اس کے لئے منتخب کئے گئے جن میں خود بنو ہاشم میں سے ایک ابولہب بھی تھا کہ یہ سب لوگ رات کو پیغمبرؐ کے مکان میں داخل ہو کر آپ کو شہید کر ڈالیں۔ (اعلام الوریٰ)

اس صورتحال سے صاف ظاہر ہے کہ مشرکین نے یہ شہید کرنے کا منصوبہ صرف اس لئے بنایا تھا کہ آپ ہجرت نہ کر سکیں یعنی جو منصوبہ ترقی اسلام کے لئے بنایا گیا ہے وہ پورا نہ ہو سکے۔ اس کے بعد رسولؐ کے لئے صرف اپنی جان کا سوال نہ تھا بلکہ اس بلند مقصد کا سوال تھا جس کے لئے ہجرت کی جا رہی تھی اور اب

ضرورت اس کی تھی کہ مشرکین کے تدابیر کے مقابلہ میں خالق کی جانب سے ایسی تدبیر کی جائے کہ مشرکین اپنا سا منہ لے کر رہ جائیں اور آپ ان کے اندر سے نکل جائیں۔ یہی ان کے منصوبہ کے ناکام بنانے اور اللہ کی جانب سے رسولؐ کو ان کے مقصد میں کامیابی کی تدبیر کا ذکر ہے جسے قرآن مجید نے ان الفاظ میں کہا ہے کہ۔

و یمکرون و یمکر اللّٰہ واللّٰہ خیر الماکرین

وہ اپنا منصوبہ بنا رہے تھے اور اللہ اپنا منصوبہ بنا رہا تھا اور اللہ سے بڑھ کر کسی کا منصوبہ نہیں ہو سکتا۔

یہ خداوندی منصوبہ کیا تھا؟ اسے اسی قدیم ترین مورخ ابن سعد کی زبان سے سنئے۔

واتٰی جبریل رسول اللّٰہ فاخبرہ الخبر وامرہ ان لا ینام فی مضجعہ تلکٔ اللیلة و امر علیا ان یبیت فی مضجعہ تلکٔ اللیلة

(طبقات ' جلد ۱ صفحہ ۱۵۳)

جبرئیل امینؑ رسول خداؐ کے پاس آئے اور آپ کو واقعہ کی اطلاع دی اور یہ حکم الٰہی پہنچایا کہ آپ آج اپنے بستر پر آرام نہ فرمائیں اور علیؑ بن ابی طالب آج رات کو آپ کے بستر پر آرام کریں۔

علامہ طبرسی کا بیان ہے کہ پیغمبر خداؐ نے حکم دیا کہ آپ کا بستر بچھا دیا جائے پھر حضرت علیؑ بن ابی طالب کو بلایا۔

فقال یاعلی افد نی بنفسکٔ قال نعم یا رسول اللّٰہ قال نم علٰی فراشی والتحف ببردتی فنام علٰی فراش رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ والہ والتحف ببر دتہ (اعلام الوریٰ)

فرمایا' اے علیؑ اپنے کو مجھ پر فدا کر دو۔ کہا بسرو چشم۔ فرمایا' میرے بستر پر سو رہو اور میری چادر اوڑھ لو' چنانچہ آپ نے رسولؐ کے بستر پر رام کیا اور آپ کی چادر اوڑھ لی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں۔

"چوں آنحضرتؐ خواست کہ وقت صباح بہ ہجرت آید علی مرتضیٰؓ را فرمود کہ شب در محل خوابگاہ آں سرور بہ خواب رود تامشرکاں در مقام التباس آمدہ از حقیقت حال آگاہ نہ شوند"۔ (مدارج النبوۃ)

یعنی حضرت علیؓ کو بستر پر اس لئے لٹایا گیا کہ مشرکین دھوکے میں رہیں اور انہیں پتہ نہ چلے کہ رسولؐ تشریف لے گئے ہیں۔

اب یہ کہ آپ کو مکہ معظمہ میں کس لئے چھوڑا گیا تھا؟ اس کا جواب بھی محدث مذکور نے تحریر کیا ہے۔

" اصل باعث برگزاشتن علی مرتضیٰ زر و مال کفار قریش بود کہ بہ اعتقاد دیانت و مشاہدہ امانت نزد آنحضرتؐ می گزاشتند و آنحضرتؐ را محمدؐ امین صادق می گفتند" ۔ (مدارج النبوۃ)

یعنی اصل وجہ حضرت علیؓ کو مکہ میں چھوڑنے کی یہ تھی کہ مشرکین کی امانتیں جو وہ رسول خداؐ کے پاس آپ کی ایمانداری کے یقین اور امانتداری کے مشاہدہ کی وجہ سے رکھا کرتے تھے اور جس کی وجہ سے وہ آپ کو صادق اور امین کہا کرتے تھے ان کے مالکوں کو واپس کر دیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ باوجودیکہ مشرکین رسولؐ کے دشمن جان تھے پھر بھی آپ کی امانتداری پر اتنا اعتماد رکھتے تھے کہ ان کی امانتیں شب ہجرت تک آپ کے پاس موجود تھیں اور یہ ان کی امانتوں کا احترام اور اس اخلاقی ذمہ داری کی تکمیل تھی جس کے لئے آپ نے یہ قربانی گوارا فرمائی تھی کہ اپنی گود کے پالے ہوئے عزیز ترین شخص کو اس خطرناک ماحول کے اندر گھر میں چھوڑ دیا تھا اور پھر یہ مقصد کے تحفظ کی خاطر اس سے بڑی قربانی تھی کہ انہیں اپنے بستر پر کھینچی ہوئی تلواروں کے حصار میں چھوڑ گئے تھے۔ مورخ ابن سعد کے الفاظ ہیں۔

فبات فيه علی و تغشی بردا احمر حضر ميا كان رسول الله صلعم ينام فيه (طبقات جلد ۱، صفحہ ۱۵۳)

علیؑ بستر رسولؐ پر سوئے اور وہ سرخ رنگ کی حضرمی (حضرموت کی بنی ہوئی) چادر اوڑھ لی جس میں رسولؐ آرام فرمایا کرتے تھے۔

اسلام کی خاطر یہ حضرت علیؑ بن ابی طالب کی فداکاری بالکل متفق علیہ حیثیت رکھتی ہے۔ محدث عبدالحق دہلوی لکھتے ہیں۔

پس خواب کرد کہ علی مرتضیٰ در جائے خواب آنحضرتؐ پوشید خود را ببرد خاص آنحضرتؐ کہ آں را پوشیدہ بخواب رفتی پس او رضی اللہ عنہ نخستیں کسے است کہ فروخت و فدا کرو نفس خود را در راہ محبت رسول خداؐ و گویند کہ آیتہ کریمہ و من الناس من یشری نفسہ ابتغآء مرضات اللّٰہ واللّٰہ رؤف بالعباد نازل شد و دریں باب شعرے ازوے رضی اللہ عنہ نقل می کنند کہ می فرمود۔

علیؑ ابن ابی طالب حضرتؐ کے بستر پر سو رہے اور حضرت کی چادر خاص جسے اوڑھ کر حضرت آرام فرماتے تھے اوڑھ لی۔ اس طرح آپ پہلے وہ شخص ہیں جس نے اپنی جان کو بیچ ڈالا اور فدا کر دیا رسول خداؐ کی محبت کی راہ میں اور کہا جاتا ہے کہ قرآن کی یہ آیت کہ "انسانوں میں وہ بھی ہے جس نے اپنی جان رضائے خدا کی خاطر بیچ ڈالی ہے اور اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے"۔ اسی کے بارے میں اتری ہے اور اس بارے میں خود حضرت علیؑ کی زبانی کچھ اشعار بھی وارد ہوئے ہیں کہ آپ فرماتے تھے۔

وقیت بنفسی خیر من وطئی الثریٰ
و من طاف بالبیت العتیق و بالحجر

"میں نے اپنے کو سپر بنا دیا اس کی جو زمین پر چلنے والوں اور خانہ کعبہ کا طواف کرنے والوں میں بہترین ذات ہے"۔

و خاف رسول اللّٰہ ان یمکروا بہ
فنجاہ ذوالطول الالہ من المکر

"رسولؐ کو اندیشہ ہوا کہ مشرکین نے جو منصوبہ آپ کے خلاف بنایا ہے وہ پورا نہ ہو جائے تو اللہ نے ان کو مشرکین کے پھندے سے چھٹکارا دیا"۔

و در مواہب ایں دو بیت ذکر کردہ در روضتہ الاحباب دو بیت دیگر نیز آوردہ کہ معاہب لدنیہ میں یہی دو شعر ذکر کیے ہیں اور روضتہ الاحباب میں دو شعر اور بیان ہوئے ہیں کہ۔

و بات رسول اللّٰہ فی الغار آمنا
موقی و فی حفظ الا لہ و فی ستر
و بت اراعیھم و ما یثبتوننی
و قد وطنت نفسی علی القتل والاسر

(مدارج النبوۃ)

شب گزاری رسول خداؐ نے غار میں جا کر امن و سکون سے محفوظ طور پر خدا کے حفظ و امان میں اور میں نے پوری رات اس طرح گزاری کہ دشمنوں کی نقل و حرکت کو دیکھ رہا تھا اور وہ مجھے پہچان نہیں رہے تھے اور میں بالکل قتل یا قیدی ہونے کے لئے تیار تھا۔

مسٹر کے اے حمید بی۔ اے (لندن) بیرسٹرایٹ لاء لاہور نے لکھا ہے کہ۔
"آپ نے حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر سلایا اور خود ۱۲ ستمبر ۶۲۲ء کو روانہ ہو گئے۔"

(تاریخ مسلمانان عالم حصہ اول صفحہ ۲۶)

رات بھر وہ لوگ رسولؐ کے مکان کو گھیرے رہے اور شقوق در سے دیکھتے رہے کہ رسولؐ لیٹے ہوئے ہیں اور آپس میں طے کر رہے تھے کہ کون آگے بڑھ کر اس سونے والے کی زندگی کا خاتمہ کرے گا۔

(طبقات ابن سعد' جلد ۱ صفحہ ۱۵۳)

وہ سب تو اس پر تلے ہوئے تھے کہ رات ہی کو مکان کے اندر گھس جائیں مگر ابو لہب نے کہا کہ نہیں رات بھر ہم نگرانی کریں اور جب صبح ہو تو اندر جائیں۔ اس کے کہنے سے وہ شب بھر محاصرہ کیے ہوئے کھڑے رہے (اعلام الوریٰ)

رسولؐ تو خدا کی قدرت سے ان کے گھیرے میں سے نکل کر آغاز شب ہی

میں چلے گئے تھے۔ جب صبح ہوئی تو۔

قام علی من الفراش فسا لوہ عن رسول اللّٰہ صلعم فقال لا علم لی بہ (طبقات ابن سعد)

علیؑ بستر سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان سب نے رسول خداؐ کو پوچھا کہ وہ کہاں ہیں؟ آپ نے کہا' مجھے ان کے متعلق خبر نہیں ہے۔

علامہ طبرسی لکھتے ہیں۔

فلما اصبحت قریش و اضاء الصبح فوثبوافی الحجرۃ و قصد وا الفراش فوثب علی الیھم و قام فی وجوھھم فقال لھم مالکم قالوا این ابن عمکٗ قال علی جعلتمو نی علیہ رقیبا۔(اعلام الوریٰ)

جب صبح ہوئی اور روز روشن ہوا تو وہ سب چھلانگیں مار مار کر مکان کے اندر داخل ہو گئے اور بستر کے پاس پہنچ گئے۔ اب علیؑ جست کرکے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور کہا کیوں تمہارا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے کہا تمہارے چچا زاد بھائی کہاں ہیں؟ آپ نے کہا کیا تم نے مجھے ان کا نگران مقرر کیا تھا؟

یہ سن کر وہ لوگ پیغمبر خداؐ کی تلاش کے لئے چلے۔

اب ادھر کی سنئے۔ رسول خداؐ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کو بستر پر لٹا کر خاموشی کے ساتھ مشرکین کے حلقے سے نکل گئے اور تیزی کے ساتھ روانہ ہوئے کہ جلد مکہ کے حدود سے باہر نکل جائیں اور قبل اس کے کہ مشرکین کو آپ کی روانگی کی اطلاع ہو' آپ اس جگہ پہنچ جائیں جو خالق کی طرف سے آپؐ کی حفاظت کے لئے جائے پناہ قرار دی گئی ہے مگر اتفاق کی بات کہ اس وقت حضرت ابوبکر کسی ضرورت سے مکان کے باہر آئے تھے انہوں نے رسولؐ کو جاتے ہوئے دیکھا تو تیزی سے قدم بڑھا کر آپ سے آ کر ملحق ہو گئے اور پوچھا کہاں جا رہے ہیں؟ یہ بہت نازک موقع تھا' رسولؐ کی نقل و حرکت پر کسی کا اس وقت مطلع ہو جانا افشائے راز کے خطرے سے خالی نہ تھا اس لئے پیغمبر خداؐ نے اپنی حکمت کاملہ سے محفوظ صورت یہی سمجھی کہ ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا چلو بس تم بھی میرے ساتھ ہی چلو۔ اس طرح

آپ پیغمبر خدا کے رفیق سفر ہو گئے اور آپ انہیں لئے ہوئے غار ثور کے کنارے پر پہنچے اور غار کے اندر داخل ہو گئے۔

(اعلام الوریٰ

مورخین اہل سنت کا بیان ہے کہ حضرت مشرکین کے حلقے سے نکل کر خود جناب ابوبکر کے مکان پر گئے اور رات تک وہاں رہے پھر ان کے ساتھ غار ثور کی طرف تشریف لے گئے۔

(طبقات ابن سعد' جلد ا صفحہ ۱۵۳)

مگر حضرت اپنے بیت الشرف سے رات ہی کو تو برآمد ہوئے تھے پھر رات تک خانہ ابوبکر میں رہنے کے کیا معنی؟ اس کے علاوہ صبح ہی کو مشرکین تعاقب کے لئے چل کھڑے ہوئے اور فطری طور پر مکہ کے تمام ناکوں پر پہرے بٹھا دیئے گئے کہ رسولؐ نکل کر نہ جانے پائیں۔ اس حالت میں آپ کا خانہ ابوبکر سے نکل کر غار ثور تک جانا بالکل قرین قیاس نہیں ہے لہٰذا درایۃً پہلی ہی روایت حقیقت کے مطابق معلوم ہوتی ہے۔

اب مشرکین حضرتؐ کی تلاش کے لئے نکلے۔ ادھر ادھر ڈھونڈا' کچھ پتہ نہ چلا تو قیافہ دانوں کی مدد سے جو اپنے فن میں اس وقت بڑے کمال کے درجہ پر فائز تھے نقش قدم کو پہچانتے ہوئے غار ثور تک آ گئے۔

علامہ طبری لکھتے ہیں کہ خصوصیت کے ساتھ قبیلہ خزاعہ کا ایک آدمی ابوکرز اس فن میں امتیاز خاص کا حامل تھا اسے بلایا گیا۔ "فقالواله یا اباکرز الیوم الیوم" انہوں نے کہا' اے ابوکرز بس آج ہی کا دن ہے' آج ہی کا دن ہے۔ یعنی تمہارے کمال فن دکھانے کا یہی موقع ہے۔ چنانچہ وہ ان کے ساتھ ہوا اور یہ کہتا ہوا کہ دیکھو یہ محمدؐ کے پیر کا نشان ہے اور یہ ابن ابی قحافہ (ابوبکر) کے پیر کا نشان ہے اور یہاں ابن ابی قحافہ کو چلنے میں ٹھوکر لگی ہے۔ برابر اسی طرح وہ سب کو لئے آگے بڑھتا گیا یہاں تک کہ سب کو غار کے دروازے پر لا کر کھڑا کر دیا اور کہا کہ چاہے یہاں سے وہ آسمان پر چڑھ گئے ہوں یا زمین میں اتر گئے ہوں بہرحال وہ

دونوں اس جگہ سے آگے نہیں بڑھے۔ (اعلام الوریٰ)

عین اسی وقت غار کے اندر حضرت ابوبکر پر رقت طاری ہوئی۔ یہ بڑی خطرناک صورت حال تھی۔ ادھر قیافہ دانوں کی اپنے مشاہدہ اور علم کی بنا پر سراغ دہی اور ادھر غار کے اندر سے رونے کی آواز کا بلند ہونا۔ اس کے بعد مشرکین کو رسولؐ تک پہنچے میں امر ہی کون مانع ہو سکتا تھا۔ یہی وہ موقع تھا کہ حضرت پیغمبر خداؐ نے اپنے ساتھی سے وہ الفاظ فرمائے جو قرآن مجید میں مذکور ہیں کہ لا تحزن ان اللّٰہ معنا" غم نہ کرو! اللہ ہمارے ساتھ ہم اور یہ قدرت کا انتظام تھا کہ مشرکین غار کے اندر کی آواز سن نہیں سکے اور غار کے دہانے پر مکڑی کا جالا اتنی کثرت اور ایسی کیفیت کے ساتھ لگا ہوا دیکھا جس کے متعلق موررخ ابن سعد کے الفاظ یہ ہیں کہ۔

قال بعضھم ان علیہ العنکبوت قبل میلاد محمدؐ

(طبقات جلد ا صفحہ ۱۵۴)

ان میں سے بعض نے کہا کہ یہاں تو اتنی شدت سے مکڑیوں نے جالا لگا رکھا ہے کہ شاید حضرت محمدؐ کی پیدائش کے بھی پہلے سے وہ یوں ہی ہے۔

چنانچہ مشرکین سب حیران ہو کر واپس گئے۔ ان کے جانے کے بعد رسولؐ برآمد ہوئے اور مدینہ کی جانب روانہ ہوئے۔

ابن سعد کا ایک جگہ بیان ہے کہ حضرتؐ کا غار سے برآمد ہونا شب دوشنبہ ۴ - ربیع الاول کو تھا۔ (طبقات جلد ا صفحہ ۱۵۷)

مگر پھر چند ہی سطروں کے بعد یہ لکھا ہے کہ حضرت مدینہ میں روز دو شنبہ ۲ ربیع الاول اور ایک روایت کے مطابق ۱۲ ربیع الاول کو پہنچے۔

علامہ طبری لکھتے ہیں کہ آپ مدینہ دو شنبہ ۱۱ ربیع الاول کو پہنچے۔

(اعلام الوریٰ)

تاریخ اسلام کی یہ وہ کمزوری ہے جو اس وقت سے لے کر وفات رسولؐ تک برابر قائم رہی ہے پھر اس کے بعد کے واقعات میں اگر یہ تاریخ اور دن کا اختلاف

نظر آوے تو اس پر حیرت کبھی نہ ہونا چاہئے اور نہ اس سے اصل واقعات کو مشکوک بنایا جانا درست ہوگا۔

"مسلمانان عالم" کے مصنف نے لکھا ہے کہ

"آپ نے حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر سلایا اور خود ۱۲ ستمبر ۶۲۲ء کو تشریف لے گئے۔ ۱۶ ستمبر ۶۲۲ء کو قبا میں پہنچے"۔

تاریخ اسلام حصہ دوئم

رسول خدا کا مدینہ میں ورود اور آپ کا استقبال

مدینہ منورہ میں جس کا نام اس وقت تک بس یثرب تھا' خبر پہنچ چکی تھی کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے یثرب روانہ ہو چکے ہیں اور یہاں تشریف لانے والے ہیں۔ اس لئے روزانہ وہ لوگ صبح سویرے بیرون مدینہ جاتے تھے اور جب دھوپ کی تپش ناقابل برداشت ہو جاتی تھی تو ناامید ہو کر واپس چلے جاتے تھے۔

(طبقات ابن سعد جلد ا' صفحہ ۱۵۷)

علامہ طبری لکھتے ہیں کہ مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں اور بچے تک ہر روز صبح سے دھوپ کی شدت ہونے تک زیر آسمان انتظار میں کھڑے رہا کرتے تھے۔ (اعلام الوریٰ) چنانچہ آخری دن بھی حسب دستور شہر سے باہر دوپہر کے قریب تک انتظار کر چکے تھے اور اب نا امید ہو کر واپس ہونا چاہتے تھے کہ جماعت یہود میں سے ایک شخص نے جو ایک ٹیلے پر کھڑا تھا' بلند آواز سے کہا کہ جس کا تمہیں انتظار ہے وہ آگیا۔ یہ سنتے ہی سب دوڑ پڑے اور چاروں طرف تکبیر کی صدائیں گونجنے لگیں۔ اس دن اہل مدینہ کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ عورتیں' بچے اور کنیزیں تک ایک دوسرے سے کہہ رہی تھیں کہ رسول خدا آ گئے' رسول خدا آ گئے۔

(ابن سعد جلد ا صفحہ ۱۵۸)

آپ نے وہیں بیرون مدینہ قبیلہ بنو عمرو بن عوف میں قیام فرمایا۔ بقول ابن سعد اس دن دو شنبہ ۱۱ یا ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ تھی۔

(طبقات جلد ا صفحہ ۱۵۷)

مسٹر کے اے حمید بیرسٹر لاہور لکھتے ہیں کہ اس دن ۶ ستمبر ۶۲۲ء تھی (مسلمانان عالم صفحہ ۴۹)۔ طبری نے معیناً" دو شنبہ کی ۱۲ ربیع الاول لکھی ہے۔ (طبری جلد دوم صفحہ ۲۴۹)

جائے قیام

بیرون مدینہ جسے یہ شرف حاصل ہوا کہ آپ اس کے مکان میں فروکش ہوں اس کے نام میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں قبیلہ بنی عمرو بن عوف کے ایک بزرگ کلثوم ابن ہدم کے یہاں قیام ہوا تھا اور بعض کہتے ہیں کہ سعد بن خثیمہ کے یہاں۔ پہلے قول کے حامیوں کا کہنا ہے کہ حضرتؐ کا قیام تو کلثوم بن ہدم ہی کے یہاں تھا' مگر چونکہ سعد بن خثیمہ شادی شدہ نہ تھے' ان کا مکان بالکل مردانہ تھا اس لئے آپ لوگوں سے ملاقات کے لئے دن کو ان کے مکان میں تشریف فرما رہتے تھے۔ اس سے کچھ لوگ یہ سمجھے کہ آپ کا قیام سعد بن خثیمہ ہی کے یہاں ہے۔
(طبری ' مطبع حسینیہ مصر جلد ۲ صفحہ ۲۴۸)

بھائی کا انتظار

حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ پیغمبر خداؐ کے چچا زاد بھائی ہی نہ تھے بلکہ ابتدائے عمر سے آپ کے زیر سایہ پرورش پانے کی وجہ سے اولاد کی سی نسبت آپ سے رکھتے تھے بلند نفوس کے لئے خود اپنے کو خطرے میں ڈال دینا اتنا دشوار نہیں ہوتا جتنا جان سے زیادہ عزیز افراد کو خطرے میں ڈالنا۔ یہ تو دین حق کی خاطر اور حکم الٰہی کی تعمیل میں ایک بڑی قربانی تھی جو رسول خداؐ" علیؑ بن ابی طالب کو اپنے بستر پر دشمنوں کے محاصرے میں چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔ مانا کہ جب آپ مکہ کے غار میں پناہ گزین تھے تو وہیں آپ کو اس رات کے خطرے سے علیؑ کی سلامتی کا حال معلوم ہو گیا تھا مگر آپ کے تشریف لے جانے سے کفار کو جو اشتعال تھا اور ایک طرح اپنی شکست کا غصہ' جس شکست میں خود علیؑ ابن ابی طالبؑ نے بستر پر سو کے ایک بڑا عملی حصہ بھی لیا تھا۔ اس لئے ظاہری اسباب کی بناء پر علیؑ کا مکہ میں جتنے دن

بھی قیام رہا اس کا ایک لمحہ بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ لہٰذا فطری طور پر پیغمبرؐ کو علیؑ کی فکر ہونا چاہئے تھے۔ پھر یہ کہ آپ مکہ میں اپنی انتہائی محترم اور مقدس امانتیں بھی علی ہی کی ذمہ داری میں چھوڑ آئے تھے۔ یہ خاندان کی محترم خواتین تھیں، جن میں خود پیغمبر خداؐ کی اکلوتی بیٹی حضرت فاطمہؑ زہرا بھی تھیں اور ان کے علاوہ جن کے نام معلوم ہیں ایک رسولؐ کی چچی جناب فاطمہ بنت اسد یعنی حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی والدہ تھیں اور دوسرے پیغمبرؐ کی چچا زاد بہن فاطمہ بنت زبیر بن عبدالمطلب تھیں۔ ان خواتین کا مدینہ آنا حضرت علیؑ بن ابی طالب سے وابستہ تھا۔ اسی لئے پیغمبر خداؐ جب قبا میں فروکش ہوئے تو باوجودیکہ آپ کے رفیق سفر ابوبکر اسی دن آپ کو چھوڑ کر داخل شہر ہو گئے اور جا کر قبیلہ خزرج کے ایک شخص حبیب بن اساف یا خارجہ بن زید بن ابی زہیر کے یہاں مقیم ہو گئے۔ (طبری جلد ۲ صفحہ ۲۴۹) لیکن حضرت پیغمبر خداؐ نے مدینہ کے داخل ہونے کو ان افراد کے پہنچ جانے پر موقوف رکھا، تاکہ سب لوگ ایک ساتھ دارالہجرت میں داخل ہوں۔

ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ حضرت نے وہاں چودہ دن قیام فرمایا (طبقات جلد ۱ صفحہ ۱۵۹) اس دوران میں ایک قول کے مطابق آپ کے ورود مدینہ کے تین دن کے بعد حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ بھی آپ تک پہنچ گئے۔ شاہ عبدالحق دہلوی نے اس کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

وہم در انجا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بتفاوت سہ روزہ از مکہ در رسیدہ آنحضرتؐ را خوشحال گردانید و در روضۃ الاحباب می گوید کہ وے رضی اللہ عنہ پیادہ راہ می رفت و پاہائے مبارک وے از پیادہ رفتن آبلہ کردہ بود حضرت دست مبارک خویش برآں مالید و درزماں صحت یافت، انتہیٰ وایں مثل آن است کہ در غزوہ خیبر چشم وے رضی اللہ عنہ درد می کرد آنحضرت لعاب مبارک خود مالید در حال شفایافت و ہرگز درد چشم نہ دید" (مدارج النبوۃ)

"تین روز بعد علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی مکہ سے وہاں پہنچ گئے۔ اور آنحضرتؐ کو شاد کام کیا۔ صاحب روضۃ الاحباب لکھتے ہیں کہ آپ (حضرت علیؑ) نے

پاپیادہ سفر کیا تھا جس سے آپ کے پاہائے مبارک میں چھالے پڑ گئے تھے۔ آنحضرتؐ نے اپنا دست مبارک پھیرا جس سے فوراً صحت ہو گئی۔ یہ بالکل اسی طرح کا واقعہ ہے کہ غزوہ خیبر میں آپ (حضرت علیؑ) درد چشم میں مبتلا تھے۔ آنحضرتؐ نے اپنا لعاب مبارک لگایا جس سے فوراً صحت ہو گئی اور پھر کبھی آنکھیں دکھنے نہیں آئیں"۔

مگر ہمیں محدث دہلوی کے اس بیان سے کہ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ حضرتؐ کے تین دن بعد پہنچ گئے تھے خاطر جمع نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو مزید دس بارہ دن بیرون مدینہ قیام کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ہمارے خیال میں یہ تین دن کا قیاس اس پر مبنی ہے کہ مورخ ابن جریر نے تصریح کی ہے کہ حضرت علیؑ نے مکہ میں رسولؐ کے تشریف لے جانے کے بعد تین دن قیام فرمایا۔ جس میں آپ نے وہ امانتیں جو پیغمبرؐ کے پاس تھیں ان کے مالکوں تک پہنچائیں۔ اس کے بعد آپ پیغمبر خداؐ کے پاس آئے اور حضرتؐ کے جائے قیام یعنی کلثوم بن ہدم کے مکان پر آپ کے ساتھ قیام فرمایا۔ (طبری جلد ۲ صفحہ ۲۴۹) مگر مدینہ میں رسولؐ کے بعد تین دن قیام کرنے سے یہ قطعاً نتیجہ نہیں نکلتا کہ آپ رسولؐ کے پاس تین دن کے بعد پہنچ گئے ہوں گے۔ جب کہ پیغمبرؐ تنہا سفر کر رہے تھے اور آپ کے ساتھ عورتیں تھیں۔ اس لئے آپ کے سفر کی رفتار پیغمبرؐ کی رفتار سفر کے برابر نہیں ہو سکتی۔ بلکہ کوئی تعجب نہیں کہ پیغمبرؐ نے جتنے دن میں وہ راستہ طے فرمایا ہو آپ نے اس سے کافی زیادہ دنوں میں اس مسافت کو طے کیا ہو' اور اس طرح تین دن بعد نہیں بلکہ اس سے کافی زیادہ دیر میں پہنچے ہوں۔ اور اس لئے ہمارے نزدیک قرین قیاس علامہ طبری کا بیان ہے جنہوں نے تحریر فرمایا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بیرون مدینہ فروکش ہوئے تو آپ کے رفیق سفر ابوبکر اسی دن شام کو مدینہ میں چلے گئے اور انصار میں سے ایک کے یہاں قیام کیا اور رسالت مآبؐ پندرہ دن تک وہیں شہر کے باہر مقیم رہے۔شاید کچھ اہل مدینہ کے اصرار سے جناب ابوبکر نے حضرتؐ کے پاس آکر کہا کہ اب آپ شہر مدینہ میں کیوں داخل نہیں

ہوتے؟ لوگ آپ کے وہاں تشریف لے جانے کے بہت مشتاق ہیں حضرتؑ نے فرمایا کہ جب تک میرا بھائی علیؑ نہ آجائے میں اس جگہ سے آگے نہیں بڑھوں گا۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر نے مایوسی کے انداز میں کہا کہ مجھے تو نہیں امید کہ علیؑ آئیں۔ حضرتؑ نے فرمایا' کیوں نہیں وہ انشاء اللہ بہت جلد آئیں گے۔ چنانچہ پانچ دن آپ وہاں اور رہے اور اس دوران میں حضرت علیؑ خواتین کو ساتھ لئے ہوئے آپ کے پاس پہنچے۔ (اعلام الوریٰ)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ کے پہنچنے کے بعد پھر رسولؐ نے قبا میں زیادہ قیام نہیں فرمایا اور اس طرح یہ بات کہ حضرت علیؑ رسولؐ کے پہنچنے سے تین دن کے بعد پہنچ گئے تھے غلط ہے۔ یا پھر جیسا کہ طبری کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے خود رسولؐ کا قیام قبا میں چار پانچ دن سے زیادہ نہیں رہا۔ چنانچہ لکھا ہے۔

فاقام رسول اللّٰه بقباء فی بنی عمرو بن عوف یوم الاثنین و یوم الثلاثاء و یوم الاربعاء و یوم الخمیس ثم اخرجه اللّٰه عز و جل من بین اظهر هم یوم الجمعة

حضرتؑ کا قیام وہاں دو شنبہ سہ شنبہ' چہار شنبہ اور پنج شنبہ کو رہا۔ اور بس جمعہ کو آپ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

آخر میں لکھا ہے کہ وہ زیادہ دن کے قیام کی روایت بنی عمرو بن عوف کے ذریعے سے پھیلی ہے۔ شاید اس لئے کہ ان کے فخر و شرف میں اضافہ ہو۔ طبری کے الفاظ یہ ہیں کہ۔

و بنو عمرو بن عوف یزعمون انه مکث فیهم اکثر من ذلک-- و یقول بعضهم ان مقامه بقباء کام بضعة عشر یوما

(تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۴۹)

اس میں دس دن یا اس سے زیادہ قیام کو بنی عمرو بن عوف کی طرف "زعم" کے لفظ سے منسوب کیا ہے جس کے معنی عموماً "ادعائے باطل" کے ہوتے ہیں"۔

مصالحتی مہم کا آغاز

یثرب کے باشندوں میں دو بڑے قبیلے تھے۔ اوس اور خزرج۔ ان میں باہم جنگ رہتی تھی۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مدینہ میں تشریف لا کر قیام کا ایک بڑا خوشگوار نتیجہ یہ سامنے آیا کہ یہ دونوں قبیلے آپس میں گلے مل گئے۔ (اس فیض رسالت کا تذکرہ بطور احسان خداوندی قرآن مجید میں آیا ہے کہ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخوانا (یعنی) تم لوگ ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس کے فضل و کرم سے بھائی بھائی ہو گئے۔ اس مہم کا آغاز ان ہی چند دنوں میں ہو گیا جب رسولؐ بیرون مدینہ قیام پذیر تھے علامہ طبری لکھتے ہیں کہ آپ کا قیام بنی عمرو بن عوف کے ایک نیک مرد پیر کلثوم بن ہدم کے مکان پر تھا۔ جو نابینا ہو چکے تھے۔ اور قبیلہ اوس کے افراد آپ کے گرد و پیش آکر بیٹھا کرتے تھے۔ پیغمبر خداؐ آنے والوں کے چہروں کو غور سے ملاحظہ فرماتے تھے تو ان میں خزرج کا کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ حالانکہ ان وفود میں جو مدینہ سے آپ کے پاس مکہ گئے تھے خزرج کے ممتاز افراد بھی تھے۔ حضرتؐ اس کو محسوس فرما رہے تھے مگر کچھ فرماتے نہ تھے۔ جب چند دن آپ کے قیام کو وہاں گزر گئے تو ایک دن نماز عشاء کے بعد اسعد بن زرارہ چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے آئے اور پیغمبرؐ کو سلام کیا۔ حضرتؐ ان کے آنے سے بہت خوش ہوئے۔ اور شاید سبب تاخیر پوچھا' انہوں نے کہا یا رسول اللہ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ میں آپ کی موجودگی کو اس قرب و جوار میں کسی جگہ سنوں اور بیٹھا رہوں مگر ہم میں اور ہمارے اوسی بھائیوں میں جو نزاع ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ اس لئے ان میں سے کسی کے گھر پر آنا میں پسند نہ کرتا تھا' مگر اس وقت مجھے تاب صبر باقی نہ رہی اور بیتابانہ آپ کی زیارت کے لئے حاضر ہو گیا۔ قبیلہ خزرج کے ایک نمایاں شخص کی اس پیش قدمی سے آپ کو موقع مل گیا کہ آپ آئندہ کی صلح کے لئے زمین ہموار فرمائیں۔ آپ نے اوس والوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم میں سے کون ہے جو انہیں پناہ دے۔ مطلب یہ تھا کہ ان کی جان و مال کی حفاظت کا جب کہ یہ تمہارے درمیان آئے

ہیں کون ذمہ دار ہوتا ہے؟ اوس کے تمام آدمی جو حاضر تھے چیخ اٹھے کہ حضورؐ کا پناہ دینا ہمارا پناہ دینا ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں' صاف صاف تم میں سے کوئی ایک ذمہ دار ہو۔ یہ سن کر عویم بن ساعدہ اور سعد بن خثیمہ نے کہا کہ رسول اللہ ہم انہیں پناہ دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ان کی حفاظت کے ذمہ دار ہوئے۔ اور اب وہ وقتاً" فوقتاً" رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے اور آپؐ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ اور قبیلہ اوس میں سے کسی جوان یا بچے کی بھی یہ ہمت نہ تھی کہ وہ اشارہ و کنایہ سے بھی انہیں کوئی تکلیف پہنچائے۔ ممکن ہے کہ اب اسعد کی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگ بھی خزرج کے آنے لگے ہوں مگر تاریخ میں ان کا ذکر نہیں ہے پھر بھی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ پہلا ہی قدم ان کے درمیان مصالحتی مہم کا جو حضرت نے کامیابی کے ساتھ اٹھایا ان میں تعلقات محبت کی بحالی اور آئندہ کی مستقل مصالحت کا سنگ بنیاد بن گیا۔

مسجد قبا

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیرون مدینہ جس محلہ میں حضرت کا قیام ہوا تھا اور جہاں بنی عمرو بن عوف کے مکانات تھے' اسی محلہ میں مسجد قبا کی تعمیر ہوئی ہے۔ مگر یہ مسجد کب تعمیر ہوئی؟ محدث دہلوی شاہ عبدالحق نے یہ محتاط الفاظ صرف کیے ہیں کہ

"اول وصول و نزول آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم در منازل بنی عمرو بن عوف بود کہ مسجد قبا در آنجابنا یافتہ است"۔ (مدارج النبوۃ)

"آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ورود و قیام پہلے بنی عمرو بن عوف کے محلہ میں ہوا جہاں مسجد قبا تعمیر کی گئی۔"

لیکن علامہ طبری کے الفاظ یہ ہیں۔

فوا فی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم و قصد مسجد قبا و نزل و اجتمع الیہ بنو عمرو بن عوف و سروابہ و استبشروا واجتمعو حوله

و نزل علی کلثوم بن الهدم (اعلام الوریٰ)

رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پہنچے اور آپؐ نے مسجد قبا کا رخ کیا اور وہاں اتر پڑے اور بنی عمرو بن عوف آپ کے پاس جمع ہو گئے اور وہ بہت خوش ہوئے اور آپ کے گرد حلقہ کر لیا اور آپ نے کلثوم بن ہدم کے یہاں قیام فرمایا۔

ان الفاظ کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ مسجد قبا پہلے سے موجود تھی اور مدینہ کے باہر ورود کے وقت آپ اپنی سواری سے سب سے پہلے وہیں اترے۔ پھر کلثوم بن ہدم کے یہاں جا کر قیام فرمایا۔ مگر مورخ کبیر کی تصریح یہ ہے کہ رسول خداؐ نے قبا میں دو شنبہ' سہ شنبہ' چہار شنبہ اور روز پنجشنبہ قیام فرمایا۔ و اسس مسجد هم "اور ان کی مسجد کی بنیاد رکھی" پھر روز جمعہ آپ وہاں سے روانہ ہوئے۔ (تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۴۹)۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ یہی عظیم مورخ آگے چل کر مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد رقم طراز ہے۔

و فی هذه السنة بنی مسجد قبا اسی سال مسجد قبا بنائی گئی۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۵۶)

ہو سکتا ہے کہ ان دونوں باتوں کا مطلب یہ ہو کہ نیو ان چند دنوں میں ڈال دی گئی تھی اور تعمیر مسجد کی اس کے بعد دوران سال میں ہوئی۔ ورنہ میں اسے "خطائے بزرگاں" کا ایک نمونہ بس سمجھ سکتا ہوں اور کیا کہا جائے۔

مدینہ کے اندر داخلہ

قبا کے چند روزہ قیام کے بعد جس پر پہلے روشنی ڈالی جا چکی ہے' جمعہ کا دن تھا' صبح کو جب دھوپ چڑھ گئی تھی تو حضرتؐ نے اپنی سواری منگوائی اور تمام مسلمان جمع ہوئے۔ اور مسلح ہو گئے۔ پھر رسولؐ ناقے پر سوار ہوئے اور لوگ دائیں بائیں آپ کے روانہ ہوئے۔ مدینہ کے رہنے والوں کو بھی اس کا علم ہو گیا۔ لوگ اپنے گھروں کے باہر نکل آئے اور انصار کے قبیلوں اور خاندانوں میں سے جن کے مکانات کی طرف سے آپؐ کا گزر ہوتا تھا' وہ آگے بڑھ کے درخواست کرتے تھے کہ حضورؐ ہمارے یہاں قیام فرمائیں۔ مجسم خلق عظیم کو کسی کی خاطر شکنی گوارا نہ

تھی- ہر ایک کو دعائے خیر دیتے تھے اور فرماتے تھے' چھوڑ دو اسے' قدرت کی جانب سے جہاں حکم ہوگا وہیں یہ مجھے پہنچا دے گا- یہ سن کر ہر ایک خاموش ہو جاتا تھا اور ناقہ آگے بڑھ جاتا تھا-

مدینہ میں پہلی نماز جمعہ اور رسولؐ کا پہلا خطبہ

اثنائے راہ میں جب زوال آفتاب کا وقت آیا تو حضرت اس وقت قبیلہ بنی سالم کے درمیان تھے- مثل راستے کے تمام لوگوں کے' انہوں نے بھی حضرت کے سامنے قیام کی پیشکش کی' جس پر حضرتؐ خاموش رہے- مگر آپ کا ناقہ ان کی مسجد کے پاس بیٹھ گیا- علامہ طبری نے صراحتاً" لکھا ہے-

و قد کانوا بنوا مسجد اقبل قدوم رسول اللّٰہ

یہ لوگ رسولؐ کے آنے سے پہلے ایک مسجد کی داغ بیل ڈال چکے تھے-

ناقے کا اس مسجد کے پاس بیٹھنا قدرت کی طرف سے اشارہ تھا کہ نماز جمعہ آج یہیں ہو گی- چنانچہ حضرت نے ظہر کے وقت نماز وہیں ادا فرمائی-

(اعلام الوئی)

علامہ طبری کا بیان ان سے اس جز میں مختلف ہے - وہ کہتے ہیں کہ مسجد وہاں پہلے موجود نہ تھی- بلکہ اس کے بعد وہاں پر مسجد کی تعمیر ہوئی-

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۵۲)

مسٹر کے اے حمید لکھتے ہیں کہ ۱۲ ربیع الاول سن ۱ ہجری کو رسول خدا نے ایک سو مسلمانوں کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا کی اور وہ خطبہ جو اس موقع پر پڑھا' دنیا کی تاریخ میں ایک نمایاں خصوصیت رکھتا ہے- (مسلمانان عالم صفحہ ۷) مگر اتنی اہم تقریر موصوف نے کاٹ چھانٹ کر کل جمع آٹھ سطروں میں درج کی ہے ہم اس مکمل تقریر کو جو کافی بسیط ہے حافظ ابن جریر کی روایت کے مطابق درج کرتے ہیں-

الحمد للّٰہ احمدہ و استعینہ واستغفرہ و استھدیہ واومن بہ ولا اکفرہ واعادی من یکفرہ و اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ وان محمدا

عبده و رسوله ارسله بالهدیٰ والنور والموعظة علیٰ فترة من الرسل و قلة من العلم و ضلالة من الناس و انقطاع من الزمان و دنو من الساعة و قرب من الاجل من یطع اللّٰه و رسوله فقد رشد و من یعصهما فقد غویٰ و فرط و ضل ضلالاً بعیدا واوصیکم بتقوی اللّٰه فانه خیر ما اوصیٰ به المسلم المسلم ان یحضه علی الاخرة وان یامره بتقوی اللّٰه فاحذروا ما حذرکم اللّٰه من نفسه و لا افضل من ذلک نصیحة ولا افضل من ذالک ذکراً اوان تقوی اللّٰه لمن عمل به علیٰ و جل و مخافة من ربه عون صدق علیٰ ما تبغون من امرالاخرة و من یصلح الذی بینه و بین اللّٰه من امره فی السر والعلانیة لا ینوی بذالک الا وجه اللّٰه یکن له ذکراً فی عاجل امره و ذخراً فیما بعد الموت حین یفتقر المرء الی ما قدم وما کان معه سویٰ ذلک یود لو ان بینه و بینه امدا بعیدا و یحذرکم اللّٰه نفسه واللّٰه رؤف بالعباد و الذی صدق قوله و نجز وعده ولا خلف لذلک فانه یقول عز و جل ما یبدل القول لدی و ما انا بظلام للعبید فاتقوا اللّٰه فی عاجل امرکم واجله فی السر و العلانیة فانه من یتق اللّٰه یکفر عنه سیئاته و یعظم له اجرا و من یتق اللّٰه فقد فاز فوزاً عظیماً و ان تقوی اللّٰه یوقی مقته و یوقی عقوبته و یوقی سخطه و ان تقوی اللّٰه یبیض الوجوه و یرضی الرب و یرفع الدرجة خذوا بحظکم ولا تفرطوا فی جنب اللّٰه قد علمکم اللّٰه کتابه و نهج لکم سبیله لیعلم الذین صدقوا و یعلم الکاذبین فاحسنوا کما احسن اللّٰه الیکم وعاد وا اعداء ہ و جاهدوا فی اللّٰه حق جهاده هو اجتباکم و سماکم المسلمین لیهلک من هلک عن بینة و یحییٰ من حی عن بینة ولا قوة الا باللّٰه فاکثروا ذکر اللّٰه واعملوا لما بعد الیوم فانه من یصلح ما بینه و بین اللّٰه یکفه اللّٰه ما بینه و بین الناس ذالک بان اللّٰه یقضی علی الناس ولا یقضون علیه و یملک من الناس ولا یملکون منه اللّٰه اکبر ولا قوة الا

باللہ العظیم

تاریخ الامم والمملوک لابی جعفر محمد بن جریر الطبری جلد ۲ صفحہ ۲۵۵، ۲۵۶

سب تعریف اللہ کے لئے ہے میں اس کی تعریف کرتا ہوں اور اس سے مدد مانگتا ہوں اور اس سے بخشش کا طلبگار ہوں اور اس سے ہدایت کا خواہاں ہوں اور اس پر ایمان لاتا ہوں اور اس کا انکار نہیں کرتا اور دشمن ہوں اس کا جو اس کا انکار کرے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی خدا نہیں سوائے اللہ کے، کوئی اس کا شریک نہیں اور یہ کہ محمدؐ اس کا بندہ اور اس کا رسول ہے جسے اس نے بھیجا ہے ہدایت اور نور اور وعظ و نصیحت کے ساتھ ایسے وقت میں جب رسولوں کا سلسلہ موقوف تھا اور علم کی کمی تھی اور لوگوں میں گمراہی پھیلی ہوئی تھی اور زمانہ دور ہو گیا تھا اور قیامت قریب تھی اور موت نزدیک؛ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے وہ راہ راست پر ہے اور جو ان دونوں کی نافرمانی کرے وہ گمراہ ہوا اور وہ تقصیر وار اور بھٹکا ہوا ہے بہت زیادہ، اور میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں اللہ کے غضب سے بچنے کی کہ بہترین وہ شے جس کی نصیحت کرے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو یہ ہے کہ وہ اسے آخرت کی تیاری پر آمادہ کرے اور اللہ سے ڈرنے کی ہدایت اور ڈرو اللہ سے جتنا اس نے اپنے سے ڈرایا ہے اور اس سے بڑھ کے کوئی نصیحت نہیں ہے اور نہ اس سے بہتر کوئی یاد ہے اور یقیناً اللہ سے پرہیزگاری اس کے لئے جو اس کے مطابق عمل کرے خوف و دہشت کے ساتھ اپنے پروردگار کی عظمت سے بہترین مددگار ہے اس منزل مقصود پر جو کہ آخرت ہے اور جو ان روابط کو جو ظاہر و باطن میں اس کے اور اللہ کے درمیان ہیں دوست رکھے اور سوائے رضائے الٰہی کے کوئی اور مقصد نہ ہو تو وہ اس کے لئے دنیا میں نیک نامی اور بعد مرگ کے لئے ذخیرہ ہو گا۔ جب انسان محتاج ہوگا، اپنے پہلے کئے ہوئے اعمال کا اور سوا اس کے کچھ اس کے ساتھ نہ ہوگا۔ وہ آرزو رکھے گا کہ کاش اس کے اور اس موقع کے درمیان بہت بڑا فاصلہ ہوتا اور اللہ تمہیں اپنے سے ڈراتا ہے اور اللہ بندوں پر شفیق و مہربان ہے اور اس نے اپنی بات کو سچ کر دکھایا اور اپنے وعدے کو پورا کیا

اور اس کے خلاف نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وہ خود فرماتا ہے کہ میرے یہاں بات بدلتی نہیں اور میں بندوں پر ظلم کرنے ولا نہیں ہوں تو اللہ سے ڈر' اپنی دنیا اور آخرت دونوں میں اور ظاہر و باطن میں اس لئے کہ جو اللہ سے ڈرتا ہے تو وہ اس کی غلطیوں کو نظرانداز کرتا اور اس کے اجر و ثواب کو بڑھاتا ہے اور جو اللہ سے ڈرتا ہے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ اور یقیناً اللہ سے ڈرنا اس کی ناراضگی سے بچاتا ہے اور اس کی سزا سے بچاتا ہے اور اس کے غضب سے بچاتا ہے اور یقیناً اللہ سے ڈر چہروں کو نورانی بناتا اور پروردگار کو راضی کرتا اور درجے بلند کرتا ہے۔ اپنا حصہ حاصل کرو اور اللہ کے بارے میں کوتاہی سے کام نہ لو حالانکہ اللہ نے تم کو اپنی کتاب کا علم دیا ہے اور تمہارے لئے اپنا راستہ صاف نمایاں کر دیا ہے تاکہ وہ جانے انہیں جو سچے ہیں اور جانے انہیں جو جھوٹے ہیں۔ تو حسن سلوک سے کام لو جس طرح اللہ نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک کیا ہے اور اس کے دشمنوں کو دشمن رکھو اور اللہ کی راہ میں جہاد کا حق ادا کرو اس نے تمہیں منتخب کیا اور تمہارا نام "مسلم" رکھا تاکہ جو ہلاک ہو' وہ حجت تمام ہونے کے بعد ہلاک ہو اور جو زندگی پائے وہ کسی حجت کی بنا پر زندگی پائے اور قوت نہیں ہے مگر اللہ کے سہارے سے تو اللہ کو بہت یاد کرو اور آج کے بعد والے دن کے واسطے کام کرو کہ جو شخص اس معاملہ کو جو اس کے اور اللہ کے درمیان ہے ٹھیک رکھے گا تو اللہ اس کے اور دوسرے لوگوں کے درمیان والے معاملے کو خود ہی ٹھیک کر دے گا اس لئے کہ اللہ لوگوں پر فیصلہ نافذ کرنے والا ہے اور وہ اس پر فیصلہ نافذ نہیں کر سکتے اور وہ لوگوں کا مالک ہے' وہ اس کے مالک نہیں ہیں اللہ سب سے بڑا ہے اور نہیں قوت مگر اللہ کے سہارے جو بزرگ ہے۔

ابو ایوب انصاری کے یہاں قیام

نماز اور خطبہ کے بعد پھر حضرت ناقے پر سوار ہوئے۔ ناقہ روانہ ہوا اور پھر راستے کے لوگوں کی طرف سے جب قیام پر اصرار ہوا تو آپ نے فرما دیا کہ بس اسی ناقے پر چھوڑو! جہاں جا کر رک جائے گا وہیں میں اتر پڑوں گا۔ چنانچہ وہ چلا اور

آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ وہ اس جگہ پہنچا جہاں مسجد نبوی ہے اور یہاں پہنچ کر وہ اک دم بیٹھ گیا۔ خوش نصیبی سے یہ جگہ ابو ایوب انصاری کے مکان کے قریب تھی وہ خوش خوش آئے اور آپ کا سامان اٹھا کر اپنے مکان کے اندر لے گئے پھر آس پاس کے دوسرے آدمیوں نے آکر اصرار شروع کیا۔ حضرت نے بطور ضرب المثل کے یہ جملہ فرمایا کہ المرء مع رحلہ یعنی جہاں آدمی کا سامان وہیں وہ آدمی۔ (طبقات ابن سعد جلد ا صفحہ ۱۶۰)

علامہ طبرسی لکھتے ہیں۔

یہ مسجد نبوی کی جگہ جہاں اب کی ناقہ آکر بیٹھا تھا قبیلہ خزرج کے دو یتیموں کی زمین تھی جن کے نام سہل و سہیل تھے اور یہ دونوں یتیم اسعد بن زرارہ کی پرورش میں تھے۔ یہ جگہ ابو ایوب کے دروازے پر تھی اور ابو ایوب کی والدہ آپ کا سامان اونٹ پر سے اتار کر اپنے گھر میں لے گئیں تو جب لوگوں نے حضرت سے اصرار کیا کہ ہمارے یہاں چلئے تو آپ نے اپنا سامان دیکھا اور وہ موجود نہ ملا تو دریافت کیا تب حضرت کو بتایا گیا کہ وہ تو ابو ایوب کی والدہ اپنے مکان میں لے گئیں۔ اس پر حضرت نے فرمایا المرء مع رحلہ اور اسعد بن زرارہ حضرت کے خالی ناقہ کی مہار تھام کر اپنے مکان پر لے گئے۔

(اعلام الوریٰ)

ہجرت کی تاریخی اہمیت

جیسا کہ فاضل ہمعصر حبیب ریحان ندوی مقیم مصر نے لکھا ہے۔ صدر اول کے مسلمانوں کی نظر میں واقعہ ہجرت کی تاریخی اہمیت کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اسلامی سال کا حساب ہجرت نبوی سے ہی کیا گیا ہے کہا جاتا ہے خلیفہ دوم حضرت عمر کی خلافت کو تقریباً" چار سال گزر چکے تھے۔ یعنی ہجرت کا سولھواں سال تھا۔ جب یہ سال ہجری مقرر کیا گیا۔ اس واقعہ کی ابتدا مقریزی جلد اول میں اس طرح درج ہے کہ حضرت عمر کے سامنے ایک چک پیش ہوا جس پر صرف شعبان لکھا ہوا تھا۔ حضرت عمر نے کہا کہ یہ کس طرح معلوم ہو کہ یہ کس سال کا ماہ شعبان ہے اس کے لئے فوراً مجلس شوریٰ مرتب کی گئی اور اکابر صحابہ کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ نے رائے دی کہ ہجرت نبوی سے سن شروع کیا جانا چاہئے۔ اس پر سب کا اتفاق ہو گیا۔

(سہ روزہ "دعوت" دہلی، سیرت طیبہ نمبر ۱۲ ستمبر ۱۹۵۹ء صفحہ ۲۱۵، ۲۱۶)

چونکہ عرب میں نیا سال محرم سے شروع ہوتا ہے اور ہجرت ربیع الاول میں ہوئی تھی اس لئے سال کو تقریباً" دو ماہ پیچھے ہٹا کر اس کی ابتداء محرم ہی سے رکھی گئی۔

شہرت عام اسی کے مطابق ہے کہ ہجرت سے تاریخ کے حساب کا آغاز عہد

خلیفہ دوم میں ہوا ہے مگر حافظ ابن جریر نے بطور اپنے مختار کے یہ روایت درج کی ہے کہ یہ ہجرت سے تاریخ کا تعین ہجرت کے بعد ہی سے بحکم رسول خدا شروع ہوا' چنانچہ انہوں نے پہلے سرخی قائم کی ہے۔ "ذکرا لوقت الذی عمل فیه التاریخ" اس وقت کا ذکر جس میں تاریخ کا تعین عمل میں آیا ہے۔ اس کے تحت میں لکھا ہے۔

قال ابوجعفر و لما قدم رسول اللهؐ المدینة امر بالتاریخ حدثنی ذکریا بن یحییٰ بن ابی زائده' قال حدثنا ابوعاصم عن ابن جریح عن ابی سلمة عن ابن شهاب ان النبیؐ لما قدم المدینة و قد مها فی شهر ربیع الاول امر بالتاریخ قال ابوجعفر فذکر انهم کانوا یورخون بالشهر بالشهرین الیٰ ان تمت السنة

"ابو جعفر (طبری) کہتے ہیں اور جب رسول خداؐ مدینہ میں تشریف لائے تو آپ نے تاریخ کے تقرر کا حکم دیا' مجھ سے بیان کیا ذکریا بن یحییٰ بن ابی زائدہ نے کہا کہ ہم سے بیان کیا ابو عاصم نے ابن جریح سے انہوں نے ابو سلمہ سے' انہوں نے ابن شہاب سے کہ رسولؐ جب مدینہ میں تشریف لائے اور آپ وہاں ماہ ربیع الاول میں آئے تھے تو آپ نے تاریخ مقرر کرنے کا حکم دیا' تو بیان کیا گیا کہ صحابہ ایک مہینہ اور دو مہینہ کے حساب سے تاریخ لکھنے لگے' یہاں تک کہ سال پورا ہوا۔"

اس کے بعد انہوں نے خلیفہ دوم کے دور میں آغاز تاریخ کو بطور قول ضعیف یوں درج کیا ہے۔

و قد قیل ان اول من امر بالتاریخ فی الاسلام عمر بن الخطاب

"ایک قول یہ ہے کہ سب سے پہلے جس نے تاریخ کے تعین کا حکم دیا اسلام میں وہ عمر بن خطاب ہیں"۔

درایت" پہلے قول کو اس لئے ترجیح معلوم ہوتی ہے کہ یہ بہت بعید ہے کہ روز مرہ کی اتنی اہم ضرورت کا احساس رسولؐ اور تمام مسلمانوں کو اور خلیفہ اول اور بلکہ بہت عرصہ تک خلیفہ دوم کو بھی نہ ہوا ہو اور اتنی مدت گزرنے کے بعد

ایک دم اس ضرورت کا احساس پیدا ہوا ہو۔

مسجد نبوی کی تعمیر

پہلے ایک روایت کے مطابق لکھا ہے کہ ابو ایوب انصاری کے مکان کے پاس یہ احاطہ جس میں مسجد نبوی ہے قبیلہ خزرج کے دو یتیموں کی ملکیت میں تھی جو اسعد بن زرراہ کی زیرِ پرورش تھے۔ خود اسعد کا تذکرہ پہلے آچکا ہے کہ یہ ان سابق الایمان افراد میں تھے جو رسولؐ کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے ہی شمع ایمان کے پروانہ ہو چکے تھے۔ اس لئے پیغمبرؐ نے ابو ایوب کے مکان میں قیام کے بعد نماز جماعت کا سلسلہ اسی احاطہ میں جاری رکھا۔ کچھ دن کے بعد حضرت نے چاہا وہاں باقاعدہ مسجد کی تعمیر ہو جائے۔ آپ نے اسعد بن زرارہ سے فرمایا کہ تم یہ زمین میرے لئے اس کے مالکوں سے خرید دو۔ انہوں نے یتیموں سے گفتگو کے بعد کہا کہ وہ حضورؐ کی خدمت میں نذر کی جاتی ہے قیمت کی ضروری نہیں۔ مگر حضرتؐ نے اسے بلا معاوضہ لینے سے انکار کیا۔ چنانچہ دس دینار کی قیمت پر آپ نے زمین خرید فرمائی۔

(اعلام الوریٰ)

طبری کا بیان ہے کہ وہ دونوں یتیم معاذ بن عفراء کے سایہ تربیت میں تھے اور معاذ بن عفراء ہی کے ذریعہ سے وہ زمین حاصل ہوئی۔ پھر اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک زیادہ صحیح روایت یہ ہے کہ یہ زمین بنی نجار کی تھی اور یہاں کچھ کھجور کے درخت اور کھیت اور کچھ زمانہ جاہلیت کے قبور تھے۔ حضرتؐ نے ان سے فرمایا کہ مجھ سے اس زمین کی قیمت لے لو۔ انہوں نے کہا، ہم سوائے رضائے پروردگار کے کوئی قیمت نہیں چاہتے۔ حضرتؐ نے اس پیشکش کو قبول فرما لیا۔ درخت کٹوا دیئے، کھیت ختم کرادیئے اور قبروں کو اکھڑوا کر صاف کر دیا اور پھر یہاں مسجد تعمیر فرمائی۔ اس کے پہلے آپ کسی معین جگہ پر نماز نہیں پڑھتے تھے بلکہ مختلف مقامات پر جہاں نماز کا وقت آگیا وہاں نماز پڑھ لیتے تھے۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۵۶)

مسٹر کے اے حمید لکھتے ہیں کہ سب سے پہلا کام جو سرکارؐ نے مدینہ پہنچ کر کیا وہ مسجد نبوی کی تعمیر تھی۔ دیواریں کچی اینٹوں سے تین گز اونچی بنائی گئیں۔ نو فٹ پھر چھت ڈال دی گئی۔ کھجور کے تنے سے شہتیر کا کام لیا گیا اور اس طور پر مسجد کی تکمیل کی گئی۔

(مسلمانان عالم جلد ۱ صفحہ ۴۹)

علامہ طبری نے تعمیر کی کیفیت ذرا تفصیل سے لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مکانات میں خانہ خدا یعنی کعبہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کے معمار اور مزدور خلیل خدا حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند اسماعیلؑ تھے تو مسجد نبوی کا یہ شرف بے مثال ہے کہ اس کی تعمیر میں فخر خلیل افضل المرسلین حبیب رب العالمین یعنی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنفس نفیس دوسرے مسلمانوں کے ساتھ معمار اور مزدور دونوں کی حیثیت سے کام کیا ہے۔ اور شروع سے لے کر آخر تک تعمیر کی جتنی منزلیں تھیں، سب میں آپ خود بنفس نفیس شریک رہے۔ حافظ ابن جریر کی تصریح بھی ہے کہ۔

تولی بناء مسجده صلی الله علیه وسلم هو بنفسه و اصحابه من المهاجرین والانصار۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۵۶)

اپنی مسجد کی تعمیر کا کام آپ نے خود کیا۔ اور آپ کے ساتھ اور آپ کے اصحاب نے مہاجرین اور انصار میں سے۔

علامہ طبری لکھتے ہیں کہ سب سے پہلا کام زمین کا خشک کرنا تھا اس لئے کہ اس احاطہ کے اندر ایک کثیر پانی کا ذخیرہ بھی تھا۔ بغیر اس پانی کے اُلچے ہوئے اور اس گڑھے کو پاٹے ہوئے کوئی عمارت بن نہیں سکتی تھی چنانچہ آپ نے اس کام کی تکمیل کرائی۔ پھر اینٹیں تیار کی گئیں اور نیو کھود کر اسے اینٹوں سے بھرا گیا۔ پھر قریب کی پہاڑی سے جو حرا کہلاتی تھی پتھر لائے گئے اور کئی دن تمام مسلمان پتھر منتقل کرتے رہے۔ چنانچہ خود پیغمبرؐ کو بھی دیکھا گیا کہ آپ ایک بڑا پتھر اپنی پشت پر

رکھے ہوئے لا رہے ہیں۔ تو اسید بن حضیر نے بڑھ کر عرض کیا کہ مجھے یہ پتھر دے دیجئے میں آپ کی طرف سے اسے پہنچا دوں۔ آپ نے فرمایا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تن آسانی پسند کروں، کوئی دوسرا میری طرف سے مشقت اٹھائے۔ چنانچہ کئی ردے پتھروں کے چاروں طرف رکھنے کے بعد پھر اینٹوں کی چنائی شروع ہوئی اور ایک قد آدم تک دیوار اونچی کی گئی پوری وسعت اس عمارت کی سو ہاتھ مربع تھی۔ شروع میں چھت نہیں بنائی گئی تھی۔ کچھ عرصہ تک یونہی رہنے کے بعد جب دھوپ سے تکلیف محسوس کی گئی۔ تو لوگوں نے حضرت سے استدعا کی کہ کوئی سایہ بھی یہاں ہو جائے۔ تب آپ نے مسجد کے آگے کے حصہ میں صحن سے متصل لکڑی کے کھمبے قائم کر کے کھجور کی چھال سے جھانپوں کا کام لے کر ایک چھپر سا بنا دیا۔ پھر تھوڑے دن میں جب لوگوں نے کہا کہ باقاعدہ چھت بنوا دیجئے تو آپ نے انکار فرمایا اور یہ تاریخی جملہ ارشاد کیا کہ "لا عریش کعریش موسیٰ" نہیں، میں چاہتا ہوں کہ حضرت موسیٰؑ والے چھپر کی طرح چھپر ہی رہے"۔

(اعلام الوریٰ)

ہمدردوں کی وفات

ابو جعفر طبری کی تصریح ہے کہ مدینہ میں آکر سب سے پہلے جس مسلمان کی وفات ہوئی وہ آپ کو بیرون مدینہ اپنے مکان میں فروکش کرنے والے کلثوم بن ہدم تھے۔ اور پھر دوسرے آپ کی ہجرت کے لئے زمین ہموار کرنے والے ابو امامہ اسعد بن زرارہ تھے اور آج چودہ سو برس کے بعد بھی کچھ کوتاہ نظر دعوے داران اسلام و ایمان کی جو ذہنیت ہے کہ اگر بقضائے الٰہی کوئی دنیا سے اٹھ جائے تو وہ اس حادثہ کو کسی گزشتہ واقعہ سے مرتبط کر کے ایک طرح کی نحوست کا تصور کر لیتے ہیں۔ اسے پیغمبر خداؐ نے یہودی اور منافق جماعتوں کی طرف نسبت دے کر اس کی غلطی نمایاں فرمائی، کہ دیکھو یہودی اور منافق تو یہ کہیں گے کہ اگر یہ نبی ہوتے تو ان کا ساتھ دینے والے جلدی سے مر نہ جاتے مگر وہ کہا کریں یہ قضائے الٰہی کے کرشمے ہیں جنہیں کوئی روک نہیں سکتا۔ (طبری جلد ۲ صفحہ ۲۵۶، ۲۵۷)

بنی نجار کا فخر

مورخ طبری رقم طراز ہیں کہ ابو امامہ اسعد بن زرارہ کی وفات کے بعد بنی نجار جمع ہو کر پیغمبر خداؐ کے پاس آئے اور کہا کہ ابو امامہ ہمارے نقیب (لیڈر) تھے' اب آپ ہم میں سے کسی کو منتخب کر دیجئے جو ان کی جگہ پر ہماری قیادت کرے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ تم میں تو میری ننھیال ہے اور اس لئے میں بھی تم ہی میں سے ہوں' تو مجھ ہی کو اپنا نقیب سمجھ لو۔ وہ سب بڑے خوش واپس گئے اور ان کے لئے ایک بڑا فخر ہو گیا کہ رسول خداؐ ان کے نقیب ہیں۔

(تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۱۵۰)

یاد رکھنا چاہئے کہ با اصول فرد یا قوم کے چھوٹے چھوٹے واقعات میں بھی ان کے بڑے اصول کارفرما رہتے ہیں۔ دین الہٰی کے زیر سایہ آنے کے بعد بھی' اگر جمہوریت کا حق خود ارادی والا اصول صحیح ہوتا تو خود بنی نجار اپنا نقیب مقرر کر لیتے۔ یا جب رسولؐ کے پاس آکر خواہش کی کہ ہمارے لئے نقیب مقرر کر دیجئے تو حضرت ہی یہ فرماتے کہ آپس میں شوریٰ کرکے کسی کو مقرر کر لو۔ میری کیا ضرورت ہے مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہ اس اصول کا ایک مظاہرہ تھا کہ ایک مسلم جب دین الہٰی کے سامنے سر تسلیم خم کر چکا تو اس کا حق خود ارادی ختم ہو گیا اب اسے اپنے رہنما یا لیڈر کے انتخاب کا حق نہیں ہے بلکہ خدا اور رسولؐ جسے منتخب کر دیں وہی ان کا لیڈر اور سردار ہوگا۔ کیا آغاز میں یہ اصول سامنے آیا تو انجام میں یہ ختم ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ لن تجد لسنة اللّٰه تبديلا ولن تجد لسنة اللّٰه تحويلا

مہاجرین کی بحالی

تقسیم ہند اور تشکیل پاکستان کے بعد سے بحالیات کی اصطلاح ہر شخص کو معلوم ہو گئی ہے اور دوسرے لفظوں میں اسے مہاجرین کی آبادکاری بھی کہتے ہیں۔ موجودہ وسائل و ذرائع کی ترقی کے دور میں یہ قہار سلطنتوں کے لئے ایک پیچیدہ کام

ہوتا ہے۔ یعنی بے گھر لوگ جو بہت سے ایک دم آ گئے ہیں' انہیں کہاں بسایا جائے اور ان کے لئے روزگار کہاں سے آئے۔ مدینہ میں مسلمانان مکہ کے منتقل ہونے کے بعد' جسے ہجرت کہتے ہیں' یہی اہم مسئلہ درپیش تھا مگر یہ مثل کہ اصل میں دل کے اندر جگہ کی ضرورت ہے۔ وہیں اصل ثابت ہوئی۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ انصار کی فراخ حوصلگی سے مہاجرین کے لئے یہ مسئلہ کوئی مسئلہ ہی معلوم نہ ہوا۔ مدینہ کے باشندوں میں سے جن کے پاس فاضل گھر تھے انہوں نے تو اپنے فاضل گھر ان کے لئے خالی کر دیئے اور جن کے پاس ایک ہی گھر تھا انہوں نے بیچ میں پردہ ڈال کر کسی ایک مہاجر کو اپنے یہاں بسا لیا۔ اس طرح مہاجرین میں سے کسی تنفس کو بھی کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوئی۔ پھر جب مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی تو حضرتؐ نے اس کے اطراف و جوانب میں اپنے لئے اور اپنے عزیز و اقارب اور اصحاب کے لئے رفتہ رفتہ مکانات تعمیر فرمائے جس کے بعد مہاجرین اپنے اپنے مکانات میں جا کر مقیم ہوئے۔

اصحاب صفہ

جیسا کہ خواجہ محمد لطیف انصاری نے تحریر فرمایا ہے مسجد کے بالکل قریب حضورؐ نے ایک صفہ (چبوترا) بنایا تھا جس پر گھاس پھونس کی چھت ڈال دی۔اس چبوترے پر نادار و مفلس مسلمان پڑے رہتے تھے اور اہل صفہ یا اصحاب صفہ کہلاتے تھے۔ سرکار رسالتؐ ان کی ضروریات کے کفیل تھے آپ ان کے کھانے اور کپڑے کی خبرگیری فرماتے اور اکثر اوقات ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔

مواخات

اسلام کے وسیع نقطہ نظر سے تو تمام انسان بھائی بھائی ہیں جن میں نقطہ اتحاد خالق کا ایک ہونا ہے مگر چونکہ بھائی کے حقوق کو وہی یاد رکھ سکتا ہے جو باپ کو یاد رکھے اس لئے عملی حیثیت سے اس برادری میں وہی منسلک ہو سکتے ہیں' جو خالق کی وحدت پر ایمان لائیں اور اس لئے قرآن نے یہ اعلان کیا کہ انما المومنون

اخوة یعنی ایمان لانے والے سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پھر حضرت پیغمبر خداؐ نے اس اخوت کے جذبے کو قوی تر بنانے کے لئے اپنے اصحاب میں مواخات قائم کی' یعنی دو شخصوں کو جو مختلف خاندان کے ہوتے تھے' اکثر صفات و عادات کی یکسانی پر نظر کرتے ہوئے ایک دوسرے کا بھائی بنایا۔ یہ مواخات ایک مرتبہ مکہ میں مہاجرین کے درمیان قائم کی گئی تھی اور اس مواخات میں سب کو ایک دوسرے کا بھائی بنانے کے بعد حضرت علی بن ابی طالبؑ کو جب کسی کا بھائی نہیں قرار دیا تھا تو علیؑ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے کہ میں اکیلا رہ گیا' اور پیغمبرؐ نے علیؑ سے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا تھا' کہ تم کو میں نے اپنے لئے چھوڑ دیا۔ تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ مواخات اس نسبی رشتہ کے لحاظ سے نہ تھی جو رسولؐ اور حضرت علیؑ کے درمیان میں تھا بلکہ رسولؐ کے اوصاف و اخلاق کا پرتو علیؑ میں جتنا تھا وہ اور کسی میں نہ تھا۔ اب مدینہ میں آنے کے بعد حضرت پیغمبر خداؐ نے دوبارہ مہاجرین و انصار میں آپس میں مواخات قائم کی اور ایک ایک مہاجر کا بھائی ایک ایک انصاری کو بنایا گیا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ جس طرح پہلی مواخات میں مہاجرین کے درمیان سے خاندانی تفرقہ کا تصور ختم' اور اس کے بجائے اوصاف اور اخلاقی اقدار کی اہمیت کا احساس نمایاں ہو۔ اس طرح اب مدینہ میں ملکی اور غیر ملکی کا امتیاز نظر انداز کر دیا جاوے اور پھر نقطہ مشترک اوصاف و اعمال رکھے جائیں مگر اس مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات میں بھی سب کے لئے اگرچہ یہ خصوصیت ملحوظ رکھی گئی کہ ایک مہاجر ہو اور ایک انصاری' چنانچہ حضرت سلمان کا بھائی ابودردا کو بنایا اور ابوذر کا منذر بن عمیر کو۔ اسی طرح عمار یاسر کے ساتھ حذیفہ یمانی مصعب بن عمیر کے ساتھ ابو ایوب انصاری' زبیر بن عوام کے ساتھ سلامہ بن وقش' ابو عبیدہ جراح کے ساتھ سعد بن معاذ' حضرت عثمان کے ساتھ اوس بن ثابت حضرت عمر کے ساتھ عتبان بن مالک اور حضرت ابوبکر کے ساتھ خارجہ بن زید' مگر اس دفعہ بھی آپ نے اپنے لئے اور حضرت علیؑ کے لئے کسی انصاری کو بھائی ہونے کے لئے منتخب نہیں کیا۔

اس سے ایک بہت بڑی بات یہ ذہن نشین کرانا تھی کہ رسولؐ بحیثیت رسولؐ یا جو ایسے ہی دینی منصب کا حامل ہو' وہ کسی سرزمین سے تعلق خاص نہیں رکھتا اور اس لئے وہ ملکی اور غیر ملکی یا مہاجر اور انصار کی تفریق سے بالا تر ہے یہ بات اس وقت باقی نہ رہتی جب آپ اپنا بھائی انصار میں سے کسی ایک کو قرار دیتے۔

یہودیوں سے معاہدہ

مدینہ میں عرصہ دراز سے کئی قبیلے یہود کے آباد تھے۔ ان میں بنی قریظہ اور بنی نضیر اور بنی قینقاع نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ باقی انہی کے ملازمین و متوسلین ہو ں گے۔ یہ لوگ قدیم آسمانی کتابوں کے مندرجہ اطلاعات کی بنا پر ایک آخری رسولؐ کے آنے کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے۔ مگر اب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جو تشریف لائے تو ان کے پیشوا اور سرگروہ آپ کی ذات سے اپنے اقتدار کی کرسی کو متزلزل دیکھنے لگے۔ اس لئے وہ ایمان لانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کے ساتھ انہیں یہ یقین تھا کہ آپ غلبہ اوراقتدار ضرور حاصل کریں گے لہٰذا شروع میں انہوں نے چاہاکہ اپنے کیش پر قائم رہتے ہوئے آپ کے ساتھ معاہدے ایسے کرلیں جن سے سیاسی طور پر ان کا موقف محفوظ رہے اور ان کے جان ومال کے لئے آئینی طور پر اطمینان حاصل ہو جائے۔

علامہ طبری لکھتے ہیں کہ ان کا وفد رسولؐ کے پاس آیا اور انہوں نے کہاکہ سردست ہم آپ سے معاہدہ کرنا چاہتے ہیں جس کے شرائط یہ ہوں گے کہ ہم کسی جنگ میں نہ آپ کو مدد دیں گے اور نہ آپ کے خلاف کوئی کاروائی کریں گے اور کسی کی آپ کے خلاف امداد بھی نہیں کریں گے اور آپ کے اصحاب میں سے کسی سے کوئی تعرض نہیں کریں گے اور نہ آپ ہم سے اور ہمارے ساتھ کے کسی آدمی سے تعرض کیجئے چنانچہ رسول خداؐ نے انہی شرائط پر ان سے معاہدہ کیا اور آخر میں یہ لکھ دیا گیاکہ اگر انہوں نے اس عہد وپیمان کے خلاف عمل کیا تو پیغمبر خداؐ پھر ان کی جان و مال کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ یہود کے تینوں قبیلوں میں سے ہر ایک کے لئے ایک ایک دستاویز اس مضمون کی لکھی گئی۔ اس موقع پر بنی نضیر کی

نمائندگی حی بن اخطب نے کی اور بنی قریظہ کی کعب بن اسید نے اور بنی قینقاع کی مخزیق نے جو ان میں سب سے زیادہ اموال و باغات کا مالک تھا۔

(اعلام الوریٰ)

مورخین امامیہ میں سے قدیم و مستند عالم علی بن ابراہیم بن ہاشم نے یہی شرائط درج کیے ہیں۔

مسٹر کے اے حمید نے اس دستاویز کے دفعات حسب ذیل لکھے ہیں۔

(۱) یہ معاہدہ محمدؐ اور دیگر اقوام کے درمیان ہے جو مسلمانوں سے کاروبار کرتے ہیں۔

(۲) بنی عوف کے یہودی مسلمانوں میں شمار کیے جائیں گے۔

(۳) جو بیرونی دشمن اس معاہدہ میں شریک ہونے والی قوموں پر حملہ کرے گا تو سب مل کر بیرونی دشمن کی مدافعت کریں گے۔

(۴) اس معاہدہ میں شریک ہونے والی قومیں ایک دوسرے کو فائدہ پہنچاتی رہیں گے۔

(۵) جنگ کے مصارف کا بار سب پر یکساں ہوگا۔

(۶) یہودیوں کی دوست دار قوموں کے حقوق یہودیوں کے برابر شمار کیے جائیں گے۔

(۷) معاہدہ میں شامل ہونے والی قومیں مدینہ میں کبھی کشت و خون نہ کریں گے۔

صحیفہ

بعض ہمعصر اہل قلم نے اپنے ایک مقالہ میں جو "رسول اکرمؐ کی معاہداتی سیاست" کے عنوان سے ہے ایک طویل معاہدہ درج کیا ہے جس کا نام "صحیفہ" ہے اور حق بجانب طور پر لکھا ہے کہ "یہ تاریخ اسلام بلکہ اگر کہا جائے تو تاریخ عالم کا پہلا دستور ہے جو مدینہ میں ہجرت کے فوراً بعد حضور اکرمؐ نے مدینہ کے مختلف قبائل سے ملنے کے بعد نافذ فرمایا" یہ صحیفہ حسب ذیل ہے۔

(۱) خدا کے پیغمبر محمد (صلعم) کا یہ معاہدہ مہاجرین قریش اور اہل یثرب(مدینہ) میں سے جو مذکورہ جماعتوں کے ساتھ متفق ہوں اور ان کے ساتھ جنگ میں شریک رہیں۔

(۲) غیر معاہدین کے مقابلہ میں معاہدین کی ایک علیحدہ جماعت شمار ہوگی۔

(۳) مہاجرین قریش بجائے خود ایک جماعت ہیں وہ حسب سابق اپنے مجرموں کی جانب سے دیت کی ادائیگی کے ذمہ دار ہوں گے اور اپنے قیدیوں کو خود ہی فدیہ دے کر چھڑائیں گے۔ یہ سب کام ایمان وانصاف کے اصول کے تحت ہوں گے۔

(۴) بنی عوف، بنی حارث، بنی ساعدہ، بنی جشم، بنی نجار، بنی عمرو بن نبیت اور بنی اوس اپنی اپنی جماعت کے لئے خود ذمہ دار ہوں گے اور بدستور سابق اپنی اپنی دیت باہم مل کر ادا کریں گے اور اپنے قیدیوں کو خود ہی فدیہ دے کر چھڑانے کے ذمہ دار ہوں گے۔ یہ تمام کام اصول دیانت اور انصاف کے تحت انجام پائیں گے۔

(۵) مسلمانوں میں اگر کوئی مفلس کسی ایسے جرم کا مرتکب ہو جس پر دیت واجب ہے یا کہیں قید ہو جائے اور فدیہ ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ تو دوسرے مسلمانوں پر لازم ہو گا کہ وہ اس شخص کی جانب سے دیت یا فدیہ ادا کرکے اسے چھڑائیں تاکہ مسلمانوں کے باہمی تعلقات میں نیکی اور ہمدردی نمایاں ہو۔

(۶) کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے آزاد کردہ غلام کی مخالفت نہیں کرے گا۔

(۷) مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ ہر ایسے شخص کی علی الاعلان مخالفت کریں جو فتنہ و فساد برپا کرتا ہو۔ اور خلق خدا کو ستاتا ہو یا زبردستی کوئی چیز حاصل کرنا چاہے اور سرکشی اختیار کرے۔ ایسے شخص کو سزا دینے میں تمام مسلمان آپس میں متفق رہیں گے خواہ وہ شخص ان میں سے کسی کا فرزند ہی کیوں نہ ہو۔

(۸) کسی مسلمان کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ کسی مسلمان کو کسی محارب کے بدلے میں قتل کرے یا کسی مسلمان کے مقابلہ میں کسی محارب کو مدد پہنچائے۔

(۹) خدا کا عہد، ذمہ داری اور پناہ ایک ہی ہے، یعنی اگر کسی مسلمان نے کسی کو پناہ دی تو اس کی پابندی تمام مسلمانوں پر لازمی ہوگی۔ خواہ پناہ دینے والا ادنی درجہ کا مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ یہ تمام دوسروں کے مقابلے میں آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

(۱۰) جن یہود نے ہمارے ساتھ معاہدہ کر لیا ہے ان کے متعلق مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان کو مدد دیں اور مواسات کا برتاؤ کریں، ان پر کسی قسم کا ظلم نہ کیا جائے اور نہ ان کے خلاف ان کے دشمن کو مدد دی جائے۔

(۱۱) سب مسلمانوں کی صلح ایک ہی ہو گی۔ جب اللہ کی راہ میں جنگ ہو تو کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو چھوڑ کر دشمن سے اس وقت تک صلح نہیں کرے گا جب تک وہ صلح سارے مسلمانوں کے لئے برابر اور یکساں نہ ہو۔

(۱۲) ان تمام جماعتوں کو جو ہمارے ساتھ جنگ میں حصہ لیں گے' نوبت بہ نوبت آرام کرنے کے لئے موقع دیا جائے گا۔

(۱۳) جو مسلمان جہاد فی سبیل اللہ میں شہید ہو جائیں ان کے پسماندگان کا تکفل تمام مسلمانوں پر واجب ہو گا۔

(۱۴) بلاشبہ تمام متقی اور پرہیزگار مسلمان راہ راست اور سب سے اچھے طریقے پر رہیں۔

(۱۵) کوئی غیر مسلم معاہد قریش کی جان و مال کو کسی طرح کی پناہ نہ دے گا اور نہ کسی غیر مسلم کو کسی مسلمان کے مقابلہ میں مدد پہنچائے گا۔

(۱۶) کوئی شخص اگر کسی مسلمان کو عمداً" قتل کر دے اور ثبوت موجود ہو تو قاتل سے قصاص لیا جائے گا۔ ہاں اگر مقتول کا وارث دیت لینے پر رضا مند ہو جائے تو دیت ادا کر کے گلو خلاصی ہو سکتی ہے۔ تمام مسلمانوں پر بلا استثنا' اس امر کی تعمیل لازمی ہو گی۔ مذکورہ امور کے علاوہ اور کوئی چیز قابل قبول نہ ہو گی۔

(۱۷) کسی مسلمان کے لئے جس نے اس صحیفہ کو تسلیم کر کے اس کی پابندی کا اقرار کر لیا اور وہ خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو' اس کے لئے یہ ہرگز جائز نہ ہو گا کہ وہ کوئی نئی بات پیدا کرے اور نہ یہ جائز ہو گا کہ وہ کسی ایسے شخص سے معاہدہ رکھے جو اس معاہدہ کا احترام نہ کرتا ہو۔ جو شخص اس امر کی خلاف ورزی کرے گا۔ قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہو گا اور اس بارے میں اس کا کوئی عذر اور توبہ قبول نہ کی جائے گی۔

(۱۸) اہل معاہدہ میں جب کسی چیز کے متعلق آپس میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کے فیصلہ کے لئے خدا اور محمدؐ سے رجوع کیا جائے گا۔

(۱۹) اس معاہدہ کے بعد یہود پر لازم ہو گا کہ وہ جنگ کی حالت میں جب کہ مسلمان

کسی دشمن کے ساتھ برسرپیکار ہوں مسلمانوں کو مالی امداد دیں۔

(۲۰) بنی عوف، بنی النجار، بنی الحارث، بنی ساعدہ، بنی جشم، بنی الدوس، بنی ثعلبہ، بنی جفنہ اور بنی الشیطبہ کے یہود جنہوں نے اس معاہدہ میں شرکت کی ہے اور مسلمانوں کے حلیف ہیں، اپنے مذہب کے پابند رہیں گے اور مسلمان اپنے مذہب کے پابند رہیں گے مذہبی باتوں کے علاوہ باقی امور میں مسلمان اور یہود ایک جماعت شمار ہوں گے ان میں اگر کوئی شخص ظلم یا عہد شکنی یا جرم کرے گا تو وہ اپنے جرم کی سزا کا مستحق ہوگا۔

(۲۱) یہود کے مذکورہ بالا قبائل کی ذیلی شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ان کو حاصل ہیں۔

(۲۲) معاہدہ کرنے والوں میں کوئی محمدؐ کی اجازت کے بغیر فوجی اقدام نہیں کرے گا۔

(۲۳) کسی زخم یا ضرب کا بدلہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔ جو شخص اس صحیفہ کی زیادہ سے زیادہ وفادارانہ تعمیل کرے گا خدا اس کی مدد کرے گا۔

(۲۴) اگر مسلمان اور یہود معاہدین کے خلاف کوئی تیسری قوم جنگ کرے تو ان تمام معاہدین کو متفق ہو کر لڑنا پڑے گا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور باہم بہی خواہی اور وفا شعاری ہو گی۔ یہودی اپنے مصارف جنگ برداشت کریں گے۔ اور مسلمان اپنے مصارف۔

(۲۵) یہود اس وقت تک مسلمانوں کے ساتھ اخراجات برداشت کرتے رہیں گے، جب تک وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

(۲۶) یثرب کا میدان جو پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے اس معاہدہ میں شریک ہونے والوں کے لئے حرم (مقدس مقام) ہوگا۔

(۲۷) پناہ گزین سے بھی وہی برتاؤ کیا جائے گا جو پناہ دہندہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے گا۔ پناہ گزین پر اس معاہدہ کی تعمیل لازم ہوگی اور اسے عہد شکنی کی اجازت نہ ہوگی۔

(۲۸) کسی پناہ گاہ میں وہاں والوں کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہیں دی جائے گی۔

(۲۹) اہل معاہدہ میں اگر کوئی حادثہ یا اختلاف رونما ہو جس سے نقض امن کا اندیشہ ہو تو اس کے فیصلہ کے لئے خدا اور محمد رسول اللہؐ سے رجوع کیا جائے جو شخص اس صحیفہ کی زیادہ سے زیادہ تعمیل کرے گا' خدا اس کے ساتھ ہوگا۔

(۳۰) قریش مکہ اور ان کے مدد گار کو کوئی شخص پناہ نہیں دے گا۔

(۳۱) اگر کوئی یثرب (مدینہ) پر حملہ آور ہو گا تو مسلمان اور یہود دونوں فریق مل کر مدافعت کریں گے۔

(۳۲) اگر مسلمان کسی سے صلح کریں گے تو مسلمانوں پر بھی لازم ہوگا کہ یہود کے ساتھ ایسا ہی تعاون کریں البتہ کسی فریق کی اپنی مذہبی جنگ میں دوسرے فریق پر تعاون کی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔

(۳۳) یثرب پر حملہ کی صورت میں ہر جماعت کو اس حصہ کی مدافعت کرنا ہوگی جو اس کے بالمقابل ہو۔

(۳۴) قبیلہ اوس کے موالی کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اس صحیفہ میں شریک ہونے والوں کو حاصل ہیں' بشرطیکہ وہ بھی وفاداری کا اظہار کریں جو اس صحیفہ کی زیادہ سے زیادہ وفاداری کے ساتھ تعمیل کرے گا خدا اس کا حامی و مدد گار ہوگا۔

(۳۵) اس معاہدہ میں شریک ہونے والی جماعتوں میں سے اگر کسی فریق یا جماعت کو جنگی ضرورت سے مدینہ سے باہر جانا پڑے تو وہ امن و حفاظت کی مستحق ہو گی اور جو مدینہ میں رہے اس کے لئے بھی امن ہوگا۔ کسی پر ظلم نہ کیا جائے گا نہ کسی کے لئے عہد شکنی جائز ہوگی جو اس صحیفہ کا سچے دل سے احترام اور تعمیل کرے گا' اس کے لئے اللہ اور اس کا رسول محمدؐ نگہبان ہیں۔

(سہ روزہ "دعوت دہلی' شمارہ خاص "سرور عالم" ربیع الاول ۱۳۸۱ھ صفحہ ۲۳-۲۶)

ہمیں اس صحیفہ کا اصل ماخذ ابھی دستیاب نہیں ہوا ہے اس لئے معاصر موصوف کے الفاظ ہی میں اسے درج کر دیا گیا ہے' حالانکہ ہمارے نزدیک بعض جگہ اس میں اصل عبارت کے ترجمہ میں کسی حد تک کوتاہی پائی جاتی ہے جس کی اصل ماخذ سے مقابلہ کے بعد ہی تصحیح ہو سکتی ہے۔

اذان اور اقامت کی تشریع

مکہ میں معدودے چند مسلمان تھے جو پیغمبرؐ کے ساتھ نماز جماعت میں شریک ہو جاتے تھے۔ اب مدینہ میں آنے کے بعد جب مسلمانوں کی تعداد جماعتوں میں کافی ہونے لگی تو ضرورت پڑی کہ اوقات نماز پر کوئی طریقہ اس اعلان کا ہو کہ اب نماز ہو رہی ہے اور پھر جماعت میں آنے والوں کے لئے کوئی طریقہ ہو جو بتلائے کہ اب نماز شروع ہو رہی ہے۔ پہلے اعلان کا مقصد اذان سے پورا ہوتا ہے اور دوسرے اعلان کا مقصد اقامت سے چنانچہ جیسا کہ سیرت حلبیہ وغیرہ میں ہے ہجرت کے پہلے سال اذان اور اقامت کی تشریع ہوئی۔

روایات اہل سنت میں اذان کا رواج قائم ہونے کے مختلف اسباب درج کئے گئے ہیں جو ائمہ اہل بیتؑ کے تعلیمات کے رو سے ناقابل قبول ہیں۔ ان پر میں نے اپنے رسالہ "تحقیق اذان" میں سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ ہمارے نزدیک اتنے اہم شرعی حکم کی بنیاد نہ کسی خواب پر ہو سکتی ہے اور نہ کسی صحابی کے مشورے پر۔ بلکہ اس کا تعلق بالکل حکم الٰہی سے ہے جیسا کہ علامہ سید محسن امین عاملی نے تحریر فرمایا ہے۔

ما فی طبقات ابن سعد و سیرة ابن هشام من ان سبب وضع الاذان والاقامة رویا راها بعض الانصار باطل لا یلتفت الیه فان الاحکام الشرعیة ما کان یشرعها بالمنامات ان هوا لا و حی یوحیٰ و فی السیرة الحلبیة عن محمد بن الحنفیة انکار ذلک اشد الانکار

(اعیان الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۱۴۳)

جو طبقات ابن سعد اور سیرت ابن ہشام میں ہے کہ اذان اور اقامت کے قرار دیئے جانے کا سبب ایک خواب ہے جو بعض انصار نے دیکھا تھا' یہ غلط چیز ہے کہ قابل توجہ نہیں ہے' اس لئے کہ احکام شرعی کو رسولؐ خوابوں کی بناء پر جاری نہیں فرماتے تھے۔ وہ تو وحی ہوتی تھی جو آپ پر آتی تھی اور سیرت حلبیہ میں محمد ابن حنیفہ کی زبانی اس کا سخت انکار درج کیا گیا ہے۔

نماز کی چار رکعات

علامہ طبری لکھتے ہیں۔

و فی ھذہ السنۃ زید فی صلواۃ الحضر رکعتان و کانت صلواۃ الحضر والسفر رکعتین و ذلک بعد مقدم رسول اللّٰہ المدینۃ بشھر فی ربیع الاخر لمضی اثنتی عشرۃ لیلۃ منہ

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۵۸)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتدائے بعثت رسولؐ سے اب تک ہر نماز دو رکعت کی تھی، ہجرت کے ایک مہینہ کے بعد ماہ ربیع الثانی میں اس نماز میں جو بحالت حضر ہو ظہر و عصر اور عشا میں دو رکعتوں کا اضافہ ہو گیا۔

مورخ کی جو فقط مورخ ہی نہیں ہے بلکہ اہل سنت میں ایک امام فقیہ اور حافظ احادیث کی حیثیت بھی رکھتا ہے یہ تصریح ہے کہ اصل تشریع میں اضافہ مقید حضر کے ساتھ تھا تو پھر فقہی حیثیت سے سفر کی حالت میں اس اضافہ کی بطور رخصت بھی کیا گنجائش ہو سکتی ہے؟

آغاز جہاد اور اس کے اسباب

مشرکین مکہ کو اگر فقط پیغمبرؐ کی ذات سے دشمنی ہوتی تو وہ آپ کی ہجرت سے اطمینان کی سانس لیتے کہ جو ہمارا دشمن تھا وہ ہمارے درمیان سے چلا گیا اور اب ہم سے اس سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ مگر انہیں تو اس مشن سے عداوت تھی جسے پیغمبرؐ پھیلا رہے تھے اور اس لئے انہوں نے آپ کی ہجرت کے منصوبے کو ناکام بنانے کے لئے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ رات کو آپ کے مکان کا محاصرہ کرکے آپ کی زندگی کا خاتمہ کر دیں مگر وہ قدرت کی طرف کا انتظام تھا جس سے وہ اپنے منصوبے میں ناکام رہے اور آپ صحیح سلامت مدینہ پہنچ گئے، ان حالات کا بیان پہلے آ چکا ہے۔

یہ ایک بہت بڑی شکست تھی جو انہیں آپ کے مقابل ہوئی وہ دیکھ رہے تھے کہ اب آپ ایسے مرکز پر پہنچ گئے ہیں جہاں آپ آزادی سے اپنے دین کی تبلیغ کریں گے۔ ان کو شروع میں یہ امید ہو گی کہ اوس و خزرج کی باہمی رقابت مدینہ میں آپ کے لئے باعث زحمت ہو گی' یعنی اگر اوس نے آپ کا ساتھ دیا تو خزرج مخالف صف میں ہوں گے اور اگر خزرج والے زیادہ آپ کے طرف دار ہوئے تو اوس کے لوگ آپ کے مقابلے میں صف بستہ ہوں گے مگر یہ امید ان کی ختم ہو گئی جب انہیں خبر ملی کہ آپ نے اوس اور خزرج دونوں کو گلے ملا دیا اور وہ دونوں اب آپ کے انصار میں داخل ہو کر ایک قوم بن گئے ہیں۔ پھر دوسری بڑی امید ان کو یہود سے ہو سکتی تھی کہ وہ ثروت اور طاقت دونوں کے مالک ہونے کی بنا پر مدینہ میں ایک بڑے مخالف کی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں۔ مگر پیغمبرؐ نے یہود کے ساتھ مذکورہ بالا معاہدہ کرکے ان کی اس امید کا بھی خاتمہ کر دیا۔ پھر بھی وہ خاموشی کے ساتھ اسلام کی ترقی کو تو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور اس کے لئے وہ مدینہ میں انتشار پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ ڈھونڈ رہے تھے کہ انہیں اپنے جاسوسوں کے ذریعے سے یہ ایک خوش آئند خبر ملی کہ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے ان میں ایک منافقین کی جماعت بھی موجود ہے۔ یہ لوگ ہیں جو در پردہ اپنے قدیم خیالات پر قائم ہیں مگر وہ مصلحتہ" اسلامی جماعت میں شامل ہو گئے ہیں ان کا سرگروہ عبداللہ بن ابی تھا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ چنانچہ انہوں نے عبداللہ بن ابی کو لکھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ حضرت کو مدینہ سے نکلوا دے۔

جیسا کہ مسٹر کے اے حمید نے لکھا ہے قریش نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ عبداللہ کی وساطت سے اہل مدینہ کو لکھا۔

"اے باشندگان مدینہ تم نے ہمارے خاندان کے ایک شخص محمدؐ کو اپنے یہاں ٹھہرا لیا ہے۔ ہم تم کو مطلع کرتے ہیں کہ تمہاری خیریت اسی بات میں ہے کہ ان کو مدینہ سے نکال دو ورنہ اس سے جنگ کرو اور اسے گرفتار کرکے ہمارے حوالے کر دو۔ اگر تم نے ہماری مرضی کے مطابق نہ کیا تو ہم نے متفقہ طور پر حلف کیا ہے کہ تم

پر حملہ کرکے تمہاری عورتوں پر قبضہ کرلیں گے اور تمہارے نوجوانوں کو قتل کر ڈالیں گے"

اس خط کے ملنے پر ایک دن عبداللہ اور اس کے رفقاء رسول خداؐ پر حملہ کرنے کی تجاویز پر غور و خوض کر رہے تھے' عین وقت پر جناب رسول خداؐ کو اس کا علم ہوگیا اور آپ بہ نفس نفیس جہاں مجلس مشاورت قائم تھی وہاں پہنچ گئے اور حاضرین کو مخاطب کرکے فرمایا۔ "قریش نے تم کو دھوکا دیا ہے' اگر تم نے اس سرزمین پر کشت و خون کرنے کا ارادہ کیا تو تمہیں سخت نقصان پہنچے گا۔ اور پھر تمہیں اپنے بھائیوں کا خون بہانا ہوگا جو ہمارا ساتھ دیں گے بلکہ تمہارا فرض یہی ہے کہ جیسا تمہاری قوم نے میرا ساتھ دینے کا عہد و پیمان کیا ہے' اگر کوئی اس شہر پر حملہ کرے تو تم سب ہمارے ساتھ مل کر اس کا دفیعہ کرو"۔ بروقت اس راز کے کھل جانے سے اور آپ کی تقریر سے یہ منصوبہ درہم و برہم ہوگیا۔

(مسلمانان عالم حصہ اول صفحہ ۴۷)

مشرکین کی یہ ابتدائی کارروائیاں خود بتلا رہی ہیں کہ اب اگر جنگ کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کا آغاز کس جانب سے ہوگا۔

یہ بھی بڑی قابل لحاظ بات ہے کہ رسولؐ کے مدینہ میں تشریف لانے کے بعد ایک سال تک کوئی خونریز تصادم آپ کا کسی جماعت سے نہیں ہوا ہے۔ اگر آپ کو جنگ کرنا مقصود ہوتی تو یہ ایک سال کا وقفہ آپ جنگ کی تیاری میں صرف فرماتے۔ جبکہ اس ایک سال میں تعمیری کام کافی انجام دیئے گئے۔ تین تین مسجدیں بن گئیں۔ ایک مسجد قبا' دوسری مسجد بنی سالم اور تیسری مسجد نبوی۔ مہاجرین کی بحالی کا کام انجام دیا گیا اور خاندان رسولؐ اور دیگر مہاجرین کے لئے مکانات کی تعمیر ہوگئی۔ احکام شرعی اور نظام اجتماعی کے دستور کا نفاذ ہوگیا مگر اس ایک سال کی مدت سے آپ نے سامان جنگ کی فراہمی میں کیا فائدہ اٹھایا؟ یہ حال اس وقت کھلے گا' جب دوسرے سال اسلام کی پہلی لڑائی ہوگی اور مسلمانوں کے پاس لڑنے کے لئے ہتھیار اور سوار ہونے کے لئے مرکب بھی موجود نہ ملیں گے یہ آپ کا عمل خود بتاتا ہے

کہ مدینہ میں آکر آپ کا نصب العین اہل مکہ سے جنگ کرنا نہ تھا جس کے پاس سازوسامان جنگ اس طرح مفقود ہو' وہ خود سے جنگ کی چھیڑ چھاڑ کبھی نہیں کرے گا۔ یہ اور بات ہے کہ زبردستی اس کے سر پر جنگ عائد کر دی جائے تو وہ اپنے ساتھیوں سمیت سر سے کفن لپیٹ کر میدان میں نکل آئے۔

قرآنی تصریحات اور ان کی تاریخی اہمیت

یوں تو قرآن ایک مذہبی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے جو بحیثیت اپنے تعلیمات و احکام کے دوسرے اہل مذاہب کو زبردستی منوایا نہیں جا سکتا مگر یہ اس کے اعتقادی حصے یعنی غیبی اطلاعات یا عقائد و احکام کے بارے میں کہا جا سکتا ہے لیکن ایک اس کی تاریخی حیثیت ہے اور وہ یہ کہ یہ کتاب حضرت پیغمبر اسلامؐ نے پیش فرمائی۔ یہ چیز مذہب و ملت کی تفریق سے بالا تر ہے۔ یہی اس کتاب کا وہ تواتر ہے جو دنیا کی کسی دوسری آسمانی کتاب کو حاصل نہیں ہے۔ اب اس کتاب میں گزشتہ انبیاء کے متعلق جو واقعات ہیں انہیں کوئی غیر مسلم چاہے تاریخی حیثیت سے اس بنا پر اہمیت نہ دے کہ وہ حضرت محمد مصطفیؐ کے عام طبعی اسباب کے لحاظ سے چشم دید نہیں ہیں یا بعد کے متعلق جو خبریں ہیں مثلاً قیامت وغیرہ کے حالات انہیں وہ نہ مانیں اس بنا پر کہ یہ چیزیں ابھی وقوع میں نہیں آئیں لیکن خود پیغمبر خداؐ کے اپنے حالات اور واقعات کے متعلق قرآن میں جو تذکرے ہوں انہیں تو ایک غیر مسلم کے نزدیک بھی تاریخی حیثیت سے اہمیت حاصل ہونا چاہئے۔ پھر رسولؐ کی ہستی وہ تھی جس کی خاص صفت کافروں کے نزدیک سچائی تھی جس کی بنا پر آپ کا لقب ہی صادق و امین ہو گیا تھا۔ اگر اس کے خلاف حالیہ واقعات کے بیان کرنے میں کوئی بھی بات ان کے نزدیک قابل گرفت ہوتی تو اس وقت کی دنیائے کفر آسمان سر پر اٹھا لیتی اور شور مچاتی کہ یہ کیا خلاف واقعہ بات آپ کہہ رہے ہیں۔ اب دیکھئے کہ قرآن نے آغاز جنگ کا پس منظر کیا بیان کیا ہے اور اس کے بعد فیصلہ کیجئے کہ پیغمبرؐ کی جنگ جارحانہ حیثیت رکھتی تھی۔ یا مدافعانہ قرآن مجید میں جہاد کے سلسلے میں جو

آیت اپنے مضمون کے لحاظ سے سب سے پہلی آیت معلوم ہورہی ہے وہ یہ ہے۔
اذن للذین یقاتلون بانهم ظلموا و ان اللّٰہ علٰی نصرهم لقدیر الذین اخرجوا من دیارهم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللّٰہ و لولا دفع اللّٰہ الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع و بیع و صلوات و مساجد یذکر فیها اسم اللّٰہ کثیرا و لینصرن اللّٰہ من ینصره ان اللّٰہ لقوی عزیز

(سورہ حج آیت ۳۹، ۴۰)

اجازت دی جاتی ہے ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جا رہی ہے اس بنا پر کہ ان پر مظالم ہوئے ہیں اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قادر ہے وہ جنہیں نکالا گیا ان کے گھروں سے ناحق بغیر کسی خطا کے سوا اس کے کہ وہ کہتے تھے ہمارا مالک اللہ ہے اور اگر نہ ہوتا دفع کرنا اللہ کا بعض لوگوں کو بعض کے ذریعہ سے تو گرا دیئے جاتے گرجے اور مختلف مذاہب کے معابد اور وہ مسجدیں جن میں اللہ کا ذکر بہت ہوتا ہے اور ضرور اللہ مدد کرے گا اس کی جو اس کی مدد کرے یقیناً اللہ طاقت والا ہے غالب آنے والا۔

اس آیت میں حسب ذیل امور قابل لحاظ ہیں۔
(ا) اس آیت کا آغاز اذن سے ہو رہا ہے جس کے معنی اجازت کے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس آیت سے پہلے مسلمانوں کے لئے جنگ کرنا ممنوع تھا اور اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ یہ سب سے پہلی آیت ہے جو جہاد کا حکم لے کر اتری ہے۔

دوسری جگہ قرآن میں یہ ذکر آیا ہے کہ۔
الم ترا لی الذین قیل لهم کفوا ایدیکم واقیموا الصلوٰة و اٰتوا الزکوٰة فلما کتب علیهم القتال اذا فریق منهم یخشون الناس کخشیة اللّٰہ او اشد خشیة وقالوا ربنا لم کتبت علینا القتال لولا اخرتنا الی اجل قریب .

(سورہ نساء آیت ۷۷)

(سورہ نساء آیت ۷۷)

کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رہو اور نماز پڑھو زکواۃ دو تو جب ان پر جنگ کرنے کا فرض عائد کیا گیا تو ایک دم یہ منظر نظر آیا کہ ان میں کا ایک گروہ آدمیوں سے اتنا ڈرتا ہے جتنا اللہ سے ڈرا ہو یا اس سے بھی زیادہ اور انہوں نے کہا کہ پروردگارا تو نے ہم پر جنگ کا فریضہ کیوں عائد کیا؟ کیوں نہ ہمیں کچھ اور مہلت دی؟

اس آیت میں سلسلہ کی ایک کڑی سیاق سے سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب خالق کی جانب سے ہاتھ روکے رہنے کا حکم تھا اور یہ کہ بس اپنی جگہ پر جو عبادتیں تمہارے ذمہ ہیں مثلاً نماز و زکواۃ یہ انجام دیتے رہو اور مخالفین سے کوئی سروکار نہ رکھو تب مسلمانوں میں ایک جماعت اس رواداری کی تعلیم سے کبیدہ خاطر تھی اور اس کا اصرار تھا کہ اب ہمیں جنگ کی اجازت دیجئے اور اسی سے ربط بعد کے فقرہ کا ہے کہ یہ جماعت پہلے تو یوں جنگ پر اصرار رکھتی تھی اور جب حکم جنگ آیا تو یہی عملی کمزوری کا ثبوت دینے لگی۔

(۲) اجازت جہاد کا پس منظر اس لفظ سے پیش کیا گیا ہے کہ ان سے جنگ کی جارہی ہے۔ یعنی فعل مجہول (یقاتلون) کے لفظی معنی ہیں اگر یقاتلون ت کے کسرہ کے ساتھ ہوتا تو یہ معنی ہوتے کہ یہ جنگ کر رہے ہیں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ کی ابتداء مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہے بلکہ مشرکین حملہ آور ہوئے ہیں تب انھیں مدافعت کا اذن ملا ہے۔ اگر ابتداء ان کی طرف سے ہوتی تو یہ الفاظ ہوتے کہ اجازت دی جاتی ہے ان کو جو جنگ کر رہے ہیں اس بناء پر کہ ان پر مظالم ہوئے ہیں۔

(۳) اس صورت حال کے ساتھ کہ جنگ کی ابتدا کافروں کی طرف سے ہوئی ہے پھر گزشتہ پوری تاریخ جو بعثت رسولؐ سے اب تک کی تھی اس کا حوالہ ایک بانھم ظلموا کی لفظ سے دیا گیا ہے کہ ان پر پہلے سے مظالم ہوتے آئے ہیں گر ان مظالم کے باوجود بھی ان کو جنگ کی اجازت اس وقت تک نہیں دی گئی جب تک ادھر

سے آغاز جنگ نہیں ہو گیا۔

(۴) "یقیناً اللہ ان کی مدد پر قادر ہے"۔ اس میں ایک بلیغ اشارہ اس طرف ہے کہ مسلمانوں کی مادی طاقت اس وقت ایسی نہیں ہے کہ یہ مشرکین سے ٹکر لے سکیں مگر یہ صرف خدا پر بھروسہ کرکے ان کے مقابلہ کے لئے آمادہ ہو سکتے ہیں۔

(۵) " ما ظلموا" کا جو اجمال تھا اس کی تفصیل کے مقام میں ان کے مظالم کا سب سے آخری جو نتیجہ تھا اسے صراحتہ" بیان کیا ہے کہ ان کے ہاتھوں یہ گھر سے بے گھر ہوئے ہیں اور غربت اور مسافرت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

(۶) آخر میں اس اذن جہاد کے فلسفہ کو بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی وقت بھی ایسا نہ ہو جب اہل حق کو باطل سے ٹکر لینے کی اجازت دی جائے یعنی ہمیشہ ہی خاموشی برقرار رکھی جائے تو ظالموں کی ہمت بڑھتی جائے گی اور انہیں ظلم کے راستے میں کسی رکاوٹ کا اندیشہ نہ رہے گا اور پھر صرف اسلامی معبد یعنی مساجد ہی نہیں بلکہ دنیا کے کسی مذہب کے مقدسات محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اور اس طرح قرآن نے فلسفہ جہاد تمام دنیا کی قوموں کو بتانا چاہا ہے اگر صرف مسلمانوں کو بتانا ہوتا تو مساجد کے انہدام کا ذکر کافی تھا۔ صوامع اور بیع اور صلوات یعنی دوسرے مذاہب کے معبدوں کا ذکر نہ کیا جاتا۔

(۷) فلسفہ جہاد بتاتے ہوئے قرآن نے دفع کا لفظ صرف کیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ جارحانہ جنگ نہیں ہے بلکہ مدافعانہ ہے اور یہ اس وقت کے قرآنی اصول کی آج چودہ سو برس کے بعد فتح ہے کہ آج دنیا کی متمدن حکومتوں میں محکمہ جنگ کا نام ہی محکمہ دفاع ہو گیا ہے اور وزیر جنگ کے بجائے وزیر دفاع مقرر کئے جاتے ہیں۔

بے بنیاد روایات کا درایتی جائزہ

پیغمبر اسلامؐ کی اہل مکہ کے مقابلہ میں سب سے پہلی خونریز جنگ بدر میں ہوئی ہے۔ بد نصیبی سے جنگ کے پس منظر میں خود مسلمان تاریخوں میں یہ حکایت آ

گئی ہے کہ اس کے پہلے مسلمانوں نے مشرکین کے تجارتی قافلوں پر جو مکہ سے شام جاتے تھے حملے شروع کر دیئے تھے۔ اور بعض دفعہ سامان لوٹ لیا تھا۔ اس کے بعد ابو سفیان جو ایک بڑے تجارتی سامان کے ساتھ شام گیا ہوا تھا اسے خبر ملی کہ مسلمان اس قافلہ پر حملہ کریں گے اور سامان تجارت کو لوٹ لیں گے۔ اس کی اطلاع اس نے مکہ میں روانہ کر دی جس کی بناء پر اس قافلہ کی حفاظت کے لئے مکہ سے فوج روانہ ہوئی چونکہ مدینہ' مکہ اور شام کے عین وسط میں واقع تھا' ادھر سے مدینہ کی طرف تجارتی قافلہ آرہا تھا اور ادھر سے ابوجہل کی سرکردگی میں یہ حفاظتی فوج آ رہی تھی۔ پیغمبرؐ کو یہ اطلاع ہوئی تو آپ اپنے ساتھ کے لوگوں کو لے کر قافلہ پر حملہ کے ارادہ سے باہر نکلے مگر قافلہ کسی اور راستے سے نکل گیا اور مسلمانوں کا مقابلہ اس فوج سے ہو گیا۔ اس طرح وہ معرکہ پیش آیا جس کا نام جنگ بدر ہے۔

جنگ کے اسباب کو اس نوعیت سے مانا جائے تو سلسلہ جنگ کی ذمہ داری پیغمبر اسلامؐ پر عائد ہوتی ہے مگر ہم نے جو قرآنی آیت پیش کی ہے جس میں قرآن نے ابتدائے جنگ کی نوعیت پر تبصرہ کیا ہے وہ اس روایت کو غلط ثابت کرتی ہے۔ اگر صورت حال یہ ہوتی اور پھر قرآن یہ کہتا کہ اجازت دی جاتی ہے ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جا رہی ہے تو اس وقت کی دنیائے کفر و شرک ایک دم چیخ اٹھتی کہ یہ کیا خلاف واقعہ بات ہے؟ ہمارے قافلہ کی لوٹ مار کے ساتھ ابتدائے جنگ آپ کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ہم سے جنگ کی جا رہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم خود سے جنگ نہیں کر رہے ہیں قرآن کی سچائی پر کوئی اعتراض نہ ہوتا اس کا ثبوت ہے کہ واقعہ یہی تھا جو قرآن نے بیان کیا ہے اس کے لئے ہم نے اس بحث کی تمہید میں یہ دکھلایا تھا کہ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت صرف تعبدی پہلو نہیں رکھتی جس کے سامنے ہر مسلمان ہی مجبور ہو کر بلکہ وہ درایتی لحاظ سے ایک تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے جس کا ماننا غیر مسلم محققین کے لئے بھی ناگزیر ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ اس کا متکلم یا اس کلام کا حامل وہ ہے جس کی صفت خاص سچائی

رہی ہے اس نے اپنی سچائی ہی کا حوالہ دیتے ہوئے یا اس کا اقرار لیتے ہوئے اپنا پہلا پیغام پیش کیا تھا اور اس کے تمام مخالف لیڈروں نے اقرار کیا تھا کہ ہم نے اس زبان سے سوا سچ کے جھوٹ نہیں سنا پھر اب ایسی صاف خلاف واقعہ بات ان کے سامنے کیونکر پیش کی جا سکتی تھی اور وہ اس پر کیونکر خاموش رہ سکتے تھے؟

پھر اسی کے ساتھ جب جنگ بدر کا سامان دیکھا جاتا ہے جیسا کہ بعد میں آئے گا کہ لشکر اسلام میں تلواریں بھی نہ تھیں اور سوار ہونے کے لئے مرکب بھی نہ تھے تو اس سے بھی قطعی طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی صاحب عقل جس کے پاس یہ سازوسامان ہو اپنی طرف سے آغاز جنگ نہ کرے گا۔ اس لئے یقینی طور پر سمجھنا چاہئے کہ تاریخ اسلام میں جنگ بدر کے اسباب میں اس روایت کا آجانا بالکل ویسا ہی جیسے واقعہ کربلا کے پس منظر میں بعض مسلم تاریخوں میں یہ روایت آگئی ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے یمن سے آتے ہوئے بار بردار اونٹوں کو جو یمن کا محاصل یزید کے پاس پہنچانے کے لئے دمشق جا رہے تھے راستے میں روک لیا اور ان کا سب سامان اپنے قبضے میں کر لیا۔ اس طرح یزید کے خلاف جارحانہ اقدام کی ذمہ داری آپ پر عائد ہو گئی۔ ہمارے نزدیک نانا کے خلاف وہ روایت وضع کرکے بدر کی ذمہ داری ان پر ڈالنا اور نواسے پر یہ الزام عائد کرکے واقعہ کربلا کی ذمہ داری ان پر عائد کرنا دونوں ایک ہی خاندان اور اس کے ہوا خواہوں کی کارستانی ہے جنھوں نے باطل کے مقابلہ میں اہل حق کے کردار کو داغدار بنانے کے لئے یہ روایت وضع کی ہے۔ مگر ہمارے نزدیک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے بہ بانگ بلند یہ قرآنی اعلان کہ اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا اجازت دی جاتی ہے انہیں جن سے جنگ کی جا رہی ہے اس وجہ سے کہ ان پر مظالم ہوتے آئے ہیں" اور اس پر تمام دنیائے کفرو شرک کی خاموشی اور کوئی احتجاج نہ کرنا اور کربلا میں حضرت امام حسینؑ کا اپنی مخالف تیس ہزار کی فوج کے سامنے خطبہ میں یہ ارشاد کہ کیا میں نے کوئی مال لے لیا ہے جس کا مجھ سے مطالبہ ہے یا کوئی خون کیا ہے جس کا قصاص مجھ سے لینا ہے؟ اور اس کے جواب میں

مخالف جماعت کی طرف سے مکمل سکوت اور کسی الزام کا آپ پر عائد نہ کر سکنا یہ دونوں باتیں ان دونوں الزاموں کے غلط ہونے کا قطعی ثبوت ہیں۔

بدر سے پہلے کی آویزشیں اور ان کی نوعیت

غزوات کے سلسلہ میں سب سے پہلے جو نام ذہن میں عموماً آئے گا وہ بدر کا ہے۔ مگر تاریخ میں بدر سے پہلے چند آویزشوں کا مشرکین کے ساتھ تذکرہ ہے جن میں سے اصطلاحی طور پر بعض کو غزوہ اور بعض کو سریہ کہا جاتا ہے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ جن میں خود رسولؐ تشریف لے گئے ہوں وہ غزوات ہیں اور جن میں کسی اور کو سردار بنا کر بھیج دیا ہو وہ سرایا ہیں۔ علامہ طبری لکھتے ہیں کہ غزوات کی تعداد چھبیس اور سرایا کی چھتیس ہے۔

(اعلام الوریٰ)

علامہ سید محسن امین عاملی کہتے ہیں کہ سیرت حلبیہ میں غزوات کی تعداد ستائیس بتائی ہے اور تفصیل جو بتائی ہے اس میں اٹھائیس ہوتے ہیں۔ اس ترتیب میں غزوہ بدر چوتھا قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح کہ۔

(۱) بواط (۲) عشیرہ (۳) سفوان (۴) بدر الکبریٰ (اعیان الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۱۵۰) ان کے درمیان میں تین چار سریوں کا ذکر ملتا ہے اور اس طرح مجموعی طور پر بدر کا نمبر جنگی کارروائیوں میں تقریباً ساتواں پڑ جاتا ہے۔

سطحی نگاہ والے مورخین روئیداد کو اس طرح سے لکھ دیتے ہیں جس سے دیکھنے والے کا ذہن یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ چھیڑ پیغمبر اسلامؐ کی طرف سے ہوئی ہے جیساکہ مورخ طبری نے لکھا ہے۔

(۱) زعم الواقدی ان رسول اللّٰہ عقد فی ھذہ السنة فی شھر رمضان علیٰ راس سبعة اشھر من مھاجرہ لحمزة بن عبدالمطلب لواء ابیض فی ثلاثین رجلا عن المھاجرین لیعترض لعیرات قریش

واقدی نے اپنے خیال کے مطابق یہ بیان کیا ہے کہ رسول خداؐ نے اسی سال

(سال اول) ماہ رمضان میں ہجرت کے سات مہینے بعد حمزہ بن عبدالمطلب کے لئے ایک علم آراستہ کیا جس کا پھریرا سفید تھا۔ مہاجرین میں سے تیس آدمیوں کے ساتھ تاکہ قریش کے تجارتی قافلوں کا راستہ روکیں۔

(۲) و ان رسول اللّٰہ عقد ایضاً فی ھذہ السنۃ علٰی راس ثمانیۃ اشھر من مھاجرہ فی شوال لعبیدۃ بن الحارث بن عبدالمطلب بن عبد مناف لواء ابیض وامرہ بالسیر الی بطن رابغ

اور رسول خداؐ نے اسی سال ہجرت کے آٹھ مہینے بعد ماہ شوال میں عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب بن عبد مناف کے لئے بھی ایک سفید جھنڈا مرتب کیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ رابغ کی وادی کی طرف جائیں۔

(۳) وفیھا عقد رسول اللّٰہ لسعد بن ابی وقاص الی الخزاز لواء ابیض یحملہ المقداد بن عمرو فی ذی العقدۃ

اور اسی سال ذی قعدہ میں رسول خداؐ نے سعد بن ابی وقاص کے لئے ایک سفید جھنڈا مرتب کیا خزاز کی طرف جانے کے لئے جسے مقداد بن عمرو نے اٹھایا۔

اب اسحاق کو ان مہموں سے جو واقدی نے ہجرت کے پہلے ہی سال بتائی ہیں اختلاف ہے اور وہ کہتے ہیں کہ حضرت نے ہجرت کے بعد پہلے سال کے اختتام تک کوئی نقل و حرکت نہیں فرمائی۔ بے شک دوسرے سال کے ماہ صفر میں آپ جنگ کے لئے نکلے اور یہی غزوہ ودآن یا ابواء ہے جس میں جنگ کی نوبت نہیں آئی اور قبیلہ بنو ضمرہ نے آپ کی اطاعت کر لی ایک مہینے کے وقفہ سے ماہ ربیع الاول میں عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب کو ساٹھ یا اسی سواروں کے ساتھ جو سب مہاجرین میں سے تھے اور ان میں کوئی انصاری نہ تھا روانہ فرمایا اور ان کی مشرکین قریش کی ایک بڑی جماعت سے جس کا سردار عکرمہ بن ابی جہل تھا۔ مڈبھیڑ ہوئی مگر پھر جنگ نہیں ہونے پائی لیکن سعد بن ابی وقاص نے ایک تیر مارا اور یہ پہلا تیر ہے جو اسلام میں لگایا گیا۔ پھر آپ نے حمزہ بن عبدالمطلب کو تیس مہاجرین کے ساتھ سیف البحر کی طرف بھیجا ان میں بھی کوئی انصاری نہ تھا ادھر سے ابوجہل

تین سو سواروں کے ساتھ آرہا تھا۔ اس موقع پر قبیلہ بنی جہینہ کے سردار مجدی بن عمرو نے جو غیر جانبدار تھا بیچ بچاؤ کر دیا اور پھر جنگ نہیں ہوئی۔ پھر ماہ ربیع الثانی میں خود رسول خداؐ قریش کی فکر میں نکلے اور مقام بواط تک جو کوہ رضوی کے اطراف میں ہے تشریف لے جا کر مراجعت فرمائی۔ پھر جمادی الاول میں آپ قریش سے جنگ کے لئے نکلے اور گھومتے پھرتے مقام عشیرہ میں جو بطن ینبع میں ہے جمادی الثانی کے کچھ دن گزرنے تک قیام فرمایا۔ پھر مدینہ واپس ہوئے۔ اس کے بعد دس دن سے کم عرصہ نہ گزرا تھا کہ کرز بن جابر فہری نے مدینہ کے مویشیوں پر، جو چر رہے تھے چھاپہ مارا اور لوٹ کر لے گیا۔ پیغمبرؐ کو معلوم ہوا تو آپ اس کے تعاقب کے لئے نکلے مگر وہ ہاتھ نہیں آیا۔ اسے غزوہ بدر اولیٰ کہتے ہیں۔ اس کے بعد جمادی الثانی اور رجب اور شعبان میں آپ سکون کے ساتھ مدینہ میں تشریف فرما رہے۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۵۹ تا صفحہ ۲۶۱)

اس دوران میں جمادی الثانی کی آخری تاریخ جس میں رجب کی پہلی ہونے کا بھی شبہ تھا۔ عبداللہ بن جحش کی قیادت میں چند مسلمانوں نے قریش کے ایک قافلہ پر حملہ کیا جس میں عمرو بن حضرمی اور دوسرے قریش کے چند آدمی قتل ہوئے اور ان کے اموال مسلمانوں کے قبضے میں آئے۔

ان کے اس عمل کو پیغمبراسلامؐ نے ناپسند فرمایا اور ادھر قریش نے آپ کے خلاف یہ پروپیگنڈا برپا کیا کہ یہ محترم مہینوں کے تقدس پر بھی عامل نہیں اور بس، اس کے بعد ابوسفیان والا بڑا تجارتی قافلہ شام گیا اور پیغمبر اسلامؐ اور آپ کے ساتھ والے مسلمانوں نے اس پر بھی حملے کا ارادہ کیا جس کی خبر ابو سفیان نے مکہ بھیج دی تو وہاں سے قافلہ کی حفاظت کے لئے فوج روانہ ہوئی جس سے مسلمانوں کی جماعت کا تصادم ہو گیا۔ اسی کو جنگ بدر کہتے ہیں۔

پھر اس جنگ بدر کے ذیل میں بار بار اس عمرو بن حضرمی کا نام آتا ہے کبھی اس وقت کہ جب ابوسفیان کا بھیجا ہوا آدمی مکہ پہنچا۔ تو اس وقت مکہ والوں نے کہا

کہ کیا عمرو بن حضرمی کا جیسے خون بہا لیا گیا ' ویسے ہی ہمارے ہر قافلہ کے آدمیوں کا خون بہا لیا جائے گا؟ اور کبھی اس وقت جب ابوسفیان کے قافلہ کے صحیح سلامت مکہ بھی واپس پہنچنے کی اطلاع آ گئی اور کچھ امن پسندوں نے یہ تحریک چلائی کہ اب فوج کو واپس چلا جانا چاہئے تو لوگوں نے حکیم بن حزام سے کہا کہ تم اپنے حلیف عمرو بن حضرمی کے خون سے درگزر کرو اور واپس چلو اس پر وہ تیار بھی ہو گیا مگر ابوجہل نہ مانا اور اس نے کہا کہ ہم یوں واپس نہیں ہوں گے۔ (طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۸) یہ ہے وہ انداز بیان جہاد اسلامی کے آغاز کا جو قدیم مورخین نے اختیار کیا ہے۔

خیر! پرانے زمانہ کے مورخین اس غلط انداز بیان کو اختیار کرتے تو قابل تعجب نہ تھا۔ جب واقعات پر روایتی نقطہ نظر سے تبصرہ نہ ہوتا تھا لیکن غضب کی بات یہ ہے کہ دور حاضر کے اہل قلم جب کہ تاریخ کے ابن خلدونی نظریہ کا چرچا ان کی زبان پر بہت آتا ہے' وہ بھی پیغمبرؐ کے ابتدائی موقف کو غلط ہی طور پر پیش کرتے ہیں اور درایت کے ان پہلوؤں پر نظر نہیں کرتے جو قطعی طور پر اسے غلط ثابت کرتے ہیں۔ مثلاً عبدالباری ایم اے اپنے مقالہ "رسول کریمؐ کی جنگی اسکیم" میں یوں لکھتے ہیں۔

"مدینہ میں آکر سب سے پہلا کام حفاظت خود اختیاری کی تدبیر تھی اس بنا پر آنحضرتؐ کا ایک کام تو یہ تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات واضح اور منضبط ہو جائیں۔ دوم یہ کہ یمن سے شام کی تجارتی شاہراہ پر اپنی گرفت مضبوط کر لیں تاکہ قریش اور دوسرے قبائل جن کا مفاد اس راستے سے وابستہ تھا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اپنی معاندانہ اور مزاحمانہ پالیسی پر نظرثانی کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں۔ اس مسئلہ پر آنحضرتؐ نے دو اہم تدابیر اختیار کیں۔ ایک مدینہ اور ساحل بحر احمر کے درمیان اس شاہرہ سے متصل جو قبائل آباد تھے ان کے ساتھ گفت و شنید شروع کی تاکہ وہ حلیفانہ اتحاد یا کم از کم ناطرف داری کے معاہدے کر لیں۔

۲۔ قریش کے قافلوں کو دھمکی دینے کے لئے اس شاہراہ پر پیہم چھوٹے چھوٹے

دستے بھیجنا شروع کیے۔ ان تاختوں کا اصل مقصود قریش کو ہوا کا رخ بتانا تھا لہٰذا ان تمام مہموں میں نہ تو کشت و خون ہوا اور نہ کوئی قافلہ لوٹا گیا۔ نہ ان میں حضورؐ نے اہل مدینہ کا ہی کوئی آدمی بھیجا۔ تمام دستے خالص مکی مہاجرین ہی سے مرتب فرماتے رہے تاکہ حتی الامکان کشمکش قریش کے اپنے ہی گھر والوں تک محدود رہے اور دوسرے قبیلوں کے اس میں الجھنے سے آگ نہ پھیل جائے"۔

(دعوت دہلی "سیرت طیبہ" ۱۶ ستمبر ۱۹۵۹ء)

اس میں دیکھیے کہ چاہے کتنا ہی گھما پھرا کر اور صفائی کی کوشش کرتے ہوئے بات کہی گئی ہو مگر بات یہ نکلتی ہے کہ پیغمبرؐ نے مکہ کے تجارتی قافلوں پر تاختیں شروع کیں۔ اور اب چاہے خود ان تاختوں میں بقول مقالہ نگار کے کوئی خونریزی نہ ہوئی ہو مگر جب کہ یہی تاختیں سبب قرار پاتی ہیں آئندہ کے بڑے تصادمات کا تو ان معرکوں میں جتنی بھی خونریزی ہوئی ہو ذمہ داری اس کی پیغمبر اسلامؐ ہی پر عائد ہوتی ہے۔

مگر ہمارے نزدیک عقلی طور پر وہ استدلال ناقابل تزلزل ہے کہ جب پہلا بڑا معرکہ بدر کا پیش آیا تو پیغمبر اسلامؐ کے پاس نہ لڑنے کے لئے تلواریں تھیں اور نہ سوار ہونے کے لئے گھوڑے تھے۔ جس کے پاس جنگ کا سامان ہی نہ ہو وہ کبھی اس جنگجو قوم کے خلاف جو پورے طور پر مسلح ہو اس قسم کا اقدام نہ کرے گا جسے تاختؔ سے تعبیر کیا جائے۔

ہمارے نزدیک بدر سے پہلے جتنی آویزشیں ہیں ان کی نوعیت پیغمبرؐ کی جانب سے کسی تاخت کی ہرگز نہیں تھی۔ بلکہ چھوٹے چھوٹے دستے اہل مکہ ہی کے آتے تھے اور وہ مدینہ کی سرحد پر کچھ اپنی طاقت کی نمائشؔ کر جاتے تھے۔ جن میں سے ایک تاخت کرنے والی جماعت کے سرگروہ کرز بن جابر فہری کا نام تاریخ میں بھی آگیا ہے کہ اس نے مدینہ کے مویشیوں پر جو چر رہے تھے چھاپہ مارا اور انہیں لوٹ کر لے گیا بس ایسی ہی صورت دوسرے دستوں کی طرف سے بھی ہوتی تھی۔ اس کی پیغمبر اسلامؐ کو جب خبر ملتی تھی تو کبھی خود کچھ جمعیت کو لے کر چلے جاتے تھے

اور کبھی کسی دوسرے سردار کی سرکردگی میں چند آدمیوں کو ان کی مدافعت کے لئے بھیج دیتے تھے جن میں اکثر ایسا ہوا کہ وہ حملہ آور نہیں ملے اس لئے وہ کچھ لوٹ مار کرکے واپس چلے گئے تھے۔ لہٰذا کسی خونریزی کی نوبت نہیں آئی اور دو ایک دفعہ اس جماعت کے کچھ افراد کا سامنا ہو گیا تو تصادم کی نوبت آئی چنانچہ عمرو بن حضرمی اور اس کے چھ ساتھیوں کا قتل ایسی ہی ایک آویزش میں واقع ہوا اور آخر میں مکہ والوں کی بڑی فوج مدینہ پر حملہ کے لئے آئی تو جنگ بدر کا خونریز معرکہ پیش آیا۔ اسی بناء پر قرآن کہہ رہا ہے کہ "ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جارہی ہے اب اجازت دی جاتی ہے کہ وہ مقابلہ کریں" اگر چھیڑ مسلسل مسلمانوں کی طرف سے ہو رہی ہوتی تو "جنگ کی جارہی ہے"۔ کہنے کے کوئی معنی نہ تھے بلکہ "جنگ کر رہے ہیں" کہا جاتا جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے ' قرآن کی یہ صراحت اور اس پر مخالف طبقہ کی طرف سے کوئی احتجاج نہ ہونا اس کا قطعی ثبوت ہے کہ اسباب جنگ مسلمانوں کے کسی عمل سے متعلق نہ تھے۔

جنگ بدر

بدر ایک کنویں کا نام تھا جو قبیلہ غفار کے بدر نامی ایک شخص کی ملکیت تھا (اعلام الوریٰ) چونکہ یہ جنگ اس کنویں کے قریب ہوئی تھی اس لئے اس غزوہ کا نام جنگ بدر ہوا۔ یہ جنگ ہجرت نبوی کے انیس مہینے بعد ۱۷ یا ۱۹ ماہ رمضان کو ہوئی ہے۔ (اعیان الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۱۵۲)۔ دن جمعہ کا تھا (سیرت ابن ہشام جلد۱ صفحہ ۱۵۳) چونکہ یہ جنگ ماہ رمضان میں ہوئی تھی اس لئے پیغمبرؐ اس سال اعتکاف کی عبادت انجام نہیں دے سکے۔ جس کے عوض دوسرے سال حضرت نے ماہ رمضان میں بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔ دس دن اس سال کے اور دس دن گزشتہ سال کی قضا کے۔ (فقہ الرضاؑ مطبوعہ طہران صفحہ ۲۱)

اس جنگ کا سروسامان شاہ عبدالحق دہلوی نے یہ لکھا ہے 'کہ مسلمانوں کی جماعت میں صرف تین گھوڑے تھے اور ستر اونٹ اور چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں۔ سوار ہونے کی صورت یہ تھی کہ ایک ایک اونٹ دو دو یا تین تین آدمیوں میں مشترک تھا جس پر ہر ایک باری باری سوار ہوتا تھا۔ یہاں بھی حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو یہ خصوصیت خاص حاصل تھی کہ آپ پیغمبر خداؐ کے شریک تھے۔

چوں نوبت پیادہ شدن حضرت میر سید' می گفتند تو سوار شویا رسول اللہ مادر رکاب تو پیادہ می رویم می فرمود نیستید شما قوی

تر از من و نیستم من بے نیاز تر شما از اجر

(مدارج النبوۃ)

جب حضرت رسولؐ کے پیادہ ہونے کی باری آتی تھی تو حضرت علی کہتے تھے آپ سوار ہوں یا رسول اللہ ہم آپ کے ہمراہ رکاب پیادہ چلیں گے' رسولؐ فرماتے تھے کہ نہ تم لوگ مجھ سے قوت میں زیادہ ہو اور نہ میں تم سب سے زیادہ اجر و ثواب سے بے نیاز ہوں۔

بعض لوگوں نے سات اونٹ اور دو گھوڑے بتائے ہیں۔

(مسلمانان عالم حصہ اول صفحہ ۷۴)

سبب جنگ

جہاں تک واقعات پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے جنگ بدر کی پوری ذمہ داری صرف دو شخصوں پر ہے۔ ایک بنی امیہ کا سردار ابو سفیان اور دوسرا ابوجہل۔ اس کے پہلے جیسا کہ گذشتہ اوراق میں لکھا گیا ہے مکہ کے لوگ چھوٹے چھوٹے دستوں کی شکل میں آکر مدینہ کے اطراف میں کچھ لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ مگر عام باشندگان مکہ کسی بڑے حملے کے لئے جو جنگ کی حیثیت رکھتا ہو تیار نہ تھے مگر اس موقع پر صورت حال یہ ہوئی کہ ابو سفیان ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ لے کر جس میں اکثر رؤسائے مکہ کا تجارتی سامان تھا' مکہ سے گیا ہوا تھا۔ اس نے اہل مکہ کو پیغمبر اسلامؐ سے جنگ پر آمادہ کرنے کے لئے ابوجہل کے پاس یہ اطلاع بھیج دی کہ ہمارا قافلہ خطرہ میں ہے اور مدینہ والے مسلمان اس پر حملہ کرکے تمام سامان لوٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس پر ابوجہل نے مکہ میں اس خطرہ کا اعلان کر دیا۔

مسٹر کے اے حمید نے شاید ابوسفیان کو بچانے کے لئے پوری ذمہ داری ابوجہل پر ڈال دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ۔

"لوگوں کو برانگیختہ کرنے کے لئے مکہ میں ابوجہل نے اعلان کیا' کہ اہل مکہ کا جو تجارتی قافلہ شام سے واپس آرہا ہے مسلمانوں نے اسے لوٹ لینے کا عزم بالجزم کر لیا ہے وہ لوگ جن کا مال و اسباب اس قافلہ میں تھا بہت برہم ہوئے اور

جوش میں آکر ان سب نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا۔ ایک ہزار آدمی، سات سو اونٹ اور تین سو گھوڑے جنگ کے لئے تیار کئے گئے باوجودیکہ وہ قافلہ جس کی وجہ سے لوگوں کو بھڑکا کر جنگ کے لئے آمادہ کیا گیا تھا، صحیح و سالم مکہ پہنچ گیا مگر ابوجہل نے جو فوج کا سپہ سالار تھا چالاکی سے فوج کو اس کا علم نہ ہونے دیا"۔

(مسلمانان عالم صفحہ ۷۲، ۷۳)

عبدالباری صاحب ایم اے نے باوجودیکہ جنگ بدر کے قبل کی چھوٹی چھوٹی آویزشوں کی نوعیت سمجھنے اور سمجھانے میں غلطی کی ہے اور طاقت کی نمائش کی پوری ذمہ داری پیغمبر اسلامؐ اور مسلمانوں پر ڈال دی ہے۔ مگر خاص جنگ بدر کے سلسلے میں انہوں نے حقیقت پسندی سے کام لیا ہے اور لکھا ہے۔

"حالانکہ شام کو جاتے وقت جب اس قافلہ کا گزر مدینہ کی طرف ہوا تو کوئی حملہ نہ ہوا تھا مگر جب واپسی کا ارادہ کیاتو ابو سفیان نے دیکھا کہ ساتھ میں پچاس ہزار اشرفی کا مال ہے اور محافظ صرف تین چالیس، اس لئے اس نے اپنی قیاس آرائی پر شعبان ۲ھ میں ضمضم ناقہ سوار کو مکہ دوڑا دیا کہ یہ خبر دے دو کہ مسلمان قافلہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں اس لئے مدد کرو۔ ادھر قریش تو پہلے سے بھرے بیٹھے تھے، جب یہ افواہ پہنچی تو اس نے بارود میں چنگاری کا کام کیا۔ بس شعلہ بھڑک اٹھا"۔

قرآن مجید میں سورہ انفال میں جو اس موقع کا تذکرہ ہے وہ بھی صاف بتا رہا ہے کہ مسلمان صرف تجارتی قافلہ کی خبر سن کر روکنے کے لئے نہیں نکلے تھے بلکہ یہ اطلاع آچکی تھی کہ مکہ کی فوج مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے آرہی ہے اور اس بنا پر روانگی کے وقت ہی خوف و دہشت کی کیفیت چھائی ہوئی تھی اور بہت سے لوگ مقابلہ پر جانے سے جی چرا رہے تھے۔ ہاں کچھ خام خیال ایسے بھی تھے جو یہ سوچ رہے تھے کہ خدا کرے فوج کے آنے کی خبر غلط ہو جائے۔ یہ تمام باتیں قرآن کی اس آیت سے صاف نمایاں ل ہیں۔

و ان فریقا من المومنین لکارھون ○ یجادلونک فی الحق بعد ما تبین
کانما یساقون الی الموت و ھم ینظرون ○ و اذا یعدکم اللّٰہ احدی
الطائفتین انھا لکم و تودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم و یرید اللّٰہ
ان یحق الحق بکلمتہ و یقطع دابرالکافرین ○ لیحق الحق و یبطل
الباطل و لو کرہ المجرمون ○

مسلمانوں میں سے ایک گروہ ناگواری محسوس کر رہا تھا' وہ آپ سے حق کے بارے میں جھگڑ رہے تھے بعد اس کے کہ وہ ظاہر ہو چکا تھا' معلوم ہوتا تھا کہ وہ موت کی طرف کھینچ کر لے جائے جا رہے ہیں جبکہ وہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جب اللہ نے اطلاع دی تھی کہ دونوں گروہوں میں سے ایک سے تمہاری مڈبھیڑ ہو گی' اور تم لوگ آرزو مند تھے کہ وہ جو قوت و طاقت نہیں رکھتا تم لوگوں کے حصہ میں آئے اور اللہ چاہتا تھا اپنی باتوں سے کہ حق کو قائم کرے اور کافروں کا قلع قمع کرے تاکہ وہ حق کو حق کر دے اور باطل کو باطل کر دے چاہے مجرم لوگ ناپسند کریں۔

۱۔ اس آیت میں حسب ذیل باتوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اگر تجارتی قافلہ کو لوٹنے کے ارادہ سے روانگی ہو رہی تھی تو خوف و اضطراب اور پہلو تہی کس بنا پر تھی اور یہ کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں؟ اس خوف و دہشت کی کیفیت سے ظاہر ہے کہ مشرکین کی فوج' اس کی کثرت تعداد اور اس کے اسلحہ وغیرہ کی تیاری یہ سب معلوم ہو گئی تھی اور اپنی جماعت کی بے سروسامانی اور قلت تعداد بھی سامنے تھی اور یہی وہ بحث ہو سکتی ہے جو لوگ رسولؐ سے کرتے تھے' جسے ارشاد کیا گیا ہے کہ وہ آپ سے جھگڑ رہے تھے' حق کے بارے میں اس کے نمایاں ہونے کے بعد۔ یہ حق حکم الٰہی تھا جس کا علم ہونے کے بعد کسی مسلمان کو پھر بحث اور ردوکد کی گنجائش نہیں ہے۔

۲۔ خالق نے اطلاع دے دی تھی کہ دونوں گروہوں میں سے ایک کا تمہارا سامنا ہوگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایک طرف سے قافلہ آرہا ہے اور دوسری طرف سے

سپاہیوں کا لشکر یعنی اس فوج کی روانگی مسلمانوں کے عزم سفر اور کسی حملہ کے ارادہ پر مبنی نہ تھی بلکہ مسلمانوں کو روانگی کا حکم اس فوج کے قریب مدینہ پہنچ جانے کے بعد ہوا تھا۔

۳۔ " تم لوگ یہ خواہش رکھتے تھے کہ وہ جس میں طاقت و قوت نہیں ہے تمہارے سامنے آئے"۔ یہ کچھ طمع رکھنے والے مسلمانوں کے تصورات کی ترجمانی ہے' جو اس صورت حال کو سامنے رکھ کر کہ ایک طرف سے قافلہ آرہا ہے جس میں سامان تجارت ہے کچھ یہ سوچنے لگا تھا کہ ممکن ہے ہمارا سامنا اس قافلہ کا ہو جائے تو بڑے اموال ہاتھ آئیں گے یہ طمع کی ذہنیت مسلمانوں کے ایک طبقہ میں شروع سے پائی جا رہی تھی جسے قرآن نے بطور مذمت نمایاں کیا ہے اور اس مذمت سے یہ ظاہر ہے کہ خدا اور رسول کی جانب سے کبھی بھی کسی تجارتی قافلہ پر حملہ کے لئے مسلمانوں کو آمادہ نہیں کیا گیا اور نہ اس کی کبھی ہمت افزائی کی گئی یہ اور بات ہے کہ خالق کے تنبیہی تازیانہ کے باوجود یہ ذہنیت اموال لوٹنے کی ایک بڑے طبقہ میں موجود رہی چنانچہ وہی پھر اس کے بعد جنگ احد میں اس تباہ کن صورت حال کا باعث ہوئی جس کے بعد بظاہر اسباب مسلمانوں کی مختتم طور پر شکست یقینی ہو گئی تھی جس کی تفصیل احد کے حالات میں آئے گی۔

پھر اس سورہ میں کفار قریش کی طرف جو مکہ سے لڑنے کے لئے بدر میں آئے اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

ولا تکونوا کالذین خرجوا من دیارھم بطرا و رئاء الناس و یصدون عن سبیل اللّٰہ (الانفال ۴۷)

اور ان لوگوں کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے مغرورانہ طور پر اور لوگوں کو اپنی شان دکھانے کے لئے نکلے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

اگر قریش صرف قافلہ تجارت کو روکنے کے لئے نکلتے تو خدا یہ کیوں کہتا کہ وہ اظہار شان اور رعب جمانے کے لئے نکلے تھے۔ اور وہ خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے تھے۔ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ وہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے نکلے تھے جس

سے مقصود اپنے زور و قوت کا اعلان اور اسلام کی ترقی کو روکنا تھا۔

افسانہ غارت گری کی بنیاد

قرآنی روایت اور عقلی درایت دونوں قطعی حیثیت رکھتی ہیں۔ پھر بعض وقت حیرت ہوتی ہے کہ کسی غیر مسلم حلقہ میں نہیں بلکہ خود مسلم حلقوں میں واقعہ بدر کا پس منظر یہ کیوں قرار دے دیا گیا کہ رسولؐ ابو سفیان کے قافلہ کو لوٹنے کے لئے مدینہ سے روانہ ہوئے تھے مگر یہ حیرت دور ہو جاتی ہے حافظ ابن جریر طبری کی تاریخ پڑھ کر جس سے سب کچھ سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ حکایات کیوں بنی اور کس وجہ سے پھیلی۔

تاریخ کے ہر طالب العلم کو یہ معلوم ہے کہ خوش نصیبی یا بدنصیبی سے مسلمانوں کے تخت و تاج کے مالک ۳۰-۴۰ برس تک اس ابو سفیان کے وارث رہے جو پیغمبرؐ کے خلاف اس خونریز جنگ کے سلسلہ کا بانی تھا جس کی پہلی کڑی جنگ بدر تھی اور پھر ۷۰-۸۰ برس تک اسی قبیلہ کی دوسری شاخ کے افراد رہے۔ طبری نے "ذکر وقعت بدر الکبریٰ" کی سرخی قائم کرکے سب سے پہلی روایت جو جنگ بدر کی تفصیلات کے متعلق درج کی ہے اور جو بنیادی حیثیت رکھتی ہے یعنی درمیان درمیان دوسری روایتیں کچھ جزئی واقعات کے سلسلہ میں لائی گئی ہیں مگر واقعہ کے پورے پس منظر پر مشتمل جو روایت ہے وہ یہی ہے اس کی شان نزول اپنے سلسلہ سند کے ساتھ طبری نے یہ درج کی ہے۔

ھشام بن عروۃ عن عروۃ انہ کتب الی عبد الملک بن مروان اما بعد فانک کتبت الی فی ابی سفیان و مخرجہ تسالنی کیف کان شانہ کان من شانہ ان ابا سفیان بن حرب اقبل من الشام فی قریب من سبعین راکباً من قبائل قریش کلھا کانوا تجاراً بالشام فاقبلوا جمعیاً معھم اموالھم و تجارتھم فذکروا لرسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم و اصحابہ۔ الخ (طبری جلد ۲ صفحہ ۲۶۷)

ہشام بن عروہ نے اپنے باپ عروہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے عبدالملک

بن مروان کو خط لکھا جس میں ابتدائی آداب و تسلیمات کے بعد لکھا تھا کہ آپ کا خط میرے پاس آیا ابو سفیان اور ان کے روانہ ہونے کے بارے میں۔ آپ مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ اس کا واقعہ کیا تھا تو اس کا واقعہ یہ تھا کہ ابو سفیان بن حرب شام سے روانہ ہوئے تقریباً" ستر سواروں کے ساتھ جو قریش کے تمام قبیلوں میں سے تھے وہ سب شام میں تجارت کرتے تھے وہ سب آ رہے تھے اور ان کے ساتھ تجارتی اموال تھے تو یہ خبر رسول خداؐ اور ان کے اصحاب کو پہنچی۔

اب ہر شخص جو غور کرے وہ اس کی پوری نوعیت کو سمجھ سکتا ہے۔ عبدالملک اسلامی خلیفہ کی حیثیت سے تخت حکومت پر ہے مگر وہ عروہ بن زبیر سے پیغمبر اسلامؐ کی روانگی کا حال نہیں پوچھ رہا ہے' بلکہ ابو سفیان کی روانگی کی کیفیت دریافت کر رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسے دلچسپی اس وقت اپنی خاندانی تاریخ سے ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں جنگ بدر کی روداد جس طرح اب تک زباں زد خلق ہے اس سے بنی امیہ کے سرگروہ ابو سفیان کا کردار جس طرح مجروح ہو رہا ہے اسے اس کے متعلق فکر ہے اور اس کے لئے اس نے منتخب کیا ہے ایک ایسے واقعہ نگار کو جو ان واقعات کو اس طرح سے درج کرے کہ ابو سفیان کا دامن بے داغ نظر آئے اور اس کے بجائے پورا الزام پیغمبر اسلامؐ اور ان کے اصحاب پر عائد ہو جائے۔ ہم آج تیرہ سو برس کے بعد اس مقصد کو بہ آسانی سمجھ لیتے ہیں تو عین اس وقت وہ واقعہ نگار جس سے یہ خواہش کی جارہی تھی اس مقصد کو کس طرح نہ سمجھتا جبکہ وہ حکومت کا منظور نظر ہونے کی وجہ سے یقیناً اس حکومت کے سابقہ احسانات کا بار بھی اپنے کاندھوں پر محسوس کرتا تھا اور آئندہ کے توقعات بھی اس کے سامنے تھے اور مرضی حکومت کے خلاف قلم کو گردش دینے میں اندیشوں کا ہونا بھی بعید نہیں ہے۔ اس بناء پر اس نے بادشاہ وقت کے منشاء کے مطابق جو کچھ اس سے ہو سکتا تھا اس کا حق ادا کر دیا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

"ابو سفیان تقریباً" ستر سواروں کے ساتھ قبائل قریش میں سے جو سب کے سب شام میں تجارت کرتے تھے اموال تجارت لیے ہوئے روانہ ہوا اور اس کی خبر

پیغمبر اسلام کو پہنچی اور ان کے درمیان اس کے پہلے جنگ ہو چکی تھی اور کچھ لوگ قتل ہو چکے تھے اور ابن حضرمی کچھ ساتھیوں کے ساتھ قتل کیا جا چکا تھا اور قریش کے کچھ آدمی بھی قتل ہو چکے تھے"۔

آپ سمجھ رہے ہیں؟ یہ پس منظر کس طرف کے اقدامات کو نمایاں کر رہا ہے؟ یعنی پیغمبر اسلامؐ یہ سب خونریزی پہلے کر چکے تھے۔ اب اس اسلامی مورخ کو کیا کہا جائے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ قرآن جنگ بدر کے موقع پر اعلان کر رہا ہے کہ اب ان کو جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔اس لئے کہ ان سے جنگ کی جارہی ہے اور ان پر ظلم ہوا ہے" یعنی قرآن جنگ کی ذمہ داری مشرکین پر ڈال رہا ہے اور یہ قرآن پر ایمان کا دعویدار مورخ جنگ کی ذمہ داری خود رسولؐ اور مسلمانوں پر ڈالتا ہے اب یہ اس وقت کے مسلمانوں کو طے کرنا ہے کہ وہ قرآن کے بیان کو سچ مانیں گے یا اس مورخ کے بیان کو جو بنی امیہ کی خاطر یہ روایت سنا رہا ہے؟

پھر جناب عروہ بن زبیر تحریر فرماتے ہیں۔

"یہی واقعہ (یعنی کفار قریش مثلاً ابن حضرمی وغیرہ کا قتل ہونا) رسول خدا اور قریش کے درمیان جنگ کا باعث ہوا اور یہ ابو سفیان اور ان کے ساتھیوں کے شام کی جانب روانہ ہونے سے پہلے ہو چکا تھا۔ پھر ابو سفیان جب واپس ہو رہے تھے قریش کے ان تاجروں کے ساتھ تو ان لوگوں نے دریا کے کنارے کا راستہ اختیار کیا' جب رسول اللہؐ نے ان کا حال سنا تو آپ نے اپنے اصحاب کو بلایا اور ان سے بیان کیا کہ ان لوگوں کے ساتھ اتنے کثیر اموال ہیں اور ان کی تعداد اتنی کم ہے"۔

دیکھ رہے ہیں آپ وہ تصویر بدر ایسے اسلامی جہاد کی جو اموی مورخ کھینچ رہا ہے؟ اور قرآن نے تو مسلمانوں کی طرف مذمت کے انداز میں یہ نسبت دی ہے کہ تم لوگ تجارتی قافلہ کا تصور باندھے ہوئے جا رہے تھے کہ شاید اس کا سامنا ہو جاوے اور یہ واقعہ نگار صاف صاف پیغمبرؐ کی طرف یہ نسبت دے رہا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو اموال قریش کی کثرت کا سبز باغ دکھا کر اور ان کی قلت تعداد کا تذکرہ کرکے گویا "ایک نرم چارا" دکھاتے ہوئے روانہ ہونے کی دعوت دی۔

اتنے ہی پر بس نہیں بلکہ خلیفہ اموی کی خاطر مورخ اس پہلو پر زور دے رہا ہے کہ۔

فخرجو الا یریدون الا ابا سفیان والرکب معه لا یرونها الا غنیمة لهم لا یظنون ان یکون کبیر قتال اذا لقوهم

وہ لوگ نکلے اس عالم میں کہ سوا ابو سفیان اور اس کے ساتھ کے سواروں کے کچھ اور ان کا مقصد نہ تھا اسے بس وہ اپنے لئے لقمہ تر سمجھ رہے تھے اور انہیں یہ خیال نہیں تھا کہ کوئی بڑی جنگ ہوگی۔

اب یاد کیجئے قرآن کا وہ بیان کہ مسلمان پیغمبرؐ سے بحث کر رہے تھے اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ موت کے منہ میں بھیجے جا رہے ہیں جب کہ وہ اسے آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اس کے بعد بھی کیا کوئی شک کیا جا سکتا ہے اس میں کہ عروہ کو حقیقت نگاری سے کوئی مطلب نہیں ہے اور صرف بادشاہ وقت کی فرمائش کی تعمیل کرتا ہے اور اس کے جذبات کا احترام اور آگے چلئے۔ عروہ رقم طراز ہیں۔

"ابو سفیان کو یہ خبر پہنچی کہ پیغمبر خدا کے اصحاب ان سے تعرض کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے مکہ کے اہل قریش کے پاس آدمی بھیجا کہ محمدؐ اور ان کے اصحاب تمہارے قافلہ کو روکنا چاہتے ہیں اس لئے اپنے سامان تجارت کی خبر لو تو جب قریش کو یہ خبر پہنچی اور ابو سفیان کے قافلہ میں قریش کے ہر خاندان کا ایک آدمی موجود تھا تو انہوں نے جنگ کے لئے لشکر مرتب کیا اور چل کھڑے ہوئے"۔

پھر یاد کیجئے قرآن کا وہ بیان کہ مسلمان جب روانہ ہوئے تو اسی وقت ایک طرف سے قافلہ آ رہا تھا اور ایک طرف سے مسلح فوج' اور مسلمانوں کو یہ اطلاع دے کر روانگی پر آمادہ کیا گیا تھا کہ تمہارا سامنا ان میں سے ایک سے ہوگا۔ اب امتحان ہے قرآن پر ایمان اور بنی امیہ سے وفاداری کا! سلاطین بنی امیہ سے وفاداری کا تقاضی یہ ہے کہ ان کے مورخ کی بات کو صحیح مانا جائے اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن کی بات کو۔ افسوس یہ ہے کہ سواد اعظم کے مورخین نے زیادہ پہلے ہی رخ کی طرف رجحان رکھا ہے اور دوسرے پہلو کو نظرانداز کیا ہے یا دبا دیا ہے۔

اب پھر یاد کر لیجئے کہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ اللہ نے تم کو اطلاع دی تھی کہ دونوں گروہوں میں سے ایک سے تمہارا سامنا ہوگا' اب اسے خواہ کوئی مذہبی نقطہ نظر سے مانے کے خالق نے بذریعہ وحی رسولؐ کو اطلاع دی تھی مگر چونکہ قرآن نے تمام مسلمانوں سے خطاب کرکے "یعدکم" کہا ہے کہ اللہ تم لوگوں سے وعدہ کر رہا تھا۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ پیغمبرؐ نے اس کی اطلاع مسلمانوں کو دے دی تھی اور یا مادی سلسلہ اسباب کو پیش نظر رکھنے والے اللہ کے اطلاع دینے کے یہ معنی قرار دیں کہ اس طرف سے یہ انتظام ہوا کہ مخبروں نے یہ خبر دے دی کہ ایک طرف سے قافلہ آرہا ہے اور ایک طرف سے فوج۔ بہرصورت قرآن یہ صاف کہہ رہا ہے کہ یہ اطلاع روانگی سے قبل آگئی تھی مگر بنی امیہ کی خاطر سے قلم اٹھانے والا مورخ (عروہ بن زبیر) اس پر زور دے رہا ہے کہ۔

و لم یسمع بنفرۃ قریش رسول اللّٰہ و لا اصحابہ حتی قدم النبیؐ بدراً"

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۹۸)

رسول خداؐ یا ان کے اصحاب نے قریش (فوج) کے روانہ ہونے کی خبر اس وقت تک نہیں سنی تھی جب تک کہ آپ بدر کے مقام پر پہنچ نہیں گئے۔

اب اس مورخ کو تو تمام چولیں بٹھانا ہیں اس لئے اسے خیال ہوا کہ کہیں بدر کا جغرافیائی محل وقوع میرے مقصد کے خلاف نتیجہ نہ دے اس لئے کہ وہ تو مدینہ اور مکہ کے بیچ میں ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ پیغمبرؐ مکہ سے آنے والی فوج ہی کو روکنے کے لئے نکلے ہیں' اس لئے دفع دخل کے طور پر وہ کہتا ہے کہ۔

بدر قریش کے قافلہ کے راستے میں اس وقت پڑتا تھا جب وہ ساحل کے راستے شام کی طرف جائیں یا واپس ہوں مگر ابوسفیان کو چونکہ اطلاع پیغمبرؐ کے روانہ ہونے کی پہنچ گئی اس لئے وہ بدر کو چھوڑ کر بالکل دریا کے کنارے کنارے مکہ چلے گئے اور رسولؐ نے بدر کے قریب رات کو قیام کیا اور زبیر بن عوام اور کچھ اپنے اصحاب کو بدر کے کنویں کے پاس بھیجا"

پھر وہ کہتا ہے۔

اور ان لوگوں کو بالکل خبر نہ تھی کہ قریش کی فوج ان کے لئے روانہ ہوئی ہے۔ یہاں پیغمبرؐ نماز پڑھنے کھڑے ہوئے اس اثناء میں قریش کے کچھ پانی بھرنے والے بدر کے کنویں پر آئے' ان میں ایک حبشی غلام بھی تھا۔ زبیر اور ان کے ساتھیوں نے اس غلام کو پکڑ لیا اور اس کے ساتھ کے آدمی اپنے لشکر کی طرف بھاگ گئے۔ یہ لوگ اسے لئے ہوئے اس جگہ آئے جہاں رسولؐ نے شب کو قیام فرمایا تھا اور اس غلام سے ابو سفیان اور اس کے ساتھیوں کو پوچھنے لگے اس یقین پر کہ یہ اسی قافلہ میں ہوگا مگر وہ غلام انہیں قریش کی فوج اور ان کے سرداروں کا حال سنانے لگا۔ باوجودیکہ وہ بالکل صحیح کیفیت بیان کر رہا تھا۔ چونکہ وہ ان لوگوں کے جذبات اور تصورات کے بالکل خلاف تھی وہ تو اس وقت صرف ابو سفیان اور اس کے ساتھ والے اموال کی دھن میں تھے اور رسول خداؐ رکوع و سجود میں مصروف تھے مگر اس حالت میں جو کچھ غلام کے ساتھ ہو رہا تھا اسے دیکھ اور سن رہے تھے تو صورت یہ تھی کہ جب وہ قریش کا ذکر کرتا تھا کہ وہ آئے ہیں اور ان کی فوج کی یہ کیفیت ہے تو یہ لوگ اسے مارنے لگتے ہیں اور اسے جھٹلاتے تھے اور کہتے تھے کہ تم ہم سے ابو سفیان اور اس کے ساتھیوں کی کیفیت چھپاتا ہے جب یہ اسے بہت مارتے تھے تو وہ مجبوراً" کہہ دیتا تھا کہ ہاں صاحب۔ ابو سفیان ہی کا قافلہ آ رہا ہے' تب یہ اسے چھوڑ دیتے تھے۔ یہی صورت دیر تک ہوتی رہی یہاں تک کہ رسولؐ نے نماز ختم کی اور آپؐ نے فرمایا قسم خدا کی جب وہ سچ کہتا ہے تو تم اسے مارتے ہو اور جب جھوٹ کہتا ہے تو اسے چھوڑ دیتے ہو۔ ان لوگوں نے کہا وہ تو کہتا ہے کہ قریش کی فوج آئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ٹھیک کہتا ہے۔ وہ اپنے قافلہ کو بچانے کے لئے آئے ہیں۔ اب آپ نے خود اس غلام کو بلایا اور اس سے دریافت فرمایا تو اس نے قریش کا حال بیان کیا اور کہا مجھے ابوسفیان کے متعلق کچھ علم نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ان لوگوں کی تعداد کتنی ہے؟ اس نے کہا مجھے پورے طور پر معلوم نہیں۔ بہرحال وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں"۔

رسولؐ کی اس گفتگو سے پہلے جہاں تک ابو سفیان کے قافلہ پر حملہ کی نیت سے اور صرف اسی نیت سے مسلمانوں کا بلکہ پیغمبر خدا کا بھی نکلنا بیان ہوا ہے۔ راوی نے ہر جز بڑے علم و یقین کے انداز میں پیش کیا ہے۔ لیکن جہاں سے رسول خدا کے متعلق اس طرح کے واقعات کا ذکر ہے جو ذرا بھی معمولی درجہ ہی تک سہی آپ کی معاملہ فہمی اور حقیقت بینی پر دلالت کرتے ہیں اسے یہ "مسلمان" مورخ زعموا کے لفظ سے بیان کرنے لگتا ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ زعم کا لفظ زیادہ تر گمان باطل یاخوش عقیدگی کے ساتھ جو خیال قائم کر لیا جائے اور جس کا کوئی ثبوت نہ ہو اس کے لئے آتی ہے چنانچہ یہ آخری جزو جو ہم نے درج کیا کہ رسولؐ نے یوں فرمایا کہ جب وہ سچ کہتا ہے تو تم اسے مارتے ہو اور جب جھوٹ کہتا ہے تو اسے چھوڑ دیتے ہو' اسے اس راوی نے زعموا کے لفظ سے بیان کیا ہے۔ یعنی مسلمانوں کی خوش عقیدگی یہ ہے کہ وہ رسولؐ کے بارے میں اس طرح کا واقعہ بیان کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد دوبارہ فزعموا "تو ان لوگوں کا خیال ہے" کہہ کر وہ بیان کرتا ہے کہ۔

"حضرت نے ان کی تعداد کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے پوچھا کہ پرسوں انہیں کھانا کس نے کھلایا تھا؟ اس نے ایک نام لیا۔ آپ نے فرمایا کتنے اونٹ اس میں نحر کرائے تھے؟ اس نے کہا نو۔ آپ نے فرمایا کل کس نے دعوت کی تھی؟ اس نے پھر ایک نام لیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس نے کتنے اونٹ نحر کرائے تھے؟ اس نے کہا دس!"

اموی خلیفہ کے مزاج کا لحاظ کرتے ہوئے پھونک پھونک کر قدم رکھنے والا مورخ پھر فزعموا کہنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ۔

"مسلمان ایسا خیال کرتے ہیں کہ یہ سن کر رسولؐ نے فرما دیا کہ یہ لوگ نو سو اور ایک ہزار کے بیچ میں ہیں' چنانچہ واقعہ یہی ثابت ہوا کہ وہ نو سو پچاس کی تعداد میں تھے۔ اس کے بعد پیغمبرؐ روانہ ہوئے اور پانی کے کنارے جا کر اتر پڑے اور اپنے لشکر گاہ میں چھوٹے چھوٹے حوض بنا کر ان میں پانی بھر لیا اور اپنے اصحاب کی

صف بندی کی یہاں تک کہ وہ فوج آئی تو انہوں نے دیکھا کہ رسولؐ پانی پر پہلے سے قیام کیے ہوئے ہیں"۔

اتنے جزو کے بیان کرنے میں راوی کو زعموا کہنے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ اس میں تو رسولؐ کی ایک عملی پیش دستی اور اموی نقطہ نظر سے قریش کی ایک طرح کی مظلومی ظاہر ہوتی ہے، لیکن اب جس جزو سے پھر رسولؐ کی حقیقت ثابت ہو وہاں پھر وہ اس احتیاطی ضمیمہ کو لگانا ضروری سمجھتا ہے اور کہتا ہے۔

فزعموا یعنی مسلمانوں کا خیال ہے کہ رسولؐ نے بارگاہ الٰہی میں ہاتھ اٹھا دیئے کہ یہ قریش اپنی پوری طاقت سے تیرے مقابلہ کے لئے آئے ہیں۔ خداوند، جو تو نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اس کا میں تجھ سے سوال کرتا ہوں"

اب بھلا جو مورخ رسولؐ کی فضیلت یا حقانیت کو وثوق و اطمینان کے ساتھ بیان کرنا نہ چاہتا ہو وہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے کسی کارنامہ، بلکہ ان کے سوا دوسرے کچھ مسلمان سپاہیوں کی بھی جانبازی اور بہادری کا بیان کس طرح پسند کر سکتا ہے۔ یا محل کے تقاضے سے کیونکر اس کی ہمت کر سکتا ہے۔ چنانچہ یہاں تک تو اس نے اتنی تفصیل سے حال بیان کیا اور اس کے بعد یہ کہہ کر وہ روداد جنگ ختم کیے دیتا ہے کہ "رسولؐ نے ان کی طرف ایک مٹھی خاک پھینک دی اور اللہ نے انہیں شکست دے دی" اللہ اللہ خیر سلا۔

اب کیا اس کے سمجھنے، سمجھانے میں کوئی دقت باقی رہ گئی کہ مسلمانوں میں جنگ بدر کے پس منظر میں اس طرح کے روایات کیوں آ گئے جو پوری ذمہ داری سلسلہ جنگ کے آغاز کی رسولؐ پر ڈال دیں، اور یاد رکھیے کہ یہ وہ اہم نقطہ ہے جس پر پیغمبر اسلامؐ کی پوری زندگی کے واقعات جہاد، بلکہ بنیادی طور پر اسلام کے نظریہ جہاد کے تعین کا انحصار ہے۔ خود مسلمانوں کی عملی زندگی کے لئے بھی اس کی اہمیت ہے کہ ایک مسلمان کے لئے تیمور، یا نادر ایسا فاتح ہونا چاہئے اور اس ضمن میں وہ چنگیز اور ہلاکو کا کردار بھی سامنے لے آئے، تو باعث فخر ہو سکتا ہے یا اکثر موقعوں پر سکوت اور چشم پوشی اور صبر و مظلومیت بھی کوئی اہمیت رکھتی ہے۔

مسلمانوں نے اس کو نہ سمجھ کر اسلام کے دامن پر ہمیشہ کے لئے دھبا لگوا دیا کہ وہ تلوار سے پھیلایا گیا ہے۔ اس کی بہت بڑی ذمہ داری بنی امیہ کے اوپر ہے۔

سلاطین بنی امیہ کی مزید خاطر داری

اس بنیادی کارروائی کے علاوہ جس سے پوری نوعیت ہی جہاد اسلامی کی بدل جاتی ہے، محدثین اور مورخین کو جنگ بدر کی رو داد کے بیان میں بھی سلاطین بنی امیہ کے جذبات کا قدم قدم پر لحاظ کرنا پڑا ہے چنانچہ باوجودیکہ جنگ بدر میں مشرکین کی طرف سے میدان میں آنے والے اور اپنے شرک و باطل پر سب سے پہلے جان قربان کرنے والے بنی امیہ ہی کے تین ممتاز افراد تھے جن کا سرگروہ معاویہ بن ابی سفیان کا نانا عتبہ بن ربیعہ تھا۔ پھر بھی مورخین نے امکانی حد تک بنی امیہ کے جرم کو جنگ بدر میں ہلکا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ طبری کے کئی صفحہ اسی قسم کے روایات سے پر ہیں کہ عتبہ بن ربیعہ نے بڑی کوشش جنگ بدر کے ٹالنے اور خونریزی کو روکنے کے لئے کی تھی مگر ابوجہل ایسا جنگ پر تلا ہوا تھا کہ وہ کسی طرح نہ مانا اور یہ اس کی شرارت تھی کہ جنگ ہو کر رہی۔ اس کے لئے ملاحظہ ہو طبری جلد ۲ صفحہ ۲۶۹، ۲۷۷، ۲۷۸ وغیرہ۔ نیز ابو سفیان کی طرف سے بھی ممکن صفائی یہ پیش کی ہے کہ وہ جب صحیح سلامت مکہ پہنچ گیا تو اس نے پیغام بھیجا کہ میں خیریت سے پہنچ گیا اب تم لوگ واپس آجاؤ مگر ان لوگوں نے شیخی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ اب یوں واپس نہ ہوں گے۔ جب تک بدر میں جا کر تین دن تک ٹھہر نہ لیں، اور ہماری طاقت کو مدینہ والے دیکھ نہ لیں پھر وہ ہمارے مقابلہ کی جرات نہ کریں گے۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۹۹)

بلکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس میں ابوسفیان کے ساتھ کسی حد تک اس جنگ آزما لشکر کی بھی صفائی کی کوشش ہے کہ ان کا بھی ارادہ اب جنگ کرنے کا نہ تھا بلکہ وہ فقط اپنی طاقت کی نمائش سے دھمکانا چاہتے تھے، مگر وہ تو رسولؐ اور

مسلمان خود جا کر ان سے بھڑ گئے اور انہیں مجبورا" جنگ کرنا پڑی' یہ ہے اموی خلفاء کے زیر اثر تاریخ کا رجحان!

صحابہ کا امتحان اور مقداد کی مجاہدانہ تقریر

جب پیغمبر خدا کو قریش کی فوج کے روانہ ہونے کی اطلاع ملی تو ان کی فوج کی کثرت اور مسلمانوں کی مادی حیثیت سے بے سروسامانی کے پیش نظر آپ نے صحابہ کو جمع فرما کر ان کے عزائم کا جائزہ لینا چاہا اور ایک تقریر فرما کر صورتحال کی نزاکت کو پیش فرماتے ہوئے ان کے خیالات دریافت کیے' اس موقع پر پہلی روایت جو ابن اسحاق کی طرف نسبت دے کر تاریخ پیش کرتی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں۔

فقام ابوبکر فقال فاحسن ثم قام عمر ابن الخطاب فقال فاحسن ثم قام المقداد بن عمر و فقال یا رسول اللّٰہ امض لما امرک اللہ فنحن معک واللّٰہ لا نقول کما قالت بنو اسرائیل لموسیٰ اذھب انت و ربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون ولکن اذھب انت و ربک فقاتلا انا معکما مقاتلون فوالذی بعثک بالحق لو سرت بنا ابی برک الغماد یعنی مدینۃ الجثۃ لجالدنا معک من دونہ حتی تبلغہ فقال لہ رسول اللّٰہ خیرا ودعالہ بخیر

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۳)

تو ابوبکر کھڑے ہوئے اور انہوں نے کچھ کہا اور خوب کہا پھر عمر بن الخطاب کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا تو بہت اچھا کہا پھر مقداد بن عمرو کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا اے رسول خدا چلئے ہمیں لے کر جہاں اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے ہم آپ کے ساتھ ہیں' خدا کی قسم ہم اس طرح نہیں کہیں گے جیسے بنی اسرائیل نے موسیٰ سے کہا تھا کہ تم جاؤ اور تمہارا پروردگار اور تم دونوں جنگ کر لو' ہم یہیں بیٹھے ہوئے ہیں بلکہ ہمارا قول یہ ہے کہ آپ چلئے اور آپ کا پروردگار اور دونوں جنگ کیجئے اور ہم بھی آپ کے ساتھ ساتھ جنگ کریں گے' قسم اس کی جس

نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا کہ اگر آپ ملک حبش کے مرکزی شہر کی طرف ہمیں لے جانا چاہیں تو ہم آپ کی معیت میں جنگ کے لئے تیار ہیں یہاں تک کہ آپ کا مقصد حاصل ہو۔ یہ سن کر رسولؐ نے ان کو شاباشی دی اور دعائے خیر کی۔

اب ذرا ہمت کرکے اس روایت کے انداز پر غور تو کیجئے۔ راوی نے پہلی دو تقریریں مبہم طور پر بیان کر دیں مضمون نہیں درج کیا کہ ان دونوں مقرروں نے کیا کہا تھا؟ "خیال خاطر احباب" یا ذاتی عقیدت کا تقاضا یا کف لسان والاصول' کسی بنا پر اس نے ان تقریروں کے خلاف کوئی تبصرہ نہیں کیا بلکہ اپنی طرف سے مجملا" کہہ دیا کہ ان دونوں حضرات نے بہت عمدہ باتیں کہیں یا بہت اچھی تقریر کی' لیکن اس راوی نے پیغمبرؐ کی طرف سے ایک حرف بھی ان تقریروں پر ارشاد فرمانے کا ذکر نہیں کیا۔ اسی سے ظاہر ہے کہ یہ دونوں تقریریں پیغمبرؐ کی مرضی کے مطابق نہیں تھیں یا دل شکن عنوان رکھتی تھیں۔ اس کے بعد جب مقداد نے یہ مجاہدانہ تقریر کی تو پیغمبرؐ خوش ہو گئے اور آپ نے انہیں دعائے خیر دی۔ اس سے حقیقت بہت حد تک سمجھ میں آجاتی ہے لیکن طبری کی دوسری روایت نے تو بالکل پردہ فاش کر دیا ہے اس میں جناب عبداللہ بن مسعود مشہور صحابی رسولؐ کی زبانی یہ درج ہے۔

لقد شھدت من المقداد مشھدا" لان اکون انا صاحبه احب الی مما فی الارض من شی کان رجلا فارسا و کان رسول اللّٰہ اذا غضب احمارت و جنتاه فاتاه المقداد علیٰ تلك الحال فقال ابشر یارسول اللّٰہ فواللّٰہ لا نقول لك کما قالت بنو اسرائیل لموسیٰ اذھب انت و ربك فقاتلا انھا ھھنا قاعدون ولکن والذی بعثك بالحق لنکونن من بین یدیك و من خلفك و عن یمینك و عن شمالك او یفتح اللّٰہ لك

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۴)

میں نے مقداد کا ایک ایسا موقف دیکھا ہے کہ وہ موقف میرے لئے حاصل ہوتا تو میرے لئے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پسندیدہ ہوتا یہ شہسوار شخص تھے اور

رسول خدا جب غضب ناک ہوتے تھے تو حضرت کے دونوں رخسارے سرخ ہو جاتے تھے اس حالت میں مقداد آپ کی خدمت میں آئے اور کہ مژدہ ہو آپ کو اے رسول خدا بخدا ہم آپ سے اس طرح نہیں کہیں گے جس طرح بنی اسرائیل نے موسیٰ سے کہا تھا کہ تم جاؤ اور تمہارا پروردگار ہم یہاں بیٹھے رہیں گے۔ بلکہ قسم اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ ہم آپ کے آگے رہیں گے، آپ کے پیچھے رہیں گے اور آپ کے دائیں بائیں رہیں گے، یہاں تک کہ اللہ آپ کو فتح عطا کرے گا۔

اب ملایئے دونوں روایتوں کو۔ بعض رواۃ نے یہ بتا دیا کہ مقداد کے پہلے کن کی تقریریں ہوئی تھیں اور اس روایت نے یہ بتا دیا کہ جب مقداد تقریر کے لئے کھڑے ہوئے ہیں تو اس وقت پیغمبرؐ کے غصہ کا کیا عالم تھا۔ اب صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان تقریروں کی نوعیت کیا تھی اور رسول خدا پر ان کا کیا اثر ہوا تھا۔

مقداد کا یہ فقرہ کہ " امض لما امرک اللّٰہ" (یعنی) "روانہ ہوجیۓ اس کے لئے جو اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی مجلس شوریٰ نہ تھی جس سے پیغمبرؐ کو اپنے لئے راہ عمل معین کرنا ہو، آپ کو تو حکم الٰہی روانگی کے لئے پہنچ ہی چکا تھا۔ اب جو جمع فرمایا تھا تو اسی مقصد سے کہ اصحاب کے عزائم سامنے آجائیں اور دلوں کی باتیں زبانوں سے سن لی جائیں اور اس کا نتیجہ بھی تاریخ میں ہمارے سامنے آگیا۔

انصار سے خطاب

اہل مدینہ کے نمائندوں نے جب مکہ معظمہ کے مقام عقبہ میں حضرتؐ سے بیعت کی تھی تو اس وقت یہ کہا تھا کہ ہم اس وقت تک آپ کی حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہیں جب تک آپ ہمارے گھر میں نہ پہنچ جائیں ہاں جب آپ ہم میں آجایئے گا تو ہم آپ کی اس طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ عہد و پیمان کی اس قید سے ایک یہ پہلو پیدا ہو سکتا تھا کہ جب آپ مدینہ کے اندر ہوں اور کوئی مدینہ میں آپ پر حملہ کرے تو ہم آپ کی حفاظت

کریں گے۔اب صورت حال یہ تھی کہ حضرت مدینہ سے نکل کر دشمن کا مقابلہ کر رہے تھے تو ایک قانونی گنجائش یہ نکلتی تھی کہ اس موقع پر انصار نصرت سے پہلو تہی کریں۔ اس لئے حضرت نے خصوصیت کے ساتھ انصار سے تخاطب فرمایا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ اس پر سعد بن معاذ نے پوچھا کہ کیا خصوصیت کے ساتھ حضورؐ ہم (اہل مدینہ) سے ہی دریافت فرما رہے ہیں؟ حضرتؐ نے فرمایا ہاں۔ اس پر انہوں نے حسب ذیل تقریر کی۔

"حضورؐ کے سوال کا جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ ہم آپ پر ایمان لائے۔ آپ کی تصدیق کی۔ اور اس کی گواہی دی کہ جو آپ لائے ہیں وہ حق ہے اور پھر ہم نے آپ کی اطاعت کا عہد کیا۔ لہٰذا ہم سے دریافت کرنا کیا ہے؟ جس مہم پر آپ جانا چاہتے ہیں تشریف لے چلیں۔قسم اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ اگر ہمیں لے کر آپ سمندر کی طرف جایئے اور اس میں پھاند پڑیے ہم اس میں آپ کے ساتھ ہوں گے۔ ہم میں کوئی ایک شخص بھی پیچھے نہیں ہٹے گا اور ہمیں اس میں کوئی ناگواری نہیں کہ آپ مستقبل قریب میں ہمارے ساتھ ہمارے دشمن سے مڈبھیڑ کریں ہم جنگ کے موقع پر ثابت قدم اور میدان کارزار میں سچے ثابت ہوں گے۔ اللہ سے امید ہے کہ وہ آپ کی نظر کے سامنے ہمارا کردار ایسا لائے گا جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔ لہٰذا اللہ کا نام لے کر چلئے۔ ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں"۔

سعد کی اس تقریر سے حضرتؐ بہت خوش ہوئے اور آپ نے فرمایا کہ اچھا اللہ کا نام لے کر چلو اور میں تمہیں فتح و ظفر کی بشارت دیتا ہوں۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۴)

حالات جنگ - دن اور تاریخ

متعدد مورخین کی تصریح ہے کہ معرکہ بدر روز جمعہ ۱۷ ماہ رمضان کو ہوا۔ (ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۵۳) علامہ سید محسن امین نے کہا ہے' ۱۷ یا ۱۹ تاریخ ہجرت نبوی سے انیس مہینہ بعد۔

(اعیان الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۱۵۲)

تعداد فوج

مسلمان اس جنگ میں تین سو سے کچھ زیادہ تھے۔ اب یہ "کچھ" کتنے تھے؟ اس میں جیسا کہ طبری نے لکھا ہے کہ تھوڑا اختلاف ہے۔ کچھ لوگوں نے معیناً بتایا ہے کہ تین سو تیرہ تھے اور یہی عام طور پر تعداد مشہور ہے جس کی تفصیل ابن عباس کی زبانی وارد ہوئی ہے۔ ستتر مہاجرین تھے اور دو سو چھتیس انصار۔ دوسرا قول تین سو اٹھارہ اور تیسرا تین سو سات کا ہے۔ لیکن زیادہ راویوں نے تین سو کے ساتھ بضعة عشر کا لفظ کہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تین سو دس سے دو چار عدد زیادہ تھے۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۲' ۲۷۳)

ان کے مقابلے میں مشرکین کی جو تعداد تھی اس کا تذکرہ عروہ ابن زبیر والی روایت میں آچکا ہے کہ وہ ایک ہزار کے قریب تھے روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی کوشش کی گئی تھی کہ کوئی قابل جنگ آدمی یا ممتاز شخص جس کا دوسروں پر اثر پڑے مکہ کے اندر نہ رہ جائے۔ ابو سفیان نے اپنی مفسدہ پردازی سے اہل مکہ کو جنگ پر آمادہ کرنے کی جو ترکیب کی تھی وہ اس انداز سے تھی کہ مکہ میں کسی آدمی کو قرار آ ہی نہ سکتا تھا۔ چنانچہ تاریخ لکھتی ہے کہ اس کا فرستادہ ضمضم بن عمرو غفاری جب مکہ کے قریب پہنچا تو اس نے دہشت انگیزی کے لئے اپنے اونٹ کی نکیل کاٹ دی۔ پالان شتر الٹ دیا اور اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور وہیں سے چیخنا شروع کر دیا کہ اے قریش والو تمہارے تمام اموال جو ابو سفیان کے ساتھ ہیں' ان پر محمدؐ اور ان کے اصحاب نے حملہ کر دیا ہے۔ جلدی خبر لو۔ الغوث' الغوث یعنی

فریاد ہے فریاد۔ اس حالت کو دیکھ کر اور آواز کو سن کر تمام لوگ بدحواس ہو گئے اور بے تحاشا چلنے پر آمادہ ہوگئے (طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۲) اور ہر آدمی کا فریضہ ہو گیا کہ یا وہ خود جاوے اور اگر خود جانے کے قابل نہ ہو تو کسی اور کو اپنی طرف سے بھیجے۔ اس طرح اشراف قریش میں سے کوئی مکہ میں باقی نہیں رہا۔ ایک بہت ہی کبیر السن جسے مٹاپے کی وجہ سے چلنے میں بھی تکلف ہوتا تھا امیہ بن خلف' اس نے ارادہ کیا تھا کہ مکہ میں رہ جائے تو عقبہ بن ابی معیط اس کے پاس آیا ایسی حالت میں جب وہ اپنی قوم کے درمیان مسجد میں بیٹھا ہوا تھا اور آگ سے سلگتی ہوئی انگیٹھی اس کے سامنے رکھ دی اور کہا تم تو بس عورتوں کی طرح تاپتے رہو۔ جس سے متاثر ہو کر وہ بھی چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ انتہا یہ ہے کہ خود پیغمبرؐ کے خاندان کے لوگ یعنی بنی ہاشم کے افراد جو کچھ مجبوریوں سے مکہ میں رہ گئے تھے انہیں بھی ان لوگوں نے اپنے ساتھ چلنے کے لئے مجبور کیا' چنانچہ رسول خداؐ کے چچا عباس اور حضرت علیؑ بن ابی طالب علیہ السلام کے بھائی عقیل' ان کے علاوہ نوفل بن حارث بن عبدالمطلب بھی اس فوج میں شامل کیے گئے' جو جنگ بدر میں مشرکین کی شکست پر مسلمانوں کے ہاتھ میں بحیثیت قیدی کے گرفتار بھی ہوئے۔ بنی ہاشم میں سے صرف ابو لہب خود نہیں آیا بلکہ اپنی جگہ عاص بن ہشام بن مغیرہ کو بھیج دیا۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۱)

کہا جاتا ہے کہ جناب ابوطالب کے سب سے بڑے فرزند طالب کو بھی زبردستی اپنے ساتھ لے گئے تھے مگر وہ عین معرکہ جنگ سے اس طرح غائب ہوئے کہ نہ اسیروں میں پائے گئے نہ مقتولین میں اور نہ اپنے گھر پر مکہ واپس ہوئے نہ پھر ان کا کوئی پتہ چلا۔ (طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۶)

علم لشکر

حضرت علیؑ کی عمر دس سال کی تھی جب پیغمبر خداؐ نے اعلان رسالت فرمایا۔ اس کے بعد تیرہ برس جو مکہ میں گزرے وہ تمام زحمتوں اور مشقتوں میں بسر ہوئے

جب کہ رسول جنگ پر مامور نہ تھے اس لئے ایسا کوئی موقع پیش نہیں آیا جب حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ تیغ آزمائی کرتے، مگر یہ رسولؐ کی نگاہ انتخاب تھی جو علی بن ابی طالبؑ کی صلاحیتوں کو بغیر کسی آزمائش کے خوب دیکھ رہی تھی کہ اس پہلی اسلام کی لڑائی میں جناب حمزہ ایسے مرد میدان کی موجودگی میں آپ نے مہاجرین کا علم علیؑ بن ابی طالبؑ کے سپرد کیا اور انصار کا علم بردار سعد بن عبادہ کو بنایا۔

(تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۲)

ابتدائی شہید

آغاز جنگ تیروں سے ہوا جو مشرکین نے روانہ کیے، چنانچہ ان میں پہلا تیر مہجع مولی عمر بن الخطاب کو لگا اور وہ کام آئے۔ پھر بنی عدی بن نجار میں سے حارثہ بن سراقہ حوض پر پانی پی رہے تھے ایک تیر ان پر پڑا جس سے وہ جاں بحق تسلیم ہوئے۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۱)

دست بدست مقابلہ

کہاں تو اموی مورخین یہ دکھلا رہے تھے کہ عتبہ بن ربیعہ بڑا صلح پسند آدمی تھا اور کہاں جب جنگ چھڑی تو مشرکین میں سے مقابلہ کے لئے سب سے پہلے یہی عتبہ اپنے بھائی شیبہ اور اپنے بیٹے ولید کے ساتھ نکلا۔ کہا جاتا ہے کہ ابوجہل نے اس پر بزدلی کا الزام لگایا جس پر اسے جوش آگیا اور اب یہ مورخین اس کی اہمیت دکھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں کہ اس نے اپنے کو ایک دم اسلحہ جنگ سے آراستہ کرنا شروع کیا تو لوہے کا خود تلاش کیا۔ مگر اس کا سر اتنا بڑا تھا کہ پورے لشکر میں ایسا خود نہ ملا جو اس کے سر پر آسکے، مجبوراً اس نے اپنی چادر کو سر پر باندھ لیا۔ ابھی وہ میدان میں نکلنے نہیں پایا تھا کہ ایک شخص مشرکین میں سے جو بہت ہی بد مزاج اور بد اخلاق تھا، اسود بن عبدالاسد مخزومی اس نے قسم کھائی کہ میں جا کر پانی کے اس حوض سے جو مسلمانوں نے بنایا ہے پانی پیوں گا اور اسے گرا دوں گا۔ چنانچہ اس حوض کی طرف روانہ ہو گیا۔ ادھر سے جناب حمزہ بن

عبدالمطلب نے اسے دیکھ لیا اور انہوں نے بڑھ کر اس کے پیر پر تلوار لگائی جس سے اس کی پنڈلی کٹ گئی اور وہ گر گیا۔ مگر اپنی جہالت سے باز نہ آیا اور زمین پر گھسٹ گھسٹ کر اسی حال میں حوض تک پہنچ کر وہ اس میں گر گیا تاکہ اپنی قسم پوری کر لے۔ جناب حمزہ نے اسی حوض میں اسے قتل کیا۔ اتنی دیر میں عتبہ تیاز ہو چکا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے میدان جنگ میں وہی تینوں آدمی مبارز طلبی کے لئے نکلے یعنی عتبہ بن ربیعہ اس کا بھائی شیبہ بن ربیعہ اور تیسرے اس کا بیٹا ولید بن عتبہ۔

ادھر سے انصار کے چند نوجوان نکلے۔ عتبہ نے کہا ہمیں تم سے مقابلہ نہیں کرنا ہے، ہمارے سامنے ہمارے خاندان والے عبدالمطلب کی نسل کے لوگ کیوں نہیں آتے۔ پیغمبر خداؐ کی نظر انتخاب اب حمزہ اور عبیدہ کے ساتھ جو معمر ہونے کی بنا پر مختلف جنگوں میں قبل اسلام بھی ممکن ہے کارہائے نمایاں کیے ہوئے ہوں، علی بن ابی طالبؑ پر پڑی اور وہیں جو علم بردار بنایا گیا تھا ایک سپاہی کی حیثیت سے پکارا گیا۔ تاریخ کے الفاظ یہ ہیں کہ رسولؐ نے آواز دی۔

یا علی قم یا حمزة قم یا عبیدة بن الحارث قم

(تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۰)

اے علیؑ تم اٹھو، اے حمزہ آپ اٹھئے اے عبیدہ بن حارث آپ اٹھئے۔

یہ عبیدہ بھی رسولؐ کے چچا زاد بھائی تھے۔ مگر کافی کبیر السن تھے جبکہ جناب حمزہ رسولؐ کے چچا ہونے کے ساتھ آپ کے ہم عمر تھے اور ان دونوں کے مقابلہ میں علیؑ گویا بچہ کی حیثیت رکھتے تھے یعنی اس وقت صرف چوبیسواں برس تھا۔

عبیدہ جو سب سے زیادہ عمر رکھتے تھے عتبہ کے مد مقابل میں نبرد آزما ہوئے اور حمزہ شیبہ کے مقابلہ میں اور علیؑ ولید کے سامنے آئے۔ جو ادھر والوں میں عمر کے لحاظ سے جوان تھا چنانچہ جناب حمزہ اور حضرت علیؑ نے بلا توقف اپنے اپنے حریفوں کا خاتمہ کیا۔ مگر عبیدہ اور عتبہ میں یہ ہوا کہ دونوں نے اپنے مدمقابل کو گھائل کر دیا اور عبیدہ کے چونکہ پیر پر تلوار پڑی اس لئے وہ گر گئے مگر یہاں حمزہ اور علیؑ دونوں

اپنے مد مقابل کی جنگ سے فراغت پا چکے تھے اس لئے عتبہ زندہ پلٹ نہ سکا اور وہ ان کی تلواروں سے ختم ہو گیا۔ (طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۹) دونوں بزرگوار عبیدہ کو اٹھا کر رسول خداؐ کی خدمت میں لے گئے' عبیدہ کو جیسے اس وقت اپنے زندہ رہ جانے کا افسوس تھا' چنانچہ رسولؐ سے پوچھا یا رسول اللہؐ کیا میں شہیدوں میں محسوب نہ ہو سکوں گا؟ حضرتؐ نے فرمایا کیوں نہیں' یعنی آپ ضرور اجر شہادت کے مستحق ہیں۔ (طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۹) بعد میں عبیدہ اس زخم سے جانبر نہیں ہوئے اور تھوڑے ہی دن کے بعد جاں بحق تسلیم ہوئے۔

فرشتوں کی امداد

یہ امر مذہبی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے ناقابل انکار ہے کہ اس جنگ میں صفوف ملائکہ بھی بحکم الٰہی امداد کے لئے حاضر تھے جس کا تذکرہ صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں ہے۔ تاریخ میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے اس طرح کہ جب جنگ ختم ہوئی تو قیدیوں میں عباس بن عبدالمطلب بھی تھے جنہیں اسیر کر کے انصار کا ایک شخص رسولؐ کے پاس لایا۔ عباس نے کہا حقیقت میں اس نے مجھے گرفتار نہیں کیا تھا۔ وہ تو ایک نہایت خوبصورت شخص ایک ابلق گھوڑے پر تھا جو اب نظر نہیں آتا۔ انصاری نے کہا واہ میں نے گرفتار کیا ہے۔ رسولؐ نے فرمایا' دونوں باتیں سچ ہیں۔ تم نے گرفتاری کی کوشش کی اور خدا نے تمہاری مدد اپنے ایک فرشتہ کے ذریعے سے کی۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۰)

جناب ابن عباس کی روایت ہے کہ قبیلہ غفار کے ایک شخص نے جو بعد میں اسلام لے آیا تھا بیان کیا کہ جنگ بدر میں میں اپنے ایک چچا زاد بھائی کے ساتھ جب کہ ہم دونوں ابھی دائرہ شرک میں تھے ایک پہاڑ پر چڑھ کر اس انتظار میں ٹھہرا کر مسلمانوں کو شکست ہو تو مال غنیمت لوٹنے میں ہم بھی شریک ہو جائیں' تو ہم نے ایک دفعہ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنی اور کسی کی صدا جو اپنے گھوڑے کو للکار رہا تھا کہ بڑھ تیز قدم بڑھ' میرے ساتھی پر تو ایسی دہشت طاری ہوئی کہ وہ

اسی وقت ختم ہو گیا اور میں بھی بس قریب مرگ ہو گیا تھا پر سنبھل گیا۔

اس کے ساتھ ایک مسلمان مجاہد ابو داؤد مازنی کا بیان ہے کہ میں مشرکین میں سے ایک شخص کا پیچھا کر رہا تھا کہ اسے قتل کروں کہ ایک دفعہ اس کا سر کٹ کے زمین پر آ رہا حالانکہ میری تلوار اس سے بھی دور تھی۔ میں سمجھا کہ اسے کسی اور نے قتل کر دیا جو آنکھوں کے سامنے نہ تھا۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۳)

ایک اور واقعہ جس کے راوی ابو رافع ہیں جو پہلے عباس بن عبدالمطلب کے غلام تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ہمارے گھر میں اسلام داخل ہو چکا تھا مگر عباس صلعم" اس کا اظہار نہ کرتے تھے۔ ہم سب لوگ بھی عالم تقیہ میں تھے۔ جنگ بدر جو ختم ہوئی تو ابو سفیان بن حارث بن عبدالمطلب واپس ہوئے۔ ابو لہب نے ان سے جنگ کی روداد پوچھنا شروع کی۔ وہ بیٹھ کے بیان کرنے لگے اور بہت سے لوگ کھڑے ہو کر اس کو سننے لگے۔ انہوں نے فوج مشرکین کی شکست کا حال بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں تو ان پر کسی بزدلی کا الزام نہ لگاؤں گا۔ ہمارا مقابلہ تو کچھ نئی طرح کے گورے رنگ کے اشخاص سے ہوا تھا جو آسمان و زمین کے درمیان چل رہے تھے۔ ابلق گھوڑوں پر سوار ان کا مقابلہ کوئی کر ہی نہیں سکتا تھا (ابو رافع کا بیان ہے (یہ سنتا تھا کہ بیساختہ میرے منہ سے نکل گیا کہ وہ فرشتے تھے۔ یہ سنتے ہی ابولہب نے ہاتھ اٹھایا اور میرے منہ پر زور سے تھپڑ مار دیا۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۱۸۸)

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فرشتے اس طرح تھے کہ مسلمان سپاہی ان کو نہیں دیکھ رہے تھے لیکن فریق مخالف کی فوج کے اکثر افراد انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ گویا مسلمانوں کے لئے یہ بھی ایمان بالغیب کا ایک امتحان ہی تھا۔

رسول اللہ ؐ کی شجاعت

یہ اسلام کی سب سے پہلی لڑائی تھی، اس لئے عام مسلمانوں پر بڑا ہراس تھا۔

اس موقع پر حضرت پیغمبر خداؐ کی طمانیت و استقلال اور شجاعت و ہمت کا اظہار مسلمانوں کے سب سے بڑے شجاع حضرت علی بن ابی طالب نے اس طرح کیا ہے کہ جب بدر کا موقع تھا اور مقابلہ آن پڑا تو تمام فوج رسول اللہؐ کی پناہ میں تھی اور آپ کی جرات و ہمت سب سے زیادہ نمایاں تھی اور آپ ہم سب میں زیادہ دشمن سے قریب تھے۔

(تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۰)

اس سے سے ظاہر ہے کہ پیغمبر خداؐ مسلمانوں سے الگ کسی جاء نے پناہ (مثلاً عریش وغیرہ) میں نہ تھے اور کوئی صاحب آپ کے محافظ بن کر کھڑے نہیں ہوئے تھے۔

یہ استقلال اور استحکام رسولؐ کا تو خلق کے سامنے تھا اور حق کی بارگاہ میں جو تذلل اور عاجزی کی کیفیت تھی وہ بھی حضرت علیؑ کی دوسری روایت سے ظاہر ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا جنگ بدر والی رات کو ہم میں سے ہر ایک کچھ نہ کچھ سویا مگر رسول خداؐ ایک درخت کے نیچے رات بھر کھڑے نمازیں پڑھتے رہے اور دعائیں مانگتے رہے۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۰)

کچھ شہدائے اسلام

جناب عبیدہ بن الحارث بن عبدالمطلب نیز آغاز جنگ کے سلسلہ میں جن دو مجاہدوں کی نیزوں سے شہادت ہوئی۔ ان کے علاوہ اس جنگ میں جو مسلمان شہید ہوئے ان میں سے دو کا بڑا دلچسپ تذکرہ تاریخ میں ملتا ہے۔

۱۔ عمیر بن حمام جو بنی سلمہ میں سے تھے رسولؐ نے ترغیب جہاد کے لئے تقریر فرمائی اور ارشاد کیا۔

والذی نفس محمد بیده لا یقاتلهم الیوم رجل فیقتل صابرا محتسبا مقبلا غیر مدبر الا ادخله اللّٰه الجنة

قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے کہ ان سے آج جو بھی شخص

جنگ کرے گا اور قتل ہو جائے گا صبر و ضبط کے ساتھ رضائے الہٰی کے پیش نظر اس طرح کہ آگے بڑھتا رہے' پیٹھ نہ پھرائے تو اسے اللہ بہشت میں داخل کرے گا۔

عمیر بن حمام اس وقت رطب کھا رہے تھے۔ یہ الفاظ سننا تھے کہ انہوں نے رطب ہاتھ سے پھینک دیئے اور کہا جنت تک پہنچنے میں اتنی ہی دیر تو ہے کہ یہ لوگ مجھے قتل کر دیں بس یہ کہا اور فوج دشمن پر حملہ کر دیا یہاں تک کہ قتل ہوئے۔

۲۔ عوف بن حارث بن عفراء۔ انہوں نے رسول اللہؐ کے پاس آکر کہا' بندہ کا کیا عمل ہو سکتا ہے جو اپنے پروردگار کو ہنسا دے؟ آپ نے فرمایا یہ کہ وہ جہاد کے وقت دشمن کے سامنے زرہ بھی جسم سے الگ کر دے۔ یہ سننا تھا کہ انہوں نے زرہ بھی جسم سے اتار کر پھینک دی اور تلوار لے کر جنگ کرنے لگے یہاں تک کہ قتل ہوئے۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۱)

نتیجہ جنگ مشرکین کی شکست اوران کے مقتولین کی کثرت اور اہمیت

اسے غیبی امداد نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے کہ جنگ بدر میں باوجودیکہ مسلمانوں کی طرف انتہائی بے سروسامانی تھی اور تعداد بھی ان کی بہت کم تھی' پھر بھی اس جنگ کے نتیجہ میں جو نمایاں کامیابی مسلمانوں کو ہوئی ویسی پھر کبھی نظر نہیں آتی۔ ان لڑائیوں میں کہ جو بعد میں ہوئیں جن میں مسلمانوں کی تعداد بھی نسبتاً زیادہ ہو گئی تھی۔ ان کے دل بھی بڑھ چکے تھے اور ساز و سامان بھی جنگ کا کافی فراہم ہو چکا تھا اس لئے کہ اس جنگ میں مشرکین کو اس معنیٰ میں شکست نہیں ہوئی کہ وہ ناکام ہو کر واپس چلے گئے ہوں اور ان کی فوج منتشر ہو گئی ہو بلکہ اس کے علاوہ یہ ہوا کہ جتنے ان کے سر برآوردہ افراد اور رؤسائے لشکر تھے سب ہی تقریباً اس معرکہ میں قتل ہو گئے جیسے عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ جن

کے قتل کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ان کے علاوہ سب سے بڑا انکا سرغنہ ابوجہل بن ہشام اور اس کے ساتھ زمعہ بن اسود اور ابوالبختری بن ہشام اور امیہ بن خلف اور نبیہ اور منبہ فرزندان حجاج وغیرہ یہ سب ہی اشخاص اس جنگ میں کام آئے چنانچہ ان میں سے بعض کی مختصر کیفیت درج کی جاتی ہے۔

ابوالبختری

اس شخص کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ یہ حضرت پیغمبر خداؐ کے مکہ معظمہ میں قیام کے دور میں جب آپ پر مظالم کی شدت تھی تو لوگوں کو آپ کی ایذا رسانی سے بہت حد تک روکتا تھا اور شعب ابی طالب کے محاصرہ کے وقت بنی ہاشم سے ترک تعلقات کا جو معاہدہ لکھا گیا تھا۔ اس معاہدہ کو منسوخ کرانے میں بھی یہ پیش پیش تھا اس لئے حضرت پیغمبر خداؐ نے بدر میں تمام مسلمانوں کو ہدایت فرما دی تھی کہ یہ ملے تو اسے قتل نہ کیا جائے مگر بدر میں جب یہ آیا ہے تو ایک عزیز اس کا اس کے ناقہ پر ہم سفر تھا۔ یہ ملیحہ دختر زہیر بن حارث بن اسد کا لڑکا جنادہ تھا اور ابوالبختری کا نام مع نسب عاص ابن ہشام بن حارث بن اسد تھا۔ اس طرح جنادہ اس کا بھانجا ہوتا تھا' میدان جنگ میں جماعت انصار کے ایک شخص مجذر بن زیاد بلوی سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو مجذر نے کہا کہ تم اپنی جان بچا کر نکل جاؤ اس لئے کہ رسول خداؐ نے تمہارے قتل کرنے سے منع کیا ہے' اس نے کہا کہ اور میرا ساتھی جو ناقہ پر میرے ساتھ آیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہم تنہا تمہاری حفاظت کے ذمہ دار ہیں' اس نے کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ میں بھی اس کے ساتھ جان دوں گا۔ ورنہ قریش کی عورتیں مکہ میں چرچا کریں گی کہ میں نے زندہ رہنے کے لالچ میں اپنے ساتھی کو چھوڑ دیا اور یہ کہہ کر مجذر سے جنگ کرنے لگا۔ وہ رجز میں یہ شعر پڑھ رہا تھا۔

لن یسلم ان حرة الیله
حتی یموت او یری سبیله

مطلب یہ ہے کہ کوئی شریف آدمی اپنے ساتھی کو نہیں چھوڑا کرتا جب تک

خود بھی اس کے ساتھ مر نہ جائے۔

بالآخر جنگ ہوئی اور مجذر بن زیاد نے اسے قتل کر ڈالا اور پیغمبر خداؐ کے پاس آکر عذر خواہی کے انداز میں روداد بیان کی کہ میں نے بڑی کوشش کی کہ میں اسے قتل نہ کروں اور زندہ ہی آپ کے پاس لے آؤں مگر اس نے جنگ کے سوا کوئی صورت قبول نہ کی، مجبوراً میں نے جنگ کی اور قتل کر دیا۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۲)

ہمارے نزدیک اب وارا نیارا تو اس کا ہی ہو چکا تھا اس لئے شاید رسالت مآبؐ نے یہ سن کر سکوت فرمایا ہو ورنہ جو روداد تاریخ نے پیش کی ہے اس کے لحاظ سے اگر مجذر خود اسے اپنا فیصلہ نہ سنا دیتے اور کہتے کہ چلو رسولؐ کے پاس اور اپنے عزیز کے لئے بھی کہو، ممکن ہے پیغمبر خداؐ اسے بھی معاف کر دیں تو شاید وہ اس پر تیار ہو جاتا اور ممکن ہے کہ پھر رسول خداؐ اس کے سابق کردار کے پاس و لحاظ سے جو آپ کے پیش نظر تھا اس کے عزیز کے بارے میں بھی اس کی مطلب براری فرما دیتے۔

امیہ بن خلف

یہ شخص اکابر قریش میں سے تھا اور اسلام کے خلاف بڑا متشدد۔ یہی شخص تھا جو مکہ میں بلال پر انتہائی ستم ڈھاتا تھا تاکہ وہ اسلام چھوڑ دیں۔ چنانچہ وہ انہیں مکہ کے ریگستان کی طرف لے جاتا تھا اور دوپہر کی دھوپ میں ان کے جسم کو برہنہ کرکے انہیں ریگ پر لٹاتا تھا اور پھر ایک بڑا پتھر منگوا کر ان کے سینے پر رکھتا تھا اور کہتا تھا کہ محمدؐ کے دین کو چھوڑو۔ لیکن وہ احد احد یعنی "خدا ایک ہے" کے نعرے لگاتے رہتے تھے۔ ہاں اس شخص کی جناب عبدالرحمٰن بن عوف کے ساتھ جو روایات جمہور کے مطابق بڑے درجہ کے صحابی اور عشرہ مبشرہ کے ایک فرد ہیں بڑی دوستی تھی۔ خود ابن عوف کا بیان ہے کہ میرا پہلا نام عبد عمرو تھا۔ جب میں مسلمان ہوا تو میرا نام عبدالرحمٰن قرار دیا گیا مگر میری دوستی امیہ بن خلف کے ساتھ قائم رہی۔ وہ جب مجھے ملتا تھا تو عبد عمرو کہہ کر پکارتا تھا اور کہتا تھا کہ اس نام کو

چھوڑ دو گے جو تمہارے باپ نے تمہارا رکھا تھا؟ میں کہہ دیتا کہ ہاں وہ نام اب میں نہیں چاہتا وہ کہتا تھا کہ میں " الرحمٰن " کو نہیں پہچانتا۔ لہٰذا کوئی درمیانی نام بتاؤ جس سے میں تمہیں پکاروں۔ اس لئے کہ میں عبد عمرو کہوں گا تو تم جواب نہ دو گے اور میں عبدالرحمٰن کہہ کر پکارنے سے رہا۔ میں نے کہا تم ہی کوئی درمیانی نام تجویز کرو۔ اس نے کہا عبداللہ میں نے کہا ہاں ٹھیک ہے۔ چنانچہ جب وہ میری طرف سے گزرتا تھا تو مجھے عبد اللہ کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور میں جواب دیتا تھا۔ گفتگو ہوا کرتی تھی۔ جنگ بدر کے موقع پر میں نے دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے علی بن امیہ کا ہاتھ پکڑے کھڑا ہے اور میرے ہاتھ میں کچھ زرہیں تھیں جن پر میں نے مال غنیمت کے طور پر مقتولین کے جسم سے اتار کر قبضہ کر لیا تھا' اس نے مجھے دیکھتے ہی پکارا۔ یا عبد عمرو! میں نے جواب نہیں دیا تو اس نے کہا یا عبدالالہ ! میں بولا کہو' کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا' کیا تم مجھے اپنے ساتھ لیتے ہو؟ میں تمہارے لئے ان زرہوں سے بہتر ہوں جو تمہارے ہاتھ میں ہیں۔ میں نے کہا' ہاں ٹھیک ہے۔ اور میں نے زرہیں اپنے ہاتھ سے پھینک دیں اور ایک ہاتھ سے اس کا اور ایک ہاتھ سے اس کے بیٹے علی کا ہاتھ پکڑ لیا اور دونوں کو اپنے ساتھ لے چلا۔ اب تقریباً ان دونوں کو اطمینان ہو گیا تھا کہ جان بچ گئی۔ چنانچہ راستے میں اس نے پوچھا کہ اے عبدالالہ بتاؤ وہ شخص کون تھا جس کے سینہ پر شتر مرغ کے پر کا نشان لگا ہے؟ میں نے کہا کہ وہ حمزہ بن عبدالمطلب ہیں عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ میں ان دونوں کو اپنے ساتھ لیے جا رہا تھا کہ ایک دفعہ بلال کی اس پر نظر پڑ گئی اور انہیں وہ مظالم یاد آ گئے جو یہ شخص ان پر کرتا تھا اور پکار کے کہا کہ ارے یہ تو راس الکفر امیہ بن خلف ہے۔ یہ زندہ نہیں جا سکتا۔ میں نے کہا یہ دونوں میرے قیدی ہیں۔ بلال نے کہا ہوا کرے۔ میں زندہ ہوں تو یہ زندہ نہیں رہ سکتا اور یہ کہہ کر مسلمانوں کو للکارا کہ اے انصار خدا' یہ راس الکفر امیہ بن خلف ہے۔ زندہ نہ جانے پائے۔ بس مسلمانوں کی جماعت نے ہمارا حلقہ کر لیا اور حملہ کر دیا اور میں ان دونوں کو بچا رہا تھا۔ اتنی دیر میں ایک شخص نے اس کے بیٹے پر تلوار لگائی اور وہ

گر گیا اور امیہ نے ایسی چیخ ماری جیسی میں نے کبھی نہیں سنی تھی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے دونوں کا کام تمام کر دیا۔

عبدالرحمٰن بن عوف کو ہمیشہ افسوس رہا اور کہتے تھے کہ بلال کی بدولت میری زرہیں بھی گئیں اور دونوں قیدی بھی بچ نہ سکے۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۳)

ابو جہل

تمام فوج کا سرغنہ ابو جہل بن ہشام تھا مگر اس کے متعلق کوئی صاف بات معلوم نہیں ہو رہی تھی کہ اس کا کیا حشر ہوا؟ چنانچہ پیغمبر خدا نے حکم دیا کہ اسے مقتولین کی لاشوں میں ڈھونڈھا جائے۔ حضرت نے فرمایا' اگر تمہیں صورت کے پہچاننے میں دشواری ہو تو ایک پہچان اس کی میں بتلائے دیتا ہوں کہ اس کے گھٹنے میں ایک زخم کا نشان ہے جس کا واقعہ یہ ہے کہ بچپن میں اس نے مجھ سے ایک مرتبہ جھگڑا کیا اور میں نے اسے دھکا دیا تو وہ گھٹنے کے بل زمین پر گر گیا جس سے اس کے گھٹنے پر ایسا زخم آیا کہ مندمل ہونے کے بعد بھی اس کا نشان ہمیشہ باقی رہا۔ اس نے پھر مکہ میں دعوت اسلام کی مخالفت بھی انتہائی شدت کے ساتھ کی تھی اس لئے تمام مسلمانوں کو اس کی فکر تھی۔ آخر عبداللہ بن مسعود نے لاشوں کے اندر سے اسے پا لیا۔

انصار میں سے ایک جوان معاذ بن عمرو بن جموح نے بعد میں یہ کیفیت بتائی کہ سب سے پہلے ابو جہل سے میری مڈبھیڑ ہوئی اور میں نے مشرکین کو سنا کہ وہ پکار پکار کے کہہ رہے ہیں کہ دیکھو ابوالحکم تک کوئی پہنچنے نہ پائے۔ یہ ابو جہل کی کنیت تھی جو مشرکین کے یہاں تھی۔ ابو جہل تو اسے مسلمانوں نے کہنا شروع کیا تھا جو اب تاریخ اسلام میں اس کا نام ہو گیا ہے۔ معاذ کا بیان ہے کہ جب میں نے یہ سنا تو میں نے بھی اسی کو اپنا نصب العین بنا لیا۔ چنانچہ جوں ہی موقع ملا میں نے اس پر حملہ کیا تو ضرب اس کی پنڈلی پر پڑی جس سے وہ زمین پر گر پڑا مگر اس کے بیٹے عکرمہ نے میرے شانہ پر تلوار لگائی اور میرا ہاتھ اس طرح کٹ گیا کہ بس کھال رہ

گئی اور ہاتھ اس کھال میں لٹکنے لگا۔ اب میں ایک ہاتھ سے جنگ کرنے لگا مگر وہ لٹکتا ہوا ہاتھ میرے لئے باعث زحمت تھا تو میں نے اپنے پیر سے نیچے ہاتھ کو رکھ کر اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ وہ جدا ہو گیا اور میں نے اسے پھینک دیا۔

مورخین کا بیان ہے کہ معاذ اس کے بعد خلیفہ سوم کے دور تک زندہ رہے۔

اب ابوجہل زخمی تو ہو چکا تھا مگر یہ زخم اس کے لئے باعث ہلاکت نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد ادھر سے ایک دوسرے انصاری معوذ بن عفراء کا گزر ہوا تو انہوں نے اس پر ضرب لگائی جس سے وہ نیم جان ہو گیا۔ پھر بھی اس میں رمق جان باقی تھی۔ اور معوذ دوسرے لوگوں سے جنگ میں شہید ہو گئے۔ ابوجہل لاشوں کے ساتھ زخمی حالت میں پڑا رہ گیا۔ یہاں تک کہ ابن مسعود تلاش کرتے ہوئے اس تک پہنچے خود ابن مسعود ایک دفعہ مکہ میں اس کی لاتیں کھا چکے تھے اور اس کے ہاتھ سے بڑی اذیت اٹھا چکے تھے۔ اب آخر میں انہوں نے اس کی زندگی کا خاتمہ کیا اور اس کا سر جسم سے جدا کر کے پیغمبر خداؐ کے پاس لائے جس پر حضرتؐ نے شکر خدا ادا کیا۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۴)

نضر بن حارث بن کلدہ

اس کا باپ عرب کا مشہور طبیب تھا اور یہ خود جماعت مشرکین میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ یہ زندہ گرفتار ہوا تھا پھر اسے رسولؐ کے حکم سے حضرت علیؑ بن ابی طالب علیہ السلام نے قتل کیا۔

عقبہ بن ابی معیط

یہ بھی زندہ گرفتار ہوا تھا۔ پیغمبر خدا نے اس کے بھی قتل کا حکم دیا۔ چنانچہ جماعت انصار میں سے عاصم بن ثابت نے اس کا کام تمام کیا۔

جنگ کے بعد - مال غنیمت پر اختلاف

یہ فتح مبین جو مسلمانوں کو حاصل ہوئی اس پر مسلمان جتنا بھی شکر الٰہی ادا کرتے کم تھا۔ اس فتح کو بلا کسی تاویل و تکلف کے صرف تائید الٰہی کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے جس میں دلاوران اسلام کے عملی کارنامہ کی منزل پر تاریخ صرف تین ہی شخصیتوں کا پتہ دیتی ہے جو تینوں اولاد عبدالمطلب یعنی رسولؐ کے قریبی گھرانے کے افراد ہیں۔ ایک حمزہ دوسرے عبیدہ جو درجہ شہادت پر فائز ہوئے اور تیسرے علی بن ابی طالبؑ۔ ان کے علاوہ اور کسی مسلمان کا کوئی بڑا کارنامہ اس معرکے میں سامنے نہیں آیا مگر جنگ سر ہوئی تو مال غنیمت پر حق جمانے کے لئے مسلمانوں میں جھگڑا ہونے لگا جن لوگوں نے ان اموال غنیمت کو لوٹا تھا ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ اس کا لوٹا ہوا مال خود اس کا قرار دیا جائے وہ لوگ جو مورچے پر تھے کہہ رہے تھے کہ ہم اگر دشمن سے مقابلہ نہ کرتے تو تمہیں اس کا لوٹنا نصیب ہی کہاں ہوتا۔ اسلئے ہمارا بھی اس میں حصہ ہونا چاہئے۔ کچھ لوگ جو حفاظت کی خاطر یا خود پناہ لئے ہوئے رسول خداؐ کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے انہوں نے کہا کہ ہم تو حفاظت رسولؐ کی وجہ سے جنگ میں شریک نہ ہو سکے لہٰذا ہمارا حصہ بھی سب کے برابر ہے یہ نزاع اتنی اہمیت اختیار کر گئی کہ ایک مستقل سورہ قرآن کا "الانفال" اس کے تصفیہ کے لئے اترا اور خالق کی طرف سے یہ فیصلہ ہوا کہ یہ تمام اموال پیغمبرؐ سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے ان کو تمام مسلمانوں میں برابر سے تقسیم فرما دیا۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۵، ۲۸۶)

ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ جب اس خاص الخاص جماعت صحابہ میں جو " بدریین" کے معزز نام سے حدیث اور تاریخ میں امتیاز رکھتی ہے مال غنیمت کے سلسلہ میں یہ ذہنیت کارفرما ہے تو آئندہ چل کر جب فتوحات میں وسعت ہو گی اور اموال غنیمت کی بدرجہا زیادہ فراوانی ہو گی اور مسلمانوں میں بھی عوام کی کثرت رائے ہو جائے گی تو اس وقت نفسی نفسی کا کیا عالم ہوگا؟ اور جب اس تھوڑے

سے مال غنیمت کے لئے یہ عالم تو جب مسند اقتدار اور گویا تاج و تخت کا سوال پیدا ہوگا تو اس وقت للہیت' خلوص اور صاحبان حقوق کے حقوق کا لحاظ کہاں قائم رہ سکتا ہے۔

مکہ میں خبر

رؤسائے قریش کے مقتول اور اسیر ہونے کی خبر پہلے ان اکا دکا آدمیوں سے جو فراریوں کی حیثیت سے وہاں پہنچے سنی گئی تو لوگوں نے انہیں جھٹلایا' چنانچہ ان میں سے ایک شخص نے جب مقتولین کے نام گنوانا شروع کیے جو بڑے بڑے آدمی تھے تو صفوان بن امیہ جو حجر اسماعیل میں بیٹھا ہوا تھا ایک آدمی سے کہا کہ ذرا اس سے میرے متعلق دریافت کرو مطلب یہ تھا کہ سب غلط سلط کہہ رہا ہے تو مجھے بھی مقتولین میں شمار کر دے گا۔ چنانچہ کسی نے کہا کہ صفوان بن امیہ کا کیا ہوا؟ اس نے کہا وہ تو سامنے حجر اسماعیل میں بیٹھے ہوئے ہیں مگر میں نے ان کے باپ (امیہ بن خلف) اور بھائی کو اپنی آنکھوں سے قتل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۷)

جیسا کہ اس روایت کا ابتدائی حصہ پہلے آچکا ہے۔ ابو رافع نے جو عبدالمطلب کے غلام تھے اور اپنے مالک اور ان کے گھر والوں کی طرح عالم تقیہ میں مکہ کے اندر زندگی گزار رہے تھے بیان کیا ہے کہ جب ابولہب جنگ کے حالات کسی سے پوچھ رہا تھا تو اس شخص نے کہا کہ شکست نہ کھاتے تو کیا کرتے۔ ہمارے مقابلہ میں تو کچھ نئی طرح کے نورانی چہروں کے سپاہی آئے جن کے سامنے کوئی ٹھہرتا ہی نہیں تھا۔ ابو رافع کہتے ہیں کہ میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا کہ وہ فرشتے تھے۔ بس یہ سننا تھا کہ ابولہب نے مجھے طمانچہ مارا اور زمین پر مجھے گرا کر میرے سینہ پر چڑھ بیٹھا یہ دیکھ کر میری مالکہ ام الفضل زوجہ عباس لکڑی کا ایک ستون لئے ہوئے جھپٹیں۔ انہوں نے ابولہب کے سر پر اسے مارا اور کہا کہ اس کا مالک نہیں موجود ہے تو تم نے اسے کمزور سمجھ لیا ہے۔ ابولہب زخمی ہو کر ذلت کی حالت میں وہاں سے چلا گیا۔ (طبری جلد ۲

ابو لہب کی ہلاکت

ابولہب خود جنگ بدر میں نہیں گیا تھا اس نے اپنی طرف سے ایک دوسرے شخص عاص بن ہشام بن مغیرہ کو بھیج دیا تھا مگر خالق کو اب اور روسائے قریش کی طرح اس کی بھی زندگی کا خاتمہ کرنا تھا۔ چنانچہ جنگ بدر کے چند دن کے بعد بڑی خراب قسم کی چیچک میں مبتلا ہوا اور ہلاک ہو گیا۔ چونکہ اس مرض کو شدید طور پر متعدی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے لڑکوں تک نے اس کے قریب جانے سے پرہیز کیا۔ یہاں تک کہ اس کی لاش سے بدبو اطراف میں پھیلنے لگی تو لوگوں نے اس کے لڑکوں کو برا بھلا کہا اور آخر سب مل کر آئے اور بغیر غسل و کفن کے اسے اٹھا کر مکہ کے باہر ایک جگہ لے جا کر ڈال دیا اور دور سے اس پر پتھر برسائے۔ اتنے کہ اس کا جسم دب گیا۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۸۸)

مشرکین کی ذہنیت اور گریہ کی ممانعت

کہا جاتا ہے کہ شروع میں قریش کے گھروں میں مقتولین پر نوحہ و ماتم ہوا۔ مگر پھر انہوں نے کہا کہ ایسا نہ کرو۔ محمدؐ اور ان کے اصحاب کو یہ خبر پہنچے گی تو وہ شماتت کریں گے۔ چنانچہ سب نے ایک دم گریہ و ماتم چھوڑ دیا۔ ان میں اسود بن عبدیغوث ایک شخص تھا جس کے تین بیٹے زمعہ بن اسود' عقیل بن اسود اور حارث بن اسود قتل ہوئے تھے وہ اپنے بیٹوں پر رونے کے لئے بہت بے تاب تھا مگر قوم کے دباؤ سے مجبور تھا۔ ایک رات کو اس نے کسی رونے والی کی آواز سنی تو اپنے غلام سے کہا کہ دیکھو اگر قریش اپنے مقتولوں پر رو رہے ہوں تو میں اپنے فرزند زمعہ پر رونا شروع کر دوں۔ اس لئے کہ میرا کلیجہ بھنا جاتا ہے۔ غلام نے واپس آکر بتایا کہ ایک عورت کا اونٹ کھو گیا ہے وہ اس پر رو رہی ہے۔ یہ سن کر اسود نے اسی کو بہانہ بنا کر کچھ شعر مقتولین بدر کے مرثیہ میں کہہ دیئے جن کا خلاصہ یہ تھا کہ ارے تو ایک اونٹ کے کھونے پر روتی ہے اور ایسے ایسے آدمی جو

بدر میں قتل ہو گئے ہیں ان پر گریہ نہیں کرتی۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۹)

اسیروں کا فدیہ

کچھ اسیر ایسے تھے جو قتل سے بچ گئے اور ان کو فدیہ یعنی مالی معاوضہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔ چنانچہ خلفائے بنی عباس کے مورث اعلیٰ عباس بن عبدالمطلب انہی میں سے تھے' حالانکہ انہوں نے فدیہ سے بچنے کے لئے بڑی کوشش کی اور کہا یا رسول اللہؐ میں تو حقیقت میں مسلمان تھا۔ یہ لوگ مجھے اپنے ساتھ زبردستی لائے تھے۔ حضرتؐ نے فرمایا وہ آپ کا اسلام جو دل میں تھا اسے تو اللہ جانے اور وہ اس کی جزا دیتا ہے تو دے گا' مگر ظاہر میں تو آپ اس جماعت میں شامل تھے اور ہمارے مقابلہ پر آئے تھے۔ اس لئے بغیر فدیہ کے آپ چھوڑے نہیں جا سکتے اور چونکہ مجھے آپ کی مالی حالت معلوم ہے اس لئے دوسرے عزیز بھی آپ کے جو اس جنگ میں آئے ہیں ان کا بھی فدیہ آپ ہی ادا کیجئے بلکہ ایک اپنے حلیف (ہم قسم) عتبہ بن عمرو کا بھی۔ انہوں نے بڑی ردوبدل کی مگر کوئی نتیجہ نہ ہوا اور آخر انہوں نے اپنے اموال سے یہ سب فدیے ادا کر کے رہائی حاصل کی۔

اسیروں میں ابوسفیان کا ایک بیٹا عمرو بھی تھا اور اس کا دوسرا بھائی حنظلہ اسی بدر میں قتل ہو چکا تھا۔ لوگوں نے ابوسفیان سے کہا کہ اب عمرو کو فدیہ دے کر بچا لو۔ مگر اس نے جواب دیا کہ کیا جانی نقصان کے ساتھ مالی نقصان بھی برداشت کروں؟ رہنے دو' جب تک ان کا دل چاہے رکھیں۔ مگر یہ عجیب اتفاق ہوا کہ ایک ضعیف العمر مسلمان سعد بن نعمان جو قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں سے تھے بالکل بے خیالی سے عمرہ کے قصد سے مکہ گئے تھے۔ اب تک عملدرآمد یہ تھا کہ حج یا عمرہ کے لئے آنے والوں سے تعرض نہ کیا جاتا تھا مگر ابوسفیان کو جو یہ پتہ لگا تو اس نے ان بچارے کے قید کر لیا اور کہا بس یہ شخص عمرو بن ابی سفیان کے عوض میں یہاں رہے گا۔ اب ان کے قبیلہ والے حضرت رسولؐ خدا کے پاس گئے' واقعہ بیان کیا اور خواہش کی عمرو بن ابی سفیان کو ہمارے ساتھ کر دیجئے تاکہ ہم اپنے اس

بزرگ کو چھڑا لائیں۔ آپ نے ان کی درخواست کو قبول فرمایا۔ اس طرح عمرو کی رہائی ہو گئی۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۹۰)

اسیروں میں وہ سہیل بن عمرو بھی تھا جس کا نام بعد میں حدیبیہ کی صلح کے ذیل میں مشہور و معروف ہے۔ یہ بھی فدیہ لے کر رہا کیا گیا' چونکہ سہیل بن عمرو مشرکین میں بہت اچھا خطیب تھا اس لئے چھوڑتے وقت حضرت عمر نے یہ نادر منصوبہ سوچا کہ رسولؐ سے عرض کیا مجھے اتنی اجازت دیجئے کہ میں سہیل بن عمرو کے نیچے والے دو دانت اکھاڑ لوں۔ پھر یہ آپ کے خلاف کبھی کوئی تقریر نہیں کر سکے گا۔ رسولؐ نے فرمایا مثلہ کرنا یعنی کسی حصہ جسم کو جدا کرنا جائز نہیں ہے۔ حضرت کے الفاظ اس موقع کے راوی نے یہ بیان کئے ہیں کہ۔

لا امثل بہ فیمثل اللّٰہ بی و ان کنت نبیا

میں نبی ہوتے ہوئے بھی اگر اس کا کوئی جزو قطع کروں تو اللہ میرے بھی اعضاء کو قطع کرے گا۔ اس کے بعد حضرتؐ نے فرمایا کہ ممکن ہے کبھی اس کی قوت تقریر حق کی حمایت میں صرف ہو چنانچہ سہیل بن عمرو کو صحیح و سالم رہا کر دیا گیا۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۹)

تعداد مقتولین

مسلمانوں کی سبے سروسامانی کے باوجود ان کا جانی نقصان بہت کم ہوا۔ یعنی صرف چودہ اشخاص قتل ہوئے۔ چھ مہاجرین میں سے اور آٹھ انصار میں سے (طبری جلد ۲ صفحہ ۲۹۶) مگر مشرکین میں سے ستر آدمی قتل ہوئے اور ستر اسیر ہوئے۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۰ و اعلام الوریٰ)

ستر میں سے پینتیس حضرت علی بن ابی طالبؑ نے تنہا قتل کیے ہوئے تھے اور باقی نصف دوسرے مجاہدین کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔

(اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد ا صفحہ ۸۷'۸۸)

اسی بنا پر مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ

"غزوہ بدر کے ہیرو (اسد اللہ الغالب) علی بن ابی طالبؑ ہیں"۔

(سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۲۵۷)

... کے ہاتھ سے قتل ہونے والے کچھ خاص خاص افراد کے نام یہ ہیں۔

(۱) ... عتبہ بن ربیعہ (۲) عاص بن سعید بن عاص ابن امیہ (۳) طعیمہ بن عدی بن نوفل (۴) نوفل بن خویلد جو جنگ جمل کے مشہور سردار زبیر کا چچا تھا اور مسلمانوں پر بڑا تشدد کرتا تھا' چنانچہ اختتام جنگ کے بعد اس کے متعلق رسولؐ نے خصوصیت سے دریافت فرمایا تو حضرت علی بن ابی طالبؑ نے کہا کہ اسے میں نے قتل کیا ہے اس پر رسول خداؐ نے صدائے تکبیر بلند کی۔

(۵) حنظلہ بن ابو سفیان' خود حضرت علیؑ نے اس کی کیفیت بیان فرمائی ہے کہ ولید بن عتبہ کے قتل ہونے پر یہ (اسکا بھانجا) میدان میں آیا۔ میں نے اس کے سر پر تلوار ماری تو وہ اس کی آنکھوں تک اتر آئی اور وہ قتل ہو کر زمین پر گر گیا۔

(۶) زمعہ بن اسود۔ (۷) حارث بن زمعہ

(۸) عمیر بن عثمان بن کعب بن تیم۔ یہ جمل کے دوسرے سردار طلحہ کا چچا تھا۔

جناب حمزہ بن عبدالمطلب نے شیبہ بن ربیعہ بن عبد شمس اور اسود بن عبدالاسود مخزومی کو قتل کیا اور عمرو بن جموح اور پھر آخر میں عبداللہ بن مسعود نے ابوجہل کا خاتمہ کیا اور عمار بن یاسر نے امیہ بن خلف کو۔ (اعلام الوریٰ)

مقتولوں اور اسیروں کے ساتھ سلوک

مجسم خلق عظیم جسے دوستی اور دشمنی سے قطع نظر اور ایمان و کفر کی تفریق سے بھی آگے حقوق انسانی کی تعلیم دینا تھی اس نے مشرکین اور دشمنوں کی لاشوں کو بھی میدان جنگ میں اس طرح چھوڑنا کہ چیل کوے انہیں کھائیں پسند نہیں کیا' بلکہ ان کی لاشوں کو پاس کے کنویں میں ڈلوا کر ایک طرح انہیں دفن کر دیا۔ ہاں ان کے عبرت ناک انجام پر حاضر اور غائب ہر ایک کو متنبہ کرنے کے لئے اور ماضی

اور حال دونوں کا موازنہ ظاہر فرمانے کے لئے آپ نے کنویں کے کنارے کھڑے ہو کر ان کے رؤسا کو نام بنام آواز دی۔

یا عتبة بن ربیعة یا شیبة بن ربیعة یا امیة بن خلف یا ابا جهل بن هشام وغیرہ وغیرہ۔

هل وجد تم ما وعد کم ربکم حقا فانی قد وجدت ما وعدنی ربی حقا

کیا تم نے اسے جو پروردگار نے تمہیں خبردی تھی (عذاب کا آنا) حق پایا میں نے تو اسے جو مجھ سے پروردگار کا وعدہ تھا (فتح و نصرت) بالکل حق پایا۔

یہ ندا ان الفاظ قرآن سے ماخوذ تھی جہاں اہل بہشت اہل دوزخ کو ایسے ہی الفاظ میں ان کے عبرت ناک انجام کو دکھا رہے ہوں گے۔ سطحی نگاہ والے حاضر الوقت بعض صحابہ نے کہہ دیا یا رسول اللہ! آپ بے جان لاشوں کو آواز دے رہے ہیں آپ نے جواب دیا کہ تم میں قوت سماعت ان سے زیادہ نہیں ہے مگر وہ میری بات کا جواب نہیں دے سکتے۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۵)

یاد رکھنا چاہئے کہ یہ انتہائی بد اعمال اور سخت ترین کافر افراد تھے جن کے ارواح کا پیغمبرؐ نے بعد موت بھی باخبر ہونا ظاہر فرمایا۔ اس کے بعد کیا تعجب خیز نہیں ہے مسلمانوں میں سے ایسی جماعت کا نظریہ جو خود رسول خداؐ یا دیگر اولیاء و مقربین کو بھی پکارنے یا ان سے تخاطب کرنے کو بے کار اور بے معنی سمجھتی ہو۔

مقتولین میں صرف امیہ بن خلف ایسا تھا کہ اس کی لاش کنویں میں پھینکی نہ جا سکی۔ وہ زرہ کے اندر ایسی پھول گئی تھی کہ مسلمانوں نے اسے زرہ سے نکالنے کی کوشش کی تو اس کے جسم کے پرخچے اڑ گئے لہٰذا اسے وہیں رہنے دیا گیا اور اتنی مٹی اور کنکر پتھر وغیرہ اس پر ڈال دیئے کہ وہ ان کے نیچے دب جائے۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۵)

قیدیوں کے ساتھ بھی سوا چند کے جو قتل کئے گئے تھے۔ بہت اچھا سلوک کیا

گیا۔ یہ قیدی مختلف صاحب استطاعت مسلمانوں کے سپرد ہوئے جو ان کے کھانے کے کفیل قرار دیئے گئے اور ان مسلمانوں کو ان اسیروں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی جس کا ذکر معصب بن عمیر کے بھائی ابو عزیز عمیر نے جو اسیروں میں تھا اس طرح کیا ہے کہ پیغمبرؐ نے اسیروں کے ساتھ جو اچھے سلوک کی ہدایت فرمائی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ میں انصار میں سے جس شخص کے سپرد تھا وہ اور اس کے گھر والے کھجوریں کھا کے بسر کرتے تھے اور روٹی مجھے دے دیتے تھے اور میں خود بعض وقت واپس کرنا چاہتا تھا کہ آپ لوگ کھایئے تو وہ نہیں مانتے تھے اور روٹی واپس نہیں لیتے تھے۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۷)

مالدار قیدیوں سے فدیہ لے کر رہا کیا گیا جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے اور جو نادار قیدی تھے اور پڑھے لکھے تھے ان کے لئے یہ فیصلہ ہوا کہ وہ مدینہ کے دس دس مسلمان لڑکوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو انہیں رہا کر دیا جائے گا اور جو اس لائق بھی نہ تھے انہیں بغیر فدیہ کے رہا کر دیا گیا۔

(اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد اول صفحہ ۸۸)

نتائج اور اثرات

یہ اسلام کی سب سے پہلی جنگ تھی اس لئے فطری طور پر اس کے نتائج اور اثرات کو بڑا دور رس ہونا ہی چاہئے۔ قریبی نتائج کو عبدالباری صاحب ایم اے کی زبان میں سنئے۔

مارے جانے والوں میں ان کے قبائل کے بڑے بڑے سردار اور اسلام کی مخالفت پر ابھارنے والے نامور ان تقریباً" سب ختم ہو گئے۔ ان کی موت نے قریش کی کمر توڑ دی اور تحریک اسلامی کی جڑ مضبوط کر دی۔ قرب و جوار کے علاقوں پر مسلمانوں کی دھاک جم گئی اور مدینہ میں منافقین اور یہود کو بھی کچھ ڈھیلا کر دیا۔

(دعوت دہلی' سیرت طیبہ' ۱۶ ستمبر ۱۹۵۹ء ۱۲ ربیع الاول ۷۹ ۱۳ھ صفحہ ۱۹۸)

یہ تو عام اسلامی نگاہ سے اس کا قریبی نتیجہ تھا۔ اب ذرا اس جنگ کے

اثرات پر مقتولین کی اس فہرست کو سامنے رکھ کر غور کیجئے جو حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے ہاتھ سے قتل ہوئے تھے تو آپ کو اس میں زیادہ تعداد بنی امیہ کے افراد کی ملے گی۔ اور خصوصیت کے ساتھ وہ افراد جن سے آل ابو سفیان کا گہرا تعلق ہے جیسے عتبہ بن ربیعہ۔ یہ کون ہے۔ ہندہ جگر خوارہ زوجہ ابو سفیان کا باپ اور امیر شام معاویہ بن ابی سفیان کا نانا اور اس کا بیٹا ولید یعنی ہندہ کا بھائی اور معاویہ کا حقیقی ماموں، پھر حنظلہ بن ابی سفیان ہندہ کا بیٹا اور معاویہ کا حقیقی بھائی۔ ان کے علاوہ دوسرے بنی امیہ جیسے عاص بن سعید بن عاص بن امیہ وغیرہ۔

یہ داغ عربوں کی انتقام پسند فطرت کی بناء پر بنی امیہ اور بالخصوص نسل ابو سفیان کے دلوں سے مٹنے والے نہ تھے اور پیغمبرؐ کے بعد اگر کوئی سیاسی مصلحت اس کی متقاضی نہ سمجھی جائے کہ بنی ہاشم اور علیؑ و آل علیؑ کے خلاف ان جذبات کی پرورش کی جائے تو پھر اس کو تدبر کے خلاف ایک سیاسی غلطی ماننا پڑے گا کہ اس جماعت کو بہ حیثیت حکمران مسلمانوں میں اقتدار حاصل کرنے کا موقع دیا جائے جس کے نتیجہ میں اسلام کی تاریخ خود مسلمانوں کے ہاتھوں خون سے رنگین ہو جائے۔ اور شام کے دربار میں انہی ابو سفیان اور ہندہ کے پوتے یزید کے ان اشعار کی گونج سنائی دے جو اس نے حسینؑ بن علیؑ اور تقریباً" پورے خاندان رسولؐ کے قتل کئے جانے اور اسیران اہل بیتؑ کے لائے جانے کے موقع پر پڑھے تھے جس میں اپنے بدر والے بزرگوں کو یاد کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ آج وہ ہوتے تو مجھے شاباشی دیتے کہ میں نے کیسا ان کا بدلا لیا ہے۔ اس کے ساتھ ذرا ہمت کر کے نوفل بن خویلد عم زبیر اور عمیر بن عثمان عم طلحہ کو بھی دیکھ لیجئے تو اندازہ ہو جائے گا کہ جمل اور صفین اور کربلا سب اسی جہاد اسلامی کے مختلف اجزاء ہیں جن کی پہلی کڑی جنگ بدر تھی۔

غزوہ بنی قینقاع

جماعت یہود سے جیسا کہ پہلے آچکا ہے یہ معاہدہ ہوا تھا کہ اگر مدینہ پر کوئی حملہ ہو تو انہیں رسولؐ اور مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہئے۔ اب اگر یہ ساتھ نہ بھی دیتے تو کم از کم ان کو الگ ہی رہنا چاہئے تھا۔

مدینہ میں ان یہودیوں کے کئی قبیلے تھے' ان میں سے ایک بنی قینقاع تھے' ان کے پاس زمین و باغات وغیرہ نہ تھے بلکہ یہ سنار لوگ تھے اور صنعت و حرفت سے دولت مند بنے ہوئے تھے۔

جماعت یہود میں سب سے پہلے انہوں نے عہد شکنی کی اور جنگ بدر میں انہوں نے مشرکین کی مدد کی۔ جب پیغمبرؐ بدر کی جنگ سر کرکے مدینہ تشریف لائے تو آپ نے ان کے کردار پر انہیں سرزنش فرمائی۔ اس کے جواب میں بجائے اس کے کہ وہ اظہار ندامت کرتے انہوں نے بڑے سرکشانہ انداز میں کہا کہ ہمیں قریش نہ سمجھ لیجئے گا۔ وہ جن سے آپ کا مقابلہ ہوا تھا فن جنگ سے واقف نہیں تھے ہم سے اگر جنگ ہو تو دیکھیے گا کہ مرد میدان کیسے ہوتے ہیں اب اس کے بعد ظاہر ہے کہ معاہدہ کی پابندی کا کوئی سوال نہ تھا۔ آپ نے ان کے خلاف تادیبی کاروائی کا ارادہ فرمایا تو انہوں نے قلعہ کی پناہ لی۔ رسولؐ نے قلعہ کا محاصرہ فرما لیا۔ یہ جنگ بدر کے دوسرے مہینے یعنی شوال ۲ھ کا واقعہ ہے۔ یہ محاصرہ پندرہ دن تک

جاری رہا۔ پھر انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور آمادہ ہو گئے کہ رسولؐ جو فیصلہ ان کے حق میں چاہیں فرمائیں۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ وہ مدینہ کو چھوڑ کر باہر نکل جائیں اور عبادہ بن صامت اس پر مامور ہوئے کہ وہ ان کے ساتھ ساتھ جا کر حدود مدینہ سے باہر پہنچا آئیں چنانچہ وہ نکل کر سرحد شام کی جانب چلے گئے اور اس طرح مدینہ کو ان کے خطرہ سے نجات ملی۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۹۷' ۲۹۸)

عقد حضرت سیدہ عالمؑ

اسی ۲ ھ کے ماہ ذیقعد میں پیغمبر خداؐ نے اپنی اکلوتی بیٹی خاتون جنت حضرت فاطمہ زہراؑ کا عقد حضرت سید الاولیاء علی بن ابی طالبؑ کے ساتھ فرمایا جیسا کہ ہم نے "رہنمایان اسلام" میں لکھا ہے۔

چونکہ شریعت اسلام میں تاکید ہے کہ لڑکی کے بلوغ کے بعد اس کی شادی میں دیر نہ کی جائے اور ہجرت کے ایک سال بعد حضرت فاطمہؑ زہرا کی عمر نو برس کی ہو گئی جو شرعاً" لڑکی کے بالغ ہونے کا سن ہے اس لئے اب وقت آ گیا تھا کہ پیغمبرؐ اس فریضہ سے سبکدوش ہوں۔ روایتیں بتاتی ہیں کہ متعدد صحابہ اس اعزاز کے حصول کی تمنا رکھتے تھے اور انہوں نے پیغمبرؐ کی بارگاہ میں آکر خواستگاری کی۔ مگر کسی کا معروضہ قابل قبول قرار نہ پایا۔ فاطمہ زہراؑ کی شادی کے لئے صرف ایک ہی فرد موزوں تھا اور وہ وہی جس کو خدا کے گھر میں پیدا ہونے کا شرف حاصل تھا۔ پھر اس نے پیغمبرؐ کی آغوش میں پرورش پائی۔ پھر آغاز رسالتؐ ہی سے پیغمبرؐ کا دست و بازو بنا۔ بچپن ہی میں پیغمبرؐ سے عہد وفاداری کیا اور اب ہجرت میں بستر رسولؐ پر کھینچی ہوئی تلواروں کے حصار میں سو کر اور پھر بدر میں یہ کار نمایاں انجام دے کر اس عہد کی عملی تکمیل کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں کی تحریک سے حضرت علیؑ بن ابی طالب نے رسولؐ کی بارگاہ میں آکر بہت محجوبانہ انداز میں یہ تمنا پیش کی اور رسولؐ کی طرف سے اس کی پذیرائی اس طرح ہوئی جیسے کہ ان کی خواستگاری کا

انتظار ہی تھا۔ رسولؐ نے دریافت فرمایا کہ تمہارے پاس مال دنیا میں سے بھی کچھ ہے؟ عرض کیا کہ سوا گھوڑے، تلوار اور زرہ کے اور کچھ بھی میرے پاس نہیں ہے۔ رسولؐ نے فرمایا کہ گھوڑا اور تلوار تمہارے ایسے مجاہد کے لئے ضروری ہے مگر زرہ غیر ضروری چیز ہے، اسے فروخت کر ڈالو۔ اس زرہ کی جو قیمت آئی اس سے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے حضرت فاطمہؑ کا زر مہر ادا کیا۔ وہ چار سو مثقال چاندی تھا۔ جو تقریباً" پانچ سو درہم کی مقدار میں ہوتا تھا۔ اور ہمارے یہاں کے مروجہ اوزان کے مطابق اس کی مقدار ایک سو تیرہ تولے چاندی ہوتی ہے۔ اس کے بعد رسولؐ نے عقد پڑھ دیا، اور اپنے خصوصیات نیز سادگی کے اعتبار سے اسلامی تاریخ میں یہ بے مثال اور مثالی شادی عمل میں آئی"۔

اس سال کے دوسرے واقعات

تبدیلی قبلہ

جیسا کہ ہم نے پارہ دوم تفسیر قرآن میں لکھا ہے ابتدائے اسلام میں قبلہ بیت المقدس تھا۔ مدینہ میں آنے کے بعد بھی حضرت کچھ عرصہ تک بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے رہے۔ یہ مدت کتنی تھی؟ اس میں اختلاف ہے۔ شیخ الطائفہ کی کتاب تہذیب میں امام جعفر صادقؑ کی زبانی ہے کہ جنگ بدر سے واپسی تک حضرت نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی ہے ایسا ہی رسالہ فضل بن شاذان میں ہے۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ آپ نے مدینہ میں آنے کے بعد سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی ہے۔ براء بن عازب نے سولہ یا سترہ مہینے کہے ہیں۔ قرب الاسناد میں امام محمد باقرؑ کی زبانی انیس مہینے درج ہیں۔ یہی صدوق کی کتاب "من لا یحضر" میں بھی ہے۔ شیخ مفید نے مسارالشیعہ میں تاریخ کے تعین کے ساتھ بتایا ہے کہ تحویل قبلہ ۱۵ رجب ۲ھ میں ہوئی ہے۔ سیوطی نے در منثور میں اس کی موافقت کی ہے بہرحال اس مدت کے اختلاف سے تبدیلی قبلہ کے اصل واقعہ کے یقینی ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا قرآن مجید کے آیات سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر خداؐ کا عمل باوجودیکہ بیت المقدس ہی کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے کا

تھا۔ مگر آپ کا دل یہ چاہتا تھا کہ کعبہ قبلہ ہوتا۔ اس لئے کہ جیسا کافی کی معتبر حدیث بتاتی ہے مکہ معظمہ میں آپ کا عمل یہ تھا کہ آپ کعبہ کے سامنے اس طرح نماز پڑھتے تھے کہ رخ بیت المقدس کی طرف ہو لیکن مدینہ میں آکر دونوں کا اجتماع ممکن نہ رہا مگر آپ نے اپنی دلی خواہش کے مطابق عمل نہیں فرمایا اور حکم الٰہی کے انتظار میں بیت المقدس ہی کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے رہے۔

اہل سنت کے صحاح ستہ اور شیعوں کے کتب اربعہ۔ ان سب سے یہ واقعہ معلوم ہوتا ہے کہ مسجد قبا میں لوگ نماز صبح پڑھ رہے تھے جب ایک شخص نے آکر اطلاع دی کہ کعبہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے کا حکم آگیا ہے۔ یہ سن کر نماز کی حالت ہی میں شام سے مکہ کی طرف منہ پھیر لیا گیا۔ علی بن ابراہیم کی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ہے کہ جناب رسالت مابؐ مسجد بنی سالم میں نماز پڑھ رہے تھے۔ دو رکعتیں بیت المقدس کی طرف رخ کرکے ہوئی تھیں کہ تبدیلی قبلہ کا حکم نازل ہوا اور حضرت نے باقی دو رکعتیں کعبہ کی طرف متوجہ ہو کر پڑھیں۔ ممکن ہے یہ واقعہ عشاء کی نماز کا ہو جس کی خبر مسجد قبا میں صبح کی نماز کے وقت پہنچی۔ اس پر یہود اور منافقین نے کیا کیا نکتہ چینیاں کیں اور اس پر قرآن نے کس کس طرح جوابات دیئے۔ اس کو قرآن اور اس کے تراجم یا تفاسیر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

صحابی رسولؐ جناب عثمان کی وفات

جناب عثمان بن مظعون قرشی اصحاب رسولؐ میں سے بڑے جلیل المرتبہ تھے اور سابقین الاسلام میں چودھویں فرد تھے۔ وہ ہجرت اولیٰ یعنی ملک حبشہ والے سفر کے بھی مہاجر تھے اور اب مدینہ کی طرف ہجرت بھی کی اور جنگ بدر میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد اسی ۲ھ کے ماہ ذی الحج میں انکی وفات ہوئی جس کا پیغمبر خداؐ کو بڑا صدمہ ہوا۔ یہ ان کی رفعت مرتبہ کا ثبوت ہے کہ پیغمبر خداؐ نے ان کی لاش پر جھک کر بوسہ لیا اور جب سر اٹھایا تو گریہ کے آثار نمایاں تھے۔ پھر آپ نے نماز پڑھائی اور انہیں جنۃ البقیع میں دفن کیا۔ اور بطور نشان قبر ان کی قبر کے

سرہانے ایک پتھر رکھ دیا اور آپ اکثر ان کی قبر کی زیارت کو تشریف لے جاتے تھے۔

اس واقعہ میں نجدی ذہنیت والوں کی بصیرت کے لئے متعدد پہلو ہیں جو سرمہ چشم بن سکتے ہیں۔ لاش کا بوسہ لینا خواہ بہ نظر احترام' خواہ بتقاضائے محبت' پھر گریہ فرمانا' پھر قبر پر بطور نشان پتھر کا رکھنا جس سے ظاہر ہے کہ جلیل القدر اور مذہبی حیثیت سے بزرگ مرتبہ افراد کے قبور کا نمایاں رہنا خدا اور رسولؐ کو پسند ہے۔

اس قبر کو پیغمبرؐ نے ہمیشہ یاد رکھا اور اس کی مرکزیت کو بڑھانے کی طرف توجہ فرمائی۔ چنانچہ جب آپ کے فرزند جناب ابراہیم کی وفات ہوئی جو اس کے کئی برس بعد کا واقعہ ہے تو آپ نے فرمایا کہ ہم اس کو عثمان بن مظعون کی قبر کے پاس دفن کریں گے۔ یہ واقعہ جوار صالحین میں دفن کی فضیلت کا ثبوت ہے۔

غزوہ سویق

اس سال کا تقریباً" آخری واقعہ سویق ہے جو روز یک شنبہ ۲۳ ذی الحج کو واقع ہوا ہے۔ اس کا پس منظر بڑا دلچسپ ہے اور وہ یہ ہے کہ امیر شام معاویہ کے والد ابو سفیان کو بدر میں مشرکین کی شکست پر اتنا جوش آیا کہ انہوں نے نذر کر ڈالی کہ وہ (کیسی ہی نجاست میں مبتلا ہوں) اس وقت تک غسل نہ کریں گے جب تک کہ پیغمبر خداؐ سے جنگ نہ کر لیں مگر ظاہر ہے کہ بدر کے انجام کو دیکھنے کے بعد رسولؐ سے مقابلہ کی جلدی تیاری نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسری طرف یہ نذر مجبور کر رہی تھی کہ شگون کے طور پر سہی جنگ کا نام ضرور ہو جائے۔ ماہ رمضان کے بعد ذی الحج تک تقریباً" تین مہینے اسی حالت میں بسر ہوئے۔ اب کہاں تک اس عالم میں رہا جاتا۔ آخر کو ابو سفیان نے اپنی قسم کو پورا کرنے کے لئے دو سو سوار قریش کے اپنے ساتھ لے کر مدینہ کی طرف رخ کیا۔ اس طرح کہ تاریکی شب میں سفر کرتے اور دن کو چھپ جاتے تھے۔ تاکہ رسولؐ کو پہلے سے خبر نہ ہو جائے۔ سہارا اس کا تھا کہ یہود کی ہمدردیاں از اول ہمارے ساتھ ہیں اور اب تو بنی قینقاع کے جلا وطن کیے جانے سے ان کے جذبات اور مشتعل ہو چکے ہوں گے۔ ہم ان سے اگر ایسا ساز باز کر لیں گے کہ وہ اندرون مدینہ خلفشار پیدا کر دیں اور ہم باہر سے حملہ آور ہو جائیں تو آسانی سے مسلمانوں کو شکست دی جا سکے گی۔ چنانچہ اس نے اپنی

جماعت کو بیرون مدینہ کسی مخفی مقام پر چھوڑ کے رات کے وقت خود تنہا قبیلہ بنی نضیر میں جا کر ان کے سردار حیی بن اخطب کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر اس پر ایسا مسلمانوں کا خوف طاری تھا کہ اس نے دروازہ بھی نہ کھولا۔ اب یہ ایک ان کے دوسرے سردار اور محافظ خزانہ سلام بن مشکم کے یہاں پہنچا۔ اس لئے کھلانے پلانے میں ظاہری خاطر داری تو خوب کی مگر اصل مقصد کے لئے کوئی ہمت افزا جواب نہ دیا۔ یہ ناکام و نامراد ہو کر شب کے آخری حصہ میں اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آ گیا۔ مگر خفت مٹانے کو اور اپنے خیال میں اپنی نذر پوری کرنے کے لئے اس نے کچھ اپنے آدمیوں کو مدینہ کے ایک بیرونی حصہ کی طرف بھیج دیا اور ادھر کے کچھ درخت جلا دیئے اور اتفاق سے ایک آدمی انصار میں سے اور اس کا ایک ساتھی دونوں اپنے کھیت میں کچھ کام کر رہے تھے۔ ان دونوں کو قتل کر دیا اور اس کے بعد صبح ہونے سے پہلے واپس چلے گئے۔ اور اب ابو سفیان اپنی پوری جماعت کے ساتھ ایسی گھبراہٹ کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوا کہ بار ہلکا کرنے کے لئے راستے میں جا بجا ستوؤں کی گٹھڑیاں جو کھانے کے لئے ساتھ تھیں پھینکتے ہوئے چلے گئے۔ اور پیغمبرؐ اس اطلاع کے ملنے پر جو تعاقب میں نکلے اور قرقرہ الکدر تک تشریف لے گئے تو مسلمانوں کو راہ میں جا بجا یہ ستو مال غنیمت میں ملے۔ اسی لئے اس مہم کا نام "غزوہ سویق" ہو گیا۔ کیونکہ عربی میں ستو کو سویق کہتے ہیں۔

(طبری جلد ۲ صفحہ ۲۹۹' ۳۰۰)

سن ۳ ہجری - چھوٹے غزوات

غزوہ قرقرۃ الکدر

جسے "قرارۃ الکدر" بھی کہتے ہیں۔ شیخ عبدالحق نے تو مدارج النبوۃ میں بس اتنا لکھ دیا ہے کہ یہ ایک جگہ کا نام ہے مگر علامہ سید محسن عاملی نے اس کی وجہ تسمیہ لکھی ہے کہ قرقرۃ تو سیدھی ہموار زمین کو کہتے ہیں اور اسی طرح کی ایک زمین تھی جہاں بنی سلیم کا قیام تھا۔ اور "کدر" طائر ہوتے ہیں مٹیالے رنگ کے' چونکہ

اس مقام میں یہ طائر پائے جاتے تھے اس لئے وہ زمین اس نام سے موسوم ہوئی۔

یہ مہم ۱۹ محرم ۳ ہجری یعنی ہجرت کے تیسویں مہینے کے شروع میں ہوئی۔ اس کی کیفیت میں شیخ عبدالحق نے بس اتنا لکھا ہے کہ۔

با جمعے از مہاجرین و انصار متوجہ ایشاں شد و لوائے ترتیب داد کہ اورا بہ علی مرتضٰی سپرد۔

(مدارج النبوۃ)

مہاجرین و انصار کی ایک جماعت کے ساتھ حضرت ان کی جانب روانہ ہوئے اور ایک علم آراستہ کیا جو علی مرتضٰی کے سپرد فرمایا۔

طبری نے بھی واقدی کی زبانی لکھا ہے کہ حضرت کا لواء حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے سپرد تھا۔

(طبری، جلد ۲ صفحہ ۲۹۹)

بس اس کے آگے اس مہم کا پس منظر ہمیں تاریخ میں نہیں ملتا۔ مگر اس سے قبل کی مہم غزوۃ السویق کے حالات میں آچکا ہے کہ ابو سفیان کے تعاقب میں حضرتؐ قرقرۃ الکدر تک تشریف لے گئے اور پھر مدینہ کی طرف واپس گئے۔ اس کے بعد دوسرے مہینے اس سرزمین کی طرف آپ کا بصورت جنگ تشریف لے جانا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ آپ کو پہلی مرتبہ اس طرف جانے میں یہ معلوم ہوا کہ ابو سفیان کے ساتھیوں نے جو اس موقع پر اہل مدینہ میں سے دو کو قتل کیا تھا اور مکانوں میں آگ لگائی تھی اور درختوں کو جلایا تھا اس میں مقامی قبیلہ کے افراد کی شرکت تھی اور اس لئے آپ نے انہیں سزا دینے کی ضرورت محسوس فرمائی۔

غزوۂ ذی امر

ذی امر قبیلہ غطفان کے ایک چشمہ کا نام تھا اور اسی لئے ابن سعد نے طبقات میں غزوہ غطفان لکھا ہے۔ یہ پہاڑ نجد کی طرف تھا اور اس جگہ اس قبیلہ کا نخلستان تھا۔

(اعیان الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۱۷۸)

واقعہ یہ تھا کہ غزوۂ سویق سے واپس آنے کے بعد حضرتؐ کو خبر ملی کہ قبیلہ غطفان نے تیاری کی ہے کہ وہ مدینہ پر حملہ کریں گے اور ان کا سردار دعثور بن حارث بن محارب ہے۔ یہ سن کر آپ چار سو پچاس آدمیوں کے ساتھ اس کے مقابلے کو نکلے۔ مگر انؓ لوگوں نے راہ فرار اختیار کی اور مختلف پہاڑیوں پر منتشر ہو گئے۔ تاریخ کا بیان ہے کہ حضرتؐ نے صفر کا پورا مہینہ تقریباً" نجد میں گزارا مگر دشمنوں نے مقابلہ کی ہمت نہ کی۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۲)

اس سلسلہ میں حضرت کے اعتماد علی اللہ اور جلال حقانیت کا ایک عجیب منظر سامنے آیا کہ اسی قیام کے زمانہ میں ایک دن بارش ہوئی اور آپ کے کپڑے پانی سے تر ہو گئے تو آپ اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر ایک طرف تشریف لے گئے اور آپ نے لنگی باندھ کر کپڑے ایک درخت پر پھیلا دیئے اور خود اس کے نیچے لیٹ گئے اس انتظار میں کہ کپڑے خشک ہوں تو انہیں پہن کر اپنے لشکر گاہ کی طرف واپس جائیں۔ ادھر ادھر کے صحرائی عرب اس صورت حال کو دیکھ رہے تھے۔ اور انہیں دعثور کے جائے قیام کا علم تھا جو اس قبیلہ کا سردار اور بہادر آدمی تھا چنانچہ ان میں سے کسی نے جا کر اسے اطلاع دے دی کہ محمدؐ اس وقت تنہا ہیں اور یہی موقع ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے اس نے ایک بڑی کاٹ دار تلوار منتخب کی اور اسے لئے ہوئے آکر پیغمبرؐ کے سرہانے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ محمدؐ! اس وقت تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟ آپ نے بغیر اپنی جگہ سے جنبش کیے ہوئے اسی طرح لیٹے لیٹے فرمایا کہ اللہ۔ بس اس لفظ نے جو اس عزم و اطمینان کے ساتھ زبان سے ادا ہوئی تھی اس کے ہاتھوں میں لرزہ ڈال دیا ایسا کہ تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اب آپ نے تلوار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کھڑے ہوئے اور فرمایا اب بتاؤ تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟ اس نے کہا کوئی نہیں اور بس اس نے کلمہ شہادتین زبان پر جاری کیا۔ کہا بخدا اب میں آپ کے خلاف لشکر کشی کبھی نہ کروں گا۔ پیغمبر خداؐ نے اس کی تلوار اسے دے دی اور وہ اسے لئے ہوئے واپس چلا گیا اور اپنی قوم کو

بھی دعوت اسلام دینے میں مصروف ہو گیا۔

(اعلام الوریٰ)

غزوۂ بحران

یہ لفظ ب کے زیر اور پیش دونوں کے ساتھ بولی جاتی تھی۔ یہاں بنی سلیم رہتے تھے۔ اس لئے ابن سعد نے طبقات میں اسے "غزوۂ بنی سلیم" کہا ہے یہ ہجرت کے ستائیسویں مہینے ہوا تھا۔

(اعیان الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۱۷۷)

معلوم ہوتا ہے کہ مکہ والے قبیلہ قریش نے وہاں آکر ان کے ساتھ ساز باز کی تھی اور اِن دونوں نے مل کر جنگ کا منصوبہ بنایا تھا اس لئے تاریخ رقم طراز ہے کہ۔

غزا یرید قریشا" و بنی سلیم

حضرت" قریش اور بنی سلیم کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے۔

اور فرع کے علاقہ میں مقام بحران تک تشریف لے گئے اور ربیع الثانی اور جمادی الاول کے دو مہینے وہاں گزارے مگر مقابلہ کی نوبت نہیں آئی۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۲)

سبط اکبر کی ولادت

۱۵ ماہ رمضان ۳ ھ کو حضرت پیغمبر خدا کی اکلوتی بیٹی حضرت فاطمہ زہرا کے یہاں پہلے فرزند کی ولادت ہوئی جس کا نام ہدایت ربانی سے رسول خدا نے حسن رکھا اسکی خوشی پیغمبرؐ خدا کو اتنی ہی نہ تھی جتنی ایک نانا کو نواسے کی ولادت سے ہونا ہی چاہئے بلکہ آپ کو اس حیثیت سے بھی بڑی خاص مسرت ہونا چاہئے تھی کہ آپ کی رسالت کے سچے ہونے کا ایک بڑا ثبوت آج سے سامنے آنا شروع ہوا تھا۔

واقعہ یہ ہے، کہ کفار و مشرکین پیغمبر خدا کے لئے بطور طعن و تشنیع کہتے تھے کہ یہ ابتر ہیں یعنی ان کی نسل چلنے والی نہیں ہے' کہنے والے وہ مشرکین تھے جن میں سے ہر ایک اولاد کی نعمت سے بہرہ یاب تھا۔ مگر ان کے جواب میں قرآن کا

سورہ کوثر اترا جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ خالق نے رسولؐ کو کثرت نسل کی دولت عطا کی ہے اور جو ان کے دشمن ہیں انہی کی نسل دنیا میں باقی نہ رہے گی۔ یہ اعلان موجودہ صورت حال کے بالکل برعکس تھا۔ اس لئے اس کی سچائی آپ کی رسالت کی حقانیت کا ایک بڑا معیار بن گئی تھی۔ اب آج دنیا آنکھوں سے دیکھ سکتی ہے کہ وہ جن کی آل اولاد بہت تھی کس طرح دنیا میں بے نشان ہیں اور پیغمبر خداؐ کی اولاد سے بفضل ربانی دنیا کا کوئی گوشہ تقریباً خالی نہیں ہے۔ یہ ہے سورۂ کوثر کی واقعاتی تفسیر جو جیتی جاگتی شکل میں سادات کے وجود کے ساتھ موجود ہے اور اس تفسیر کے سلسلہ کی پہلی کڑی یا اس کتاب مبین کی پہلی سطر تھی جو صفحہ وجود پر حضرت امام حسنؑ کے ساتھ ظہور میں آئی تھی۔

اس طرح آپ رسولؐ کے لخت جگر ہونے کے علاوہ آپ کی حقانیت کا ایک زندہ معجزہ بن کر دنیا میں آئے تھے۔

جنگ احد

سبب جنگ

اس جنگ کا سبب بالاتفاق مشرکین کا جذبہ انتقام تھا۔ چنانچہ مسٹر کے اے حمید بیرسٹر لاہور بھی لکھتے ہیں کہ۔

"بدر کی لڑائی کی شکست کے بعد قریش کا جذبہ انتقام بھڑک اٹھا۔ انہوں نے نہایت وسیع پیانہ پر فوجی تیاریاں شروع کیں تاکہ وہ انتقام لے کر شکست کا دھبا اپنے دامن سے دھونے میں کامیاب ہوں۔ مکہ میں چندے کی فہرستیں کھولی گئیں تقریروں سے عوام میں جوش پھیلایا گیا' لات اور عزیٰ کی قسمیں دے کر ان کے ناموس بچانے کے لئے کہا گیا مشہور شاعر ابو عزہ نے لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ قریش کی امداد کریں۔

(تاریخ مسلمانان عالم حصہ اول صفحہ ۵)

سب سے زیادہ جوش انتقام کا ابو سفیان کو تھا۔ ایک تو اس لئے کہ جنگ بدر کا بانی مبانی وہی تھا لہٰذا تمام لوگ اپنے جانی و مالی نقصان کا اسے ذمہ دار سمجھتے تھے پھر یہ کہ خود اس کا بیٹا حنظلہ اس جنگ میں قتل ہوا تھا۔ اور اس سے زیادہ جذبہ انتقام اس کی بیوی ہندہ کو تھا جسے اپنے بیٹے کے علاوہ اپنے باپ عتبہ اور چچا شیبہ اور بھائی ولیدان تینوں کا بھی داغ اٹھانا پڑا تھا لہٰذا اگر ابو سفیان خاموش رہنا بھی چاہتا تو

ہندہ اسے خاموش رہنے نہیں دے سکتی تھی۔ چنانچہ یہ پہلے آ چکا ہے کہ ابو سفیان نے قسم کھائی تھی کہ جب تک پیغمبر اسلامؐ سے جنگ نہ کرے گا اس وقت تک وہ نہائے گا نہیں۔ اگرچہ ایک مضحکہ خیز انداز سے اس نے جنگ کا شگون کر کے نہانا شروع کر دیا تھا مگر ظاہر ہے کہ اس کے جذبہ انتقام کو اس سے تسلی کہاں ہو سکتی تھی۔

عربوں کا عقیدہ تھا کہ قتل ہونے والوں کا اگر ماتم کر لیا جائے اور رو کر دل کی بھڑاس نکال لی جائے تو جذبہ انتقام سرد پڑ جاتا ہے چنانچہ یہ بھی ذکر پہلے آچکا ہے کہ اس کی شدید تاکید کی گئی تھی کہ کوئی شخص بدر کے مقتولین کو روئے نہیں۔ یہ وہی سکوت و سکون تھا جو شدید آندھی کے پہلے والے سناٹے میں ہوا کرتا ہے۔

جنگ کی تیاریاں

سامان جنگ کی فراہمی میں سب سے مقدم روپیہ ہوتا ہے اس کے لئے عبداللہ بن ابی ربیعہ، عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ اور بہت سے وہ جن کے باپ بھائی، بیٹے بدر میں قتل ہوئے تھے، سب مل کر ابو سفیان کے پاس آئے اور ان کے روسا کے پاس جن کے اموال تجارت ابوسفیان والے قافلہ میں تھے اور انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس مرتبہ کی تجارت میں جتنی رقم حاصل ہوئی ہے وہ سب پیغمبر اسلامؐ سے جنگ کے لئے دے دی جائے۔ یہ تمام لوگ اس تجویز سے متفق ہو گئے اور اس طرح مالی حیثیت سے پورا اطمینان ہو گیا۔ فوج کی فراہمی کے لئے متعدد صاحب اثر اور زبان آور اشخاص اطراف کے قبائل میں دورہ کے لئے نکلے۔

ابو عزہ عمرو بن عبداللہ جمحی ایک ممتاز شاعر تھا۔ باوجودیکہ پیغمبرؐ کا احسان اس پر تھا کہ یہ بھی بدر میں اسیر ہوا تھا مگر اس نے پیغمبرؐ سے التجا کی کہ میں غریب ہوں اور لڑکیاں رکھتا ہوں تو مجھے بغیر فدیہ کے چھوڑ دیجئے۔ حضرتؐ نے اس کی التجا قبول فرمائی اور اسے رہا کر دیا۔ اس کا ضمیر اس احسان کے بار کو محسوس بھی کر رہا تھا۔ چنانچہ پہلے اس نے مشرکین کے ساتھ تعاون سے یہی کہہ کر انکار بھی کیا مگر پھر ان لوگوں نے اس کو آمادہ کر لیا کہ تم خود چاہے جنگ میں نہ جانا مگر اپنی زبان سے

ہمیں تقویت پہنچاؤ چنانچہ وہ تہامہ کے علاقہ میں قبیلہ کنانہ کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لئے نکلا اور دوسرے اشخاص دوسرے اطراف کی طرف گئے۔ جبیر بن مطعم نے جس کا چچا طعیمہ بن عدی بدر میں قتل ہوا تھا اپنے حبشی غلام وحشی کو بلایا جو حبش والوں کے طریقہ پر ایک حربہ کو پھینک کر نشانہ لگانے میں بڑا ماہر تھا۔ اس سے کہا کہ اگر تم میرے چچا طعیمہ کے بدلے میں محمدؐ کے چچا (حمزہ) کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔ بعض راویوں نے حمزہ کے ساتھ رسول خداؐ اور حضرت علیؑ کا نام بھی لیا ہے کہ آزادی کو ان میں سے کسی کے بھی قتل کرنے سے مشروط کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے گھرانوں کی عورتیں ساتھ لی گئیں تاکہ ناموس کے خیال سے لوگ میدان جنگ سے فرار نہ کریں۔ تاریخ میں ان میں سے خاص خاص عورتوں کے جو ممتاز حیثیت رکھتی تھیں نام موجود ہیں۔ چنانچہ سردار فوج کے ساتھ جو ابوسفیان تھا اس کی بیوی ہند بنت عتبہ بن ربیعہ تھی۔ اسی طرح عکرمہ بن ابی جہل کے ساتھ ام حکیم بنت حارث اور اس کے چچا حارث بن ہشام کے ساتھ فاطمہ بنت ولید اور صفوان بن امیہ کے ساتھ برزہ یا برہ بنت مسعود اور عمرو بن العاص کے ساتھ عبداللہ بن عمرو بن عاص کی ماں ریطہ بنت منبہ بن حجاج اور طلحہ بن ابی طلحہ کے ساتھ سلافہ بنت سعد۔ یہ تمام عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ تھیں۔ اور خناس بنت مالک اپنے بیٹے ابوعزیز بن عمیر کے ساتھ تھی سب سے زیادہ ہندہ بنت عتبہ سپاہیوں کو جوش دلاتی تھی اور خصوصیت کے ساتھ اس حبشی غلام وحشی کو جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۱۰)

مدینہ پر حملہ

ان تمام تیاریوں کے بعد جو پورے ایک سال تک ہوئی تھیں ابوسفیان کی سرکردگی میں فوج روانہ ہوئی اور مدینہ سے بالکل متصل کوہ احد کے دامن میں پہنچ کر اس نے اپنے مورچے جما لیے۔ سواد اعظم کے مورخین کا بیان ہے کہ حضرت پیغمبر خداؐ کا رجحان یہ تھا کہ مدینہ کے اندر رہ کر دشمنوں کا مقابلہ کیا جائے۔ اکثر

انصار بھی یہی کہہ رہے تھے اور ایک روایت کے مطابق راس المنافقین عبداللہ ابی نے بھی یہی کہا کہ ہمارے شہر کے اندر جب بھی کوئی داخل ہوا ہے تو ہم نے اسے شکست دی ہے۔ مردان جنگی شہر کے دروازوں پر رہ کے مقابلہ کریں اور بوڑھے' بچے اور عورتیں کوٹھوں پر سے سنگ باری کریں تو دشمن کی مجال نہیں کہ وہ ہمارے شہر پر قبضہ کر سکے۔

دوسری روایت یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی نے باہر نکلنے کی رائے دی اور کہا کہ ان کتوں سے باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہئے۔

کچھ سادہ لوح مسلمان جوش شہادت میں اس پر اصرار کرنے لگے غرض کہ شوریٰ کے موقع پر اکثریت اس پر ہو گئی کہ باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہئے اور مجلس مشاورت کے اس فیصلہ کے احترام میں پیغمبرؐ روانگی کے لئے تیار ہو گئے مگر جب حضرتؐ چلنے لگے تو یہ سب حضرات جنہوں نے باہر نکلنے کی رائے دی تھی اپنے اس اصرار پر پشیمان ہوئے اور آکر رسولؐ سے عرض کیا کہ جو آپ کی رائے تھی اسی پر عمل کیجئے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ نہیں۔ ایک رسولؐ جب جنگ کا لباس پہن کر تیار ہو جائے تو پھر اسے واپس نہیں ہونا چاہئے۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۱۱)

ہمارے نزدیک پیغمبر خداؐ کے افعال کی بنیاد وحی ربانی پر ہوتی تھی ہو سکتا ہے کہ خالق کی حکمت متقاضی ہوئی ہو' بالخصوص اس جنگ کے مستقبل کو دیکھتے ہوئے کہ مسلمانوں پر اتمام حجت کر دی جائے اور جب کہ باہر نکل کر مقابلہ ان کی رائے سے ہوا تھا تو اب جو عملی کمزوری ان کے سامنے آئے اس کا مواخذہ ان سے شدید تر ہو جائے کہ خود ہی تو تم نے باہر نکلنے پر اصرار کیا اور خود ہی میدان جنگ سے فرار اختیار کیا۔

بہرصورت اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے کافی سامان بصیرت ہے جو شوریٰ اور کثرت رائے کی حقانیت پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے کہ صورت واقعہ سے ظاہر ہے کہ خود شوریٰ کرنے والوں نے بعد میں یہ احساس کیا کہ ہمارا طرز عمل غلط تھا

اور خود ہی پھر رسولؐ سے اس کے خلاف عمل کی تحریک کرنے لگے پھر جب پیغمبر خداؐ کے سامنے مجلس شوریٰ کا فیصلہ مجروح ہو گیا تو پیغمبرؐ کے بعد اگر کوئی شوریٰ ہو تو اسے غلطی سے معصوم کیونکر مانا جا سکتا ہے۔

پیغمبرؐ کی روانگی

تاریخ کا بیان ہے کہ قریش اپنے مورچہ پر کوہ احد کے دامن میں چہار شنبہ کے دن آ گئے تھے مگر حضرت پیغمبر خداؐ نے اس کے بعد تین دن توقف فرمایا اور جمعہ کی نماز مدینہ ہی میں پڑھائی۔ اتفاق سے اس دن مسلمانوں میں سے ایک انصاری کا قبیلہ بنی نجار میں سے جن کا نام مالک بن عمرو تھا' انتقال ہو گیا۔ حضرت پیغمبر خداؐ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور اس کے بعد مشرکین کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے اور روز شنبہ ۱۵ ماہ شوال کو ان سے مقابلہ ہوا۔

علامہ سید محسن امین ۷ شوال اور بقولے ۱۵ شوال روز شنبہ ۳ ہجری لکھتے ہیں۔ ہجرت کے بتیس مہینے بعد۔

(اعیان الشیعہ' جلد ۲ صفحہ ۱۷۷)

تعداد فوج

مشرکین کی تعداد اس جنگ میں تین ہزار تھی اور بقولے دو ہزار۔ (اعلام الوریٰ) ان کے مقابلہ میں حضرت پیغمبر خداؐ ایک ہزار اصحاب کو لے کر نکلے مگر عین موقع پر جنگ کے کچھ ہی پہلے عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر واپس آ گیا۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ اس کی رائے وہی تھی کہ مدینہ کے اندر رہ کر مقابلہ کیا جائے چنانچہ یہی کہہ کر وہ واپس ہوا کہ انہوں نے میرا کہنا نہ مانا۔ اب میں اپنے کو اور اپنی جماعت کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۱۲)

اس طرح لشکر اسلام کی تعدادا سات ہی سو رہ گئی اور یہ پہلی ضرب تھی جو مسلمانوں کی اخلاقی طاقت پر لگی۔ جس نے دوسروں کے بھی عزم و استقلال میں رخنہ پیدا کیا چنانچہ بنی سلمہ اور بنی حارثہ دو قبیلے اور واپسی کا ارادہ کرنے لگے مگر پھر

کچھ سوچ سمجھ کر انھوں نے اس ارادہ کو ترک کر دیا جس کا تذکرہ قرآن مجید کے ان الفاظ میں ہے کہ۔

اذهمت طائفتان منکم ان تفشلا

جب کہ دو گروہوں نے تم میں سے ارادہ کیا کہ وہ عمل میں کمزوری دکھلائیں۔

مشرکین میں سات سو زرہ پوش تھے اور مسلمانوں میں صرف سو کے جسم پر زرہیں تھیں۔ وہاں دو سو گھوڑے تھے اور یہاں اس جنگ میں بھی کل جمع دو ہی گھوڑے تھے۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۱۲)

سن و سال کا جائزہ اور مسلمان بچوں کا جوش

مسلمان فوج میں بہت سے بچے شامل ہو گئے تھے۔ رسول خداؐ نے جو اپنی فوج کا جائزہ لیا تو کئی بچوں کو سن کی کمی کی بناء پر واپس فرما دیا جیسے زید بن ثابت' عبداللہ بن عمیر' اسید بن ظہیر' براء بن عازب' عرابہ بن اوس اور ابوسعید خدری مگر اس موقع پر بعض بچوں کا ولولہ جہاد قابل قدر سمجھا گیا جیسے رافع بن خدیج۔ یہ بھی کم سن تھے' مگر جب بچے آپ کے سامنے لا کر کھڑے کیے گئے تو یہ بڑی بے تابی سے اپنے پنجوں پر زور دے دے کر کھڑے ہو رہے تھے کہ قد ان کا چھوٹا معلوم نہ ہو۔ حضرتؐ نے اس شوق و ذوق کو محسوس فرمایا اور کہا اس بچہ کو ساتھ چلنے دو۔ جب رافع کو آپ نے اس طرح اجازت دے دی تو سمرہ بن جندب نے جو کم سنی کی بنا پر واپس کئے جا چکے تھے اپنے سرپرست کے ذریعہ سے پیغمبرؐ کی خدمت میں کہلوایا کہ آپ نے رافع کو جنگ میں جانے کی اجازت دے دی ہے مگر میں دعویٰ رکھتا ہوں کہ رافع سے کشتی لڑوں تو رافع کو پٹخ دوں گا۔ حضرتؐ کو یہ طفلانہ استدلال بھی پسند آیا اور فرمایا اچھا تو پھر میرے سامنے کشتی ہو جائے چنانچہ کشتی ہوئی اور واقعی سمرہ نے رافع کو پٹخ دیا جس پر حضرت نے سمرہ کو بھی شرکت جنگ کی اجازت دے دی۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۱۲-۱۳)

یہ مسلمانوں میں بچپن سے اس ذہنیت کی ہمت افزائی تھی کہ وہ راہ حق میں مرنے مارنے کو کھیل سمجھیں اور کسی خطرہ اور دہشت کا احساس دل میں پیدا نہ ہونے دیں۔

لشکروں کی ترتیب اور جنگ کے انتظامات

مشرکین نے اپنے لشکر کو مرتب کیا اس طرح کہ میمنہ کا افسر خالد بن ولید کو بنایا اور میسرہ کا عکرمہ بن ابی جہل کو اور علم لشکر طلحہ بن ابی طلحہ کے سپرد کیا۔ پیغمبر خدا ؐ نے اپنے یہاں کی مورچہ بندی اس طرح کی کہ کوہ احد کو حفاظت کے لئے پشت پر رکھا کہ دشمن پشت کی طرف سے حملہ آور نہ ہو جائے۔ اس کے لئے آپ نے پچاس تیر اندازوں کے ایک دستہ کو قبیلہ عمرو بن عوف کے ایک بہادر عبید اللہ بن جبیر کی سرکردگی میں اس درہ کے دہانے پر مقرر فرمایا۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ ہمیں چاہے فتح ہو چاہے شکست، تم بغیر ہماری ہدایت کے یہاں سے نہ ہٹنا۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۱۳)

پیغمبر خدا ؐ نے مہاجرین کا علم حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کو سپرد کیا اور انصار کا علم بردار سعد بن عبادہ کو بنایا اور انصار کی ہمت افزائی کے لئے حضرت خود اسی علم کے نیچے تشریف فرما ہوئے۔ علامہ طبرسی نے ایسا ہی لکھا ہے۔

(اعلام الوریٰ)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ آپ نے اس جنگ میں تین علم مرتب فرمائے تھے مگر وہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ۔

لوائے مہاجرین بہ علی مرتضیٰ (مدارج النبوۃ)

آپ نے مہاجرین کا علم حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کو مرحمت فرمایا۔

مشرکین کے بڑے گھروں کی پندرہ خواتین جن میں سے کچھ کا نام بہ نام ذکر پہلے آچکا ہے۔ اور یقیناً ان کے ساتھ کنیزیں وغیرہ بھی ہوں گی یہ تمام میدان جنگ

میں سپاہیوں کو جوش دلانے کے کام کو انجام دے رہی تھیں۔ چنانچہ ہندہ مادر معاویہ کے اشعار اس موقع کے تاریخ میں مشہور ہیں:۔

نحن	بنات	طارق
نمشی	علی	النمارق
ان	تقبلوا	نعانق
او	تدبروا	نفارق
فراق	غیر	وامق

(استیعاب مطبوعہ حیدر آباد جلد ۲ صفحہ ۲۸۶)

ہم ہیں ستار ہائے فلک کی بیٹیاں جو نازو نعمت سے ریشمی مسندوں اور تکیوں پر رہے ہیں اگر تم قدم آگے بڑھاؤ گے تو ہم تمہارے گلے ملیں گے اور اگر تم نے پیٹھ پھرائی تو ہم جدا ہو جائیں گے ایسا جدا ہونا جس میں مہر و محبت کا شائبہ بھی نہ ہوگا۔

ابو سفیان جو سالار لشکر تھا۔ مجسم اپنے دونوں خداؤں یعنی لات و عزیٰ کو اپنے ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے تھا (طبری جلد ۳ صفحہ ۱۴) تاکہ ان کے پرستار ان کی حفاظت کے لئے جان لڑا دیں۔

دست بدست مقابلہ

ادھر سے طلحہ بن عثمان جو علم دار لشکر تھا باہر نکلا اور پکار کر کہا' اے اصحاب محمدؐ تمہارا تو خیال ہے کہ جو تمہاری تلوار سے ہم میں کا قتل ہو وہ فوراً دوزخ میں جائے گا اور جو ہماری تلوار سے تم میں کا قتل ہو وہ سیدھا بہشت میں پہنچ جائے گا۔ تو کیا کوئی ہے تم میں سے جو میری تلوار سے جلد بہشت میں پہنچ جائے یا مجھے اپنی تلوار سے جلد دوزخ میں پہنچا دے۔ یہ سننا تھا کہ حضرت علیؓ بن ابی طالبؑ کھڑے ہو گئے اور پکار کر کہا' قسم ہے اس کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے' میں تجھ سے الگ نہیں ہوں گا۔ جب تک کہ جلد تجھے اپنی تلوار سے دوزخ میں نہ پہنچا دوں یا تو مجھے اپنی تلوار سے جلد بہشت میں نہ پہنچا دے۔ آپ نے جاتے ہی ایسی تلوار لگائی کہ اس کا پیر کٹ گیا اور وہ گرا تو برہنہ ہو گیا اور

کہنے لگا، میں تمہیں واسطہ دیتا ہوں اس رشتہ کا جو ہمارے درمیان تھا کہ بس اب مجھے چھوڑ دو۔ فوراً آپ اسے چھوڑ کر الگ ہو گئے اور دوسرا وار نہیں کیا مگر وہ ضرب ایسی تھی جس سے وہ جانبر نہیں ہو سکتا تھا۔ پیغمبرؐ خدا نے صدائے تکبیر بلند کی۔ مگر جب حضرت علیؑ واپس آئے تو دوسرے اصحاب نے کہا کہ ارے آپ نے اس پر دوسرا وار نہ کر دیا، آپ نے فرمایا کہ وہ برہنہ ہو گیا تھا اور پھر اس نے مجھے قسم دے دی تو اب مجھے حملہ کرتے ہوئے شرم آئی۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۱۵)

تاریخ کے طالب العلم اسے عرصہ تک یاد رکھیں۔ اس لئے کہ فریق مخالف نے اس نسخہ کو ہمیشہ یاد کر لیا، چنانچہ صفین کی لڑائی میں شام کی فوج کے دو سورماؤں نے یکے بعد دیگرے علیؑ کی تلوار کی زد پر آنے کے بعد ارادۃً" برہنہ ہو کر ہی جان بچائی۔ اس وقت تو لوگ یہی سمجھے کہ ان میں سے پہلے نے دوسرے کے لئے مثال قائم کی مگر اب احد کے معرکہ کی روداد پڑھ کر پتہ چلا کہ یہ سبق ان لوگوں نے احد کے علم دار مشرکین طلحہ سے حاصل کیا تھا مگر طلحہ کا کردار ایسا داغدار نہیں ہے جیسا ان مسلمان بہادروں کا اس لئے کہ وہ مہلک طور پر زخمی ہو چکا تھا تو یقیناً وہ غیر ارادی طور پر اس طرح گرا اور ان حضرات نے اس روایت کو صرف تدبیر جنگ کے طور پر عمداً" دہرایا تھا۔

طلحه بن ابی طلحه که صاحب لوا قریش بود بر آمد و فریاد کرد و مبارز خواست و شیر بیشه ہیجا و ہنر بر میدان دغا علی مرتضیٰ رضی اللّٰه عنه و کرم اللّٰه وجه در میدان رفت و مبادرت نمود و تیغے بر سروے زد که تا مغزش شگافته شد و باز گشت و بصف خویش آمد یاراں گفتند که چرا کار طلحه تمام نه ساختی، جواب داد که چوں وے بیفتاد عورتش ظاہر شدو مرا سوگند داد که از سرا و در گزرم شرم دانستم که دیگر تعرض بوے کنم و دانستم که عنقریب ہلاک خواہد شد

طلحہ بن ابی طلحہ جو قریش کا عملدار تھا باہر نکلا۔ چیخا اور مبارز طلب کیا ادھر سے نیستان جنگ کے شیر اور میدان نبرد کے ضرغام حضرت علیؓ مرتضیٰ میدان میں گئے اور پیش دستی کی اور ایک تلوار اس کے سر پر لگائی جس سے اس کا سر بھیجے تک شگافتہ ہو گیا اور پھر واپس چلے گئے اور اپنی صف میں آ گئے۔ ساتھیوں نے کہا کہ آپ نے طلحہ کا کام تمام کیوں نہیں کیا' جواب دیا کہ جب وہ گرا تو برہنہ ہو گیا اور مجھے اس نے قسم دی کہ میں اسے اب چھوڑ دوں' مجھے شرم آئی کہ اب اس کے درپے ہوں اور یہ مجھے معلوم تھا کہ وہ بہت جلد ہلاک ہو جائے گا۔

(مدارج النبوۃ)

طلحہ کی ولدیت میں جو اختلاف نظر آتا ہے اسے اختلاف نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس لئے کہ ابو طلحہ تو کنیت ہے اس شخص کا کوئی نام تو ہونا ہی چاہئے۔ طبری نے اس کے باپ کا نام بتایا کہ وہ عثمان تھا۔ بے شک ضرب کی کیفیت میں اختلاف ہے جس میں مجھے کسی حد تک ترجیح محدث دہلوی کی روایت کو محسوس ہوتی ہے اس لئے کہ پیر کا قطع ہو جانا گرنے کا باعث ہو سکتا ہے لیکن وہ بہت جلد ہلاکت کا سبب ہو جائے ایسا معلوم نہیں ہوتا۔ حضرت علیؓ کا یہ خیال کر کے واپس ہونا کہ یہ از خود بہت جلد ہلاک ہو جائے گا یہی بتاتا ہے کہ تلوار کاسہ سر پر پڑی تھی جس نے مغز تک شگاف ڈال دیا تھا پھر یہ کہ ہمیں حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ کی ضرب کی عام کیفیت بھی یہی معلوم ہے کہ آپ یا سر پر تلوار لگاتے تھے اور یا کمر پر۔ شاذ و نادر پیر پر وار فرماتے تھے۔

گھمسان کی جنگ

علمدار لشکر کے مارے جانے سے مشرکین کی کمر ٹوٹ گئی اور اب کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ مبارز طلبی کو نکلے۔ اب طرفین سے عام حملہ ہو گیا جس میں حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ اور حضرت حمزہ ایسے ممتاز مجاہدوں کے علاوہ دوسرے مسلمانوں نے بھی کافی ہمت و جرات سے مقابلہ کیا جن میں جناب مقداد بن اسود اور زبیر بن عوام کا نام تاریخ میں خصوصیت کے ساتھ ملتا ہے۔ (طبری جلد ۳ صفحہ ۱۵)

ایک اور مجاہد جن کا کارنامہ نمایاں ہے جناب ابو دجانہ انصاری ہیں۔ خود زبیر راوی ہیں کہ پیغمبر خداؐ نے روز احد ایک تلوار ہاتھ میں اٹھائی اور فرمایا کہ کون لیتا ہے اس تلوار کو اس شرط سے کہ اس کا حق ادا کر دے۔ یہ کہتے ہیں کہ میں کھڑا ہو گیا۔ اور میں نے کہا' میں حاضر ہوں۔ آپ نے میری طرف سے منہ پھیر لیا۔ پھر فرمایا' کون اس تلوار کو اس کا حق ادا کرنے کے ساتھ لیتا ہے۔ پھر میں کھڑا ہوا اور میں نے کہا' یا رسول اللہؐ میں۔ مگر پھر آپ نے منہ پھر لیا۔ تیسری دفعہ جب یہی آواز بلند ہوئی تو ابو دجانہ سماک بن خرشہ کھڑے ہو گئے اور کہا' میں اس کا حق ادا کرنے کے ساتھ اسے لوں گا مگر بتا دیجئے اس کا حق ہے کیا؟ فرمایا' حق اس کا یہ ہے کہ اس سے کبھی کسی مسلمان کو قتل نہ کرنا اور کسی کافر کے سامنے سے فرار نہ ہونا۔ چنانچہ حضرت نے تلوار ان کو دے دی اور ان کا قاعدہ تھا کہ جب جنگ پر آمادہ ہوتے تھے تو پیشانی پر ایک عصابہ (پٹی) باندھ لیتے تھے۔ زبیر کا بیان ہے کہ میں بڑے اشتیاق سے دیکھتا رہا کہ یہ آج کیا کرتے ہیں؟ تو میں نے دیکھا کہ کوئی ان کے سامنے نہیں آتا مگر یہ کہ وہ اسے دو نیم کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ان عورتوں تک پہنچ گئے جو دامن کوہ میں دف بجا بجا کر سپاہیوں کو جوش دلا رہی ہیں اور ان میں ایک عورت یہ اشعار پڑھ رہی تھی۔

نحن بنات طارق ان تقبلوا نعانق
و نبسط النمارق او تدبروا نفارق
فراق غیر وامق

(ذرا سے فرق کے ساتھ یہ وہی اشعار ہیں جو اس کے پہلے ہندہ بنت عتبہ کی زبانی درج ہو چکے ہیں۔ مگر زبیر نے اس بیان میں معلوم نہیں تقیہ سے یا اور کسی بناء پر اس عورت کا نام نہیں لیا ہے حالانکہ خود طبری نے دوسرے مقام پر ہندہ کا نام لیا ہے)۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۱۶)

ابودجانہ نے تلوار اٹھائی کہ وہ اس عورت پر ٹوٹ پڑیں مگر پھر تلوار روک لی' یہ

دیکھ کر میں ان کے سامنے گیا اور میں نے کہا کہ آج کی تمہاری پوری کارگزاری میں دیکھتا رہا ہوں مگر یہ کیا تھا کہ تم نے اس عورت پر تلوار اٹھائی' پھر ہاتھ روک لیا۔ انہوں نے کہا مجھے پیغمبر خداؐ کی تلوار کے لئے خلاف شان معلوم ہوا کہ میں اس سے ایک عورت کو قتل کروں۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۱۵)

دوسری روایت میں خود ابو دجانہ کا یہ بیان ہے کہ عورت مردانہ وار بری بہادری سے لڑ رہی تھی۔ میں جب اس کے قریب حملہ کے ارادہ سے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ عورت ہے' اس لئے میں نے تلوار اس کے مقابلہ میں روک لی۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۲۷)

ابو سفیان نے اس موقع پر ایک چال چلی جو ناکام ہوئی۔ وہ یہ تھی کہ اس نے پکار کر جماعت انصار سے کہا کہ اے اوس و خزرج ہمیں تم سے لڑنا نہیں ہے۔ ہمیں اور ہمارے بھائیوں کو آپس میں مقابلہ کرنے دو اور تم واپس چلے جاؤ۔ ہم تم سے کوئی مزاحمت نہ کریں گے۔ مگر انصار نے بہت تلخ الفاظ میں اس کی اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔

مدینہ کے باشندوں میں سے ایک بااثر آدمی ایسا تھا جو پیغمبر خداؐ کی ہجرت کے بعد خفا ہو کے یہاں سے مکہ چلا گیا تھا اور اس کے ساتھ کے پندرہ اور بقولے پچاس قبیلہ اوس کے غلام بھی چلے گئے تھے اس نے قریش کو انصار کے متعلق بڑی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا اور کہا تھا کہ میں جب سامنے چلا جاؤں گا تو تمام اہل مدینہ ٹوٹ جائیں گے اور پیغمبرؐ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ یہ شخص ابو عامر تھا جو اس کے پہلے مدینہ والوں میں اپنے زہد و تقویٰ کی شہرت کے' باعث راہب یعنی تارک الدنیا کے لقبؒ کے ساتھ مشہور ہو گیا تھا۔ پیغمبر خداؐ سے مخالفت کے بعد اسے یہاں عام طور پر فاسق کہا جانے لگا۔ احد کے میدان میں وہ بڑے طنطنہ کے ساتھ میدان میں آیا اور اس نے پکار کر کہا' اے میرے قبیلہ اوس والو! میں ہوں ابو عامر' مگر اوس کے قبیلہ کی طرف سے جواب ملا کہ خدا کی مار تجھ پر او فاسق! اپنی توقع کے خلاف

یہ سن کر وہ مارنے مرنے پر آمادہ ہو گیا اور بڑی شدت کے ساتھ اس نے جنگ کی۔ بالآخر قتل ہو گیا۔

مسلمانوں کی ابتدائی فتح

اہل اسلام اور مشرکین میں گھسان کا رن پڑا جس میں تاریخ نے نمایاں حیثیت سے صرف تین نام لئے ہیں۔ طبری کے الفاظ یہ ہیں۔

و قاتل ابو دجانة حتی امعن فی الناس و حمزة بن عبدالمطلب و علی بن ابی طالب فی رجال من المسلمین فانزل اللّٰه عز و جل نصره و صد قهم وعده فحسو هم بالسیوف حتی کشفو هم و کانت الهزیمة لا شك فیها۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۱۶)

ابو دجانہ نے جنگ کی یہاں تک کہ مخالفین کا ستھراؤ کر دیا اور حمزہ بن عبدالمطلب اور علیؓ بن ابی طالبؓ نے کچھ اور مسلمانوں کے ساتھ' تو اللہ نے اپنی مدد اتاری اور اپنا وعدہ ان سے پورا کیا تو انہوں نے ان کو تلواروں سے اتنا مارا کہ انہیں ہٹا دیا' اور شکست ہو گئی' فوج مخالف کو جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔

ماضی قریب کے ہندوستانی مورخ علامہ شبلی کے الفاظ یہ ہیں۔

"علمبرداروں کے قتل اور حضرت علیؓ اور ابو دجانہ انصاری کے بے پناہ حملوں سے فوج کے پاؤں اکھڑ گئے' پری وش نازنینیں جو اپنے سریلے رجزوں سے سپاہوں کے دل ابھا رہی تھیں۔ وہ بھی بدحواسی کے ساتھ ہٹیں اور مطلع صاف ہو گیا۔

(سیرۃ النبی صفحہ ۲۷۶)

زبیر کا بیان ہے کہ میں ان عورتوں کا جو ہند بنت عتبہ کے ساتھ آئی تھیں یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ وہ پائنچے اٹھائے بھاگی جا رہی تھی اور ان کے گرفتار کئے جانے میں کوئی دشواری نہ تھی۔

مسلمانوں کا مال غنیمت پر ٹوٹنا اور جنگ کا بگڑ جانا

فیصلہ کن جنگ منزل تک پہنچ گئی تھی، مشرکین کی فوج قطعی طور پر پسپا کر دی گئی اور لشکر کفار نے راہ فرار اختیار کی تھی۔ اب اموال غنیمت مجاہدین اسلام کا مطمح نظر بن گئے اور معزز صحابہ کی جماعت مال غنیمت لوٹنے میں مصروف ہو گئی۔

دو سپاہی جو پہاڑ کے دہانے پر اس ہدایت کے ساتھ کھڑے کیے گئے تھے کہ ہمیں چاہے فتح ہو چاہے شکست، تم یہاں سے بغیر حکم ثانی ملے ہوئے ہٹنا نہیں، انہیں بھی مال غنیمت کی فکر ہو گئی جب کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ فوج کے سپاہی بے تحاشا مال لوٹنے میں مصروف ہیں، وہ سمجھے کہ اگر ہم یہیں کھڑے رہے تو ہمیں کچھ بھی نہ مل سکے گا، اس لئے وہ بھی اپنی جگہ چھوڑنے پر تیار ہو گئے حالانکہ ان کے سالار عبداللہ بن جبیر نے بہت منع کیا اور انہیں پیغمبر خدا کی صریحی ہدایت یاد دلائی۔ مگر "حب دنیا"

(یہ لفظ قرآن مجید کی اس صراحت پر مبنی ہے کہ منکم من یرید الدنیا (یعنی) "تم" میں کچھ دنیا کے طلبگار ثابت ہوئے"۔ طبری کی روایت میں تشریح ہے کہ الذین ارادوا الغنیمة یہ وہ لوگ ہیں جو مال غنیمت پر ٹوٹے" - ابن مسعود کہتے تھے کہ آج سے پہلے مجھے تصور نہیں تھا کہ اصحاب رسولؐ میں کوئی ایک بھی "حب دنیا" میں گرفتار ہے مگر احد میں پتہ چل گیا۔ (تاریخ طبری، جلد ۳ صفحہ ۱۴)

کا وہ زور تھا کہ ان کی اکثریت کسی طرح نہ رکی یہاں تک کہ عبداللہ بن جبیر کے پاس اکا دکا آدمی وہاں کھڑے رہ گئے اور باقی سب مال غنیمت لوٹنے میں مصروف ہو گئے۔ دیکھا جائے تو ان لوگوں کی یہ ہوس اور پیغمبرؐ کی حکم عدولی بجائے خود اگرچہ بہت قابل اعتراض ہے مگر اس کی کچھ ذمہ داری اصل فوج مجاہدین پر بھی عائد ہوتی ہے۔ ان کو بھی یہ خیال کرنا چاہئے تھا کہ ہمارے کچھ بھائی پہاڑ کے دہانے پر روک دیئے گئے ہیں۔ جب تک مشرکین اتنی دور نہ چلے جائیں کہ ان مجاہدین کو جو وہاں حفاظت کے لئے کھڑے ہیں واپس بلایا جا سکے اس وقت تک ہمیں ان اموال غنیمت کے لوٹنے کی طرف توجہ نہ کرنا چاہئے، مگر یہاں تو "زر طلبی" کی ایک

آندھی چلی ہوئی تھی۔ یہ سوچنے اور کسی کا لحاظ کرنے کا وقت ہی کہاں تھا۔

پھر جب یہ لوگ اتنے بے تاب تھے تو وہ بھی تو سینوں میں ایسے ہی دل رکھتے تھے۔ وہ کیونکر پیچھے رہتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پہاڑ کے اس دہانے پر ایسی طاقت نہ رہ گئی جو دشمن کو روک سکے' ادھر مشرکین کی فوج کا ایک بڑا سورما خالد بن الولید اس دہانے کی تاک میں تھا۔ اس نے جو دیکھا کہ وہ سپاہی جو ادھر متعین تھے منتشر ہو گئے ہیں اور بس دو چار آدمی ہی کھڑے ہوئے ہیں تو وہ مشرکین کی فوج کے ایک دستہ کو لئے ہوئے اس طرف سے مسلمانوں پر حملہ آور ہو گیا بچارے عبداللہ بن جبیر اور ان کے ساتھ کے آدمیوں نے جو اب وہاں کھڑے تھے جان توڑ مقابلہ کرکے اپنی جانیں دے دیں مگر وہ اس ریلے کو کہاں روک سکتے تھے۔ ادھر سے اس حملہ کی کامیابی کو دیکھ کر اس طرف سے مشرکین کی اصل فوج بھی پلٹ پڑی۔ اب یہاں تو مسلمان مال غنیمت پر گرے ہوئے تھے اور ادھر پشت پر سے مشرکین کی تلواریں برسنے لگیں۔ بس اب کیا تھا؟ کچھ جی دار مسلمان تھے جنہوں نے اپنے کو سنبھالا اور ایک دم لڑنے میں مصروف ہو گئے اور باقی تمام فوج اسلام کے قدم اکھڑ گئے اور تلواریں لے کر حملہ آوروں کی طرف پلٹنے کی بجائے جس کا جدھر منہ تھا ادھر ہی بھاگنے میں اس نے اپنی نجات محسوس کی۔ پیغمبر خداؐ کے پاس تھوڑے سے آدمی جو رہ گئے تھے انہوں نے بلا ترتیب جو جہاں پر تھا وہاں پر لڑنا شروع کیا اس طرح کہ انمیں سے ایک کو دوسرے کی خبر نہ رہی کسی طرف حمزہ' کسی طرف ابودجانہ اور کسی طرف علیؑ بن ابی طالبؑ اور ایسے ہی کچھ اور جانباز مجاہدین میں سے اکثر بعد کو قتل ہو گئے یا زخموں سے چور ہو کر گر گئے۔ یہاں تک کہ ایک وقت آیا کہ مشرکین نے اپنا پورا نصب العین پیغمبرؐ کی ذات کو بنا لیا اتنے حملے ہوئے کہ آپ زخموں سے نڈھال ہو کر ایک گڑھے میں گر گئے۔ کسی نے غلطی یا شرارت سے یہ صدا بلند کر دی کہ آپ شہید ہو گئے۔ اب تو جو مسلمان آس پاس کچھ سوچ بھی رہے تھے کہ آگے بڑھ کر مقابلہ کیا جائے۔ وہ یہ کہتے ہوئے کہ رسولؐ تو قتل ہو گئے اب جنگ سے کیا فائدہ؟ دور دور بھاگ کر جانے لگے اور دوسروں کو بھی یہی

کہہ کہہ کر اپنی جانیں بچانے کی تحریک کرنے لگے۔ تاریخ کے الفاظ ہیں۔

تفرق عنه اصحابه و دخل بعضهم المدينة وانطلق بعضهم فوق الجبل الى الصخرة فقاموا عليها و جعل رسول اللّٰه يدعوا الناس الى الى عباد اللّٰه

(طبری جلد ۳ صفحہ ۲۰)

آپ کے اصحاب آپ کے پاس سے ادھر ادھر منتشر ہو گئے اور کچھ مدینہ میں چلے گئے اور کچھ پہاڑ کی چٹان پر جا کر ٹھہر گئے اور حضرت پیغمبر خداؐ بہ آواز بلند پکارنے لگے لوگوں کو بلاتے ہوئے کہ میری طرف آؤ میری طرف اے بندگان خدا۔

اسی کو قرآن مجید نے کہا ہے۔

والرسول يدعوكم فى اخرلكم

رسولؐ تمہارے پیچھے سے تمہیں آواز دے رہے تھے۔

بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ حذیفہ کے والد یمان جن کا نام حسیل بن جابر تھا، خود مسلمانوں کی تلواروں سے شہید ہوئے۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۲۶)

ظاہر ہے کہ جب پوری فوج میں یہ افراتفری کا عالم ہو اور بھگدڑ پڑی ہوئی ہو تو میدان سے ہٹنے والوں کی مکمل فہرست بنانے کی تاریخ کو کیا ضرورت تھی۔ تاریخ ایسے ہی ناموں کو اس موقع پر محفوظ رکھ سکتی ہے، جن کا میدان سے ہٹنا ان کے خصوصیات کی بنا پر تاریخ کو غیر معمولی معلوم ہوا۔ یا ان افراد کے نام جو سب کے راہ فرار اختیار کرنے کے بعد میدان میں ثابت قدم رہ کے ایک غیر معمولی کردار کے حامل ثابت ہوں چنانچہ بلا تفریق فرقہ جمہورات کے اہل قلم نے دونوں قسموں کے ایسے نام محفوظ کر دیے ہیں جو ذیل کے اقتباسات سے ظاہر ہوں گے۔

انس بن نضر کی جانبازی

حافظ ابن جریر کی روایت ہے۔

انتهى انس بن نضر عم انس بن مالكؒ الى عمر بن الخطاب و طلحة بن

عبداللّٰہ فی رجال من المهاجرین والانصار و قد القوا بایدهم فقال ما یجلسکم قالوا قتل محمدؐ رسول اللّٰہ قال فما تصنعون بالحیاۃ بعدہ قوموا فموتوا علٰی ما مات علیہ رسول اللّٰہ ثم استقبل القوم فقاتل حتی قتل

(طبری جلد ۳ صفحہ ۲۰)

انس بن مالک کے چچا انس بن نضر (جو غالباً" میدان احد میں نہ آئے تھے۔ بس اس بھگدڑ یا رسولؐ کی شہادت کو سن کر اس میدان کی طرف روانہ ہوئے) ایک مقام پر پہنچے جہاں عمر بن خطاب اور طلحہ بن عبداللہ مہاجرین و انصار کی ایک جماعت کے ساتھ ہاتھ پاؤں ڈالے ہوئے ایک جگہ بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا ارے تم لوگ بیٹھے کیوں ہو؟ انہوں نے کہا کہ حضرت رسول خداؐ تو قتل ہو گئے انہوں نے کہا کہ پھر تم لوگ ان کے بعد زندہ رہ کر کیا کرو گے؟ اٹھو اور اسی راستے پر جان دے دو جس پر رسولؐ دنیا سے اٹھے پھر وہ خود فوج کے مقابلہ میں پہنچ گئے اور جنگ کی یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔

اب طبری کی دوسری روایت میں یہ ملاحظہ کر لیجئے اور جتنی چاہے عبرت حاصل کیجئے کہ یہ حضرات جنہیں انس بن نضر نے پہاڑ کی چٹان پر بیٹھے دیکھا تھا آپس میں گفتگو کیا کر رہے تھے؟

فشا فی الناس ان رسول اللّٰہ قد قتل فقال بعض اصحاب الصخرۃ لیت لنا رسولا الٰی عبداللّٰہ بن ابی فیاخذ لنا امنۃ من ابی سفیان یا قوم ان محمدا قد قتل فارجعوا الی قومکم قبل ان یا توکم فیقتلوکم قال انس بن النضر یا قوم ان کان محمد قد قتل فان رب محمد لم یقتل فقاتلوا علٰی ما قاتل علیہ محمد اللهم انی اعتذر الیک مما یقول هولاء و ابراء الیک مما جاء بہ هولاء ثم شد بسیفہ فقاتل حتی قتل

(طبری جلد ۳ صفحہ ۲۰)

لوگوں میں مشہور ہوا کہ رسول خداؐ شہید ہو گئے تو ان لوگوں میں سے جو پہاڑ کی

چٹان پر بیٹھے تھے۔ بعض نے کہا کہ کاش کوئی آدمی ایسا ہوتا جسے ہم عبداللہ بن ابی کے پاس بھیجتے کہ وہ ہمارے لئے ابو سفیان سے امان حاصل کرے اے بھائیو! محمد تو قتل ہو گئے تو اب اپنی قوم (مشرکین قریش) کی طرف واپس چلو قبل اس کے کہ وہ تم تک پہنچیں اور تمہیں قتل کر دیں۔ انس بن نضر نے کہا اے بھائیو اگر محمدؐ قتل ہو گئے تو محمدؐ کا خدا تو قتل نہیں ہوا تو تم جنگ کرو اسی راستے پر جس پر محمدؐ جنگ کر رہے تھے' خداوندا میں تیری بارگاہ میں معافی کا طالب ہوں اس سے جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں اور برائت کرتا ہوں اس سے جو ان لوگوں نے کیا پھر اپنی تلوار لے کر حملہ کیا اور جنگ کی یہاں تک کہ قتل ہو گئے۔

انس بن مالک کا بیان ہے کہ انس بن نضر کے جسم پر اس دن تلواروں اور نیزوں کے ستر زخم پائے گئے۔ یہاں تک کہ ان کی لاش کو کوئی پہچان نہ سکا۔ صرف ان کی بہن نے ان کی انگلیوں کی پوروں کے ایک خاص حسن سے جو تھا اس لاش کو پہچانا۔

(طبری' جلد ۳ صفحہ ۱۹)

پسپا ہونے والے نمایاں چہرے

دو نام تو ابھی انس بن نضر کے حال میں آ چکے۔ فطری طور پر یہ اطمینان سے ہاتھ پاؤں ڈالے ہوئے بیٹھنا میدان جنگ سے کافی دور پر ہی ہو سکتا ہے جہاں اطمینان ہو کہ دشمن جلد نہیں پہنچے گا۔ ورنہ اس کے پہلے ظاہر ہے کہ افتاں و خیزاں دشمن کی زد سے نکلنے ہی کی فکر ہو سکتی ہے۔ جس کی کیفیت حضرت عمر نے اپنے متعلق خود یوں بیان کی ہے۔

لما کان یوم احدا نھرمنا ففررت حتی صعدت الجبل فلقدر ایتنی انزو کاننی اروی

(تفسیر در منشور' سیوطی)

جب احد کی جنگ میں ہم لوگوں کو شکست ہوئی تو میں بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا اور میری یہ حالت تھی کہ میں جست و خیز کر رہا تھا جیسے بز کوہی ہوتی ہے۔

مگر علامہ فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں۔

و من المنهز مين عمر رضى الله عنه الا انه لم يكن فى لوائل المنهزمين و لم يبعد بل ثبت على الجبل

پسپا ہونے والوں میں حضرت عمر بھی تھے مگر وہ پہلے بھاگنے والوں میں نہ تھے اور زیادہ دور نہیں گئے تھے بلکہ پہاڑ پر ٹھہرے رہے تھے۔

طبری کا بیان ہے۔

و فر عثمان بن عفان و عقبة بن عثمان و سعد بن عثمان رجلان من الانصار حتى بلغوا الجلعب جبلابنا حية المدينة مما يلى الاعوص فاقاموا به ثلاثا ثم- رجعوا الى رسول الله فزعموا ان رسول الله قال لهم لقد ذهبتم فيها عريضة

(طبری، جلد ۳ صفحہ ۲۱)

اور عثمان بن عفان اور انصار کے دو آدمی عقبہ بن عثمان اور سعد بن عثمان نے جب فرار کیا تو جلعب پہنچ گئے جو مقام اعوص کے قریب مدینہ کے پاس ایک پہاڑ ہے تو وہاں تین دن قیام کیا پھر رسول خداؐ کے پاس یہ لوگ واپس آئے تو ان لوگوں کا بیان ہے کہ رسولؐ نے ان سے فرمایا کہ تم لوگ تو بڑے لمبے ہو گئے۔

مستدرک حاکم اور قرة العینین شاہ ولی اللہ دہلوی کا یہ اقتباس نواب احمد حسین خاں (پریانواں) نے درج کیا ہے کہ۔

عن عائشة قالت قال ابوبكر الصديق لما جال الناس عن رسول الله يوم احد كنت اول من فاء اليه فبصرت به من بعد فاذا انا برجل اعتنقنى من خلفى يريد رسول اللهؐ فاذا هو ابو عبيدة الجراح

(تاریخ احمدی صفحہ ۴۲)

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر فرماتے تھے کہ جب روز احد لوگ رسول اللہ کو چھوڑ کر منتشر ہوئے تو سب سے پہلے میں آپ کے پاس واپس آیا تھا تو میں نے دور سے آپ کو دیکھا اور اس وقت ایک شخص نے پیچھے سے آکر

میرے گلے میں باہیں ڈال دیں یہ بھی رسول خدا کی طرف (واپس) آرہے تھے میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ ابو عبیدہ جراح تھے۔

شاہ عبدالحق دہلوی نے اس بھگدڑ کی بڑی مکمل اور عبرت انگریز تصویر کھینچی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

اضطراب عظیم درمیان لشکر اہل اسلام پیدا شدو لشکر تمام از ہم فروریخت و ازغایت شوریدگی حال کہ بایشاں راہ یافتہ بود بقتل یکدیگر افتادند و شعور بشعارنہ داشتند چنانکہ گویند اسید بن حضیر را دو زخم از مسلمانان رسید و بر ابو بردہ نیز دو زخم رسید و یمان پدر حذیفہ بدست مسلماناں مقتول شد۔ اصحاب دراں حین بر چہار قسم شد ند جمعے جنگ کردند و شہید شدند و گروہے گریختہ در زوایا و شعاب جبل مختفی گشتند و بعضے بشہر رفتہ قرار گر فتند و عثمان بن عفان از آنجملہ بود و بعد از اتمام معاملہ مقاتلہ و تسکین نائرہ جنگ بخدمت مراجعت نمودند۔ جز چہاردہ نفر ہفت از مہاجرین و ہفت از انصار باوے کسے نماند۔ عجب است کہ در ایشاں عمر بن الخطاب را ذکر نہ کردہ اند۔

(مدارج النبوۃ)

زبردست ہل چل مسلمانوں کے لشکر میں پیدا ہو گئی اور فوج تمام تتر بتر ہو گئی۔ انتہائی بد حواسی سے جو ان میں ہو گئی تھی' خود آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے اور جو آپس کی علامتی نشان تھا اس کا احساس نہ رہا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اسید بن حضیر کو دو زخم مسلمانوں کے ہاتھ سے آئے اور ابو بردہ کے جسم پر بھی دو زخم لگے اور حذیفہ کے والد یمان مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ اصحاب اس وقت چار گروہوں پر بٹ گئے تھے۔ ایک جماعت نے جنگ کی اور شہید ہوئے اور ایک گروہ بھاگ کر گوشوں اور پہاڑ کی گھاٹیوں میں چھپ گیا اور کچھ لوگوں نے شہر میں جا کر قرار لیا اور عثمان بن عفان انہی میں سے تھے۔ جنگ کا مرحلہ ختم

ہونے اور آتش کار زار کے خاموش ہونے کے بعد خدمت رسولؐ میں واپس آئے۔ سوائے چودہ آدمیوں کے سات مہاجرین میں سے اور سات انصار میں سے حضرتؐ کے پاس کوئی نہیں رہ گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں حضرت عمر کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

جن چودہ کے نام پیغمبرؐ کے پاس لئے گئے ہیں ان میں بھی نہیں کہا جا سکتا کہ کتنے وہ تھے جو پورے طور ثابت قدم رہے اور کتنے ایسے تھے جو دور جا کر پھر کسی وجہ سے واپس آ گئے۔ چنانچہ ان میں حضرت ابوبکر کا نام ہے۔ مگر خود ان کا قول اس کے پہلے درج ہو چکا ہے کہ جب لوگوں نے فرار کیا ہے تو میں سب سے پہلے واپس آیا تھا۔ یہیں آپ نے ایک دوسرے بزرگوار کے واپس آنے کا بھی ضمناً تذکرہ کر دیا ہے اور وہ ابو عبیدہ جراح تھے۔ پھر جنگ میں کارنمایاں کرنے والوں میں جناب طلحہ بن عبداللہ کا نام بھی تاریخ نے لیا ہے مگر انس بن مالک کے چچا انس بن نضر کی روایت پہلے درج ہو چکی ہے کہ انھوں نے حضرت عمر کے ساتھ جن لوگوں کو دامن کوہ میں ہاتھ پیر ڈالے ہوئے بیٹھے دیکھا تھا ان میں طلحہ بھی تھے جس پر انس نے بڑے تلخ انداز میں ملامت کی تھی اور جوش دلایا تھا اور خود جا کر دشمن کے مقابلہ میں مصروف جنگ ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ ممکن ہے کہ انہی کی نصیحت کے اثر سے بعد میں طلحہ بھی آکر جنگ میں شریک ہو گئے ہوں پھر جنگ کے اختتام کے موقع پر بھی جیسا کہ بعد میں آئے گا' بڑی دیر تک رسولؐ کے پاس کوئی نظر نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ واپس آئے تھے وہ بھی پھر تاب مقاومت نہ لا کر دوبارہ رخصت ہو گئے تھے۔ اس لئے بالآخر رسول اللہ کے پاس سوائے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے کوئی بھی نہ تھا۔

وفاداروں کے کارنامے

ابو دجانہ انصاری کی شہادت

ابودجانہ نے اس جنگ کے پہلے دور میں بھی داد مردانگی دی تھی جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے اب اس نازک مرحلہ پر جب کہ ساتھی منتشر ہو چکے تھے وہ حضرت پیغمبر خداؐ کے سامنے سپر بن کر اس طرح کھڑے ہو گئے کہ وہ آپ پر جھک گئے تھے تاکہ کسی طرف سے آپ کو گزند نہ پہنچ سکے اور تیروں کو اپنی پشت پر لے رہے تھے' یہاں تک کہ بہت سے تیر ان کے جسم میں پیوست ہو گئے۔

(طبری' جلد ۳ صفحہ ۱۸)

بالاخر وہ درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

مصعب بن عمیر

عرب میں بڑی لڑائیوں میں دو جھنڈے ہوتے تھے ایک بڑا ہوتا تھا جو رایت کہلاتا تھا اور دوسرا چھوٹا ہوتا تھا جو لواء کہا جاتا تھا' پیغمبر خداؐ کا رایت تو ہمیشہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے سپرد رہتا تھا مگر لواء کبھی کبھی کسی دوسرے کو بھی دے دیا جاتا تھا۔ چنانچہ جنگ احد میں جیسا کہ پہلے آ چکا حامل رایت حضرت علیؑ تھے۔ مگر لواء آپ کا جناب مصعب بن عمیر کے پاس تھا۔ جب جنگ میں شدت ہوئی تو مصعب جنگ کرکے درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ طبری کے الفاظ یہ ہیں۔

و قاتل مصعب بن عمیر دون رسول اللّٰہ ومعہ لوائہ حتی قتل و کان الذی اصابہ ابن قمیئۃ اللیثی و ھو یظن انہ رسول اللّٰہ فرجع الیٰ قریش فقال قتلت محمداً" فلما قتل مصعب بن عمیر اعطی رسول اللّٰہ اللواء علی بن ابی طالبؑ

(طبری جلد ۳ صفحہ ۱۸)

مصعب بن عمیر نے پیغمبرؐ کے سامنے جنگ کی اور ان کے پاس حضرت کا لواء تھا یہاں تک کہ وہ قتل ہو گئے اور جس نے ان کو قتل کیا وہ ابن قمیئہ لیثی تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ یہ رسول خداؐ ہیں تو وہ قریش کی طرف واپس گیا یہ کہتا ہوا کہ

میں نے محمدؐ کو قتل کر دیا۔ جب مصعب بن عمیر قتل ہو گئے تو رسول اللہؐ نے لواء بھی علیؑ بن ابی طالبؑ کے سپرد کر دیا۔

اس روایت میں اس غلط افواہ کا کہ رسول خداؐ شہید ہو گئے ماخذ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس سے دو چار آدمیوں نے شاید غلط فہمی سے اور کچھ نے شرارت سے یہ خبر پھیلا دی اور ممکن ہے کہ جنگی سیاست کی بناء پر مسلمانوں کی ہمت اور زیادہ پست کرنے لئے مسلمانوں میں سے بھی کچھ منافقین نے دشمنوں کا آلہ کار بن کر اس آگ کو ہوا دے دی۔

زیاد بن سکن

ایک روایت میں نام ان کا عمارہ بن زیاد بن سکن لکھا ہے یعنی اس میں اختلاف ہے کہ یہ باپ کا واقعہ ہے یا بیٹے کا۔ انہوں نے کچھ انصار کے ساتھ رسولؐ کے سامنے جہاد کیا۔ یہاں تک کہ ایک ایک کرکے وہ سب قتل ہو گئے سب سے آخر میں یہ زخموں سے چور ہو کر گرے' اتنی دیر میں کچھ اصحاب واپس آ چکے تھے۔ یا ابھی وہ رسولؐ کے پاس باقی تھے۔ حضرتؐ نے فرمایا کہ انہیں میرے قریب لاؤ چنانچہ انہیں حضرت کے پاس لا کر لٹایا گیا۔ اس طرح کہ ان کا رخسار حضرتؐ کے قدموں پر تھا اور اس عالم میں ان کی روح نے جسم سے مفارقت کی۔

حنظلہ غسیل الملائکہ

یہ ایک نوجوان تھے جن کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور شاید اسی لئے یہ مسلمانوں کی فوج کے ساتھ میدان جنگ میں نہیں گئے تھے۔ مگر جب رسولؐ کی شہادت یا لڑائی کے بگڑنے کی وحشت ناک خبر مدینہ میں پہنچی تو یہ جوش وفاداری اور جذبہ ایمانی میں بے تحاشا احد کی طرف روانہ ہو گئے اس حالت میں کہ انہوں نے غسل جو ان پر واجب تھا نہ کیا تھا' میدان میں پہنچ کر یہ فوج مخالف پر ٹوٹ پڑے' اثنائے جنگ میں ان کی نظر سالار لشکر مشرکین ابو سفیان پر پڑ گئی اور یہ اس سے دست و گریبان اور اسے زمین پر گرا کے سینہ پر سوار ہو گئے۔ اس کا کام تمام کرنا

ہی چاہتے تھے کہ شداد بن اسود نے دوڑ کر ان پر تلوار ماری جو بھرپور پڑی اور وہ درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ بعد میں پیغمبر خداؐ نے بتایا کہ انہیں ملائکہ آسمان نے غسل دیا۔ (طبری جلد ۳ صفحہ ۲۱) اس لئے وہ "غسیل الملائکہ" کہلائے بعد میں ان کی نسل بھی چلی جن کے نام کے ساتھ یہ لقب وابستہ رہا۔ چنانچہ جب اہل مدینہ نے یزید کی بد اعمالیوں کی بنا پر اس کی بیعت توڑنے کا اعلان کیا تو انہی حنظلہ کے بیٹے عبداللہ کو اپنا سردار قرار دیا تھا۔ پھر یوم حرہ میں جب مدینہ رسولؐ میں فوج یزید کے ہاتھوں قتل عام ہوا تو اس میں وہ شہید ہوئے۔

ام عمارہ انصاریہ

اس معرکہ میں ایک خاتون کی بھی جان نثاری یادگار ہے' یہ میدان احد میں زخمیوں کی مرہم پٹی کے لئے آئی تھیں مگر جب انہوں نے دیکھا کہ پیغمبر خداؐ پر دشمن حملے کر رہے ہیں تو یہ خاتون حضرتؐ کے سامنے کھڑی ہو گئیں اور تیروں کو اپنے سینہ پر لینے لگیں' یہاں تک کہ جب نیزوں اور تلواروں سے مخالفین نے حملہ کیا تو انہوں نے بھی تلوار لے کر دشمنوں سے مقابلہ کیا یہاں تک کہ زخمی ہو گئیں۔ (سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۸۴' اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد ۱ صفحہ ۹۹) اس خاتون کا یہ جہاد اور مردان جنگی کی اکثریت کا کردار دونوں صفحہ تاریخ پر عبرت کا سرمایہ ہیں۔

جناب حمزہ کا جہاد اور ان کی شہادت

پہلی دفعہ فتح کا سہرا جن مجاہدین کے سر تھا ان میں جناب حمزہ کا نام آچکا ہے جنگ بگڑنے کے بعد انہوں نے دوبارہ دشمن سے مقابلہ میں جان توڑ کوشش کی چنانچہ اس مہم میں بھی جو علمداران لشکر کفار کے قتل کرنے کی تھی جس کا ذکر بعد میں آئے گا جناب حمزہ نے شرکت کی اور علمداروں میں سے ایک ارطاۃ بن عبد شرحبیل بن ہاشم بن عبد مناف بن عبدالدار بن قصی کو انہوں نے قتل کیا۔ پھر ان کی طرف سے سباع بن عبدالعزیٰ غبشانی کا گزر ہوا جس کی کنیت ابو نیار تھی وہ

اس سے برسرپیکار ہو گئے اور اسے کاری ضرب لگائی۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۱۸)

جنگ کے لئے مشرکین کی تیاریوں کے ذیل میں وحشی کا ذکر آ چکا ہے علامہ طبری لکھتے ہیں کہ یہ جبیر بن مطعم کا غلام تھا۔ جبیر کا چچا طعیمہ جنگ بدر میں حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے ہاتھ سے قتل ہو چکا تھا۔ اس لئے جبیر کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ وحشی ملک حبش کے ایک ہتھیار "حربہ" کے لگانے میں جو پھینک کر مارا جاتا تھا بڑی مہارت رکھتا تھا جبیر نے اسے بلا کر میدان احد میں جانے سے پہلے یہ کہہ دیا تھا کہ اگر خود محمد (رسول خداؐ) کو تو قتل کر دے تو آزاد ہو جائے گا اور اگر ان کے چچا (حمزہ) کو قتل کر دے تو آزاد ہو جائے گا اور اگر ان کے چچا زاد بھائی (حضرت علیؑ) کو قتل کر دے تو آزاد ہو جائے گا چنانچہ وہ جنگ احد میں اس آزاد ہونے کی دھن میں گیا۔ اس کا خود بیان ہے کہ رسولؐ کے قتل کر سکنے کی تو مجھے امید نہ تھی مگر خیال تھا کہ علیؑ یا حمزہؑ کو شاید دھوکے سے قتل کر دوں اور آزادی کی نعمت حاصل کروں۔

(اعلام الوریٰ)

شدت جنگ کے دوران میں جناب حمزہ کا مقابلہ سباع بن عبدالعزیٰ سے ہو رہا تھا اور حمزہ ادھر متوجہ تھے کہ وحشی نے موقع پاکر اپنے حربہ کو پوری قوت سے پھینکا جو جاکر آپ کے سینہ پر لگا اور سینہ و شکم کو چاک کرتا ہوا پیروں کے پاس گر گیا۔ حضرت حمزہ کی جرات و ہمت وہ تھی کہ اس عالم میں بھی وہ وحشی کی طرف جھپٹے مگر ضعف سے تیورا کر گر گئے۔ ان کے گرنے کے بعد بھی وحشی کی اتنی ہمت نہ تھی کہ پاس آتا۔ جیسا کہ اس نے خود بیان کیا ہے۔ جب اس نے محسوس کر لیا کہ اب ان کی روح نے جسم سے مفارقت کی تو وہ قریب آیا اور اس نے اپنا حربہ زمین سے اٹھا لیا اور پھر خاموشی کے ساتھ لشکر گاہ کی طرف واپس چلا گیا۔ اس لئے کہ اسے اب جنگ کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی تھی جو اس کا مطلب تھا وہ حاصل ہو گیا تھا۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۱۰)

سعد بن ربیع

یہ انصار کے قبیلہ بنی الحارث بن خزرج میں سے تھے۔ یہ بھی اس جنگ میں شہید ہوئے ۔ راوی کا بیان ہے کہ اختتام جنگ کے بعد رسولؐ نے فرمایا' کون ہے جو سعد بن حارث کی خبر لائے کہ وہ زندوں میں ہیں یا مردوں میں۔ ایک انصاری نے کہا کہ میں جا کر دیکھتا ہوں۔ چنانچہ جا کر دیکھا تو انہیں زخموں سے چور پایا اس طرح کہ ان میں بس رمق جان باقی تھی۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے سعد کو بتلایا کہ رسول خداؐ نے تمہیں اس طرح دریافت فرمایا ہے' انہوں نے کہا بس جا کر بتا دو کہ میں مردوں میں ہوں اور رسول خداؐ کو میرا سلام کہنا اور میری طرف سے یہ کہہ دینا کہ اللہ آپ کو بہترین وہ جزا عطا فرمائے جو کسی بھی نبی کو اس نے عطا کی ہو اور میری قوم کو سلام پہنچا دینا اور ان سے میری طرف سے کہہ دینا کہ جب تک تم میں سے ایک متنفس بھی زندہ ہے رسولؐ کا بال بیکا نہ ہونے پائے ورنہ روز قیامت خدا کے سامنے تمہارے پاس کوئی جواب نہ ہوگا۔ یہ کہنے کے بعد ان کی روح نے جسم سے مفارقت کی۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۲۴' ۲۵)

پیغمبر خدا پر حملوں کی شدت

سابق زمانہ کے مورخین کی یہ عادت نہ تھی کہ وہ واقعہ کو مسلسل لکھیں۔ راویوں سے جو منتشر طور پر بیانات ملتے تھے انہیں پاشاں و پریشان طریقہ پر درج کر دیتے تھے۔ راویوں نے بھی زیادہ تر تسلسل کے ساتھ پورا واقعہ بیان نہیں کیا۔ بلکہ حسب موقع واقعہ کے جس جزو کے بیان کی جس وقت ضرورت محسوس ہوئی بس اتنا بیان کر دیا۔ اب بعد کے مورخین کو وہ سب بیانات یکجا ملتے ہیں تو ان میں ترتیب قائم کرنے میں بڑی دقت محسوس ہوتی ہے اور اسی بے ترتیبی سے بعض وقت واقعات میں تضاد محسوس ہوتا ہے۔ کہ پیغمبر خداؐ کے پاس کچھ آدمی موجود ہیں کہیں پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے آس پاس کوئی بھی نہیں ہے۔ ساتھ کے آدمیوں

میں کبھی زیادہ تعداد نظر آتی ہے اور کبھی بہت مختصر۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ واقعہ کے بیان میں کوئی اختلاف کی صورت نہیں ہے بلکہ جنگ بگڑنے کے بعد یکے بعد دیگرے جنگ کے مختلف دور سامنے آئے ہیں۔ پہلا دور وہ ہوگا جس میں اکثریت کے قدم اٹھ گئے مگر حضرت علی بن ابی طالب کے ساتھ ابو دجانہ انصاری حضرت حمزہ اور شاید ڈیڑھ دو سو مجاہدین ابھی مصروف پیکار تھے جس کی قطعی دلیل شہدائے احد کی تعداد ہے۔ جو متفق علیہ حیثیت رکھتی ہے یعنی ستر آدمی مسلمانوں میں سے شہید ہوئے۔ اگر یہ مانا جائے کہ پورے اسلامی لشکر نے فرار اختیار کیا تو آخر یہ مجاہدین کیونکر قتل ہوئے۔ ماننا پڑتا ہے کہ ایک معتدبہ تعداد ایسی تھی جو مصروف جہاد رہی اور ان کی دیکھا دیکھی بہت سے لوگ ابھی نتیجہ کے انتظار میں تذبذب کے عالم میں ہوں گے اور یہ وہ دور تھا جس میں براہ راست پیغمبر خداؐ پر حملے نہیں ہو رہے ہوں گے اور نہ آپ کے جسم مبارک کے زخمی ہونے کی نوبت آئی ہوگی۔ اس کے بعد دوسرا دور وہ ہوگا جب جانباز مجاہدین کی شہادت کی وجہ سے رفتہ رفتہ ان کی تعداد تیزی کے ساتھ کم ہوتی گئی ہوگی۔ اس طرح وہ منزل آئی کہ اب پیغمبرؐ کے پاس اتنے سپاہی نہ رہ گئے جن کی وجہ سے آپ حملوں سے محفوظ رہ سکیں' اس وقت ایک موقع وہ آیا ہوگا جب مردان میدان میں آپ کے بالکل قریب ابودجانہ انصاری تھے اور اب ان کو بجائے دشمنوں سے بڑھ بڑھ کے جنگ کرنے کے یہی صورت جاں نثاری کی نظر آئی کہ وہ رسولؐ کے سامنے سپر بن کر کھڑے ہو جائیں جس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے۔ پھر ابودجانہ کی شہادت کے بعد وہ وقت آیا ہوگا کہ جب ام عمارہ کو اس کی ضرورت پڑی ہوگی کہ وہ پیغمبرؐ کی سپر بن کر دشمنوں کا دفعیہ کریں مگر ظاہر ہے کہ ایک خاتون کا بس کثیر التعداد دشمنوں سے کہاں چل سکتا تھا۔ ادھر میدان جہاد میں ایک حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ رہ گئے تھے جن کے کارنامہ وفاداری کا ذکر ابھی آئے گا۔ وہ دشمنوں سے لڑنے میں مصروف تھے اور ادھر رسولِ خداؐ تھے جو اب دشمنوں کے حملہ کا مرکز بن گئے تھے۔

پیغمبر خداؐ اپنی زندگی کے عام حالات میں ہر موقع پر قوت اعجاز سے کام لینے پر

مامور نہ تھے ورنہ مکہ والے تیرہ برس کی مدت میں اکثر اوقات جسم مبارک پر پتھر مارے نہ جا سکتے اور یا مارے جاتے تو حضرتؐ کے جسم اقدس تک نہ پہنچتے اور جنگ احد میں بھی کوئی زخم جسم اطہر پر آنا ممکن نہ ہوتا مگر یہ امر خالق کے دستور و حکمت کے خلاف تھا۔ اس کے ساتھ رسول خداؐ کسی ایسی شریعت کے حامل نہ تھے جس میں مدافعانہ طور پر اسلحہ کا استعمال بھی ممنوع ہو بلکہ یہ وہ شریعت ہے جس میں حفاظت نفس کے لئے بھی دفاع ایک فریضہ دینی ہے۔ لہٰذا یقین کرنا چاہئے کہ جب حملے ہونے لگے اس وقت آپ نے مدافعت بھی فرمائی ہو گی۔ چنانچہ تاریخی بیانات کی کم مائیگی کے باوجود جنگ احد میں دشمن کے مقابلہ میں آپ کی تیر اندازی کا بھی ذکر ملتا ہے۔ (طبری جلد ۳ صفحہ ۱۸) اور ایک بڑے نمایاں شخص کا مشرکین میں سے جو آپ کو شہید کرنے کے منصوبہ سے آپ کی طرف بڑھا تھا آپ کے ہاتھ سے قتل ہوا بھی' یہ شخص ابی بن خلف جمحی تھا۔ اگرچہ راویوں نے اس کی ہلاکت کے اسباب میں روحانی اور نفسیاتی تاثرات کو بھی شریک کر دیا ہے مگر یہ واقعہ مسلم ہے کہ آپ نے اس کی گردن پر نیزہ مارا اور اس زخم سے وہ ہلاک ہوا۔ اگر آپ کو فقط اعجاز کی قوت سے کام لینا ہوتا تو نیزہ مارنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ حضرت کا نگاہ غضب سے اس کی طرف دیکھ لینا ہی کافی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مکہ میں یہ شخص جب حضرتؐ سے ملتا تھا تو کہتا تھا کہ میں اپنے مرکب کو روز اس نیت سے دانہ کھلاتا ہوں کہ ایک دن میں اس پر بیٹھ کے تم کو قتل کروں گا تو رسالت مآبؐ فرماتے تھے نہیں بلکہ انشاء اللہ میں تمہیں قتل کروں گا۔ جنگ احد میں جب حضرتؐ کے پاس محافظین کی کمی ہو گئی اور دشمنوں کی ہمت بڑھی تو یہ شخص گھوڑا دوڑاتا ہوا حضرتؐ کی طرف قتل کے ارادہ سے آیا۔ رسولؐ خداؐ چونکہ خود بہ نفس نفیس جنگ نہیں فرماتے تھے۔ اس لئے آپ اپنے پاس زیادہ ہتھیار رکھتے بھی نہیں تھے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت آپ نے اپنے پاس کے ایک شخص حارث بن صمہ سے نیزہ لیا اور یہ نیزہ لے کر آپ ابی بن خلف کے مقابلہ پر آگے بڑھ گئے اور آپ نے ایک ہلکا سا وار اس کی گردن پر کیا جس کا اثر یہ تھا کہ وہ گھوڑے پر سے

گر کر کچھ دور تک لڑھکتا ہوا چلا گیا۔ پھر آپ نے اس سے کوئی تعرض نہیں فرمایا۔ اور وہ چیختا ہوا یہ کہتا ہوا اپنی فوج کی طرف بھاگا کہ بخدا محمدؐ نے مجھے مار ڈالا۔ لوگوں نے کہا کہ تمہارا دل الٹ گیا ہے۔ یہ زخم کون ایسا گہرا ہے جو باعث ہلاکت ہو۔ اس نے کہا ارے مکہ میں وہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ میں تمہیں قتل کروں گا۔ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ میں اس زخم سے جانبر ہوں چنانچہ جنگ احد کے اختتام پر جب قریش واپس ہوئے تو مکہ کے راستے میں مقام سرف پر اس کی روح جسم سے جدا ہو گئی۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۱۹)

اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایک شخص کی ہمت نہیں تھی کہ وہ حضرتؐ کی طرف بڑھے اس لئے ایک بڑی جماعت نے مل کر آپ پر حملے شروع کیے جن میں بہت سے لوگ پتھر برسا رہے تھے۔ چنانچہ سر مبارک شگافتہ ہو گیا اور خون بہہ کے چہرہ پر آیا اور دہن مبارک پر بھی پتھر پڑا جس سے ہونٹ شگافتہ ہو گئے اور پیشانی و رخسار بھی زخمی ہوئے اور ابن قمیہ نے داہنے پہلو پر تلوار ماری۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۱۷)

دوسری روایت یہ ہے کہ اسی نے وہ پتھر مارا تھا جس سے چہرہ مبارک زخمی ہوا تھا اور دہن مبارک پر ضرب آئی تھی۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۲۰)

علمائے شیعہ کسی حصہ جسم کی کمی کو خلاف شان رسول سمجھتے ہیں اور شیعی روایت یہ ہے کہ کوئی دانت شکستہ نہیں ہوا تھا بلکہ چہرہ مبارک زخمی ہوا تھا۔

(اعلام الوریٰ)

پھر اور حربے ہوتے رہے یہاں تک کہ وہیں پاس ایک گڑھا تھا جس میں ضعف سے نڈھال ہو کر گر گئے۔

ممکن ہے یہ شہرت کہ آپ شہید ہو گئے ظاہری حیثیت سے آپ کی بقائے حیات کا سبب بن گئی ہو اس طرح کہ پھر مشرکین نے ادھر توجہ نہ کی ہو اور یہ سمجھ

لیے ہوں کہ آپ اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور اب ان کی پوری توجہ حضرت علیؓ کے مقابلہ پر مرکوز ہو گئی جو دوسری سمت میں علم کفر کو سرنگوں کرنے کی مہم میں مصروف تھے جس کا تذکرہ ابھی آئے گا۔

حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ کا بے مثال کارنامہ

جیسا کہ ہم نے درایت کے تقاضا سے بتایا ہے کہ روایتیں جو حالات جنگ سے متعلق ہیں وہ مختلف ادوار سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی طرح حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ کے کارنامہ وفاداری کے جو تفصیلات وارد ہوئے ہیں وہ بھی بلا شبہ جنگ کے مختلف دوروں سے متعلق ہیں۔

ایک دور وہ تھا جب آپ کے ساتھ مشرکین کی جنگ میں سو ڈیڑھ سو مجاہدین موجود تھے۔ پھر ایسا دور آیا ہو گا جس میں ساتھ والے ثابت قدم افراد رفتہ رفتہ سب شہید ہو گئے یا ایسے زخمی ہو گئے کہ جنگ کرنا ان کے لئے ممکن نہ رہا اور جو ان کی دیکھا دیکھی کچھ داد شجاعت دے رہے تھے، وہ رفتہ رفتہ میدان سے کھسک گئے اس طرح آپ نصرت اسلام میں تن تنہا رہ گئے ان تمام ادوار میں آپ کا کردار بہر صورت مثالی حیثیت رکھتا ہے۔

روایات اور واقعات کی درایتی رفتار دونوں کو سامنے رکھ کر ہم جو ترتیب قائم کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ پہلے جب ایک دم مشرکین کی فوج نے پشت پر سے حملہ کر دیا اور مسلمانوں کی اکثریت نے بے تحاشا راہ فرار اختیار کی اور میدان میں ایک قلیل جماعت رہ گئی جو اس کثیر فوج کی یورش میں یکجائی منظم طاقت کی حیثیت بھی نہ رکھتی تھی بلکہ الگ الگ افراد تھے جو مصروف پیکار ہو گئے تو اس وقت حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ نے اپنی خدا داد بصیرت یا مادی تعبیر کی جئے تو جنگ کی بے مثال فنی مہارت یہ دیکھتے ہوئے کہ اتنی بڑی فوج کے ریلے کو چند آدمی نہیں روک سکتے اور نہ کسی ایک کے بس میں ہے کہ وہ اس پوری فوج کو تہ تیغ کر دے مگر بڑے سے بڑے مجمع کے خاص نفسیات ہوتے ہیں جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ ایسے

چند افراد جو اس کے سرغنہ ہیں اگر تہ تیغ ہو جائیں تو پوری جماعت کا دل ٹوٹ جاتا ہے اور باوجود اپنی مادی قوت کے اخلاقی طور پر شکست کھا کے ہمت ہار بیٹھتی ہے۔ لشکر میں اس طرح کی نمایاں حیثیت علم داروں کی ہوتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جنگ بدر میں بھی مشرکین نے اپنی شکست کا ذمہ دار اپنے علم داروں کی کمزوری کو قرار دیا تھا۔ چونکہ اب تک قریش میں علم برداری کا منصب بنی عبدالدار میں تھا تو ابو سفیان نے جنگ احد میں جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی بنی عبدالدار کے علم داروں کو پکار کر کہا تھا۔

یا بنی عبدالدار ان کم ولیتم لواء نا یوم بدر فاصا بنا ما قد رائیتم و انما یوتی الناس من قبل رایا تھم اذا زالت زالوا فاما ان تکفونا لواء نا و اما ان تخلوا بیننا و بینہ فسنکفیکموہ

اے قبیلہ عبدالدار والو! تم لوگ بدر کے دن ہمارے علمدار تھے تو ہم کو وہ مصیبت درپیش ہوئی جو تم سب نے دیکھی اور تمام لوگوں کا دارومدار ان کے علموں پر ہے جب علم ہٹ جائیں گے تو وہ لوگ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے تو یا تم لوگ علم کو اچھی طرح سنبھالو اور یا پھر اسے چھوڑ کر الگ ہو جاؤ ہم خود اس کی حفاظت اپنے ذمہ لیں گے۔

یہ سن کر ان سب کو جوش آ گیا اور کہا واہ! ہم اپنا منصب تمہارے سپرد کر دیں! دیکھنا جب مقابلہ ہوگا ہم کیا کرتے ہیں۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۱۶)

جنگ احد کے پہلے ہی دور میں جیسا کہ اس کے پہلے آچکا ہے ان کا سب سے بڑا علم دار طلحہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے ہاتھ سے قتل ہو چکا تھا مگر ابھی متعدد علم دار موجود تھے۔

اب اس دوسرے سخت دور میں حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے اپنا پورا نصب العین یہ قرار دے لیا کہ کسی طرح کفار کے علم کو سرنگوں کر دیا جائے۔ اگر علم زمین پر آگیا اور کوئی اس کا اٹھانے والا نہ رہا تو پھر یہ فوج چاہے تعداد میں جتنی ہی

زیادہ ہو شکست کھا کے رہے گی۔ غالباً" آپ نے اپنے اس منصوبہ میں جناب حمزہ کو شریک کر لیا تھا۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے۔ علمداروں میں سے ایک جناب حمزہ کے ہاتھ سے قتل ہوا مگر مشرکین کے جو سر بر آوردہ افراد تھے وہ بھی اس راز سے واقف تھے کہ اگر علم سرنگوں ہو گیا تو فوج نہیں ٹھہر سکتی۔ پھر جیسا کہ ابھی ذکر آیا علم داروں کو خاص طور پر انتباہ بھی کیا جا چکا تھا اس لئے ان کی جان توڑ کوشش یہ تھی کہ علم گرنے نہ پائے۔ ہندہ زوجہ ابی سفیان بھی خصوصیت کے ساتھ انہی علم برداروں کو جوش دلا رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

و یھا بنی عبدالدار ویھا حماۃ الادبار ضربا بکل بتیار

(طبری جلد ۳ صفحہ ۱۴)

شاباش بنی عبدالدار ! شاباش پشت پناہ بن کر حمایت کرنے والو! شمشیر براں سے وار پر وار کرتے رہو۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ادھر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ" ایک علم اٹھانے والے پر ضرب لگاتے تھے' ادھر فوراً ایک دوسرا آدمی اس علم کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا تھا کہ وہ سرنگوں ہونے نہ پائے۔ اس وقت حضرت علیؑ کو صرف ہر علم دار سے دست بدست مقابلہ ہی کرنا نہ پڑتا تھا بلکہ چاروں طرف مشرکین کا ہجوم بھی یہ کوشش کرتا ہوگا کہ وہ علم دار قتل نہ ہونے پائے اس لئے آپ کو کتنی دفعہ جنگ مغلوبہ کا سامنا پڑتا ہوگا مگر بالاخر آپ اس علم دار کو قتل کر دیتے تھے۔ یہ مقابلہ بڑی دیر تک جاری رہا۔ مشرکین کے جگر دار افراد بڑھ بڑھ کے علم کو سنبھالتے رہے اور حضرت علیؑ ایک ایک کو قتل کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت وہ آیا کہ کافی دیر تک علم زمین پر پڑا رہا اور کسی کو اٹھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ تو ایک عورت عمرہ بنت علقمہ حارثیہ نے بڑھ کر علم اپنے ہاتھ میں لے لیا جس پر قریش کو حمیت دامن گیر ہوئی اور انہوں نے اسے ہٹا کر پھر خود علم کو سنبھالا اور خاندان ابو طلحہ کا ایک حبشی غلام صواب علم دار بنا اور علم کو لے کر اس نے بڑی دلیری سے جنگ کرنا شروع کی۔ تاریخ کہتی ہے کہ اس کے ہاتھ قطع ہو گئے تو وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا

اور اس نے علم کو سینہ اور گردن کے سہارے سنبھالا۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں قتل ہو گیا بس یہ کفار قریش کا آخری علم بردار تھا جس کے بعد کوئی علم کا اٹھانے والا نہ رہا۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۱۷)

ایک خیال یہ بھی قرین قیاس ہے کہ مشرکین کی پے در پے شکستیں جو علم برداروں کے قتل سے ہو رہی تھیں اور جن سے فوج کا دل تھوڑا ہو رہا تھا انہی کا تدارک ان کے سرداروں نے یہ سوچا تھا کہ اگر ادھر علم داروں کے قتل سے فوج کی ہمت ٹوٹ رہی ہے تو اس کا جواب صرف یہ ہے کہ ادھر خود پیغمبرؐ کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے تاکہ مسلمانوں کے لئے جہاد کا کوئی مرکز ہی باقی نہ رہے اور پھر علیؑ بن ابی طالبؑ کی بھی ہمت شکستہ ہو جائے کہ اب رسولؐ رہے ہی نہیں تو میں جنگ کر کے کیا کروں ؟ مگر وہ دوسرے ہو سکتے تھے جن کی ہمت پست ہو جائے۔ علیؑ بن ابی طالبؑ نے تو جب یہ آواز سنی کہ رسولؐ نہیں رہے تو انہوں نے شدت سے جنگ شروع کر دی کہ جب پیغمبرؐ ہی نہ رہے تو اب میں زندہ رہ کر کیا کروں گا؟ اس کا نتیجہ تھا کہ آخر بگڑی ہوئی جنگ پھر بنی اور علم کفر کے آخری مرتبہ سرنگوں ہونے پر عمومی طور پر فوج کے قدم اکھڑ گئے اور اب حضرت علیؑ کو اتنا موقع ملا کہ آپ آ کر رسولؐ کی خبر لیں۔ اب رسولؐ جہاں زخمی ہو کر گر گئے تھے وہاں سے نکل کر پھر کھڑے ہو گئے تھے اور یہ دیکھ کر فوج مخالف کے کچھ منتشر دستے پھر حضرت پر حملہ آور ہونے لگے تھے مگر اب علیؑ رسولؐ کے پاس آ چکے تھے۔ اس موقع کا تذکرہ مورخ ابن جریر نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

لما قتل علی بن ابی طالب اصحاب الالویة ابصر رسول اللہ جماعة من مشرکی قریش فقال لعلی احمل علیھم فحمل علیھم ففرق جمعھم و قتل عمرو بن عبداللہ الجمحی قال ثم ابصر رسول اللہ جماعة من مشرکی قریش فقال لعلی احمل علیھم فحمل علیھم ففرق جماعتھم و قتل شیبة بن مالک احد بنی عامر بن لوی فقال

جبریل یا رسول اللّٰہ ھذہ المواساۃ فقال رسول اللّٰہ انہ منی و انا منہ فقال جبرئیل و انا منکما قال فسمعوا صوتاً لا سیف الا ذوالفقار ولا فتی الا علی

(تاریخ طبری)

جب علیؑ بن ابی طالبؑ نے تمام علمبرداروں کو قتل کر دیا' رسول خداؐ نے ایک جماعت کو مشرکین قریش میں سے دیکھا۔ علیؑ سے فرمایا کہ ان پر حملہ کرو۔ انہوں نے ان پر حملہ کیا۔ ان کے مجمع کو منتشر کیا اور عمرو بن عبداللہ جمجی کو قتل کیا۔ پھر سول خداؐ نے ایک دوسری جماعت کو مشرکین قریش میں سے دیکھا۔ علیؑ سے فرمایا کہ ان پر حملہ کرو تو انہوں نے ان پر حملہ کیا' ان کی جماعت کو منتشر کیا اور قبیلہ عامر بن لوی کے ایک شخص شیبہ بن مالک کو قتل کیا اس پورے منظر سے متاثر ہو کر جبریل نے کہا یا رسول اللہ بلا شبہ ہمدردی و غم خواری اس کا نام ہے (جو علیؑ کر رہے ہیں) رسولؐ نے فرمایا (اس میں تعجب کیا ہے) یقیناً وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ جبرئیل نے کہا اور میں آپ دونوں سے ہوں۔ تو لوگوں نے ایک آواز سنی کہ کوئی تلوار سوا ذوالفقار کے نہیں اور کوئی جوان سوا علیؑ کے نہیں۔

یہی آواز ہے جو فقرہ نثر۔ لا فتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار کی صورت میں مشہور و معروف ہے۔

شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے اس مقابلہ اور جان نثاری میں حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کے تاثرات' کارناموں اور ان کے نتیجہ کو بڑے مکمل اور موثر طریقہ پر درج کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

از علی مرتضیٰ مروی ست کہ چوں کفار بر مسلماناں غلبہ کردند' حضرت از نظر من غائب شد و درمیان کشتگان رفتم و تفحص کردم درمیان کشتگان نہ دیدم با خود گفتم کہ مگر حق تعالیٰ بواسطہ فعل ما برما غضب کرد و پیغمبر خویش را بہ آسماں بردگفتم بہتر ازاں نیست کہ قتال کنم تا کشتہ شوم شمشیر کشیدم

و بر مشرکاں حملہ کردم و از ہم پاشیدند ناگاہ حضرت را دیدم کہ بہ سلامت است

حضرت علی مرتضیٰؑ سے روایت ہے کہ جب کافروں نے مسلمانوں پر غلبہ کیا تو آنحضرتؐ میری نظر سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے مقتولین میں گردش کی اور تلاش کیا تو مقتولین میں بھی آپ کو نہ پایا۔ میں نے اپنے سے کہا کہ شاید خدا وند عالم نے ہم لوگوں (مسلمانوں) کے کردار کے سبب سے ہم پر غضب نازل کیا اور اپنے پیغمبرؐ کو آسمان پر اٹھا لیا۔ اب اس سے بہتر کچھ نہیں ہے کہ میں جنگ کروں یہاں تک کہ قتل ہو جاؤں میں نے تلوار کھینچی اور مشرکین پر حملہ کیا اور انہیں منتشر کیا تو ایک دفعہ حضرتؐ کو دیکھا کہ آپ زندہ سلامت ہیں۔

پھر لکھتے ہیں

منقول ست کہ چوں مسلمانان روئے بہ ہزیمت آوردند و حضرت راتنہا گزاشتند حضرت در غضب آمد و عرق از پیشانی ہما یونش متقا طر گشت و مثال مروارید از جبین بینش فرو دوید دراں حالت نظر کرد علیؑ بن ابی طالبؑ را دید کہ بر پہلوئے وے ایستادہ است فرمود چونست کہ تو بہ برادران خود ملحق نہ گشتی علیؑ گفت آ اکفر بعد الایمان ان لی بلٔ اسوۃ آیا کا فرشوم بعد از ایمان بلرستی مرابتو اقتدا است یعنی مرا بہ شما کا راست بایاراں و برا دراں کہ در پے غنیمت رفتند و ہزیمت نمودند ارچہ کار دارم دریں حین جمعے از کافراں متوجہ آں حضرت شدند فرمود اے علی مرا ازیں جمع نگاہ دارو حق خدمت و نصرت بجائے آر کہ وقت نصرت ست علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ متوجہ آں قوم شد و مارا از روز گار شاں بر آورد و ایشاں را متفرق گردانید و جمعے کثیر رابہ دوزخ فرستاد۔ و می گویند کہ چوں علی مرتضٰی ایں مردانگی کردہ داد نصرت داد جبریل بہ آں حضرت گفت کہ ایں کمال مواساۃ و جواں مردی است

که علی با تومی برد آنحضرت فرمود انه منی وانا منه به درستی علی از من است ومن ازویم کنایتے ست از کمال اتحاد و اخلاص ویگانگی و آمده است که چوں آنحضرت ایں کلمه را فرمود جبریل گفت و انا منکما من از شما ہر دویم' و می گویند آوازے شنید ند که گوینده غیبی می گفت لا فتٰی الا علی ولا سیف الا ذوالفقار ظاہرا قصه ناد علیٰ مظهر العجائب ہم دریں قتال و معرکه واقع شده است اما درکتب حدیث ذکر نه کردند و بالجمله وے رضی اللّٰه عنه حق مبارزت و محاربت و جلالت و شجاعت بجآئے آورده که فوق آں تصور نه تواند کرد۔

(مدارج النبوۃ)

روایت میں ہے کہ جب مسلمانوں نے پسپائی اختیار کی اور آنحضرتؐ کو اکیلا چھوڑ دیا تو حضرت غضب ناک ہوئے اور پسینے کے قطرے آپ کی پیشانی اقدس سے ٹپکنے لگے اور موتیوں کی طرح آپ کی جبین انور سے گرنے لگے اسی عالم میں آپ نے نظر اٹھائی تو علیؑ بن ابی طالبؑ کو دیکھا کہ وہ آپ کے پہلو میں کھڑے ہیں۔ فرمایا کیوں تم بھی اپنے دوسرے بھائیوں میں شامل نہ ہو گئے۔ علیؑ نے کہا کہ کیا میں ایمان کے بعد کافر ہو جاتا میرے لئے تو آپ کی سیرت مثالی نمونہ ہے یعنی مجھے آپ سے مطلب ہے ان دوستوں اور بھائی بندوں سے جو مال غنیمت کے پیچھے گئے اور فرار اختیار کیا مجھے کیا مطلب اسی حالت میں کافروں کی ایک جماعت نے حضرت کی طرف رخ کیا۔ فرمایا یا علیؑ اس مجمع کو دفع کرو اور خدمت و امداد کا حق ادا کرو کہ یہ مدد کا وقت ہے' حضرت علیؑ اس جماعت کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کا قلع قمع کرکے اسے متفرق کیا اور بہت سے لوگوں کو واصل جہنم کیا۔

راویوں کا بیان ہے کہ جب حضرت علیؑ نے اس بہادری سے کام لیا۔ امداد کا حق ادا کیا تو جبریل نے پیغمبرؐ سے کہا کہ یہ انتہائی غم خواری اور بہادری ہے جو علیؑ آپ کے ساتھ کر رہے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے

ہوں یہ اشارہ ہے انتہائی اتحاد اور خلوص اور یگانگی کی طرف اور وارد ہوا ہے کہ حضرتؐ نے یہ جملہ فرمایا تو جبریل نے کہا اور میں آپ دونوں سے ہوں اور کہا جاتا ہے کہ ایک آواز سنی کہ غیبی کہنے والا کہہ رہا ہے لا فتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار غالبا" ناد علیا مظہر العجائب کا واقعہ بھی اسی سال اور اسی جنگ میں ہوا ہے مگر کتب احادیث میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ الحاصل آں جناب (حضرت علیؑ) نے مقابلہ اور جنگ اور دلیری اور بہادری کا ایسا حق ادا کیا جس سے بالاتر تصور میں نہیں آسکتا۔

ہمارے یہاں یہی مضمون یعنی پیغمبرؐ کی پیشانی سے فرط غضب کی بنا پر موتیوں کی طرح پسینے کے قطروں کا ٹپکنا اور پھر حضرت علیؑ پر نظر پڑنا اور فرمانا کہ تم بھی کیوں نہ چلے گئے اور آپ کا جواب کہ اکفر بعد الایمان اور پھر رسولؐ کا علیؑ سے مدافعت کے لئے فرمانا اور جبرئیل امین کا مکالمہ یہ سب امام جعفر صادقؑ کی روایت سے وارد ہوا ہے۔

(اعلام الوریٰ)

ہزاروں کے لشکر سے تن تنہا جنگ میں فطری طور پر آپ کو خود زخمی بھی ہونا چاہئے تھا چنانچہ اسے بھی محدث دہلوی نے درج کیا ہے۔

روایت است از قیس کہ وے از پدرش سعد روایت کرد کہ گفت از علی مرتضیٰ شنیدم کرم اللہ وجہ کہ فرمود روز احد شانزدہ ضربت بہ من رسید کہ در چہار ضربہ ازاں بر زمین افتادم

(مدارج النبوۃ)

قیس بن سعد بن عبادہ نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت علی مرتضیٰؑ سے سنا خود آپ نے فرمایا کہ غزوہ احد کے دن سولہ زخم مجھ کو لگے جن میں سے چار زخم ایسے تھے کہ ان سے میں زمین پر گر گیا تھا۔

مذکورہ بالا واقعات کی رفتار میں یہ بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ فرار ہونے والی جماعت میں سے کچھ بزرگوار جو واپس آئے جن میں سے بعض کی زبانی آچکا ہے کہ

میں سب سے پہلے واپس آیا تھا۔ یہ واپسی کس وقت تھی؟ کیونکہ علمداروں کے قتل کے بعد جب فوج دشمن دوبارہ پسپا ہوئی تو اس وقت کی صورت حال ابھی آ چکی ہے کہ حضرت پیغمبر خداؐ بالکل تنہا تھے۔ پھر جس وقت حضرت علیؑ آپ کے پاس پہنچ چکے ہیں اس وقت بھی کافی دیر تک آپ تنہا ہی نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت بھی بس رسولؐ اور علیؑ ہی نظر آتے ہیں جب حضرت علیؑ سپر میں پانی بھر کر لائے اور حضرتؐ کے چہرہ سے خون دھویا اور کچھ پانی سر مبارک پر ڈالا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب فوج دشمن کے مختلف دستوں کے منتشر حملے بھی ناکام ہو چکے اور اب جنگ بالکل رک گئی اس کے کافی دیر کے بعد آس پاس سے جو افراد مختلف پناہ گاہوں میں نتیجہ کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے اور بہت دور نہیں گئے تھے۔ وہ رسولؐ کے پاس واپس آئے۔ یا یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ حضرات بیچ میں واپس آئے ہوں اور پھر شدت وقت کو طاقت برداشت سے باہر پا کر روانہ ہو گئے ہوں۔

ہندہ کا جوش انتقام

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ تاریخ نے ترتیب تو لکھی نہیں مگر صورتحال کی نوعیت سے یقین یہی ہوتا ہے کہ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب میدان جنگ مسلمان فوجیوں سے باکل خالی ہو اور جنگ کا ہنگامہ بھی ختم ہو چکا ہو اور یہ وہی وقت ہو سکتا ہے جب حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ اب رسولؐ کی خدمت میں تھے ہندہ نے مع اپنے ساتھ کی عورتوں کے یہ کام انجام دیا کہ مسلمان مقتولین کے اعضاء جوارح قطع کرائے علامہ طبری لکھتے ہیں کہ کسی شہید کی لاش محفوظ نہیں رہی تھی سوا حنظلہ بن عامر کے جن کا باپ مشرکین کے ساتھ تھا اس کے لحاظ سے ان کی لاش کو بغیر مثلہ کیے ہوئے چھوڑ دیا۔

(اعلام الوریٰ)

سب سے زیادہ نشانہ ظلم حضرت حمزہ کی لاش بنائی گئی۔ ہندہ نے آپ کا شکم

چاک کرا کے کلیجا نکلوایا اور منہ میں رکھ کر چبانا چاہا مگر چب نہ سکا تو زمین پر تھوک دیا اور تمام مقتولین کے ناک اور کان جو قطع کرائے تھے ان کا گلوبند بنایا اور گلے میں پہنا اور اپنا گلوبند اور گوشوارے وغیرہ سب انعام میں وحشی، قاتل جناب حمزہؓ کو دے دیا۔ پھر ایک بڑی چٹان پر بلند آواز سے فخریہ کچھ اشعار جو اس نے نظم کیے تھے پڑھنے لگی۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۲۲، ۲۳)

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

"خاتونان قریش نے انتقام بدر کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بدلا لیا ان کے ناک کان کاٹ لیے۔ ہندہ (معاویہ کی ماں) نے ان کو پھولوں کا ہار بنایا اور اپنے گلے میں ڈالا۔ حضرت حمزہؓ کی لاش پر گئی اور ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور چبا گئی لیکن گلے سے نیچے نہ اتر سکا۔ اس لئے اگل دینا پڑا۔ تاریخ میں ہندہ کا لقب جو جگر خوارہ لکھا جاتا ہے اسی بنا پر لکھا جاتا ہے۔

(سیرت النبیؐ جلد ۱ صفحہ ۲۷۳)

ابن عبدالبر نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اس نے حضرت حمزہؓ کے جگر کو انگاروں پر بھون کر کھا لیا۔

(استیعاب جلد ۲ صفحہ ۲۸۶)

جنگ کے بعد

جنگ ایسے عالم میں ختم ہوئی کہ کسی ایک فریق میں بھی اس وقت اتنا دم نہ تھا کہ وہ دوسرے سے کوئی تعرض کر سکے اس لئے اس وقت جیسے ہر ایک دوسرے کی طرف سے مطمئن تھا۔ اگرچہ بالاخر پھر فتح اسلام کی ہوئی تھی مگر وہ حقیقتاً اسلام ہی کی فتح تھی۔ مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی تو میدان سے اس طرح فرار کیا کہ زمین و آسمان کو اپنی شکست کا گواہ بنا دیا۔ پھر پیغمبر خداؐ کا زخموں سے چور ہونا۔ ستر مسلمانوں کا خاک و خون میں بے جان لاشوں کی صورت میں پڑا ہونا اور خصوصیت کے ساتھ حمزہ ایسے خدا اور رسولؐ کے شیر کا میدان میں کام آنا اور پھر پیغمبرؐ کے

پاس اب سوا ایک مدد گار کے جو خود بھی اتنا زخمی ہو چکا تھا کہ کئی مرتبہ نڈھال ہو کر جنگ میں زمین پر گر چکا تھا اور صرف روحانی مدد کے سہارے سے اٹھ کر کھڑا ہوا تھا، جس مدد کے لئے شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی روایت ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا تھا کہ وہ جبرئیل امین تھے جنہوں نے ہر مرتبہ علیؑ کو کھڑا کر دیا۔

(مدارج النبوۃ)

اس صورت حال میں اب کہاں اس کا موقع تھا کہ حضرت علیؑ از خود دشمنوں کا تعاقب کرتے یا ان پر جب کہ وہ جنگ سے ہاتھ اٹھا چکے تھے اپنی طرف سے حملہ کرتے۔

دوسری طرف مشرکین کی یہ صورت حال تھی کہ اگرچہ تعداد کے لحاظ سے ان کا جانی نقصان زیادہ نہ ہوا تھا مگر ان کی فوج کے جتنے علم بردار تھے وہ سب قتل ہو گئے تھے۔ اصل میں بڑے آدمیوں کا تو مکمل ستھراؤ جنگ بدر ہی میں ہو چکا تھا۔ اب یہ طلحہ بن ابی طلحہ وغیرہ چند آدمی جو اس جنگ میں نمایاں تھے وہ سب بھی قتل ہو گئے۔ اب فوج جس کا نام تھا وہ عوام کی بھیڑ تھی یا ایک سالار لشکر ابو سفیان تھا جسے اپنی جان کی خیر منانا تھی۔ اس نے دیکھ لیا کہ علیؑ ایک وہ ہیں جن کا پوری فوج کچھ نہ بگاڑ سکی۔ اور انہوں نے ایک اکیلے تمام علم داروں کا خاتمہ کر دیا تو وہ جانتا تھا کہ اب اگر جنگ ہو تو میری ہی باری ہے۔ اس لئے اب اس میں بھی ہمت نہ تھی کہ وہ دوبارہ جنگ کو چھیڑے۔ یہ ہے جنگ کے بعد کی کیفیت جس میں ہم ایسے واقعات دیکھتے ہیں جو پرامن فضا اور اطمینانی صورت حال ہی میں ہو سکتے ہی۔ ادھر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ اپنی سپر کو الٹ کر اس میں پانی لاتے ہیں اور پیغمبر خداؐ کے زخموں کو دھوتے ہیں۔ ادھر ابو سفیان میدان میں بہ اطمینان پھر رہا ہے۔ اور لاشوں کا معائنہ کر رہا ہے اور اس کی نظر ان لاشوں پر پڑتی ہے جنہیں مثلہ کیا گیا تھا اور خصوصیت سے جناب حمزہؑ کی لاش جس کی کیفیت پہلے بیان ہو چکی ہے۔ اس سے معلوم نہیں اس کے ضمیر نے شرمندگی محسوس کی یا کیا کہ اس نے پہاڑ پر چڑھ کر بلند آواز سے رسولؐ کو مخاطب کیا۔

مورخین جمہور کا بیان ہے کہ اس وقت کچھ مسلمان بھی رسولؐ کے پاس موجود تھے اور مشرکین ابھی تک اس گومگو میں تھے کہ پیغمبر خداؐ کیا واقعی شہید ہو گئے یا بقید حیات ہیں۔ چنانچہ ابو سفیان نے پہاڑ پر چڑھ کر صدا بلند کی۔

لنا العزیٰ ولا عزیٰ لکم

عزیٰ (بت) ہمارا مدد گار ہے اور تمہیں عزیٰ نصیب نہیں۔

رسولؐ نے حضرت عمر سے فرمایا اس کا جواب دو کہ۔

اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم

اللہ ہمارا سرپرست ہے اور تمہارا کوئی سرپرست نہیں۔

اس جواب کو سن کر ابو سفیان نے پوچھا کہ کیا محمدؐ تم میں ہیں؟ معلوم ہونا چاہئے کہ تمہارے مقتولین میں کچھ مثلہ ہوئے ہیں۔ جس کا میں نے حکم نہیں دیا تھا ہاں منع بھی نہیں کیا تھا اور اب بھی مجھے اس کی نہ کوئی خوشی ہے اور نہ غم۔

(طبری ' جلد ۳ صفحہ ۲۱)

دوسری روایت میں یہ ہے کہ ابو سفیان نے پہاڑ کے اوپر چڑھ کے ان مسلمانوں سے جو رسولؐ کے پاس اس وقت تھے پکار کر پوچھا کہ کیا تم میں محمدؐ ہیں؟ دو دفعہ اس نے یہ سوال کیا۔ حضرت نے فرمایا' جواب نہ دو۔ پھر اس نے تین مرتبہ پوچھا کہ کیا تم میں ابن ابی قحافہ (ابوبکر) ہیں۔ حضرت نے فرمایا چپ رہو۔ پھر اس نے تین مرتبہ کہا کہ کیا تم لوگوں میں ابن خطاب (عمر) ہیں؟ حضرتؐ نے فرمایا اب بھی جواب نہ دو۔ یہ سن کر ابوسفیان نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ لو یہ سب تو قتل ہو گئے۔ اگر زندہ ہوتے تو جواب دیتے۔ بس یہ سن کر حضرت عمر کو تاب نہ ہوئی اور کہا اے دشمن خدا تو جھوٹا ہے۔ ہم لوگ زندہ موجود ہیں۔ اب ابو سفیان نے "ہبل (بت) زندہ باد" کا نعرہ لگایا۔ رسولؐ نے فرمایا' اب اس کا جواب دو! لوگوں نے پوچھا کیا کہیں؟ آپ نے فرمایا کہو کہ اللہ بلند و برتر ہے۔ اب ابوسفیان نے وہ صدا بلند کی کہ ہمارے لئے عزیٰ ہے اور تمہارے پاس عزیٰ نہیں ہے۔ رسول نے فرمایا اس کا جواب دو۔ لوگوں نے پوچھا کیا کہیں؟ آپ نے فرمایا کہو اللہ ہمارا سرپرست

ہے اور تمہارا کوئی سرپرست نہیں ہے۔ ابو سفیان نے کہا کہ آج بدر کا بدلا ہو گیا اور جنگ کے لئے تو مشہور ہی ہے کہ "دو سر دارد" مگر تمہاری جماعت کے کچھ لاشے مثلہ ہوئے ہیں۔ میں نے اس کا حکم نہیں دیا تھا مگر مجھے اس کا کوئی غم بھی نہیں ہیں۔

(طبری، جلد ۳ صفحہ ۲۳، ۲۴)

اس آخری فقرہ کو جو دونوں روایتوں میں ہے ضمیر کی شرمندگی کو چھپانے کی خیرہ چشمی کے ساتھ کوشش بھی سمجھا جا سکتا ہے اور ایک طرح سے "نمک بر جراحت" بھی۔ لیکن علامہ طبری کی روایت سے ابھی تک پیغمبر خداؐ کے پاس سوا حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے کسی دوسرے کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ابوسفیان نے پکار کر کہا کہ ارے کیا ابن ابی کبشہ (یہ وہ لفظ ہے جس سے کفار قریش پیغمبر خداؐ کو یاد کیا کرتے تھے) بھی زندہ ہیں؟ ابن ابی طالبؑ کو تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ تو موجو دہیں۔ اس پر حضرت علیؑ نے ہی پکار کر جواب دیا کہ ہاں قسم اس کی جس نے ان کو حق کے ساتھ بھیجا ہے یقین مانو کہ وہ تمہاری بات خود سن رہے ہیں۔ اس نے کہا اچھا تو سنو کہ تمہارے مقتولین میں کچھ مثلہ کئے گئے ہیں۔ بخدا میں نے اس کا حکم نہیں دیا تھا اور نہ اس سے منع کیا تھا۔ اور اب ہمارے تمہارے درمیان آئندہ سال اسی مہینہ میں بدر کے میدان کا مقابلہ ہو گا۔ ابن قمیئہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے محمدؐ کو قتل کیا ہے مگر تم میرے نزدیک ابن قمیہ سے زیادہ سچے ہو۔

(اعلام الوریٰ)

بھائی کی لاش پر بہن کی آمد

شہر کے اندر جناب حمزہؑ کی شہادت کی خبر پہنچ گئی جسے سن کر جناب صفیہ خواہر جناب حمزہؑ میدان احد کی طرف روانہ ہو گئیں۔ رسولؐ کو اس کا علم ہوا۔ پہلے تو آپ نے ان کے صاحبزادے کو بھیج کر روکنے کی کوشش فرمائی کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کو اس عالم میں نہ دیکھ سکیں گی۔ مگر جب انہوں نے کہا کہ مجھے تو معلوم ہو چکا

ہے کہ ان کی لاش کی کیا کیفیت ہے' اس لئے مجھے روکنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ (طبری جلد ۳ صفحہ ۲۵) تو آپ نے یہ اہتمام فرمایا کہ ان کے آنے سے پہلے حمزہؓ کی لاش پر چادر ڈال دی جائے ۔ پھر بھی پیر کھلے رہ گئے تو انہیں گھاس اور پتے جمع کرکے چھپایا گیا۔ صفیہ جب لاش پر آئیں اور دعائے مغفرت کرکے واپس ہونے لگیں تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ اس موقع پر خود پیغمبرؐ بھی ان کے ساتھ شریک ماتم تھے اور شدت کے ساتھ گریہ فرما رہے تھے۔

(تاریخ خمیس دیار بکری)

ایک خاتون کا جذبہ ایمانی

بنی نجار کی ایک ضعیف العمر خاتون جن کے باپ' شوہر اور بھائی تینوں احد میں شہید ہو گئے۔ وہ پیغمبر خداؐ کے قریب آئیں جب کچھ مسلمان آپ کے پاس آ چکے تھے اور پیغمبر کو گھیرے ہوئے تھے انہوں نے بیتابانہ کہا۔ ارے رسولؐ زندہ ہیں؟ لوگوں نے کہا ہاں' رسولؐ زندہ ہیں۔ کہنے لگیں مجھے ایک نظر رسولؐ کو دیکھ لینے دو۔ لوگوں نے جو حلقہ کیے ہوئے تھے راستہ دیا۔ بس وہ آئیں اور کہنے لگیں آپ زندہ ہیں تو سب مصیبتیں اس کے بعد آسان ہیں۔

(اعلام الوریٰ)

عبرت ناک

ظاہری آنکھیں تو پیغمبرؐ کے ساتھ رہنے ہی کو دیکھتی ہیں اور اسی کو اپنی عقیدت کا معیار بنا لیتی ہیں۔ چہ جائیکہ پھر پیغمبرؐ کی نصرت میں جنگ کرنا۔ اس کے دو ہی نتیجے سمجھ میں آتے ہیں۔ زندہ رہے تو غازی اور مر گئے تو شہید اور جب شہید ہوئے تو حسن انجام میں شک ہی کیا۔ مگر چمک دار پردوں کے پیچھے کیسی تاریکیاں چھپی ہوتی ہیں اسے جنگ احد نے دو مثالوں کی شکل میں پیش کیا ہے ایک میں غازی کی نقاب کشائی ہوئی ہے اور دوسرے میں ظاہری طور پر ایک شہید کی۔

پہلا واقعہ حاطب بن امیہ بن رافع کا ہے جو ایک سن رسیدہ آدمی تھا اور ظاہر ہے کہ جنگ احد میں جو ہجرت کے تیسرے ہی سال ہوئی ہے جو مسلمان موجود ہو وہ

کسی نہ کسی درجہ تک سابقین ہی میں محسوب ہو سکتا ہے۔ اس کا جوان فرزند یزید بن حاطب معرکہ کارزار میں زخمی ہو گیا اور گھر لاتے لاتے اس کی حالت خراب ہو گئی تمام مسلمانوں نے اسے جنت کی بشارت دینا شروع کی۔ حاطب بولا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان بشارتوں میں کوئی اصلیت بھی ہے یا نہیں؟ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اس بھولے بھالے جوان کو تم لوگوں نے دھوکا دے کر بے کار جان لی اور مجھے اس ضعیفی میں اس کا داغ دیا۔

دوسرا شخص قزمان مسلمانوں کی جماعت میں شامل تھا اور روز احد اس نے سخت جنگ کی اور آٹھ نو مشرکین کو قتل کیا۔ آخر زخمی ہو کر گرا اور اسے اٹھا کر معرکہ جنگ سے لے گئے۔ مسلمانوں نے کہنا شروع کیا کہ اے قزمان جنت مبارک ہو۔ وہ کہنے لگا کہ تم مجھے کیا بشارت دیتے ہو۔ میں نے تو اپنی قوم کی حمایت میں جنگ کی اور ایسا نہ ہوتا تو کبھی جنگ نہ کرتا اس کے بعد بھی جب زخم کی تکلیف زیادہ ہوئی تو اس نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکالا اور اپنی شہ رگ کو قطع کر دیا جس سے خون بہنا شروع ہوا۔ اس طرح خود کشی کرکے اس کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۲۶)

ان مسلمانوں کے ساتھ ایک یہودی کا کردار بھی یاد رکھنے کا ہے۔ اس کا نام مخیریق تھا۔ جب احد میں جنگ کی حالت دگرگوں ہوئی اس نے یہودیوں سے کہا کہ تمہیں محمدؐ کی حمایت لازم ہے۔ انہوں نے کہا آج ہفتہ کا دن ہے جس میں ہم کوئی کام نہیں کرتے۔ اس نے کہا ہفتہ وفتہ کچھ نہیں۔ یہ کہہ کے اس نے ہتھیار لگائے اور چلتے وقت کہا کہ اگر میں قتل ہو جاؤں تو میرا تمام مال محمدؐ کا ہے' وہ جو چاہیں کریں اور میدان میں پہنچ کر جنگ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ رسولؐ کی حمایت میں قتل ہو گیا۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۲۱)

دفن شہداء

ابن الوردی نے لکھا ہے کہ پیغمبر خداؐ نے پہلے تو حمزہؓ کی نماز جنازہ پڑھائی اور سات تکبیریں کہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ فضیلت کے لحاظ سے میت کے لئے دعا و استغفار کے ساتھ تکبیروں میں اضافہ ہوتا ہے پھر دوسرے مقتولین کئی کئی لا کر حمزہؓ کے پہلو میں رکھے جاتے تھے اور حضرت حمزہؓ کی شرکت کے ساتھ ان سب کی نماز جنازہ پڑھاتے تھے۔ اس طرح سے تمام مقتولین کی نماز پڑھائی اور مجموعی طور پر بہتر مرتبہ نماز ہوئی جن میں سے ہر ایک میں حمزہؓ شریک تھے پھر حمزہؓ کو علیحدہ دفن فرمایا اور دو شہیدوں کو جو عمرو بن جموح اور عبداللہ بن عمرو بن حرام تھے۔ حضرت نے فرمایا ان میں زندگی میں بڑا اتحاد تھا لہٰذا ان دونوں کو ایک قبر میں دفن کرو۔ (طبری جلد ۳ صفحہ ۲۱) اور تمام شہداء کو علیحدہ ایک ساتھ دفن کیا۔ ایک روایت ہے کہ کچھ لوگ اپنے مقتولین کو اٹھا کر مدینہ لے گئے اور وہاں دفن کیا۔ پھر پیغمبرؐ نے منع فرمایا اور کہا کہ جہاں ان کا مقتل ہے وہیں ان کا مدفن ہونا چاہئے۔

مراجعت

پہلے صورت حال پر روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ اختتام جنگ ایسے عالم میں ہوا تھا کہ اب دونوں جماعتوں میں سے کسی میں مقابلہ کی سکت نہ تھی۔ چنانچہ ابو سفیان نے رسول اللہ کے جائے قیام کے قریب آکر اعلان کیا کہ اب ہم سے تم سے مقابلہ آئندہ سال بدر میں ہوگا۔ رسول خداؐ نے اپنے اصحاب میں سے کسی سے کہا کہ کہہ دو اچھا' یہی ہمارے تمہارے درمیان وعدہ رہا۔ اس پر ابو سفیان واپس چلا گیا مگر بہ ظاہر اسباب بعید سہی پھر بھی امکان اس کا تھا کہ یہ جنگی سیاست کا کوئی کرتب ہو اور غفلت میں پھر حملہ ہو جائے۔ اس لئے احتیاطاً" پیغمبر خداؐ نے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کو بھیجا کہ ان کے پیچھے جاؤ اور دیکھو کہ یہ کیا کرتے ہیں۔ اگر یہ کوتل گھوڑوں کو ساتھ لیے جا رہے ہوں اور خود اونٹوں پر سوار ہوں تو یقین کر لینا چاہئے کہ وہ مکہ کی طرف واپس جا رہے ہیں اور اگر گھوڑوں پر سوار ہوں اور

اونٹوں کو خالی ساتھ رکھا ہو تو سمجھنا چاہئے کہ مدینہ پر حملہ کا ارادہ ہے۔ پھر مجھے فوراً مدینہ جا کر ان کا مقابلہ کرنا ہے۔ حسب ہدایت حضرت علی گئے اور صورت کو پہلی ہی شکل میں پایا اور آپ نے واپس آکر پیغمبرؐ کو اطمینان دلا دیا کہ وہ اب جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے اور بالکل واپس جا رہے ہیں۔ یہ اطمینان حاصل ہونے کے بعد پیغمبر خداؐ نے بھی مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی۔

(طبری جلد ۳۳ صفحہ ۲۴)

شہداء کا ماتم

مورخ ابن جریر کی روایت ہے کہ حضرت پیغمبر خداؐ بنی عبدالاشہل اور بنی ظفر کے مکانات کی طرف سے گزرے جو انصار کے دو قبیلے تھے تو حضرت نے سنا کہ عورتیں اپنے عزیزوں پر جو جنگ احد میں شہید ہوئے نوحہ و ماتم کر رہی ہیں۔ اس سے خود پیغمبر خداؐ کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ پھر فرمایا۔

لکن حمزة لا بواکی له

مگر حمزہ پر رونے والیاں نہیں ہیں۔

سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر دونوں صحابی جو انصار میں سے تھے واپس ہوئے تو انہوں نے خواتین کو ہدایت کی کہ وہ جائیں اور عم رسولؐ کا ماتم کریں۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۲۷)

علامہ طبری لکھتے ہیں کہ یہ تمام خواتین حضرت فاطمہ زہراؑ کے پاس آئیں اور آپ کو جناب حمزہؓ کا پرسا دیا۔ رسول خداؐ جب مسجد میں تشریف لے جانے لگے اور حضرت فاطمہ زہراؑ کے دروازے پر پہنچے تو رونے کی آواز سنی۔ آپ نے ان خواتین کے لئے دعائے خیر کی اور فرمایا تم نے ہمدردی و غم خواری کا حق ادا کیا۔

(اعلام الوریٰ)

قدیم ترین مورخ ابن سعد کاتب واقدی نے لکھا ہے کہ اس کے بعد خواتین انصار میں یہ رسم جاری ہو گئی کہ جب کسی کا کوئی عزیز دنیا سے اٹھتا تھا تو پہلے حمزہؓ

کا نام لے کر رویا جاتا تھا' پھر اپنے مرنے والے پر گریہ ہوتا تھا۔
(طبقات ابن سعد از روئے حوالہ تاریخ احمدی صفحہ ۴۵' ۴۶)

نبیؐ و علیؑ کی تلواریں فاطمہ زہراؑ کے ہاتھ میں

عام تصور یہ ہے کہ حضرت پیغمبر خداؐ نے بہ نفس نفیس کبھی جنگ نہیں فرمائی مگر یہ جنگ احد کے علاوہ اور دوسرے غزوات کی حد تک تصور درست معلوم ہوتا ہے۔ مگر جنگ احد میں پہلے بھی ذکر آچکا ہے کہ حضرت رسولؐ نے جب کہ آپ کے پاس سوا علیؑ کے جو قلب فوج میں علمداروں کے قتل کی مہم میں متصرف تھے کوئی نہیں رہ گیا تھا' تو پیغمبر خداؐ نے خود بھی جنگ فرمائی۔ آپ کے ہاتھ سے ایک زخمی ہو کر ہلاک ہونے والے کا ذکر بھی آچکا ہے۔ اب اس کا مزید ثبوت تاریخ سے ملتا ہے کہ جب آپ مدینہ واپس ہوئے اور بیت الشرف میں داخل ہوئے تو آپ نے اپنی تلوار حضرت فاطمہؑ کو دی اور فرمایا کہ بیٹی! اس سے اس خون کو جو اس پر ہے دھو کر صاف کر دو اور حضرت علیؑ نے بھی اپنی تلوار حضرت فاطمہ زہراؑ کو دی اور فرمایا اسے بھی دھو دینا۔ کہ بخدا اس نے میرے ساتھ آج سچی وفاداری کی۔ اس موقع پر دیوان حضرت علیؑ میں چند شعر بھی وارد ہیں' جنہیں مورخ ابن جریر نے ان الفاظ میں درج کیا ہے کہ۔

زعموا ان علی بن ابی طالب حین اعطی فاطمة علیها السلام سیفه قال

لوگ خیال کرتے ہیں کہ جب علیؑ بن ابی طالبؑ نے حضرت فاطمہؑ کو اپنی تلوار دی تو یہ کہا۔

"زعموا" کا لفظ اگرچہ ضعف روایت کا پتہ دیتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مورخ کو اس کی صحت پر اطمینان نہیں ہے مگر اس سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اشعار چوتھی صدی ہجری میں جو طبری کا زمانہ ہے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اور اسلئے ان کی قدامت میں شبہ نہیں ہے۔ وہ اشعار حسب ذیل ہیں۔

افاطم هاءٔ السیف غیر ذمیم فلست برعدید ولا بملیم
لعمری لقد قاتلت فی حب احمد وطاعة رب بالعباد رحیم
و سیفی بکفی کالشهاب اهزه اجذبه من عاتنی و صمیم
فما زلت حتی فض ربی جمو عهم و حتی شفینا نفس کل حلیم
طبری، جلد ۳ صفحہ ۲۷

(یعنی) اے فاطمہؑ لو یہ تلوار جس کی کوئی مذمت نہیں ہو سکتی کہ میں نہ پریشان ہونے والا ہوں نہ مضطرب، قسم ہے کہ میں نے جنگ کی ہے پیغمبرؐ کی محبت اور پروردگار عالم کی اطاعت میں اور میری تلوار میرے ہاتھ میں مثل شہاب ثاقب کے تھی جس کو میں حرکت میں دے کر بڑے بڑے مردان جنگی کا خاتمہ کر رہا تھا۔ تو برابر میں مقابلہ کرتا رہا یہاں تک کہ پروردگار نے ان کے دستوں کو منتشر کیا اور دلوں کو اطمینان نصیب ہوا۔

غزوۂ حمراء الاسد

مورخین کا بیان ہے کہ مدینہ میں واپسی کے بعد دوسرے ہی دن یعنی روز یکشنبہ ۱۶ شوال کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ ہم دشمن کے تعاقب میں جائیں گے اور وہی ہمارے ساتھ چلیں جو کل کے معرکے میں موجود تھے۔ چنانچہ تمام جنگ احد میں شریک ہونے والے مسلمان جن میں بہت سے زخمی تھے او ران کے پاس سوار ہونے کے لئے مرکب تک نہ تھے اس ارشاد کی تعمیل میں حضرتؐ کے ساتھ روانہ ہوئے اور حضرتؐ ان کے ساتھ حمراء الاسد تک جو مدینہ سے آٹھ میل ہے تشریف لے گئے اور وہاں تین دن ٹھہرے رہے مگر مشرکین تو مکہ کی طرف جا چکے تھے لہٰذا آپ تین دن وہاں ٹھہرنے کے بعد مدینہ واپس ہو گئے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ اقدام صرف یہ دکھلانے کے لئے تھا کہ ہم کل کے واقعہ سے ہمت نہیں ہارے ہیں اور ہم میں لڑنے کی سکت باقی ہے۔ (طبری جلد ۳ صفحہ ۲۸) مگر اختتام جنگ کی جو صورت پہلے درج ہو چکی ہے اور وہ خود انہی مورخین

نے لکھی ہے کہ دونوں طرف سے قول قرار ہو گیا کہ اب آئندہ سال مقابلہ ہوگا۔
اس کے بعد ہمیں درایتی طور پر یہ حکایت ناقابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ نیز کل مسلمانوں سے جو عملی کمزوریاں نمایاں ہوئیں وہ اتنی زیادہ نمایاں تھیں کہ اس کے بعد اس طرح کا کوئی نمائشی مظاہرہ کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ جب کہ پیغمبر خدا حضرت علیؑ کو بھیج کر یہ اطمینان کر چکے تھے کہ مشرکین مکہ چلے گئے ہیں اور واپسی کا ارادہ نہیں رکھتے تو پھر اس طرح کی نمائش ہمیں تو شان رسالت کے مطابق بالکل معلوم نہیں ہوتی۔ اس لئے ہم اس کی تصدیق سے قاصر ہیں۔

ہمارا خیال تو یہ ہے کہ یہ روایت خوش عقیدہ مورخوں ہی نے وقوع میں آئی ہوئی کمزوری کو چھپانے اور مسلمانوں کی وفاداری کو امکانی حد تک پایہ ثبوت کو پہنچانے کے لئے تصنیف فرمائی ہے۔

تاریخ اسلام

جلد سوئم

رجیع اور بئر معون ۔ دو اندوہناک المیے

مشرکین مکہ کی سازش

احد سے جو اندوہناک حوادث کا سلسلہ شروع ہوا وہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ چنانچہ اس کے بعد ہی رجیع کا اندوہناک واقعہ ہوا اور پھر بالکل اسی نوعیت کا مگر اس سے زیادہ شدید بئر معونہ کا المیہ وقوع پذیر ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں قریش یعنی اہل مکہ ہی کی سازش تھی۔

(تاریخ مسلمانان عالم حصہ اول صفحہ ۷۷)

رسولؐ کا علم غیب

معلوم ہونا چاہیے کہ علم غیب بعطیئہ الہٰی حسب مشیت ربانی رسول یا امام کو ہوتا ہے مگر روز مرہ کی زندگی میں اطلاعات پر عمل بھی ہوتا تھا اور لوگوں کے قول و قرار پر اعتبار بھی۔ یہی ان کا من جانب اللہ فریضہ تھا جس میں ظاہری طور پر عام زبان میں انہیں زک بھی اٹھانا پڑی ہے۔ چنانچہ ان دونوں واقعوں میں یہی صورت تھی۔

رجیع کا معاملہ یہ تھا کہ عرب کے بعض قبائل نے جن کا نام علامہ طبری نے عضل و ریش لکھا ہے۔ ابن خلدون نے عضل اور قارہ بنی الہون ابن خزیمہ اخوۃ بنی اسد (تاریخ ابن خلدون طبع بیروت جلد ۱ صفحہ ۷۶۸) اور مسلمانان عالم کے

مصنف نے (غالباً" غلط طور پر) عقل اور فارد لکھا ہے' رسولؐ کے پاس وفد بھیجا اور کہلوایا کہ ہم اسلام لانا چاہتے ہیں۔ اپنے یہاں کے کچھ آدمی ہمارے یہاں بھیجئے کہ ہمیں قرآن اور مذہبی مسائل کی تعلیم دیں۔

انہیں یہ معلوم ہو گا کہ اسی قسم کی خواہش مدینہ والوں نے حضرت ﷺ سے اس وقت کی تھی جب آپ مکہ میں تھے تو آپ نے معصب بن عمیر کو ان کے یہاں بھیج دیا تھا لہٰذا ہم بھی ایسی خواہش کریں تو اصولاً" رسول ﷺ کو ہماری دعوت کی پذیرائی کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت ﷺ نے مرثد بن ابی مرثد غنوی کی سرکردگی میں چھ افراد کو اپنے اصحاب میں سے روانہ کر دیا۔

تبلیغی وفد کا قتل

جب یہ لوگ بطن رجیع میں پہنچے جو عسفان کے قریب قبیلہ ہذیل کا چشمہ تھا تو ان "میزبانوں نے غداری کر کے قبیلہ ہذیل کو خبر دی اور جنگ کے لئے للکار دیا۔ جنھوں نے حملہ کر دیا اور یہ سب قتل ہو گئے۔

(اعلام الوریٰ)

دوسری روایت یہ ہے کہ حملہ ہونے پر جب یہ لوگ مقابلہ پر آمادہ ہو گئے تو ان لوگوں نے انہیں جان کی امان دی اور کہا ہم تمہیں زندہ مکہ والوں کے پاس لے جائیں گے اور ان سے رقم حاصل کریں گے۔ اس پر تین بزرگواروں نے جن میں ان کے سردار مرثد بھی تھے انکار کر دیا اور وہ جنگ کر کے شہید ہو گئے باقی تین کو انہوں نے قید کیا اور مکہ کی طرف لے چلے۔ ان میں سے بھی ایک نے راستے میں لڑ کر جان دے دی اور خبیب اور زید کو انہوں نے مکہ لے جا کر قریش کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

(ابن خلدون جلد ۲ صفحہ ۲۲۸' ۲۲۹)

مسٹر کے۔ اے حمید لکھتے ہیں کہ باقی ماندہ کو سفیان ہذلی مکہ لے گیا۔ جنھوں نے نہایت بے رحمی سے انہیں سخت سے سخت ایذائیں دیں اور آخر کو پھانسی پر لٹکا دیا۔

حضرت خبیبؓ کا ایمانی جذبہ

حضرت خبیبؓ کے واقعہ قتل کو دنیا فراموش نہیں کر سکتی۔ جب آپ کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالا گیا تو آپ نے فی البدیہ یہ چند شعر کہے جن کے ہر لفظ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کس قسم کے لوگ تھے۔ ان کے دلوں میں راستبازی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ تو اس شمع کے پروانے تھے جو دنیا کے اندھیرے کو ہمیشہ کے واسطے فنا کرنے کے لئے جلائی گئی تھی۔

تختہ دار پر نعرہ ایمان

ان کے اشعار کا ترجمہ یہ ہے۔

کافروں کے گروہ در گروہ میرے پاس جمع ہوئے ہیں۔ میں اس ہلاکت گاہ میں بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہوں ان کافروں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو بلا لیا ہے اور مجھ کو ایک مضبوط شہتیر کے پاس لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کفر اختیار کرو تو تمہاری جاں بخشی ہو سکتی ہے۔ میں کفر اختیار کرنے سے موت کو ترجیح دیتا ہوں۔ میں دشمنوں کے سامنے نہ عاجزی کروں گا نہ روؤں گا اور نہ چلاؤں گا مجھے یقین ہے کہ میں خدا کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے لئے جا رہا ہوں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ البتہ دوزخ کی آگ سے ڈرتا ہوں۔ اے عرش کے مالک تو مجھ کو اس مصیبت کبریٰ میں صبر عنایت فرما ان کافروں نے میرے گوشت کے ٹکرے ٹکرے کر دیئے ہیں اور میں زندگی سے مایوس ہو چکا ہوں۔ خدا کی قسم جب میں اسلام پر فدا ہو رہا ہوں تو مجھ کو پروا نہیں کہ کس پہلو گرتا ہوں اور کس طرح جان دیتا ہوں۔

(تاریخ مسلمانان عالم صفحہ ۷۷'۷۸)

اسی کے بعد جنگ احد سے چار مہینے بعد بئر معونہ کا واقعہ نجد کی سرزمین پر پیش آیا۔ بعض مورخین نے تصریح کی ہے کہ یہ صفر ۴ ہجری کا واقعہ ہے۔ (مراۃ الجنان للیافعی مطبوعہ حیدر آباد دکن جلد ۱ صفحہ ۹) جس کی تفصیل یہ ہے کہ ابوالبراء

عامر بن مالک بن جعفر ملاعب الاسنہ نے آکر رسول ﷺ سے عرض کیا' آپ کچھ آدمیوں کو اہل نجد کی طرف روانہ فرمائیں جو انہیں دعوت اسلام دیں۔ تو مجھے امید ہے کہ وہ آپ کی دعوت کو قبول کریں گے۔

اہل نجد پر رسول ﷺ کی بے اطمینانی

حضرت ﷺ نے فرمایا' مجھے نجد والوں پر اطمینان نہیں ہے ابو براء نے کہا میں ذمہ دار ہوں۔ چنانچہ اس اتمام حجت کے بعد حضرت ﷺ نے منذر بن عمرو کو بیس سے چالیس تک کی تعداد میں اور ایک روایت میں تو ستر تک ان کا شمار بتایا گیا ہے مگر مورخ واقدی نے چالیس کو محقق قرار دیا ہے۔ (کتاب المغازی للواقدی مطبوعہ مطبع آکسفورڈ یونیورسٹی ۱۹۶۶ جلد ۱ صفحہ ۳۴۷) خوش کردار حفاظ قرآن کی جماعت کے ساتھ روانہ کر دیا۔ یہ لوگ روانہ ہوئے یہاں تک کہ ایک کنویں کے پاس جسے بئر معونہ کہتے تھے جا کر قیام کیا اور اپنے میں سے ایک صحابی رسول ﷺ حزام بن ملحان کو رسول ﷺ کا خط دے کر وہاں کے سردار عامر بن طفیل کے پاس بھیجا۔ خط کا پہنچنا تھا کہ وہ آگ بگولا ہو گیا اور اس نے خط پڑھنا بھی گوارا نہ کیا اور تمام عرب کے بین القبائلی دستور کے خلاف عامر نے جھپٹ کر خود اس قاصد کو قتل کر دیا اور اب اس نے تمام بنی عامر کو اس جماعت کی خونریزی کی ترغیب دی مگر انہوں نے کہا کہ ہم ابوالبراء کی ضمانت کے خلاف نہیں کریں گے تب اس نے آس پاس کے دوسرے قبائل عصیہ اور رعل وغیرہ سے فریاد کی۔ یہ اس کی آواز پر جمع ہو گئے اور مسلمانوں کی اس جماعت کو وہیں جہاں وہ اتری ہوئی تھی آکر گھیر لیا۔ ان بہادروں نے تلواریں نیام سے نکالیں اور ان سے جان توڑ مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ سب کے سب شہید ہو گئے۔ کوئی اتنا بھی نہ ہوتا جو اس کی اطلاع مدینہ تک پہنچاتا۔ وہ تو چراگاہ میں ان کے مویشیوں کی حفاظت کے لئے دو آدمی عمرو بن امیہ ضمری اور حارث بن صمہ ان سے کچھ دور رہ گئے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ طیور جو میدان جنگ میں کشتوں کی لاشوں پر جمع ہو جایا کرتے ہیں اس سمت میں منڈلا رہے ہیں۔ اس سے انہیں پریشانی پیدا ہوئی

اور وہ گئے کہ صورت حال معلوم کریں تو انہوں نے دیکھا کہ وہ سب خاک و خون میں آغشتہ پڑے ہوئے ہیں - اس پر عمرو نے کہا کہ ہمیں جا کر رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اس کی اطلاع دینا چاہئے۔ مگر حارث نے ساتھ جانے سے انکار کیا اور کہا میں تو اس سعادت کو نہیں چھوڑوں گا اور اسی قربان گاہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کروں گا۔ چنانچہ انہوں نے جنگ شروع کر دی اور دو کافروں کو قتل کر کے شہید ہو گئے - عمرو بن امیہ کو ان لوگوں نے قید کر لیا۔ (کتاب المغازی للواقدی جلد اصفحہ ۳۴۸) یہ صفر ۴ ھ کا واقعہ ہے۔

ظالموں پر نام بنام لعنت کرنا سنت رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہے۔

علامہ طبری کا بیان ہے کہ عمرو بن امیہ ہی نے مدینہ جا کر حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اس سانحہ کی اطلاع دی۔ (اعلام الوریٰ) جس کا حضرت کو بہت صدمہ ہوا اور تمام مسلمانوں پر اس اندوہناک واقعہ کا اثر ہوا اور یہ ایک بڑی اہم حقیقت ہے کہ اس مجسم ضبط و تحمل رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر جس نے خود اپنے جسم پر پتھروں کی بارش ہونے پر کبھی دشمنوں کے لئے بد دعا نہ کی ان بے گناہوں کے اس خون ناحق کا اتنا اثر ہوا کہ آپ نے ایک مدت تک نماز کے قنوت میں ان قبائل پر جو اس ظلم و تشدد کے مرتکب ہوئے تھے نام بنام لعنت فرمائی۔

(واقدی، ج ا صفحہ ۳۴۹-۳۵۰)

جماعت یہود سے تصادم کا آغاز

اس سے پہلے یہ ذکر آچکا ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مدینہ میں تشریف لانے کے بعد جماعت یہود نے آپ سے ایک معاہدہ کر لیا تھا جس کی رو سے انہوں نے اس حکومت اسلامیہ کے ساتھ جو رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سربراہی میں منجانب اللہ قائم تھی وفاداری کا اقرار کر لیا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آئینی طور پر انہوں نے اس حکومت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کا رعایا ہونا قبول کر لیا تھا اس لئے ان کی حیثیت کسی مخالف قوم کی نہ تھی جن سے جنگ کا کوئی سوال ہوتا

بلکہ اب یہ قلمرو مملکت اسلامی کے باشندہ ہونے کے بعد دستور کی رو سے خود اختیاری رضا مندی کے ساتھ ایک طرح اس قوم کا جز بنے ہوئے اس کی وفاداری کے پابند تھے لہٰذا اجب ان کی کسی خلاف ورزی پر جو کارروائی بھی ہو از اول تا آخر خواہ وہ بنی نضیر کی مہم ہو جو اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی ہے اور خواہ خیبر کی مہم ہو جو سب سے آخر میں فیصلہ کن حیثیت سے وقوع میں آئی اسے آج کل کی اصطلاح میں جنگ کہنا درست نہیں تاکہ اس میں دیکھا جائے کہ وہ مدافعانہ تھی یا جارحانہ بلکہ اسے تادیبی مہم کہنا چاہیے جسے عام زبان میں "پولیس ایکشن" کہتے ہیں اور وہ مجرموں کی سرکوبی یا ان کی سزا کی حیثیت سے ہوتی ہے لیکن چونکہ قدیم محاورات میں مہمات کی اس تفریق کے لئے الفاظ نہ تھے اس لئے مورخین جس طرح بدر و احد اور خندق کو غزوات کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اسی طرح وہ مجبور ہیں کہ ان مہمات کے لئے بھی غزوہ بنی نضیر اور غزوہ بنی قریظہ اور غزوہ بنی المصطلق اور غزوہ خیبر یا جنگ خیبر کے الفاظ استعمال کریں اور چونکہ ان مہمات کا یہی اصطلاحی نام ہو گیا ہے لہٰذا ہم بھی آئندہ یہی الفاظ استعمال کریں گے لیکن اس فرق کو جس پر یہاں بقدر ضرورت روشنی ڈالی گئی ہے پیش نظر رکھنا ان تمام مہمات میں ضروری ہے کہ ان غزوات یا جنگوں کی نوعیت وہ نہیں ہے جو بدر و احد وغیرہ کے غزوات کی ہے جن میں مخالف قوم کا مقابلہ تھا اور جن کے لئے بدلائل یہ حقیقت ثابت ہے کہ وہ ہمیشہ مدافعانہ طور پر ہوئے ہیں اور کبھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے پیش قدمی کی صورت سے وقوع میں نہیں آئے۔

غزوہ بنی نضیر

ان قبائل یہود میں سے ایک طاقتور قبیلہ وہ تھا جسے بنی نضیر کہا جاتا تھا۔ ان کا سردار کعب بن اشرف تھا۔

چونکہ اب تک بظاہر تعلقات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ خوشگوار تھے اس لئے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعب بن اشرف کے پاس ایک اسلامی مہم کے سلسلہ میں قرض لینے کے لئے تشریف لے گئے۔

آنحضور کو قتل کرنے کی یہودی سازش

اس نے بظاہر آپؐ کا خیر مقدم کیا اور آپ سے بڑے تپاک کے ساتھ ملاقات کر کے آپ کو باتوں میں لگایا مگر دوسری طرف وہاں کے یہودیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر آپؐ کی زندگی کے ختم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ تاریخ میں اس شخص کا نام بھی درج کر دیا گیا ہے جو مقرر کیا گیا تھا کہ وہ ایک پتھر کو لے جا کر اس دیوار پر سے جس کے نیچے آپؐ تشریف فرما ہیں آپ کے سر پر لڑھکا دے اور وہ اس پتھر کو لڑھکانے کے لئے اپنی جگہ سے حرکت بھی کر چکا تھا بس اب کیا ہوا؟

علامہ طبرسی نے لکھا ہے۔

فنزل جبرئیل علیه السلام فاخبره بما هم به القوم من الغدر

(اعلام الوریٰ)

جبرئیل امین اترے اور انہوں نے آپؐ کو اطلاع دی کہ ان لوگوں نے آپؐ کے خلاف یہ منصوبہ بنایا ہے۔
ابن خلدون نے بھی لکھا ہے

و اوحی اللّٰہ بذالک الی نبیہ

(تاریخ ابن خلدون جلد ۲ صفحہ ۲۷۱)

اللہ نے بذریعہ وحی اپنے پیغمبرؐ کو اس کی اطلاع دی۔
بعض جدید اہل قلم بھی ایسا ہی لکھتے ہیں۔

(محمدؐ و بنو اسرائیل تالیف الدکتور مصطفیٰ کمال و صفی صفحہ ۸۴)

کہا جاتا ہے کچھ اصحاب بھی اس موقع پر آپ کے ساتھ تھے۔ آپؐ بغیر ان سے کچھ کہے اٹھے، اس طرح جیسے ابھی ضرورت سے فارغ ہو کر واپس تشریف لائیں گے۔ اصحاب کافی دیر تک انتظار کرتے رہے۔ جب آپؐ واپس نہیں آئے تو انہیں تشویش ہوئی اور وہ دریافت حال کے لئے وہاں سے باہر نکلے اور آس پاس کے لوگوں سے پوچھا تو کسی نے کہا کہ حضرت تو مدینہ کی طرف جا رہے تھے۔ تب وہ اصحاب مدینہ آئے اور حضرتؐ سے سبب معلوم کیا۔ آپؐ نے ان سے منصوبہ کی کیفیت بیان فرمائی۔

بعض مصنفین نے لکھا ہے کہ اس موقع پر ان کی جانب سے آپ پر قاتلانہ حملہ ہو گیا اور ایک بھاری پتھر گرا دیا گیا جس سے آپ بال بال بچے۔ (تاریخ مسلمانان عالم حصہ اول صفحہ ۷۸)

اگر قدیم ماخذوں میں یہ روایت مل جائے تو کوئی شبہ نہیں کہ درایتہ" اس کا وزن کافی ہے۔

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی خباثت

ان کی اس حرکت کی پاداش میں حضرتؐ نے ان کو مدینہ سے چلے جانے کا حکم دیا جسے انہوں نے پہلے منظور کر لیا مگر پھر رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی وغیرہ کے

بھڑکانے سے انکار کر دیا اور کہا ہم اپنا قلعہ نہیں چھوڑیں گے آپ جو کر سکتے ہوں کر لیجئے۔

(مدارج النبوۃ جلد ۲ صفہ ۲۰۳)

حضرت علیؑ یہود کا محاصرہ کرتے ہیں

اب حضرتؐ ان کی تادیب کے لئے مسلمانوں کی جماعت کو لے کر اور علم فوج حضرت علیؑ کو دے کر روانہ ہوئے اور ان کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ وہ قلعہ بند ہو گئے اور ان کی طرف سے تیر اندازی بھی شروع ہو گئی چنانچہ ایک تیر خود حضرت پیغمبر خداؐ کے خیمہ میں آیا جس کی وجہ سے حضرتؐ کا خیمہ اس جگہ سے ہٹا کر لگایا گیا۔ حضرت علیؑ ان تیر اندازوں کی فکر میں رہے - یہاں تک کہ آپ نے دیکھا کہ ان کا ایک مشہور تیر انداز جس کا نام عزورا تھا دوسرے دو پہلوانوں کے ساتھ ایک کمین گاہ سے برآمد ہوا اور یہ تینوں ہاتھوں میں تلواریں لئے ہوئے تھے۔ یہ دیکھتے ہی آپ نے حملے کیا اور عزورا کو قتل کر کے اس کا سر حضرتؐ کے پاس لائے - ابودجانہ وغیرہ نے دوسرے اس کے ساتھیوں کو قتل کیا۔ پھر قلعہ میں سے کوئی باہر نہیں نکلا۔ بہر حال ان کے اس سرکشی کے تیوروں کو دیکھ کر حضرتؐ نے محمد بن مسلمہ کے ذریعے سے ان کو کہلوایا کہ

بنی نضیر کی جلا وطنی

انہیں تین دن کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس تین دن کے اندر وہ مدینہ سے باہر نکل جائیں (اعلام الوریٰ) انہوں نے اب خوب سمجھ لیا تھا کہ وہ عرصہ تک مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے اب وہ سر تسلیم خم کرنے کے لئے مجبور ہو گئے اور مدینہ سے جلا وطن ہو کر خیبر میں جا کر آباد ہوئے۔

یہ ہجرت کے چھتیس مہینے کے بعد ربیع الاول ۴ھ کا واقعہ ہے۔

(اعیان الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۲۱۱)

"فدیہ اسلام" کی پیدائش

اسی سال ۳ شعبان کو حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ کے یہاں پیغمبر اسلامؐ کے چھوٹے نواسے کی پیدائش ہوئی جس کا نام حسینؑ رکھا گیا۔ دنیا کو اس وقت چاہے خبر نہ ہو مگر مستقبل پردہ اٹھائے گا تو سب ہی کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ یہ پیدا ہونے والا صرف علیؑ و فاطمہ فرزند اور رسولؐ کا نواسہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ اپنے نانا کے قائم کیے ہوئے اس دین کی قیامت تک کے لئے بقا کا ذریعہ بننے والا ہے اس لئے اسکی پیدائش تاریخ اسلام کے ایک اہم باب کی سرخی ہے جس کا مضمون ۶۱ھ میں ریگ زار کربلا میں بہتے ہوئے اس کے خون کی روشنائی سے معرض تحریر میں آئے گا۔

غزوہ بدر الموعد

اس کے پہلے جنگ احد کے حال میں آچکا ہے کہ مشرکین کی طرف سے یہ اعلان ہوا تھا کہ اب آئندہ سال بدر کے مقام پر ہم سے تم سے پھر مقابلہ ہو گا۔ اس کو رسالت مآبؐ نے بھی منظور فرمایا۔ چنانچہ اس قرار داد کے مطابق بروایتے یکم ذیقعدہ کو ہجرت سے ۴۵ مہینے کے بعد (المغازی للواقدی صفحہ ۳۸۴) اور دوسری روایت کے لحاظ سے ماہ شعبان ہی میں (اعلام الوریٰ) رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم لشکر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کو دیا (واقدی صفحہ ۳۸۴، مدارج النبوۃ مطبوعہ لکھنؤ جلد ۲ صفحہ ۲۰۸) اور لشکر اسلام کے ساتھ باہر نکل کر بدر میں ایک ہفتہ تک قیام فرمایا اور ادھر سے ابو سفیان بھی اہل مکہ کی فوج لے کر شہر سے نکلا۔

غالباً اس تصور میں کہ جنگ احد کی ہولناک صورت حال کے بعد اب مسلمانوں کو باہر آنے کی ہمت نہیں رہی ہو گی اور ہم اس طرح مفت کی ایک فتح حاصل کر لیں گے اس نے یہ اقدام کیا تھا مگر شہر سے باہر آنے کے بعد جب اسے مخبروں سے یہ اطلاعیں ملیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کی فوج کو ساتھ لئے جنگ پر تیار باہر نکل چکے ہیں تو مقام ظہران تک پہنچ کر اس نے ارادہ بدل دیا اور اپنی فوج کو لے کر واپس چلا گیا۔

یہاں بدر کے قریب ایک بازار لگتا تھا وہ لگ گیا اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ان کے اصحاب نے اس بازار میں تجارتی صورت سے شرکت فرما کر خرید و فروخت میں حصہ لیا جس سے اچھی منفعت حاصل ہوئی۔ (اعلام الوریٰ)

اس کے بعد رسالت مابؑ سولہ دن کے بعد فاتحانہ طور پر مدینہ واپس تشریف لے گئے۔

غزوہ مریسیع یا بنی مصطلق

یہ دو شعبان ۵ھ میں ہوا ہے (مدارج النبوۃ جلد۲ صفحہ ۲۱۱) قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ تھی جس نے حملہ کے لئے مدینہ کا رخ کیا تھا تو حضرتﷺ نے باہر نکل کر مریسیع کے پاس جو ایک کنواں تھا ان سے مقابلہ کیا۔ (اعیان الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۲۱۹) سرداران کا حارث بن ابی ضرار تھا۔

فوج اسلام کے آنے کی دہشت سے اس قبیلہ کے ساتھ جو دوسرے لوگ ادھر ادھر کے کثرت سے جمع ہو گئے تھے سب منتشر ہو گئے اور بس حارث اور اس کے قبیلے والے رہ گئے جو مقابلہ پر تیار ہوئے ۔ پیغمبر خداؑ نے مسلمانوں کو ان پر اجتماعی طور پر حملہ کرنے کا حکم دیا جس کے نتیجے میں ایک بھی آدمی ان میں سے بھاگ نہیں سکا، بلکہ دس آدمی قتل ہوئے اور باقی سب قید کر لئے گئے۔

غزوہ احزاب یا جنگ خندق

مشرکین مکہ اپنی انفرادی طاقت کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے میں اب قطعی طور پر ناکافی سمجھ چکے تھے۔ اس لئے کہ بدر میں جب مسلمان بالکل ہی بے سروسامان تھے تو ان کی تعداد میں تگنی مسلح فوج نے ان کے مقابلے میں ایسی شکست کھائی کہ جتنے ان کے بڑے بڑے چوٹی کے آدمی تھے تقریباً" سب مار ڈالے گئے۔ پھر وہ پوری طاقت کے ساتھ جب احد میں آئے تو انھوں نے یہ دیکھ لیا کہ وہ فوج اسلام کی اکثریت کو میدان سے پسپا کر دینے کے بعد بھی آخر کار جنگ کو سر نہ کر سکے اور جتنے ان کی فوج کے علمدار تھے وہ تو سب ہی کام آ گئے۔ اب اس کے بعد بس یہ ایک صورت باقی تھی کہ وہ دوسری جماعتوں کو جو اسلام کی مخالفت میں ان کے ساتھ شریک ہو سکتی ہیں اپنے ساتھ شریک کر کے متحدہ طاقت کے ساتھ پیغمبرؐ کا مقابلہ کریں۔

اسلام کے خلاف یہود' قریش اور کفار کا گٹھ جوڑ

اس میں انہیں یہود کی اس جماعت سے جو مدینہ میں تھی فطری طور پر مدد ملنے کی امید پیدا ہونا ہی چاہیے تھی اس تلخی کی وجہ سے جو بنی نضیر کی جلا وطنی سے پیدا ہو چکی تھی چہ جائیکہ حیی بن اخطب' سلام بن ابی حقیق اور کنانہ بن ربیع اور سلام بن مشکم وغیرہ سرداران یہود خود مکہ پہنچ گئے اور سرداران قریش سے

مل کر انہیں متفقہ طاقت کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کرنے کے لئے آمادہ کیا۔

(ابن خلدون صفحہ ۷۷۴ و اعلام الوریٰ)

عبدالباری صاحب ایم۔ اے نے معینا" اس غزوہ کی تاریخ ۲۸ ذیقعد ۵ھ درج کی ہے (دعوت دہلی سیرت طیبہ نمبر ربیع الاول ۷۹ ۱۳ھ صفحہ ۱۸۳) مگر بعض مورخین اس معرکہ کو ذیقعد کے بجائے شوال میں بتلاتے ہیں۔

(اعیان الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۲۲۲)

خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری نے ذیقعد ۵ھ کے ساتھ لکھا ہے مارچ اپریل ۶۲۷ء۔ (اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد ۱ صفحہ ۱۰۹)

تعین سال کے متعلق ابن خلدون کی کمزور دلیل۔

خیر یہ تو صرف مہینہ کا اختلاف تھا مگر علامہ ابن خلدون نے تو الٹی چھلانگ لگا کر ایک دم اس واقعہ کو ایک سال قبل پہنچا دیا ہے۔ وہ یہ لکھنے کے بعد کہ یہ شوال ۵ھ میں ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ والصحیح انہا فی الرابعة صحیح یہ ہے کہ وہ ۴ھ میں ہوا ہے۔ دلیل میں جناب عبداللہ بن عمر کا قول نقل کیا ہے کہ احد میں میں چودہ برس کا تھا۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے واپس کر دیا کہ یہ نابالغ ہے۔ خندق میں مجھے اجازت دے دی کہ اس وقت میں پندرہ برس کا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ احد اور خندق کے درمیان صرف ایک سال کا فرق ہے۔ (تاریخ ابن خلدون جلد ۲ صفحہ ۷۷۳) لیکن یہ استدلال زیادہ وزن نہیں رکھتا اور زیادہ وقیع مستند یہی بتاتے ہیں کہ یہ غزوہ ۵ھ میں ہوا ہے۔

(مروج الذہب للمسعودی طبع مصر جلد ۲ صفحہ ۱۸۳)

علامہ طبری کا بیان ہے کہ یہی یہودی لیڈر جن کے نام پہلے آچکے ہی غطفان اور کنانہ کے سرداروں کے پاس بھی گئے اور انہیں بتایا کہ قریش کو ہم نے پورے طور پر آمادہ کر لیا ہے۔ اب تمہارے ساتھ دینے کی ضرورت ہے چنانچہ یہ لوگ بھی اس کے لئے تیار ہو گئے۔

(اعلام الوریٰ)

مکہ معظمہ سے قریش کا لشکر ابو سفیان کی قیادت میں نکلا قبیلہ غطفان کی قیادت عینیہ بن حصین بن فزارہ کی معیت میں کر رہا تھا۔ بنی مرہ کو لے کر حارث بن عوف اور قبیلہ اشجع کے ساتھ دبرۃ بن طریف۔ یہود کا کوئی لشکر ان کے ساتھ نہ تھا مگر منصوبہ یہ تھا کہ وہ مدینہ کے اندر سے مسلمانوں پر حملہ آور ہو جائیں گے۔ اس طرح مسلمان چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں پس کر رہ جائیں گے۔

حضرت سلمانؓ کی تجویز خندق

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک یہ پوری خبر پہنچی اور تمام منصوبہ کی اطلاع ہوئی۔ اس موقع پر با جماع مورخین جناب سلمانؓ فارسی نے رائے دی کہ دشمنوں کے لئے رکاوٹ پیدا کرنے کے لئے خندق کھودی جائے۔

(المغازی للواقدی صفحہ ۴۴۵)

مگر اس خندق کی نوعیت کیا تھی؟ اس پر جب غور کیا جاتا ہے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مدینہ منورہ کئی طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس لئے مکہ معظمہ سے جو فوج آئے وہ بس ایک ہی طرف سے شہر میں داخل ہو سکتی تھی لہٰذا جناب سلمانؓ کی رائے سے اس سمت میں جدھر سے فوج کے داخل ہونے کا اندیشہ تھا ایک وسیع خندق کھودی گئی جسے فوج مخالف کے سوار اور پیادے ایک دم عبور نہیں کر سکتے تھے چنانچہ جب لوگ بسلسلہ حج زیارت مدینہ منورہ کے لئے جاتے ہیں تو ان کو دوسری زیارتوں کے ساتھ وہ جگہ بھی دیکھنے کا موقع ملتا ہے جہاں جنگ خندق ہوئی تھی۔

واقدی نے تو خندق کے حدود بھی لکھ دیئے ہیں وہ ہذاد سے ذباب تک اور پھر راتج تک تھی۔ حاشیہ پر اس کی تشریح درج ہے۔ کہ ہذاد بنو سلمہ کی ایک شاخ کا مملوکہ ٹیلا تھا جو مسجد فتح کے مغرب میں تھا۔ (وفاء الوفاء جلد ۲ صفحہ ۳۷۰) راتج وہ پہاڑی تھی جو کوہ بنی عبید کے پہلو میں بطحان کے مغرب میں واقع تھی۔ (وفاء الوفا' جلد ۲ صفحہ ۳۱) اس سے نوعیت خندق کی وہی ثابت ہوتی ہے جو ہم نے ابھی لکھی ہے مگر مسٹر کے اے حمید لکھتے ہیں کہ۔

"سلمان فارسی نے سرکار کے رو برو تجویز پیش کی کہ ایران میں ایسے خطرناک موقعوں پر شہر کے گرد خندق کھود دیتے ہیں کہ دشمن اسے عبور کرکے شہر میں داخل نہ ہو سکے۔ سرکار کو یہ تجویز پسند آئی۔ چنانچہ مدینہ کے ارد گرد ایک عمیق خندق تیار کی گئی"۔

(تاریخ "مسلمانان عالم" حصہ اول ۷۹)

"مدینہ کے ارد گرد" کے جو معنی عام طور پر ذہن میں آتے ہیں ویسی "عمیق خندق" اگر تیار کی گئی ہوتی تو تمام مسلمانوں کے اس میں لگ جانے کے بعد بھی پہاڑی علاقہ کی سنگلاخ زمین میں یہ چند مہینے سے کم کا کام نہیں ہو سکتا۔ یہ واقعہ کے قطعاً" خلاف معلوم ہوتا ہے اور اگر ایسا ہوتا تو مشرکین کے مکہ سے نکلنے کے پہلے یہ کام شروع ہو چکا ہوتا' جس کی انہیں پہلے سے اطلاع ہو گئی ہوتی۔ حالانکہ جیسا بعد میں آئے گا۔ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے وہاں ہی پر یہ دیکھا کہ خندق کھدی ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ وہیں پر رک گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خندق بس چند دن کی محنت میں مشرکین کے مکہ سے نکلنے کے بعد ہی تیار ہوئی تھی۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا اس جنگ کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ ذیقعد میں ہوئی اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ ماہ شوال میں ہوئی ہے غالباً" دوسرے قول کی بنا پر یہ امر قرین قیاس ہو سکتا ہے کہ خندق کے کھودے جانے کا کام ماہ صیام کی آخری تاریخوں میں ہوا ہو جیسا کہ تفاسیر سے ثابت ہوتا ہے کہ ذیل کی آیت

حکم قرآن اور صحابہ کی عملی مخالفت

احل لکم لیلة الصیام الرفث الی نسائکم هن لباس لکم و انتم لباس لهن علم الله انکم کنتم تختا نون انفسکم فتاب علیکم وعفا عنکم والان باشرو هن وابتغوا ما کتب الله لکم و کلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر ثم اتموا الصیام الی اللیل

(بقرہ آیت ۱۸۷)

تمہارے لئے جائز کیا گیا ہے روزہ کی رات میں اپنی عورتوں سے مقاربت کرنا وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم اپنی ذات کے ساتھ غداری کرتے رہے ہو تو اب اس نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہیں معاف کر دیا ہے تو اب تم ان سے مقاربت کرو اور جو کچھ اللہ نے تمہاری تقدیر میں لکھا ہے اس کے طلبگار ہو اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صبح کا سفید ڈورا کالے ڈورے سے الگ ہو کر تمہارے لئے نمایاں ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ کو پورا کرو۔

ان ہی دنوں میں نازل ہوئی جیسا کہ میں نے تفسیر قرآن پارہ دوم میں لکھا ہے۔ ابتدائے اسلام میں یہ حکم تھا کہ ماہ مبارک رمضان میں راتوں کو بھی عورت سے مخصوص تعلقات کا قائم کرنا جائز نہ تھا۔ اکثر مسلمان چوری چھپے اس حکم کی مخالفت کرتے تھے۔ اس آیت میں خالق نے اس حکم کو منسوخ فرمایا اس طرح کہ ان کے گذشتہ کردار پر سرزنش بھی فرمائی اور پھر آئندہ کے لئے معافی کا اعلان بھی کر دیا۔ الفاظ قرآن میں اس حکم کے ساتھ صاف صراحت قبل والے حکم کے منسوخ کرنے کی ہے مگر دوسرے حکم میں الفاظ سے اس کی صراحت نہیں نکلتی۔ روایت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی ابتدائے اسلام میں ایک حکم تھا کہ ماہ رمضان المبارک میں جب آدمی سو جائے تو پھر کچھ کھانا پینا جائز نہیں رہتا تھا۔

(تفسیر مجمع البیان پارہ دوم)

اس حکم لو بھی اس آیت میں منسوخ کیا گیا مگر اس منسوخی کے ساتھ کوئی سرزنش نہیں ہے اس لئے کہ کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی تھی بلکہ ایک صحابی رسولؐ نے جن کا نام بعض روایات میں خوات بن جبیر ہے اور بعض میں مطعم بن جبیر جنگ خندق میں اتفاق سے درمیان میں سو جانے کی وجہ سے روزہ پر روزہ رکھ لیا اور پھر خندق کھودنے میں مصروف ہو گئے۔ یہاں تک کہ غش آگیا تو یہ آیت نازل ہوئی اور وہ حکم برطرف کیا گیا۔

دوسرے مسلمانوں کے ساتھ خود حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی خندق کھودنے میں مصروف تھے اس عالم میں کہ بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا۔

(مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۲۲۸)

ایک خیال یہ ہے کہ اس ضعف و ناتوانی کی شدت کا سبب اس پوری جماعت کے لئے قحط کی وجہ سے مسلسل فاقہ کشی بھی تھی۔ چنانچہ خواجہ محمد لطیف صاحب لکھتے ہیں۔

"اس واقعہ کے مہینوں پہلے سے مدینہ میں قحط تھا۔ خرمے کی پوری فصل تباہ ہو گئی تھی۔ خوراک کی کمی تھی۔ کفار کے حملہ کی وجہ سے بیرونی رسد کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ مسلمانوں پر فقر و فاقہ کی کیفیت طاری تھی۔ اس پر تیز و تند ہوا چل رہی تھی۔ ابر و باراں بھی تھا۔ دن دن پر پتھریلی زمین کا کھودنا بڑے بڑے دلیروں کے کلیجے ہلے جا رہے تھے"۔

(اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد اول صفحہ ۱۱۱' ۱۱۲)

السلمان منا اهل البيت

بعض روایات کے مطابق یہی موقع خندق کھدنے کا وہ ہے جب حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب سلمان فارسیؓ رضوان اللہ علیہ کو وہ بیش بہا سند عطا فرمائی جس کا فخر صحابہ رسولؐ سے کسی دوسرے فرد کو حاصل نہیں ہوا۔ چونکہ جناب سلمانؓ بہت سے اہل الرائے کی طرح صرف رائے دے کر بری الذمہ نہیں ہو گئے بلکہ جب اس پر عمل ہوا اور پیغمبر خداؐ نے چالیس چالیس گز زمین دس دس ادمیوں کے ذمہ کی تو جناب سلمانؓ خود بھی خندق کھودنے والوں میں شریک ہوئے اور باوجود اپنی اس عمر طویل کے جس کا شمار بعض راویوں نے سینکڑوں کے حساب سے کیا ہے' وہ قوی ہیکل ایسے تھے اور پھر عزم' قوت ارادی اور اس سے بالا تر قوت ایمانی ایسی رکھتے تھے کہ جتنا کام دس آدمی مل کر کرتے تھے اتنا وہ اکیلے کر لیتے تھے تو مہاجرین اور انصار میں ان کے اپنانے میں مقابلہ ہونے لگا۔ مہاجرین

کہنے لگے کہ سلمانؓ ہم میں سے ہیں (کیونکہ وہ مدینہ کے باشندہ نہیں تھے۔ باہر ہی سے آئے تھے) اور انصار نے کہا' نہیں۔ سلمانؓ ہم میں سے ہیں (کیونکہ مہاجرین تو وہ ہیں جو کہ مکہ سے ترک وطن کرکے آئے ہیں اور ان میں جناب سلمانؓ داخل نہیں ہیں) اس بحث کو سن کر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
"سلمان منا اھل البیت" "سلمانؓ ہم اہل بیت میں سے ہیں"۔

(مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۲۳۰)

علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں آیت قل اللھم مالک الملک تو تی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء و تعز من تشاء و تذل من تشاء بیدک الخیر میں اس روایت کو درج کیا ہے اور اسے علامہ نوری نے حالات جناب سلمانؓ میں نقل کیا ہے۔

(نفس الرحمٰن' ط ایران صفحہ ۳۱)

مدینہ کا محاصرہ

مشرکین کی فوجیں مدینہ کے قریب پہنچیں تو سامنے خندق کھدی ہوئی پاکر اسی خندق کے کنارے پر صف آرا ہو گئیں اور ادھر سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی فوج کے ساتھ خندق کے اس طرف مقیم ہو گئے۔ بیس دن سے زیادہ دونوں طرف کے مورچے جمے رہے مگر سوا تیر اندازی اور سنگ باری کے کسی جنگ کی نوبت نہیں آئی۔

(اعلام الوریٰ)

جنگ کے نازک وقت بنی قریظہ کی عہد شکنی

یہ پہلے آچکا ہے کہ وہ یہودی جو مدینہ سے باہر نکالے جا چکے تھے اس جنگ کے اصل محرک تھے اور تمام مخالف اسلام عناصر کی یہ جتھے بندی انہیں کی کوشش سے ہوئی تھی مگر مدینہ میں ابھی جو ان کا قبیلہ بنی قریظہ نام کا باقی تھا وہ ابھی تک اپنے معاہدہ دوستی پر بظاہر قائم تھا اس لئے ایک حد تک مسلمانوں کو مدینہ کی اندرونی حالت سے اطمینان تھا مگر باہر کے یہودیوں نے کوشش شروع کر دی کہ انہیں بھی

وہ رسولؐ کی مخالفت پر آمادہ کریں اور انہوں نے مشرکین کو پہلے ہی اس کا اطمینان دلایا تھا کہ تم ادھر سے حملہ کرو تو ہم ذمہ دار ہیں کہ مدینہ کے اندر کے یہودی بھی تمہارا ساتھ دیں گے۔ جن میں ساڑھے سات سو جنگ آزما سپاہی موجود ہیں۔ اس بناء پر جب مکہ سے لشکر روانہ ہوا اور مدینہ کے قریب پہنچا تو ابو سفیان نے بنی نضیر کے سردار حیی بن اخطب کو وہ وعدہ یاد دلایا اور کہا کہ اب تم مدینہ میں جا کر بنی قریظہ کو تیار کرو اور ان سے اس معاہدہ کے توڑنے کا اعلان کرا دو جو ان میں اور رسول خداؐ میں ہو چکا تھا کہ جب مدینہ پر کوئی حملہ کرے گا تو مدینہ کے یہودی شہر کی حفاظت کی مہم میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔ (المغازی للواقدی صفحہ ۴۵۴)
چنانچہ حیی بن اخطب خفیہ طریقہ پر مدینہ گیا اور کعب بن اسد کے پاس جا کر جو بنی قریظہ کا سردار تھا اسے عہد شکنی پر آمادہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ پہلے تو کعب نے اس کے منصوبہ کا اندازہ کر کے اس سے ملنے سے بھی انکار کر دیا مگر وہ کسی طرح نہ ٹلا۔ آخر کو اس سے ملاقات کی اور قریش اور ان کے ساتھیوں کی طاقت کا ایسے مبالغہ آمیز طریقہ پر تذکرہ کیا اور اپنی کامیابی کے ایسے سبز باغ دکھائے کہ وہ بالآخر اس کے کہنے میں آگیا اور وہ تحریر منگوا کر جو حضرت پیغمبر خداؐ کے ساتھ معاہدہ کی دستاویز کے طور پر لکھی گئی تھی۔ حیی نے اپنے ہاتھ سے چاک کر دی اور باہر آ کر تمام بنی قریظہ میں اس کا اعلان کر دیا۔

(واقدی صفحہ ۴۵۶)

بعض افراد فطری حیثیت سے وہ ہوتے ہیں جنہیں دہشتناک خبریں پہنچانے کا خاص ذوق ہوتا ہے۔ جو خود ان کی ایک خاص قلبی کیفیت کا ترجمان ہوتا ہے۔ چنانچہ واقدی نے لکھا ہے۔

فبینا رسول اللّٰہ والمسلمون فی الخندق اتی عمر بن الخطاب الی رسول اللّٰہ و ھو فی قبتہ فقال یا رسول اللّٰہ بلغنی ان بنی قریظة قد نقضت العھد و حاربت فاشتد ذلک علیٰ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

" اس دوران میں جب رسول خدا اور دیگر مسلمان خندق میں تھے۔ (خلیفہ ثانی) عمر بن خطاب رسول خدا کے پاس آئے جبکہ آپ اپنے خیمہ کے اندر تھے اور کہا' یا رسول اللہ! مجھے اطلاع ملی ہے کہ بنی قریظہ نے معاہدہ توڑ دیا اور برسر جنگ ہو گئے ہیں۔ یہ خبر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بہت شاق گزری۔

حضرت نے کسی کو تحقیق حال کے لئے بنی قریظہ کی طرف بھیجنا چاہا تو انہوں نے ہی رائے دی کہ زبیر کو بھیجئے۔ چنانچہ زبیر جا کر حالات کا مشاہدہ کر کے واپس آئے اور بتایا کہ وہاں قلعہ کی حفاظت کے سامان ہو رہے ہیں اور لڑائی کی تیاری ہو رہی ہے۔ اب حضرت نے انصار میں سعد بن معاذ' سعد بن عبادہ اور اسید بن حضیر ایسے ممتاز افراد کو بلا کر انہیں اس کی اطلاع دی چونکہ یہ مدینہ کے معزز باشندہ ہونے کے لحاظ سے زمانہ قدیم سے روسائے یہود کے ساتھ برابر کے تعلقات رکھتے تھے' بالخصوص جناب سعد بن معاذ کے ان سے بڑے گہرے روابط تھے۔ اس لئے حضرت نے ان کو منتخب فرمایا کہ یہ ان سے جا کر بات چیت کریں اور صاف صاف ان کا عندیہ معلوم کریں۔ تاریخ کا بیان ہے کہ حضرت نے انہیں ہدایت فرمائی کہ اگر یہ بات کہ وہ برسر مخالفت ہیں غلط ثابت ہو تو آکر صاف صاف اعلان کر دینا ورنہ ایسے الفاظ میں کہنا کہ عام لوگ اسے سمجھ نہ سکیں۔ چنانچہ وہ لوگ گئے اور گفتگو کی کوشش کی مگر ادھر سے بجائے کسی سنجیدہ گفتگو کے فحش گالیوں سے ان کی تواضع کی گئی اور سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ ایسے معززین کو مغلظات گالیوں کے سننے کا تجربہ ہوا۔ مجبورا" یہ حضرات واپس آئے اور خاص رمزی الفاظ میں حضرت پیغمبر خدا تک حقیقت واقعہ پہنچائی تاکہ عام مسلمانوں کی اس خبر کے سننے سے ہمت پست نہ ہو۔ مگر ایسی خبر جو اتنے آدمیوں میں گردش کر چکی ہو راز کہاں رہ سکتی ہے۔ عموما" ایسا ہوتا کہ ہر ایک اپنے مخصوص آدمیوں سے اس طرح کہتا ہے کہ دیکھو' یہ راز ہے' ظاہر نہ ہونے پائے۔ پھر ان میں سے ہر ایک نے اپنے مخصوص شخص یا اشخاص سے کہا۔ اس طرح

کجا ماند نہاں رازے کزو سازند محفلہا

رفتہ رفتہ وہ خبر بالکل عام ہو جاتی ہے چنانچہ یہی ہوا کہ دوسرے ہی دن سارے مسلمانوں میں یہی چرچا تھا اور اب مسلمانوں کے خوف و دہشت کا وہ عالم تھا جس کا اظہار ہمارے لئے تو اپنے الفاظ میں ممکن بھی نہیں تھا اور شاید کچھ لوگ اسے مبالغہ پر بھی مبنی سمجھتے کہ بھلا "غازیان اسلام" اور ان کا یہ عالم! مگر کیا کیا جائے کہ قرآن مجید اپنے معجزانہ الفاظ میں اس کی پوری عکاسی کر رہا ہے۔

مجاہدین اسلام پر دشمن کی ہیبت کا منظر قرآنی الفاظ میں

سورہ احزاب میں ارشاد ہوتا ہے۔

اذ جاء و کم من فوقکم و من اسفل منکم و اذ زاغت الابصار و بلغت القلوب الحناجر و تظنون باللّٰہ الظنونا ھنالک ابتلی المومنون و زلزلوا زلزالا شدیدا

(آیت ۱۰ - ۱۱)

وہ عالم یاد کرو جب دشمن تمہارے اوپر سے آئے اور تمہارے نیچے کی جانب سے اور تمہاری آنکھیں پھر گئیں اور دل منہ کو آ گئے تھے اور تم اللہ کی نسبت طرح طرح کی بدگمانیاں کر رہے تھے یہ موقع مسلمانوں کے لئے بڑا آزمائش تھا اور وہ سخت زلزلہ سے تہ و بالا ہو رہے تھے۔

ظاہر ہے کہ دو ایک آدمیوں کی یہ حالت ہو تو وہ اس طرح بیان کرنے کی مستحق بھی نہیں ہو سکتی۔ انداز کلام بتا رہا ہے کہ مسلمانوں کا عام طور پر عالم یہی تھا جس سے بری بس کچھ مستثنیٰ اکائیاں ہی ہو سکتی ہیں۔ واقدی نے لکھا ہے۔

فکان ابوبکر الصدیق یقول لقد خفنا علی الذراری بالمدینۃ من بنی قریظۃ اشد من خوفنا من قریش و غطفان ولقد کنت اوفی علیٰ سلع فانظر الی بیوت المدینۃ فاذا ارایتھم ھادئین حمدت اللّٰہ عز و جل

حضرت ابوبکر کا بیان تھا کہ ہمیں اب سامنے والے دشمن سے زیادہ اپنے اہل و عیال کے لئے جو مدینہ میں تھے بنی قریظہ سے خوف ہو گیا تھا اور میں سلع

پہاڑی پر چڑھ چڑھ کے مدینہ کے مکانوں پر نظر ڈالتا تھا اور جب وہاں سکون پاتا تھا تو خدا کا شکر ادا کرتا تھا۔

نعرہ تکبیر کا رعب

اب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے ساتھ کے مسلمان تو خندق کے پاس سے ہٹ کر جا نہیں سکتے تھے۔ ان دشمنوں کی وجہ سے جو سامنے صف آراء تھے لہٰذا آپ نے سلمہ بن اسلم اشہلی کو دو سو آدمیوں کے ساتھ اور زید بن حارثہ کو تین سو آدمیوں کے ساتھ مقرر کیا کہ وہ دو جانب سے مدینہ کی طرف صدائے تکبیر بلند کرتے ہوئے جایا کریں تاکہ گھروں میں رہنے والے مسلمانوں کو اس سے ڈھارس ہو اور دشمن محسوس کریں کہ یہ بے سہارا نہیں ہیں۔ ظاہری اسباب میں یہ تدبیر وہ تھی جس سے بنی قریظہ کو اندر سے حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

(کتاب المغازی للواقدی صفحہ ۴۶۰)

رو داد جنگ

مستند مورخین کے بیانات کی روشنی میں یہ پتہ چلتا ہے کہ جنگ خندق با اعتبار اپنی روداد کے نام ہے صرف ایک فرد یعنی حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے کارنامہ کا جس کی تفصیل ابھی آپ کے سامنے آئے گی۔

مسٹر کے۔ اے حمید بی۔ اے (لندن) بیرسٹر ایٹ لاء لاہور جنہوں نے تاریخ اس صنعت میں لکھی ہے کہ حتی الامکان حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کا کوئی کارنامہ نمایاں نہ ہونے پائے۔ انہیں بھی ضمیر کے دباؤ سے آپ کا نام تو لینا پڑا ہی ہے مگر انہوں نے روداد جنگ کو اجمال کے پردہ میں چھپا کر آپ کی اس انفرادیت کا پردہ ڈالا ہے جس کا نمایاں ہونا جنگ کے واقعی روداد لکھنے کی صورت میں یقینی تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

بیس دن تک دشمنوں نے مدینہ کا محاصرہ رکھا لیکن باوجود انتہائی کوشش کے وہ

شہر میں داخل نہ ہو سکے۔ فرداً" فرداً" لڑائیاں ہوتی رہیں جن میں کبھی کفار کامیاب ہوتے کبھی مسلمان۔ حضرت علیؑ نے مردانگی کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ قریش دنگ رہ گئے"۔

اسے انہوں نے غالباً" شاہ عبدالحق کے یہاں سے لیا ہے انہوں نے بھی روداد جنگ خندق کچھ اسی انداز سے لکھی ہے چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

مشرکاں می آمد ند و قصد خیمہ آں حضرت می کردند و لیکن مجال ندا شتند کہ از خندق بگزرند۔ القصہ محاربہ و مقاتلہ میان دو لشکر واقعہ شد خصوصاً" از علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ دریں غزا مبارزہ ہا و مقاتلہ ہا واقع شد از حد قیاس بیروں چنانکہ در اخبار وارو شدہ است لمبارزة علی بن ابی طالب یوم الخندق افضل من اعمال امتی الٰی یوم القیامة کذا فی روضة الاحباب

(مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۲۳۳۔ ۲۳۴)

مشرکین آتے تھے اور آنحضرتؐ کے خیمہ تک پہنچنے کا قصد کرتے تھے لیکن انہیں ممکن نہیں ہوتا تھا کہ خندق کو پار کریں۔ خلاصہ یہ ہے کہ دونوں فوجوں میں جنگ و پیکار وقوع میں آئی خصوصیت کے ساتھ حضرت علی مرتضیٰ سے اس جنگ میں ایسے ایسے مقابلے ہوئے اور لڑائیاں وقوع میں آئیں جو تصور کے حدود سے باہر ہیں جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ علیؑ بن ابی طالبؑ کی جنگ بروز خندق قیامت تک کے میری امت کے اعمال سے بہتر ہے۔ ایسا ہی روضتہ الاحباب میں مذکور ہے۔

مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب مسلمانوں کا لشکر خندق کے ادھر تھا' یہ اسے پار کرکے ادھر نہیں جا سکتا تھا اور مشرکین کا لشکر ادھر تھا' وہ اسے پار کرکے ادھر نہیں آ سکتا تھا تو فرداً" فرداً" لڑائیاں یا دونوں لشکروں میں "محاربہ و مقاتلہ" کوئی بھی صورت ہوئی کیونکر؟

میری جہاں تک قدیم ماخذوں پر نظر ہے۔ مجھے وقتاً" فوقتاً" تیر اندازی و سنگباری کے علاوہ جس کی نوعیت وہی تھی جسے اس وقت نہر سویز کے ادھر اور ادھر

سے آج کل مصر اور اسرائیل کے درمیان اکثر گولہ باری کا تبادلہ ہو جایا کرتا ہے۔ باقی فردا" فراد" "لڑائیاں" کیسی، اس دوران میں ایک لڑائی یا "ما بین دو لشکر" کسی بھی محاربہ و مقاتلہ کے وقوع کا پتہ نہیں ملتا بلکہ مورخین نے تصریح کی ہے کہ خندق کے بیچ میں حائل ہونے کی وجہ سے کسی جنگ کی نوبت ہی نہ آئی۔ چنانچہ ابن الوردی نے لکھا ہے۔

اقام المشرکون بضعا و عشرین لیلة و رسول اللّٰہ مقابلھم لیس بینھم قتال غیر المر آماۃ باللیل ثم خرج عمرو بن عبدود

(تاریخ ابن الوردی جلد ا صفحہ ۱۴۲)

مشرکین نے بیس شب و روز سے زیادہ قیام کیا اور رسول خداؐ ان کے مقابلے پر جمے رہے اور ان کے درمیان اس عرصہ میں کوئی جنگ نہ ہوئی سوا تیر اندازی کے۔ پھر عمرو بن عبدود میدان میں نکلا۔

ابن خلدون تحریر کرتے ہیں۔

دام الحصار علی المسلمین قریبا" من شھر و لم تکن حرب۔ و تمادی الامر فظھرر فوارس من قریش الی الخندق فیھم عکرمة بن ابی جھل و عمر و ابن عبدود

(تاریخ ابن خلدون، جلد ۲ صفحہ ۷۷۵)

مسلمان ایک مہینے کے قریب محصور رہے اور کسی جنگ کی نوبت نہیں آئی اور اس سلسلے نے طول کھینچا یہاں تک کہ کچھ شہسوار قریش کے خندق سے اس طرف آ گئے جن میں عکرمہ بن ابی جہل اور عمرو بن عبدود (وغیرہ) تھے۔

اسماعیل ابو الفداء کے بالکل وہی الفاظ ہیں جو ابن الوردی کے تھے۔

(تاریخ ابو الفدا جلدا صفحہ ۱۴۲)

طبری رقم طراز ہیں۔

فا قام رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و اقام المشرکون علیہ بضعا و عشرین لیلة قریبا من شھر و لم یکن بین القوم حرب الا الرمی

بالنبل والحصا

(تاریخ طبری، ط مصر ۱۹۶۱ء جلد ۲ صفحہ ۵۷۲)

تو حضرت پیغمبر خدا نے قیام فرمایا اور مشرکین بھی قیام پذیر رہے۔ بیس شب و روز سے زیادہ تقریباً" ایک مہینے اور ان لوگوں کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہو رہی ہے سوا تیروں اور پتھروں کے پھینکنے کے۔

پھر اس کے بعد دوسرے صفحہ پر ہے۔

فا قام رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و عدو هم محاصرو هم لم یکن بینهم قتال

(تاریخ طبری، ط مصر ۱۹۶۱ء جلد ۲ صفحہ ۵۷۲)

رسول خدا نے قیام فرمایا اور دشمن اب سب کو اپنے گھیرے میں لیے رہے بس اس کے سوا ان کے درمیان کوئی جنگ نہ تھی۔

حافظ ذہبی نے اپنی کتاب "العبر فی خبر من غبر" میں لکھا ہے۔

لم یکن فیها الا رمی بالنبل و مصابرة اکثر من عشرین یوما و خرج للمبارزة عمرو بن عبد ود

(العبر، مطبع کویت جلد ۱ صفحہ ۷)

اس معرکہ میں بس تیر اندازی ہوتی رہی اور قوت برداشت کا مقابلہ بیس دن سے زیادہ رہا اور اب جنگ کرنے کے لئے عمرو بن عبدود نکلا۔

تلاش کی جائے تو اور مورخین کے یہاں بھی یہ صراحت موجود ملے گی۔

معرکہ خندق اکیلے علیؑ کا کارنامہ ہے

اس جنگ میں لڑائی جو ہوئی ہے وہ بس ایک ہے اور اسی کو تمام مورخین نے درج کیا ہے اور وہ حضرت علیؑ کا کارنامہ ہے اور اسی پر یہ جنگ ختم ہو گئی ہے۔اس کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

جنگ بدر میں مشرکین قریش کے بڑے بڑے سرداروں کے خاتمہ اور احد میں ان کے علم داروں کے ستھراؤ کے بعد اب مشرکین مکہ کے پاس صرف ایک سورما باقی تھا جس سے امید وابستہ کی جا سکتی تھی۔ وہ عمرو بن عبدود بن ابی قیس تھا عامر بن لوی بن غالب کی نسل سے جو قریش میں سے بنی عامر کہلاتی تھی اور اس لئے اس کے نام کے ساتھ عامری کا لفظ آتا ہے وہ بدر کے معرکہ میں موجود تھا مگر اس دن جنگ میں بہت زخمی ہو گیا تھا تو پھر احد میں شریک نہیں ہوا۔ اب خندق میں وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوا اور اس نے اپنے سر پر ایک نشان لگا رکھا تھا جس سے اس کا امتیاز نمایاں رہے۔

(طبری، طبع مصر ۱۹۶۱ء جلد ۲ صفحہ ۵۷۲)

عمرو ابن عبدود کی دھاک

راتوں کو تیر اندازی کے جو معرکے ہوتے تھے ان میں بھی اس کا نام آیا ہے کہ اکثر وہ خندق کے پاس آکر اپنے حوصلہ نبرد آزمائی کا مظاہرہ کرتا تھا اور خندق کے بیچ میں حائل ہونے کے باوجود جب وہ خندق کے پاس آ جاتا تھا تو مسلمانوں میں تلاطم پڑ جاتا تھا کہ عمرو بن عبدود آگیا ہے اور اکثر رسول خدا کو سوتے سے جگا دیا جاتا تھا اور آپؐ کو مسلمانوں کی ڈھارس کے لئے بلا وجہ اس شب تار میں خندق کے پاس تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمانا پڑتی تھی۔

(المغازی للواقعدی)

اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک خطرہ مسلمانوں کے دل میں برابر یہ قائم تھا کہ کہیں عمرو بن عبدود وغیرہ خندق کو پار کرکے ادھر نہ آ جائیں ورنہ وہ لوگ خندق کے پار سے تیر اندازی کرتے رہتے اور ان میں سے کچھ لوگ تیر برسا دیا کرتے۔ یہ راتوں کو پریشانی کے ساتھ مضطرب ہونے کی کیا وجہ تھی؟

اس کے علاوہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ عمرو ان راتوں میں برابر اس طولانی خندق میں ایسے مقام کی تلاش میں لگا ہوا تھا جس کا پار کرنا کسی شہسوار کے لئے ممکن ہو اور آخر اس نے ایک جگہ تجویز کر لی اور پھر اس رات کو جس کی صبح ہونے پر اس

نے یہ فیصلہ کن اقدام کیا جس کا ذکر ابھی آئے گا' اس نے کئی چوٹی کے پہلوانوں سے اس کا ذکر کرکے انہیں اپنے ساتھ متفق کیا۔

اس سے یقیناً اس کی بہادری کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور یہ کہ اس طولانی محاصرہ کی دور دور سے بے نتیجہ تیر اندازی نے اس کے جذبات میں گھٹن کا سا احساس پیدا کر دیا تھا اور اب وہ بے چین تھا کہ کسی طرح سے مختتم مقابلہ ہو جائے اور اب آج کا دن اس نے طے کر لیا تھا اور ان پہلوانوں کو اس نے اپنے منصوبہ سے آگاہ کر کے اپنے ساتھ تیار کر لیا تھا۔

عمرو کے علاوہ ان پہلوانوں کے نام تاریخ میں حسب ذیل ملتے ہیں۔

(۱) عکرمہ بن ابی جہل مخزومی

(۲) ضرار بن خطاب قبیلہ بنی محارب میں سے

(۳) ہبیرہ بن ابی وہب مخزومی

(۴) نوفل بن عبداللہ

(۵) مرداس

بعض تاریخوں میں مرد اس کا نام الگ نہیں ہے بلکہ ضرار کا نسب اس طرح لکھا ہے کہ "ضرار بن خطاب بن مرداس۔

ان سب نے آج یہ طے کر لیا تھا کہ آج ہمیں اس جنگ کا وارا نیارا کرنا ہے چنانچہ یہ لوگ اسلحہ جنگ سے آراستہ ہو کر گھوڑوں پر سوار نکلے تو قبیلہ کنانہ کی صفوں کی جانب سے گزرے اور کہنے لگے "اے کنانہ کے بہادرو! تیار ہو جاؤ۔ آج تمہیں معلوم ہو گا کہ شہسوار کون ہوتے ہیں"۔

(طبری طبع مصر ۱۹۶۱ء جلد ۲ صفحہ ۲۷۲)

چنانچہ ان فوجیوں کا دل بھی تیار ہو گیا اور ان کے پیچھے روانہ ہوا اور وہ چند دلیر اپنے گھوڑوں پر سوار آ کر خندق پر منڈلانے لگے۔غالباً" اس جگہ کی تلاش میں جہاں انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ چوڑان کم ہے اور گھوڑوں کو پھندا کر اس پار پہنچ جانا ممکن ہے مگر زیادہ حصہ خندق کا اتنا وسیع تھا کہ اس کا پار کرنا غیر ممکن معلوم

ہو رہا تھا اور اس وجہ سے انہیں جناب سلمانؓ پر غصہ آ رہا تھا کہ یہ انہی کی بتائی ہوئی ترکیب ہے چنانچہ اس موقع پر ان کی زبان پر یہ جملہ تھا۔

هذه مكيدة ما كانت تعرفها- العرب

(طبری جلد ۲ صفحہ ۵۷۳)

یہ اس طرح کی تدبیر ہے جسے عرب نہیں جانتے تھے۔

عمرو بن عبدود خندق پار کرتا ہے

پھرتے پھرتے وہ جگہ انہیں مل گئی جہاں خندق کا عرض کچھ کم تھا اور ایک مرتبہ انہوں نے اپنے گھوڑوں کو چابک مارے تو عربی گھوڑے جست کرکے خندق کے اس پار پہنچ گئے۔

(اعلام الوریٰ)

ظاہری حیثیت سے دیکھا جائے تو بہادری کے جوش میں انہوں نے یہ انتہائی حماقت کا کام کیا تھا۔ اس لئے کہ اس طرح وہ گنتی کے آدمی اپنی پوری فوج سے کٹ کر الگ ہو گئے تھے کیونکہ وہاں کوئی تختے تو ایسے موجود نہ تھے جنہیں وہ خندق پر پل کی طرح رکھ کر اپنی پوری فوج کو اس پر سے گزار سکیں۔ اس طرح وہ اب بس چار پانچ آدمی ہی تھے اور ادھر مسلمانوں کا پورا لشکر تھا۔ اگر یہ سب نہتے ہی دوڑ پڑتے تو دو چار سپاہیوں کو پیس ڈالنے کے لئے ان کی یورش ہی کافی ہو سکتی تھی۔ مگر کیا کیا جائے کہ اس پوری فوج پر اس اکیلے عمرو بن عبدود کی ہیبت بری طرح چھائی ہوئی تھی جس میں اس کی اس حیرت انگیز غیر معمولی جرات نے کہ اس نے خندق کو پار کرنے کی ہمت کس طرح کی۔ اس وقت خاص طور پر اضافہ کر دیا تھا اس لئے پوری مسلم فوج ہکا بکا ہو کر بس دیکھ رہی تھی جیسے سن ہو گئی ہے۔ اس وقت کا ان کا عالم جو تھا اس کی مرقع کشی کے لئے تاریخ کے یہ الفاظ کافی ہیں۔

عمر بن عبدود کے رعب سے مسلم فوج کی حالت

والاصحاب ساکنون کانما علٰی رؤوسھم الطیر

(تاریخ خمیس، جلد ۱ صفحہ ۴۸۶)

تمام اصحاب بے حس و حرکت تھے جیسے ان کے سروں پر طائر بیٹھے ہوں۔

یعنی "جیسے وہ ذرا بھی سر کو جنبش نہیں دینا چاہتے تھے کہ کہیں یہ طائر پرواز نہ کر جائیں"۔

عمرو بن عبدود کتنا ہی بہادر سہی مگر اس وقت اس نے اپنی تمام عمر کا سب سے بڑا جوا کھیلا تھا جس میں اپنی زندگی اور زندگی بھر کی شہرت داؤ پر لگا دی تھی۔ اسے فطری طور پر یہ اندیشہ ہونا چاہئے تھا کہ ہم دو چار آدمیوں پر چاروں طرف سے مسلمانوں کی یلغار ہو گئی تو کیا ہوگا؟ مگر اب جو اس نے یہ سکون و سکوت کا عالم دیکھا تو اس کی ہمت بڑھی اور اس نے للکار کر اپنے مقابلے کی دعوت دی۔

عمرو کے مقابلہ میں علی کی للکار

پیغمبر خدا کے پاس حضرت علیؑ موجود تھے۔ انہوں نے جو آواز سنی تو فوراً کہا۔

انا لہ یا رسول اللّٰہ میں یا رسول اللہؐ اس سے مقابلہ کروں گا۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسرے مسلمانوں کو موقع بھی دینا چاہتے تھے اور پھر آپ کو معلوم تھا کہ عمرو بن عبدود کی نسبت "جہاں دیدہ" اور "تجربہ کار" اصحاب کے کیا تاثرات ہیں اور کیسے کیسے مشاہدات دہرائے جا رہے ہیں جس سے تمام فوج اسلام کے لئے وہ ایک بہت بڑا "ہوا" بن گیا ہے۔ ہو سکتا تھا کسی کو یہ تصور ہوتا کہ علیؑ چونکہ کمسن ہیں۔ یہ عمرو بن عبدود کی شخصیت سے واقف نہیں ہیں اور انہوں نے نوجوانی کے الڑپن میں جیسے بے سمجھے یہ بات کہہ دی۔ ان تمام حالی تصورات اور امکانی خیالات کے پیش نظر پیغمبر خدا نے بڑے معنی خیز انداز میں فرمایا۔ احبس انہ عمرو بیٹھ (جانتے بھی ہو؟) وہ عمرو ہے۔

عمرو کا مسلمانوں کی مذہبی غیرت کو چیلنج

اتنی دیر میں عمرو کی ہمت اور بڑھ چکی تھی۔ اب اس نے مسلمانوں کے ایمان بالآخرت اور عقیدہ بہشت و دوزخ پر طنز شروع کر دیا۔ اس نے کہا۔

این جنتکم التی تزعمون انه من قتل منکم دخلها افلا تبر زون الی رجلا

کہاں ہے وہ تمہارا بہشت جس کے لئے تمہارا خیال ہے کہ جو تم میں سے قتل ہو وہ اس میں داخل ہوگا تو پھر اس وقت میری طرف کسی کو بھیجتے کیوں نہیں؟

پھر علیؑ بے قرار ہو کر اٹھے اور رسولؐ نے وہی جملہ کہا۔ تیسری مرتبہ جب عمرو نے پھر آواز دی اور علیؑ پھر اٹھے اور پیغمبرؐ نے وہی جملہ کہا تو حضرت علیؑ بولے۔

و ان کان عمرا"۔ ارے عمرو ہے تو وہ ہوا کرے

اب جو مقصد رسولؐ کا اس توقف سے تھا وہ حاصل ہو چکا تھا۔ اب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اجازت دی۔

(تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۸۶)

علم رسالت و امامت الگ چیز ہے۔ عام نظام اسباب کے ماتحت رسول اور امام ہر شے سے وہی اثر قبول کرتے تھے جو ظاہری اسباب کا تقاضا ہے۔ اس لئے کوئی موقع ایسا جو خطرناک ہو اس سے خطرہ کا احساس ہونا کوئی غلط چیز نہیں مگر بلند مقاصد کی خاطر اس خطرہ کو قبول کیا جاتا ہے۔ اس کا نام ہوتا ہے "قربانی"

عمرو بن عبدود سے جب کہ عام طور پر ہر شخص خطرہ محسوس کر رہا تھا تو رسولؐ کو خطرہ کا احساس نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا اس احساس کے باوجود وہ اپنے گود کے پالے کو بھیج رہے تھے تاکہ عزت حق کی حفاظت ہو۔ چنانچہ اس وقت رسولؐ کے اہتمام اور بارگاہ الہی میں تضرع و التجا کی کیفیت بھی بالکل وہی تھی جو ایک ایسے خطرہ کے احساس کے وقت اللہ سے لو لگانے والے انتہائی مخلص بندہ کی ہونا چاہئے۔

جنگ کے لئے علیؑ کو اسلحہ پہنا کر رسولؐ دعا کرتے ہیں۔

تاریخ کے الفاظ یہ ہیں۔

لما اذن رسول اللّٰہؐ لعلی اعطاہ سیفه ذا الفقار والبسه ذرعه الحدید و عممه بعمامته و قال اللهم اعیه علیه و فی روایة انه رفع عمامته الی السماء و قال الهی اخذت عبیدة منی یوم بدر و حمزه یوم احد و هذا علی اخی و ابن عمی فلا تذرنی فرداً وانت خیر الوارثین۔

(تاریخ خمیس، جلد ۱ صفحہ ۴۷۷)

جب پیغمبر خدا نے علیؑ کو اجازت دی تو اپنی تلوار ذوالفقار انہیں عطا فرمائی اور اپنی خاص زرہ ان کے زیب تن کی اور اپنا عمامہ ان کے سر پر باندھا اور کہا پروردگارا اس کے خلاف اس کی مدد فرما اور ایک روایت میں ہے کہ حضرتؐ نے اپنا عمامہ آسمان کی طرف بلند کیا اور کہا اے خدا، تو نے عبیدہ کو مجھ سے بدر کے دن لے لیا اور حمزہ کو احد کے دن۔ اب یہ ایک علیؑ ہے جو میرا بھائی اور میرے چچا کا فرزند ہے تو اب تو مجھے اکیلا نہ چھوڑنا اگرچہ تو بہترین ذات ہے جو سب کے بعد باقی رہنے والی ہے۔

رسولؐ کا اس آیت کو پڑھنا کہ لا تذرنی فرداً وانت خیر الوارثین یہ بتلاتا ہے کہ پیغمبرؐ انہیں مثل اپنی اولاد کے سمجھتے تھے اور یہ بھی کہ آپ اپنا تنہا مدد گار عالم امکان میں اب اس ذات کو جانتے تھے۔

علامہ طبری رحمہ اللہ نے اس محل پر غیر معمولی اختصار سے کام لے کر صرف اتنا لکھ دیا کہ۔

فبرز الیه علی علیه السلام فقتله (اعلام الوریٰ)

حضرت علیؑ نے اس کے مقابلہ میں نکل کر اسے قتل کر دیا۔

بعض اور مورخین نے بھی مجملا اتنا ہی لکھ دیا ہے کہ

قتل علی بن ابی طالب عمرو بن عبدود (تاریخ ابن خلدون جلد ۲ صفحہ ۷۷۵)

علیؓ بن ابی طالبؓ نے عمرو بن عبدود کو قتل کر دیا۔

خرج المبارزة عمرو بن عبد و د فبارزه علی رضی اللّٰہ عنه و قتله

(العبر فی خبر من غبر للحافظ الذہبی' طبع کویت جلد ۱ صفحہ ۷)

عمرو بن عبدود جنگ کے لئے نکلا تو حضرت علیؓ نے اس سے مقابلہ کیا اور اسے قتل کر دیا۔

مگر ظاہر ہے کہ اتنے بڑے مرد جنگی کا قتل ہو جانا اتنی سی مختصر بات نہ تھی۔ لہٰذا دوسرے مورخین اہل سنت نے اسے کافی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے مگر بیانات ان کے کچھ الجھے ہوئے سے ہیں۔

بعض مورخین لکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ آگے بڑھے تو کچھ اور مسلمان فوجی بھی آپ کے ساتھ ہو لیے آپ نے ان لوگوں کو اس تنگ راستے پر کھڑا کیا جہاں سے یہ لوگ آئے تھے اور عمرو بن عبدود اور اس کے ساتھی گھوڑے دوڑاتے ہوئے ان کی طرف آئے۔

(طبری' ط مصر ۱۹۶۱ء جلد ۲ صفحہ ۵۶۷ پہلا ایڈیشن مطبع حسینیہ مصر' جلد ۳ صفحہ ۴۸)

کل ایمان اور کل کفر کا مقابلہ

حضرت علیؓ بڑھ کر عمرو کے سامنے آ گئے اس نے پوچھا تم کون ہو؟ فرمایا علیؓ! اس نے کہا' عبد مناف کی نسل سے؟ کہا' ہاں میں علیؓ بن ابی طالبؓ ہوں۔ وہ کہنے لگا' اے میرے بھتیجے' تمہارے چچاؤں میں سے کوئی جو تم سے زیادہ سن دار ہو میرے مقابلہ کو آئے۔ مجھے تمہارا خون بہانے سے ناگواری محسوس ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا' مگر مجھے بخدا تیرے خون کے بہانے سے کوئی ناگواری محسوس نہیں ہوتی۔ بس یہ سن کر اسے طیش آ گیا اور اس نے اپنی تلوار کھینچ لی جو آگ کا شعلہ معلوم ہوتی تھی (تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۸۷) اور غصہ میں اپنے گھوڑے کے پیروں پر ماری تو چاروں پیر اس کے کٹ گئے اور پھر آپ کی جانب بڑھا۔

(ابن الوردی جلد ۱ صفحہ ۱۴۲ ابوالفدا جلد ا صفحہ ۱۸۰)

طبری کی روایت ہے کہ آپ نے اس سے کہا کہ تم نے تو اللہ سے عہد کیا

ہے کہ قریش کا جو آدمی تمہارے سامنے کوئی دو خواہشیں پیش کرے گا تو تم ان میں سے ایک کو ضرور منظور کر لو گے۔ اس نے کہا بے شک' حضرت علیؓ نے کہا' اچھا تو پہلے میں تمہیں اللہ اور اس کے رسولؐ اور اسلام کی طرف دعوت دیتاہوں۔ اس نے کہا مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے کوئی اور بات کہو۔ آپ نے کہا بس پھر دوسری بات یہ ہے کہ میدان میں اتر پڑو مقابلہ ہو جائے اس پر اس نے کہا کہ مجھے تمہارا قتل کرنا ناگوار ہے اور حضرت علیؓ نے کہا' مجھے تو تمہارا قتل کرنا ناگوار نہیں ہے۔ یہ سن کر عمرو کو تاؤ آگیا اور وہ بے تحاشا گھوڑے پر سے پھاند پڑا اور تلوار سے اس کے پیر قطع کر دیئے یا وہ تلوار اس کے منہ پر لگا دی اور حضرت علیؓ کے سامنے آگیا۔

(طبری طبع مصر ۱۹۶۱ء جلد ۲ صفحہ ۵۶۷ طبع اول جلد ۳ صفحہ ۴۸)

دیار بکری کی درج کردہ روایت میں ہے کہ جو دو باتیں آپ نے پیش کی تھیں ان میں سے پہلے تو وہی تھی کہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں اور جب اس نے کہا مجھے اس کی ضرورت نہیں تو آپ نے فرمایا کہ اچھا دوسری بات یہ ہے کہ واپس چلے جاؤ اور اپنے گھر میں جا کر بیٹھو۔ اس نے کہا' یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ عرب کی عورتیں طعنہ نہ دیں گی کہ میں میدان میں آیا اور پھر بھاگ کر واپس آگیا۔ آپ نے کہا تو پھر اب یہی رہ جاتا ہے کہ بڑھو' جنگ ہو جائے۔ اس پر اس نے کہا مجھے تمارا قتل کرنا پسند نہیں ہے۔ آپ نے کہا' اب مجھے تو تمہارا قتل کرنا بالکل پسند ہے۔ یہ سن کر اس میں گرمی پیدا ہو گئی۔ وہ اپنے گھوڑے سے کود پڑا اور تلوار کھینچ کر اس کے پیر قطع کیے اور دوسری ضرب اس کے منہ پر لگائی۔ پھر حضرت علیؓ کی طرف آیا۔

(تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۸۷)

حضرت علیؓ کی خصوصیات

دوسری جنگوں کا حال دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ حضرت علیؓ ابن ابی طالبؓ کے مقابلہ میں عرب کا کوئی سورما کبھی دیر تک نہیں ٹک سکا۔ بلکہ ادھر جنگ شروع

ہوئی اور بس پہلے ہی وار میں اس کا فیصلہ ہو گیا۔ چنانچہ آپ کی یہ خصوصیت مشہور ہے کہ۔

کانت ضرباته ابکارا اذا اعتلی قد و اذا اعترض قط

اپ کی ضربیں یکتا ہوتی تھیں جب سر پر تلوار لگاتے تو لمبائی میں کاٹ دیتے تھے۔ اور جب پہلو پر لگاتے تھے تو چوڑان میں دو ٹکڑے کر دیتے تھے۔

مگر عمرو بن عبدود ایک وہ جنگ آزما ہے جو حضرت علیؑ کے مقابلہ میں دیر تک ٹھہرا رہا اور بہت سے واروں کے ادھر ادھر سے تبادلہ کی صورت پیدا ہوئی۔

جنگ کے پورے کیفیات تاریخ میں درج نہ ہونے کے باوجود جو درج ہو بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ غبار کی شدت سے کوئی ان دونوں مردان جنگ کی نقل و حرکت دیکھ ہی نہ رہ تھا۔ پھر بھی تاریخ نے بالاجمال بھی جو جنگ کا حال لکھا ہے وہ مذکورہ بالا حقیقت کو نمایاں کرنے کے لئے کافی ہے۔

دشمن دین کا قتل

اس سلسلہ میں سب سے مختصر الفاظ یہ ہیں۔

فتناز لا وتجادلا فقتله علی علیه السلام

(تاریخ طبری پہلا ایڈیشن مطبوعہ مطبع حسینیہ مصر جلد ۲ صفحہ ۴۸ جدید ترین ایڈیشن ۱۹۶۱ء صفحہ ۵۷۴)

دونوں بہادر میدان میں اترے اور جولانی کرتے رہے جس کے نتیجہ میں حضرت علیؑ نے اسے قتل کر دیا۔

اس سے بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک دم قتل نہیں ہو گیا بلکہ کچھ دیر ردوبدل ہوتی رہی اور مقابلہ جاری رہا۔

اس سے زیادہ الفاظ یہ ہیں۔

فتقاتلا و تجاولا و علاهما غبرة و سمع المسلمون التکبیر فعلموا ان علیا قتله و انکشفت الغبرة و اذا علی علٰی صدره یذبحه

(ابن الوردی، جلد ۱ صفحہ ۱۳۲ ، ابوالفدا جلد ۱ صفحہ ۱۳۲)

دونوں نے باہم جنگ کی اور جولانی کرتے رہے اور ان دونوں پر غبار چھا گیا اور مسلمانوں نے تکبیر کی آواز سنی تو سمجھے کہ حضرت علیؑ نے اسے قتل کر دیا اور غبار ہٹا تو یہ نظر آیا کہ حضرت علیؑ اس کے سینہ پر سوار اس کا سر تن سے اتار رہے ہیں۔

شیخ حسین بن محمد حسن دیار بکری رقمطراز ہیں

ثم اقبل نحوه فاستقبل علی رضی اللّٰہ عن بدرقنه فضربه عمرو فیها فقدها و اتبت فیها اسیف و اصاب راسه فشجه و ضربه علی علٰی حبل العاتق فسقط و ثار العجاج و سمع رسول اللّٰہ التکبیر فعرف ان علیاً قتله

تاریخ خمیس جلد صفحہ ۴۸۷)

سابق گفتگو ختم ہونے کے بعد اس نے آپ کی جانب رخ کیا تو حضرت علیؑ سپر لیے ہوئے اس کے مقابلہ پر آئے مگر عمرو نے تلوار جو لگائی وہ سپر کو کاٹتی ہوئی آپ کے سر تک پہنچ گئی اور زخمی کر دیا اور اب حضرت علیؑ نے اسپر وار کیا تو تلوار اس کے کندھے پر پڑی جس سے وہ گر گیا اوز غبار بلند ہوا اور رسول خداؐ نے تکبیر سنی تو سمجھے کہ حضرت علیؑ نے اس کو قتل کر دیا۔

بہرحال ان کے بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ انہی دو ضربوں کی بس ردوبدل ہوئی ورنہ غبار جنگ کے اتنے بلند ہونے کے کوئی معنی نہیں بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ انہوں نے جنگ کی کیفیت اور طولانی ردوبدل میں سے ان دو ضربوں کا تذکرہ کیا جن کا اثر بعد میں سامنے آگیا۔ یعنی حضرت علیؑ کا زخمی ہونا اور دوسرے حریف کا قتل ہو جانا بے شک دوسرے مورخین سے تعجب ہے کہ انہوں نے اس اہم واقعہ کو کہ آپ زخمی ہو گئے کیوں نظر انداز کر دیا جب کہ وہ یقینی طور پر ثابت ہے اور اس ردوبدل کی شدت کا جسے دوسری مورخوں نے لکھا تھا۔ انہوں نے کیوں ذکر نہیں کیا جبکہ صورت حال کی بناء پر وہ بھی یقیناً درست ہے۔

عمرو کے دوسرے ساتھیوں کا فرار

یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ عمرو کے ساتھ چند دوسرے منچلے بھی ادھر کے خندق پار آ گئے تھے جن میں تاریخ نے چند ناموں کو محفوظ کیا ہے، عکرمہ بن ابی جہل ہبیرہ بن وہب اور ضرار بن خطاب وغیرہ، مگر حقیقت میں یہ کوئی مستقل وجود نہ رکھتے تھے۔ یہ صرف عمرو کے سہارے پر آئے تھے۔ اب عمرو کو جو انہوں نے خاک و خون میں غلطاں دیکھا تو انہوں نے راہ فرار اختیار کی اور اسی تنگ راستے سے جہاں سے پھاند کر وہ ادھر آئے تھے گھوڑے پھندا پھندا کر پھر ادھر پہنچ گئے۔

(ابن خلدون جلد ۲ صفحہ ۵۷۵)

معلوم ہوتا ہے کہ جو مسلمان وہاں کھڑے تھے وہ ان بھاگتے ہوؤں کے روکنے پر بھی قادر نہ تھے اور بھاگتے ہوئے کا پیچھا کرنا حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کا شعار نہ تھا اس لئے آپ نے بھی ان سے کوئی تعرض نہیں فرمایا۔

طبری کا بیان ہے کہ عمرو کے ساتھ دو آدمی قتل ہوئے۔ ایک منبہ بن عثمان بن عبید بن سباق بن عبددار، اسے ایک تیر لگا جس سے وہ زخمی ہو گیا اور مکہ جا کر اس زخم سے ہلاک ہوا اور دوسرے بنی مخزوم میں سے نوفل بن عبداللہ بن مغیرہ، وہ خندق میں کود پڑا تو چوٹ کھا گیا۔ ادھر سے مسلمان اس پر پتھر برسانے لگے تو وہ پکارا

"اے عرب قوم کے سپوتو، قتل ہی کرنا ہے تو اس سے اچھا کوئی طریق"۔ یہ سن کر حضرت علیؑ خندق میں اتر گئے اور اسے تلوار سے قتل کیا۔ مسلمانوں نے اس کی لاش پر قبضہ کر لیا۔

پیغمبرؐ کا لاش مشرک کی قیمت لینے سے انکار

مشرکین نے بعد میں خواہش کی کہ آپ کچھ رقم لے کر لاش ہمارے حوالے کر دیجئے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا ہمیں نہ اس کی لاش کی ضرورت ہے اور نہ اس کی قیمت کی۔ چنانچہ آپ نے وہ لاش ان کے سپرد کر دی۔

(طبری قدیم ایڈیشن جلد ۳ صفحہ ۴۹، تازہ ایڈیشن جلد ۲ صفحہ ۵۷۴)

علامہ دیار بکری نے ایک روایت یہ درج کی ہے کہ عمرو بن عبدود کے قتل ہونے کے بعد ضرار بن خطاب اور ہبیرہ بن وہب نے مل کر حضرت علیؑ پر حملہ کر دیا۔ آپ ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئے تو ضرار نے غور سے آپ کے چہرے کو دیکھا اور ایک دم فرار کیا

کافر علیؑ کی شکل میں موت دیکھتا ہے

بعد میں سبب پوچھا گیا تو اس نے کہا علیؑ کی صورت دیکھتے ہی یہ محسوس ہوا کہ موت کی شکل مجھے نظر آ رہی ہے۔ دوسرا اس کا ساتھی ہبیرہ ٹکا رہا اتنا کہ تلوار اس کے جسم تک پہنچی۔ اب اپنی زرہ اتار کر اس نے پھینک دی اور خود بھاگ نکلا۔ حضرت علیؑ نے اپنے اصول کے مطابق کسی فرار کرنے والے کا پیچھا نہیں کیا۔

ضرار کا عمر ابن خطاب پر احسان

مگر یہاں پر مورخ نے کسی راوی کا بیان کردہ ایک عجیب منظر نقل کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

قد کان ضرار بن الخطاب یفر و عمر یشتد فی اثرہ فکر ضرار راجعا و حمل علٰی عمر بالرمح لیطعنہ ثم امسکٗ و قال یا عمر ھذہ نعمة مشکورة اثبتہا علیكٗ و ید لی عندكٗ غیر مجزی بھا فاحفظھا

(تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۸۷)

ضرار بن خطاب جب بھاگا جارہا تھا تو حضرت عمر نے اسکا پیچھا کیا (پہلے تو ضرار اور شدت سے بھاگا ہو گا مگر پھر اسے یہ یاد آیا ہو گا کہ علیؑ عام طور پر بھاگنے والوں کا پیچھا نہیں کرتے۔ یہ ہو نہ ہو کوئی اور ہے' بس سوچتے ہی ضرار پلٹ پڑا اور عمر پر نیزہ کے ساتھ حملہ کیا۔ پھر ہاتھ روک لیا اور کہا اے عمر! یہ احسان اس وقت تمہارے ساتھ کر رہا ہوں۔ شکرگزار رہنا اور یہ ایسا احسان جس کا معاوضہ کچھ نہیں ہو سکتا بس اسے یاد رکھنا۔

بلند ظرفی کا مثالی نمونہ

عرب میں عموماً جب کوئی اپنے مدمقابل پر جنگ میں غالب آ کر اسے قتل کرتا تھا تو اس کی زرہ اور کپڑوں کو لاش پر سے اتار لیتا تھا۔ قانون اسلام میں بھی مجاہدین کے لئے اس دستور عرب کو برقرار رکھ کر اسے ان کا ایک آئینی حق قرار دیا گیا جس کے لئے یہ حدیث مشہور ہے کہ۔

من قتل قتیلا فله سلبه

جو کسی کو قتل کر دے تو اس کے جسم کا لباس وغیرہ اس کا حق ہوگا۔

مگر خود رسولؐ اور آل رسولؐ اپنے عمل میں قانون کی اکثر مراعاتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے تھے اور یہی ان کا بلند کردار وہ تھا جس نے تبلیغ اسلام میں شمشیر فولادی سے زیادہ کام کیا ہے۔ چنانچہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے عمرو بن عبدود کو جب قتل کیا تو آپ نے اس حق سے فائدہ نہیں اٹھایا حالانکہ اس کے جسم پر بڑی قیمتی زرہ تھی مگر آپ نے زرہ کو اس کے جسم سے نہیں اتارا کہ اس کی لاش عریاں نہ ہو جائے۔

مقتول عمرو بن عبدود کی بہن کی زبانی علیؑ کا قصیدہ

یہ وہ بلند ظرفی تھی جس کی قدر عمرو کی بہن کو ہوئی۔ جب وہ بھائی کی لاش پر آئی اور اس نے دیکھا کہ جسم پر اس کے زرہ اور لباس موجود ہے تو اس نے کہا۔

ما قتله الا کفو کریم

اسے قتل نہیں کیا ہے مگر کسی شریف برابر دار نے

پھر اس نے قاتل کا نام دریافت کیا اور لوگوں نے بتایا کہ علیؑ بن ابی طالبؑ نے اسے قتل کیا ہے تو اس نے یہ شعر نظم کیے۔

لوکان قاتل عمر و غیر قاتله   لکنت ابکی علیه آخر الا بد

لکن قاتله من لا یعاب به   من کان یدعی قدیما بیضة البلد

(تاریخ خمیس دیار بکری جلد ۱ صفحہ ۴۸۸)

"اگر عمرو کا اس قاتل کے سوا کوئی قاتل ہوتا تو میں اس پر ہمیشہ ہمیشہ روتی

رہتی، مگر قاتل اس کا وہ ہے جس کے ہاتھ سے قتل ہو جانا کوئی عیب نہیں ہے۔ وہ وہ ہے جو ہمیشہ سے شہر کا ممتاز آدمی سمجھا جاتا رہا ہے"۔

زیادہ تر کتابوں میں یہ اشعار عمرو کی بہن ہی کے بیان کیے گئے ہیں مگر علامہ ابن صباغ مالکی نے تین مزید اشعار کے ساتھ درج کرتے ہوئے لکھا ہے۔

قالت ام عمرو ترثیہ

عمر کی ماں نے اسکے مرثیہ میں یہ شعر کہے۔

اس کے علاوہ مذکورہ بالا دونوں شعروں کا چوتھا مصرع انہوں نے یوں لکھا ہے۔

من کان یدعی ابوہ بیضۃ البد

(الفصول المہمہ، طبع ایران صفحہ ۵۰، ۵۱)

وہ وہ ہے جس کا باپ اس شہر کا ممتاز ترین شخص کہا جاتا تھا۔

مجھے معنوی حیثیت سے مصرع یہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے لیکن مصرع کی اس تبدیلی کے بعد بھی اس کی کوئی وجہ نہیں کہ ہم زیادہ تر مورخین کے تصریحات کے مطابق ان کی نسبت عمرو کی بہن ہی کی طرف مرجح نہ سمجھیں۔

جناب سعد بن معاذ معرض شہادت میں

مدینہ منورہ کے انصار میں بڑے ممتاز درجہ کے اور بہت معزز ایک صحابی جناب سعد بن معاذ تھے جنہوں نے شروع شروع رسولؐ کی ہجرت سے پہلے ہی ایمان قبول کیا تھا اور مدینہ کے اندر اشاعت اسلام میں ان کا بڑا حصہ تھا۔

یہ قبیلہ اوس کے سردار تھے اور اوس کا قبیلہ بنی قریظہ کے ساتھ حلیف کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس بناء پر خود ان کے سرداران بنی قریظہ سے بڑے خاص قدیمی روابط تھے۔ اسی لئے پیغمبر خدا نے بنی قریظہ کی بغاوت کا حال سن کر تحقیق حال کے لئے جن افراد کو بھیجا تھا ان میں سعد بن معاذ بھی تھے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے وہاں جا کر انہوں نے ان کو سمجھانے کی بھی کوشش کی جو کارگر نہ ہوئی بلکہ خود انہیں وہاں گالیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بنی قریظہ کے اس رویہ سے جو انہوں نے اس جنگ کے موقع پر اختیار کیا تھا جناب سعد کو بڑی تکلیف پہنچی اور ان کی دلی تمنا

تھی کہ اس جنگ سے فرصت ہو تو ان غداروں کو ان کے کرتوت کی سزا دی جائے۔

غالباً اس وقت جب حضرت علیؑ اور عمرو بن عبدود میں مقابلہ ہو رہا تھا اور پھر حضرت علیؑ نے عمرو کو قتل کیا سب ہی مسلمان اپنی اپنی جگہ سے حرکت کرکے اس منظر کو دیکھنے کے لئے سامنے آ گئے تھے۔ جب تک مقابلہ جاری رہا مشرکین بھی خندق کے اس پار سے خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہے مگر جب حضرت علیؑ کی صدائے تکبیر بلند ہوئی اور عمرو کے ساتھی فرار کرکے ادھر پہنچے تو اب مشرکین کی فوج نے اپنی خفت مٹانے کو یا جوش انتقام کے غصہ میں یا اس خوف سے کہ کہیں اب مسلمان اسی راستے سے خندق کو پار کرکے ادھر نہ پہنچ جائیں تیر باران کر دیا اور اس وقت ایک کافر حبان بن قیس بن العرقہ نے تاک کر ایک تیر سعد بن معاذ کو لگایا جو ان کی کہنی کے پاس شہ رگ پر پڑا جسے اکحل کہا جاتا ہے۔ (تاریخ طبری طبع جدید جلد ۲ صفحہ ۵۷۵) اور وہ ایسی رگ ہے کہ اس سے خون جاری ہو جائے تو بند نہیں ہوتا اور تمام جسم کا خون نکل جاتا ہے۔ چنانچہ خون بہتا تھا کہ یقین ہو گیا کہ اب جانبری مشکل ہے۔

سعد بن معاذ کی دعا

انہوں نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی کہ پروردگارا! مجھے ابھی مشرکین قریش سے جنگ کا کوئی موقع باقی ہو تو مجھے ان کے مقابلے کے لئے زندہ رکھ اور اگر اب ان سے جنگ کا سلسلہ ختم ہو گیا تو اسے میرے لئے حصول شہادت کا ذریعہ بنا دے مگر مجھے اس وقت تک دنیا سے نہ اٹھا جب تک بنی قریظہ کا انجام میں اپنی آنکھ سے دیکھ نہ لوں۔ یہ دعا ان کی قبول ہوئی اور فوراً خون بند ہو گیا۔

(مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۲۲۴)

اس وقت کا عالم یہ تھا کہ کوئی فرش موجود نہ تھا جس پر زخمی سعد بن معاذ کو لٹایا جا سکے تو رسولؐ نے اپنے بستر پر سعد کو لٹایا اور خود حضرت فرش خاک پر تشریف فرما ہوئے۔ (اعلام الوریٰ)

جنگ خندق کا اختتام

جیسا کہ ہم نے قبل میں لکھا ہے کہ اس جنگ میں معرکہ بس ایک ہی ہوا ہے اور وہ حضرت علیؑ اور عمرو بن عبدود کا مقابلہ۔ اس کے بعد جنگ ختم ہو گئی۔ اب یہ ختم کیونکر ہوئی؟

مسٹر کے اے حمید لکھتے ہیں۔

"جب محاصرین شہر میں داخل ہونے سے عاجز ہو گئے تو تنگ آکر خود بخود محاصرہ چھوڑ کر چلے گئے"۔

(تاریخ مسلمانان عالم حصہ اول صفحہ ۷۹)

جب کہ دوسرے مورخین سب یہ لکھتے ہیں کہ انتہائی شدید آندھی آئی جس نے مشرکین کو سراسیمہ و مضطرب کر دیا اور اس غیر معمولی آندھی کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی موجود ہے۔

یا یھا الذین آمنوا اذکروا نعمة اللّٰه علیکم اذ جاتکم جنود فارسلنا علیھم ریحا" وجنودا لم تروھا و کان اللّٰه بما تعملون بصیراO و کفی اللّٰه المومنین القتال و کان اللّٰه قویا عزیزا O

اے مسلمانو! اللہ کا فضل و کرم جو تم پر ہوا یاد رکھو' جب کہ تمہارے مقابلہ میں بڑی فوجیں آگئیں تو ہم نے ایک بڑی سخت ہوا اور ان فوجوں کو بھیجا جنہیں تم دیکھ نہیں رہے تھے اور جو کچھ تمہاری کار گزاری تھی اسے اللہ خوب دیکھ رہا تھا اور اللہ نے مسلمانوں کو جنگ کی زحمت سے بچایا اور اللہ قوت والا ہے' زبردست قدرت والا ہے۔

پھر اس سب کو نظر انداز کرنے میں معقولیت ہی کیا ہو سکتی ہے؟ علامہ طبری تحریر فرماتے ہیں کہ اندھیری رات تھی اور بڑی سخت سردی تھی۔ رسولؐ اس ٹیلے پر کھڑے ہوئے جس پر اس کے بعد مسجد فتح کی تعمیر ہوئی اور کہا کون ہے جو جا کر ان کی خبر لائے اور میں اس کے لئے بہشت کا ضامن ہوں اس پر کوئی کھڑا نہیں ہوا۔

بہشت کی ضمانت پر بھی صحابہ کی خاموشی

پھر حضرت نے دوبارہ اور سہ بارہ فرمایا۔ آخر جناب حذیفہؓ کھڑے ہوئے اور جناب رسالتمابؐ نے فرمایا جاکر ان کی گفتگو سنو اور ان کے حالات کی اطلاع مجھے دو۔ پھر حضرت نے ہاتھ اپنے بارگاہ الٰہی میں اٹھائے اور حذیفہ کے لئے حفاظت کی دعا فرمائی۔ اس کے بعد ادھر حذیفہ روانہ ہوئے اور ادھر حضرتؐ نماز میں مصروف ہو گئے اور بعد نماز بڑے سوز و درد کے ساتھ خالق سے فتح و نصرت کی دعا مانگی۔ حذیفہ نے جا کر دیکھا کہ آگیں سرد پڑی ہیں اور ایک سخت آندھی جس میں سنگریزے ہیں پوری فوج کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے جس سے تمام خیمے اکھڑ گئے ہیں۔ چھولداریاں زمین پر آ گئی ہیں اور عالم یہ ہے کہ وہ ڈھالیں منہ پر لیے ہوئے سنگریزوں سے بچاؤ کی کوشش کر رہے ہیں۔ حذیفہ کا بیان ہے کہ سنگریزوں کے ان ڈھالوں سے ٹکرانے کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔

ابو سفیان کا نعرہ فرار

ابو سفیان اپنی سواری کے قریب آیا اور پکارا النجا النجا یعنی "بھاگ کر اپنی جان بچاوء، جان بچاؤ" یہی عیینہ بن حصین نے کہا اور یہی آواز حارث بن عوف نے بلند کی اور بس اس کے بعد جتنی فوجیں تھیں سب واپس ہو گئیں اور حذیفہ نے اس سب کی اطلاع آ کر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی۔ (اعلام الوریٰ)

بہرصورت اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اصل پست ہمتی اور تھوڑ دلی ان میں عمرو بن عبدود کے قتل سے پیدا ہو چکی تھی اور اس کے بعد ان میں پھوٹ بھی پڑ گئی تھی۔ جس کا تفصیلی بیان تاریخ میں موجود ہے۔ (طبری تازہ ایڈیشن جلد ۲ صفحہ ۵۷۸، ۵۷۹) اب وہ واپسی کے لئے کوئی بہانہ ڈھونڈ رہے تھے چنانچہ اس شدید آندھی کے حملے نے انہیں واپس جانے کا ایک قوی سبب پیدا کر دیا جس کے بعد پھر کبھی ہمت ان کو مدینہ پر حملہ کی نہیں ہوئی۔

بنی قریظہ کی سرکوبی

قریظہ یہودیوں کا ایک طاقتور قبیلہ تھا۔ اس نے جنگ خندق کے ایسے نازک حالات میں اپنے عہد و پیمان کو توڑ کر پیغمبر اسلامؐ اور مسلمانوں کی پریشانی میں شدید اضافہ کیا۔ اس سے حضرت پیغمبر خداؐ اور تمام آپ کے وفاداروں کو اتنی تکلیف ہوئی کہ جیسا پہلے آ چکا ہے سعد بن معاذ نے تیر کا مہلک زخم کھانے کے بعد بارگاہ پروردگار میں جو التجا کی وہ یہ کہ بنی قریظہ کا آخری انجام میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ اب مشرکین کی شکست خوردہ واپسی اور پیغمبر اسلامؐ اور مسلمانوں کی فتح مندانہ مراجعت کے بعد اس کا وقت آگیا تھا۔ چنانچہ پیغمبر خداؐ نے جنگ خندق سے مدینہ آنے کے بعد بر بنائے وحی الٰہی مُسلمانوں کو ذرا دم لینے کا موقع بھی نہ دیا اور اسی دن بنی قریظہ کے قلعہ کی طرف کوچ کا حکم ہو گیا' اور سب روانہ ہو گئے۔

(شذرات الذہب فی اخبار من ذہب لابن العماد الحنبلی جلد ۱ صفحہ ۱۱)

مولوی عبدالباری ایم - اے نے چونکہ غزوہ خندق کی تاریخ ۲۸ ذیقعدہ ۵ ہجری درج کی ہے لہٰذا بنو قریظہ کے ساتھ جنگ کو ذی الحجہ ۵ ہجری میں بتایا ہے۔ (دعوت دہلی' سیرت طیبہ' ۱۲ ربیع الاول ۱۳۷۹ ھ صفحہ ۱۸۳) لیکن مستند تاریخیں غزوہ بنی قریظہ کو ذیقعد میں بتاتی ہیں۔

(ابو الفدا جلد ۱ صفحہ ۱۴۳' اعیان الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۲۳۹)

حضرت علیؑ علمدار لشکر

باتفاق مورخین علم لشکر حضرت علیؑ بن ابی طالب کے سپرد کیا گیا۔ (ابن الوردی جلد ۱ صفحہ ۱۲۲ طبری طبع جدید جلد ۳ صفحہ ۲۸۸ ابوالفداء جلد ۱ صفحہ ۱۴۲ مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۳۹) اور تمام لوگوں کو تاکید فرمائی گئی کہ نماز عصر جا کر بنی قریظہ کے اندر پڑھنا۔ حضرت علیؑ مہاجرین اور بنی عبدالاشہل اور بنی نجار کی جماعتوں کو ساتھ لیے ان کی طرف روانہ ہوئے یہاں تک کہ ان کے قلعوں کے سامنے پہنچ گئے۔ انہوں نے قلعہ کے اوپر سے آپ کو دیکھا تو گالیاں دینے لگے اور نہ صرف آپ کی نسبت بلکہ پیغمبر خداؐ کی شان میں بھی طرح طرح کے رکیک الفاظ کہنے لگے۔

اس جہالت کا جواب آپ نے مکمل خاموشی سے دیا۔ چونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باقی مسلمانوں کے حلقہ میں روانہ ہوئے تھے' حضرت علیؑ نے پلٹ کر راستے میں آپ کو ٹھہرایا اور عرض کیا کہ حضور! آپ ان کے قریب تشریف نہ لے جائیں تو کیا حرج ہے۔ انشاء اللہ وہ خود رسوا ہو کر رہیں گے۔ پیغمبر سمجھ گئے کہ وہ لوگ گالیوں پر اتر آئے ہیں۔ علامہ طبری کا بیان ہے کہ آپ نے وہیں قیام فرمایا۔ (اعلام الوریٰ) مگر دوسرے مورخین کہتے ہیں کہ حضرتؐ نے ان کی بد زبانیوں کی پروا نہیں کی اور قلعہ کے سامنے تشریف لے گئے اور مسلمانوں نے چاروں طرف سے ان قلعوں کو گھیر لیا اور پچیس دن تک یہ محاصرہ قائم رہا۔

بنی نضیر کا سردار حیی بن اخطب جس نے مشرکین کی فتح کے سبز باغ دکھا کر انہیں غداری پر آمادہ کیا تھا۔ ان کے سردار سے اپنی گفتگو کے ذیل میں زبان دے چکا تھا کہ اگر میرے توقعات غلط ثابت ہوئے اور اہل مکہ مدینہ میں داخل نہ ہو سکے تو پھر میں تمہارے قلعہ میں آجاؤں گا کہ جو حال تمہارا ہو وہ میرا بھی ہو۔ اس نے واقعی اپنے اس قول پر عمل کیا اور وہ مشرکین کے شکست کھانے کے بعد بجائے اپنے قبیلہ کی طرف جانے کے بنی قریظہ کے قلعہ میں آگیا اور ان کے انجام میں شرکت کے لئے محاصرہ کے دوران ان کے ساتھ بند رہا۔

حضرت علیؑ کی ہیبت سے دشمن نے ہتھیار ڈال دیئے

پچیس دن کے محاصرہ کے بعد جب ان کے لئے کوئی چارہ کار نہ رہا تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور اس کے بعد کیا ہوا؟

یہ امر یقینی ہے کہ اس کے بعد جو ان کا نتیجہ ہوا وہ جناب سعد بن معاذ کے فیصلہ کے مطابق ہوا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ فیصلہ ان کے جرم کی شدت کے بالکل مطابق سخت ہو جس کا تذکرہ ابھی آوے گا مگر سعد بن معاذ ثالث کیونکر مقرر ہوئے۔

حضرت سعد بن معاذ کی ثالثی

اس کے لئے میں نے قدیم تاریخوں میں کافی جستجو کی تو وہ سب یہ صورت بتلاتی ہیں کہ مدینہ میں یہود کے جس قبیلہ نے پہلے غداری کی تھی وہ بنو قینقاع تھا جو انصار میں سے قبیلہ خزرج کے حلیف تھے یعنی ان سے معاہدہ دوستی رکھتے تھے اور یہ بنی قریظہ دوسرے انصار کے قبیلہ اوس کے حلیف تھے۔ بنی قینقاع نے جب ہتھیار ڈالے تو عبداللہ بن ابی نے جو قبیلہ خزرج کا رکن رکین تھا رسولؐ سے ان کے بارے میں نرمی برتنے کی سفارش کی اور حضرتؐ نے ان کے ساتھ یہ مراعات برتی کہ انہیں حکم دیا کہ وہ صحیح سلامت مدینہ سے باہر چلے جائیں۔ اب بنی قریظہ نے جو مجبور ہو کر ہتھیار ڈالے تو اوس کے قبیلہ نے آکر حضرت کو گھیر لیا اور کہا جس طرح عبداللہ بن ابی کے کہنے سے آپ نے بنی قینقاع کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کیا اسی طرح بنی قریظہ کے ساتھ بھی کیجئے حضرت نے فرمایا' کیا تم اس پر تیار ہو کہ ان کے معاملہ کو سعد بن معاذ پر چھوڑ دیا جائے۔ سعد بن معاذ خود اسی قبیلہ اوس کے سردار تھے۔ وہ سب بڑی خوشی سے اس پر راضی ہو گئے اور انہوں نے کہا' جی ہاں ' مناسب ہے کہ سعد بن معاذ ان کے بارے میں فیصلہ کر دیں۔ اس طرح سعد بن معاذ بلائے گئے اور انہوں نے وہ فیصلہ کیا جو ابھی آپ کے سامنے آئے گا۔

ابن وردی کے الفاظ ذیل میں درج ہیں۔

حاصر بنی قریظة خمسا و عشرین لیلة و قذف اللّٰه فی قلوبهم الرعب فنزلوا علی حکمه صلی اللّٰه علیه وسلم و کانوا حلفاء الاوس فسالته الاوس فیهم کما اطلق بنی قینقاع حلفاء الخزرج بسؤال عبداللّٰه بن ابی بن ابی سلول فقال الا ترضون ان یحکم فیهم سعد بن معاذ وهو سید الاوس قالوا بلٰی ظنا منهم انه یحکم باطلا قهم فامر باحضار سعد

(تاریخ ابن الوردی جلد ۱ صفحہ ۱۱۲)

حضرتؐ نے بنی قریظہ کا پچیس شب و روز تک محاصرہ قائم رکھا اور اللہ نے ان کے دلوں پر ہیبت طاری کر دی تو انہوں نے حضرتؐ کے فیصلہ پر انحصار کرکے ہتھیار ڈال دیئے اور وہ قبیلہ اوس کے حلیف تھے تو اوس نے ان کے بارے میں حضرتؐ سے درخواست کی جیسا آپ نے بنی قینقاع کو جو خزرج کے حلیف تھے عبداللہ بن ابی بن ابی سلول کی درخواست پر چھوڑ دیا تھا۔ حضرتؐ نے فرمایا تم لوگ کیا اس پر تیار نہیں ہو گے کہ سعد بن معاذ ان کے بارے میں فیصلہ کر دیں اور وہ قبیلہ اوس کے سردار تھے۔ وہ سب کہنے لگے کیوں نہیں (ہم بالکل اس پر تیار ہیں) اور ان کا خیال تھا کہ سعد ان کے چھوڑ دینے ہی کا فیصلہ کریں گے اس پر حضرت نے سعد کے بلائے جانے کا حکم دیا۔

جتنی قدیم تاریخیں ہیں سب صورت واقعہ اسی طرح لکھ رہی ہیں۔ (المغازی للواقدی جلد ۲ صفحہ ۵۰۹ طبری طبع جدید صفحہ ۵۸۶ تاریخ ابن خلدون طبع بیروت ۱۹۵۶ء جلد ۲ صفحہ ۷۷۷، ابو الفدا، جلد ۱ صفحہ ۱۴۳) جیسا کہ بعد کو آئے گا۔ (جو فیصلہ سعد نے کیا وہ منطقی طور پر اور آئین انصاف و قانون، عدل اور اصول کے لحاظ سے بالکل درست تھا مگر اس سبب کے باوجود دل تاریخ کے ان بیانات سے مطمئن نہیں ہوتا او رکچھ اور تلاش کر رہا ہے۔ اس تلاش میں مجھے تواریخ اہل سنت میں بالکل کامیابی نہیں ہوئی مگر علامہ طبرسیؒ کے بیان میں مجھے یہ دل کا مطلب یا "گم گشتہ حقیقت" مل گئی اور جیسا کہ تاریخ اسلام حصہ اول میں میں نے اس پر متنبہ کیا ہے آل رسولؐ کے ارشادات سے علامہ طبرسی کے یہاں کچھ ایسے "جواہر پارے" آگئے ہیں جن سے عام تاریخیں خالی ہیں۔ یہاں انہوں نے اگرچہ کوئی سند درج نہیں کی ہے مگر جمہور کی تاریخ سے الگ کسی جز کا بیان ہونا خود اس کا ثبوت ہے کہ یہ کسی اور ماخذ سے دستیاب ہوا ہے۔ طبرسی رحمتہ اللہ علیہ کے الفاظ جو بہت مختصر مگر بڑے قیمتی ہیں۔ حسب ذیل ہیں۔

فحاصر هم رسول اللہ صلی اللہ علیه و آله وسلم خمسا و عشرین لیلة حتی نزلوا علی حکم سعد بن معاذ (اعلام الوریٰ)

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے پچیس دن تک ان کا محاصرہ قائم رکھا یہاں تک کہ ان لوگوں نے سعد بن معاذ کے فیصلہ پر انحصار کر کے ہتھیار ڈال دیئے۔

دل بڑی گرمجوشی سے ان الفاظ کا استقبال کرتا ہے اور وہ بالکل قرین قیاس معلوم ہوتے ہیں کیونکہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ سعد بن معاذ کے ان سے اس کے پہلے بڑے گہرے روابط تھے۔ وہ سمجھے کہ سعد ان تعلقات کی بناء پر ہم سے رعایت کریں گے۔ حالانکہ سعد بڑے مخلص باایمان تھے۔ وہ ایمانی تقاضوں کے سامنے ذاتی تعلقات کا خیال نہیں کر سکتے تھے اور غالباً" قبل میں انہیں بنی قریظہ کی وفاداری پر بھروسا تھا۔ اس لئے جب خلاف امیدان سے عہد شکنی اور غداری ظہور میں آئی تو انہیں شدید رنج پہنچا اور فطری طور پر بہت سخت غصہ تھا جس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے جو پہلے درج ہو چکا ہے کہ جب جنگ خندق میں انہیں مہلک زخم تیر کا لگا تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعا یہی کی کہ خداوندا مجھے دنیا سے اٹھانا نہیں۔ جب تک کہ ان کی بدعہدی کا انجام میں اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لوں۔ اب اسے قدرت خدا کے سوا کیا سمجھا جائے کہ انہی دشمنوں کی طرف سے خود انہی کے ہاتھوں ان کی اس دعا کی قبولیت کا سامان ہو رہا تھا۔

دل کہتا ہے کہ اگر وہ اپنے کو خدا اور رسولؐ کے رحم و کرم پر چھوڑتے تو انہیں اتنے تباہ کن انجام کا شاید سامنا نہ کرنا پڑتا۔ مگر انہوں نے رسول کریمؐ کے خلق عظیم پر بے اعتمادی سے کام لیتے ہوئے اپنے ذاتی تعلقات پر بھروسا کیا اور سعد کو ثالث بنا دیا۔ جس کے بعد فیصلہ کی ذمہ داری خود رسولؐ پر بالکل نہ رہی۔ انہیں سعد کے ذاتی تعلقات پر بھروسا تھا جو انہوں نے ان کا نام ثالثی کے لئے پیش کیا اور رسولؐ کو ان کے خلوص ایمانی پر اعتماد تھا جو آپ نے اس کی اس پیشکش کو قبول فرما لیا مگر اصولا" اگر علامہ طبری کا بیان مجھے سہارا دینے کے لئے نہ ہوتا تو صرف دل کے فتوے پر میں بطور واقعہ اس روداد کو لکھنے کی جرات نہ کرتا لیکن مورخین اہل سنت بلاوجودیکہ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ طبری کی

کتاب "اعلام الوریٰ" ان کے سامنے نہ تھی۔ صرف دل کے تقاضے سے اس چودھویں صدی میں متفقہ طور پر صورت واقعہ اسی طرح درج کر رہے ہیں جن میں جہاں تک مجھے علم ہے سب سے سابق زمانہ حال کے اردو تاریخ نگاروں کے سرخیل مولانا شبلی ہیں جنہوں نے اس طرح لکھا ہے۔

"تقریباً" ایک مہینہ محاصرہ رہا۔ بالآخر انہوں نے درخواست پیش کی کہ حضرت سعد بن معاذ جو فیصلہ کریں ہم کو منظور ہے۔ حضرت سعد بن معاذ اور ان کا قبیلہ (اوس) قریظہ کا حلیف اور ہم عہد تھا۔ عرب میں یہ تعلق ہم نسبی سے بڑھ کر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی درخواست منظور کر لی"۔

(سیرۃ النبی حصہ اول مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۶۰ء صفحہ ۴۳۵)

اب اس کے بعد تو جتنے اہل قلم ہیں سب یہی لکھ رہے ہیں جس طرح قدیم مورخین میں مجھے تلاش سے علامہ طبرسی کے سوا کوئی ایسا نہیں ملا جس نے اسے لکھا ہو' اسی طرح اس صدی کے ہندوستانی تاریخ نگاروں میں مجھے کوئی ایسا نہیں ملا جس نے اس کے خلاف لکھا ہو۔ چنانچہ قاضی محمد سلیمان رقم طراز ہیں۔

. انہوں نے چاہا کہ ایک منصف جو مقبول فریقین ہو ان کا فیصلہ کرے۔ منصف نے ان کا فیصلہ بموجب احکام توریت شریف جس کے وہ قائل تھے کر دیا"۔

(رحمتہ للعالمین لاہور صفحہ ۲۳۸)

نعیم صدیقی لکھتے ہیں۔

"حضور نے اس سے گفت و شنید کر کے ان کی رضا مندی سے سعد بن معاذ کو حکم ٹھہرایا اور دونوں طرف سے پورے اعتماد کے ساتھ فیصلہ ان پر چھوڑ دیا گیا"۔

محسن انسانیت مطبوعہ سرگودھا حصہ اول جلد ۲ صفحہ ۱۱۲)

محمد اجمل خاں کے الفاظ یہ ہیں۔

"یہودیوں نے سعد بن معاذ کو حکم بنایا کہ وہ جو فیصلہ کریں گے ہمیں منظور ہو گا"۔

(رسول عربی مطبوعہ الجمعتیہ پریس دہلی صفحہ ۳۹۹)

مولوی عبدالعلیم احراری بی۔ اے آنرز جامعہ ملیہ (یعنی ڈاکٹر عبدالعلیم وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) بھی یہی تحریر فرماتے ہیں کہ

"خود بنی قریظہ نے یہ درخواست کی حتی کہ سعد بن معاذ کو جو ان کے حلیف تھے ان کا فیصلہ کرنے کی اجازت دی جائے"۔

(سیرت نبوی اور مستشرقین شائع کردہ مکتبہ جامعہ اسلامیہ دہلی صفحہ ۷۵)

مولوی اولاد حیدر صاحب فوق مرحوم نے معلوم نہیں کس ماخذ سے اسے زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ۔

ہر طرف سے مایوس و مجبور ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تصفیہ کے خواہاں ہوئے۔ آپ ان غداروں کی مفسد طبیعتوں سے خوب واقف ہو چکے تھے اور ان کی فتنہ انگیز حرکتوں کا متواتر تجربہ اٹھا چکے تھے۔ اس بناء پر خود تصفیہ کرنے سے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ میں تصفیہ کرنے پر راضی تو ضرور ہوں لیکن میں خود تصفیہ نہیں کروں گا۔ تم ہی اپنی طرف سے کسی کو حکم کرو، جو وہ تصفیہ کر دے اس پر ہم دونوں راضی ہو جائیں۔ بنی قریظہ نے قبول کر لیا اور اپنے قدیم تعلقات کی بناء پر سعد بن معاذ کو حکم مقرر کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی سعد کی تحکیم کو منظور فرما لیا"۔

(اسوۃ الرسول جلد ۲ صفحہ ۵۴۹)

جناب سعد بن معاذ چونکہ مہلک طور پر تیر کا زخم کھا چکے تھے اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے ساتھ بہت تعلق خاطر تھا تو مدینہ میں آنے کے بعد حضرتؐ نے انہیں ان کے مکان پر جو فاصلہ پر تھا جانے نہیں دیا تھا بلکہ فرمایا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے قریب رہیں کہ میں وقتاً" فوقتاً" انہیں آکر دیکھ سکوں۔ اس لئے وہ مسجد نبوی کے احاطہ ہی میں ایک خیمہ کے اندر فروکش تھے۔

اب ان کے فیصلہ پر جو انحصار کیا گیا تو حضرتؐ کے حکم سے لوگ جا کر انہیں ایک مرکب پر سوار کر کے لائے۔ حضرتؐ نے انہیں آتے دیکھا تو قبیلہ اوس کے لوگوں سے فرمایا۔ قوموا الی سیدکم "اٹھو اپنے سردار کی طرف" یعنی جاؤ اور

مرکب سے اتار کر انہیں آرام کے ساتھ لاؤ"۔

(ابن خلدون جلد ۲ صفحہ ۷۷۸)

حضرتؑ کا اشارہ پاتے ہی یہ لوگ دوڑ پڑے۔ جناب سعد بن معاذ نے مرکب سے اترتے ہی پہلے ان لوگوں سے کہا کہ جو کچھ میں فیصلہ کروں اس پر تم سب لوگ راضی رہو گے۔ ان لوگوں نے متفقہ طور پر اقرار کیا۔ اب ادب و احترام کی بناء پر بغیر حضرتؑ کو مخاطب کیے یا حضرت کا نام لیے انہوں نے اس سمت کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ادھر کے حضرات بھی اسے قبول کریں گے؟

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت کے طبعی رحم و کرم کی بناء پر انہیں اندیشہ تھا کہ وہ سخت فیصلہ جو کریں گے حضرتؑ کے نزدیک سزاوار عمل نہیں ہو گا۔

ان کی اس آواز پر حضرتؑ نے فرمایا کہ ضرور' جو فیصلہ ہو گا ادھر سے بھی اس پر عمل ہو گا۔

اس کے بعد وہ آگے چلے تو خود ان کے قبیلے اوس کے لوگ ان سے منت سماجت کرنے لگے کہ رسولؐ نے فیصلہ بنی قریظہ کا آپ پر چھوڑ دیا ہے۔ اب اس قبیلہ سے ہمارے قدیم تعلقات دوستی کے جو رہے ہیں ان کا خیال رکھیے گا۔ ان کے ساتھ نرمی سے کام لیجئے گا۔ اس پر پہلے تو وہ خاموش رہے۔ جب یہ لوگ بہت پیچھے پڑے تو انہوں نے اتنا کہا کہ اب میں زندگی کی اس منزل میں ہوں کہ زبان خلق کی کوئی پرواہ نہیں کر سکتا۔ کچھ لوگ ان کے اس جملہ ہی سے سمجھ گئے کہ وہ بنی قریظہ کے ساتھ کوئی رعایت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

(طبری طبع جدید' جلد ۲ صفحہ ۵۸۷)

ثالث کا فیصلہ

انہوں نے یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ میرا فیصلہ قطعی ہو گا اور اس پر لازماً عمل کیا جائے گا۔ فیصلہ یہ سنایا کہ ان کے مردوں کو قتل کر دیا جائے اور بچوں اور عورتوں کو قیدی بنا لیا جائے اور جتنے اموال ان کے ہیں وہ سب بطور مال غنیمت تقسیم کیے جائیں لیکن غیر منقولہ جائیدادان کی صرف مہاجرین پر تقسیم ہو جو پردیسی

ہیں کیونکہ ان کے پاس یہاں املاک نہیں ہے انصار کو اس میں حصہ نہ دیا جائے۔
جناب سعد کا یہ فیصلہ اصول' قانون اور آئین انصاف و عدالت کے رو سے بالکل درست تھا۔ اس کے علاوہ جیسا کہ مولانا شبلی نے لکھا ہے۔
"حضرت سعد نے جو فیصلہ کیا وہ توراۃ کے مطابق تھا"
توراۃ کتاب تثنیہ اصحاح ۲۰ فقرہ ۱۰ میں ہے۔
" جب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لئے تو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے۔ اگر وہ صلح کرلیں اور تیرے لئے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے لیکن اگر صلح نہ کریں تو ان کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا تجھ کو ان پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں سب کو قتل کر دے۔ باقی بچے' عورتیں' جانور' اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں سب تیرے لئے مال غنیمت ہوں گی۔

(سیرۃ النبی حصہ اول صفحہ ۴۳۵' ۴۳۶)

ڈاکٹر عبدالعلیم لکھتے ہیں۔
" دراصل بنو قینقاع اور بنو نضیر کے ساتھ جو سلوک کیا گیا تھا وہ انصاف نہیں تھا بلکہ اس میں رحم کی کارفرمائی نظر آتی ہے اس لئے کہ رسول خدا جیسا رحیم انسان اس کا ذمہ دار ہے۔ہاں بنو قریظہ کے ساتھ پورا انصاف کیا گیا اور سختی کے ساتھ وہ سزا دی گئی جس کے وہ مستحق تھے۔ اگر کسی کو اس میں بے جا شدت نظر آتی ہے تو اس کے ذمہ دار رسولؐ نہیں سعد بن معاذ ہیں۔ جو بنو قریظہ کے دوست تھے اور جنہیں خود انہوں نے نامزد کیا تھا۔"
لین پول لکھتا ہے۔
" سزا سخت تھی۔ لیکن یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ ان لوگوں کا جرم حکومت سے کھلی ہوئی بغاوت تھی اور وہ بھی محاصرے کے زمانہ میں۔ جو لوگ یہ پڑھ چکے ہیں کہ ولنگٹن کی فوج کے راستے کا پتہ غداروں اور ڈاکوؤں کی ان لاشوں سے چلتا تھا جو ادھر ادھر درختوں پر لٹکتی ہوتی تھیں انہیں تو کم از کم ایک غدار قبیلہ کے قتل

کیے جانے پر متعجب ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے"۔
(سیرت نبوی اور مستشرقین صفحہ ۷۶)

حقیقت امر یہ ہے کہ سزا کے درجوں میں جرم کی ابتدائی اور انتہائی منزلوں کے اعتبار سے بھی فرق ہوتا ہے۔ یعنی کسی نے پہلی مرتبہ جرم کیا ہو تو اس کے لئے ہلکی سزا تجویز کرنا مناسب ہوتا ہے لیکن وہی جرم جب دوبارہ سرزد ہو تو پہلی سزا ناکافی قرار پاتی ہے اور اب سزا اس سے سخت تر ہوتی ہے اور جب پھر تیسری مرتبہ وہی جرم ہو تو اگر اتنا ہی ہو جتنا پہلے ہوا تھا تو بھی سزا شدید تر ہو جائے گی۔ چہ جائیکہ خود جرم اپنی کیفیت اور ماحول اور اثرات کے لحاظ سے شدید تر ہو گیا ہو تو اب یہ خیال کرنا کہ سزا بس وہی ہو جو پہلے دی گئی تھی۔ اصول مکافات کے لحاظ سے بالکل غلط ہے۔

یہود کے قبائل میں جو مدینہ کے اندر تھے بنی قینقاع کا جرم پہلی دفعہ ہوا تھا۔ انہیں جلا وطنی کی سزا دی گئی تھی اس سے دوسرے قبیلوں کو سبق لے لینا چاہئے تھا مگر دوسری مرتبہ بنو نضیر نے وہی عمل اختیار کیا اور اب بنی قریظہ نے اس غداری کے کردار کو تیسری مرتبہ اختیار کیا اور پھر ان نازک حالات میں جب ایک اتنے بڑے طاقتور غنیم کے حملہ آور ہونے سے قوم کی حیات و موت کا سوال درپیش تھا اور یونہی پریشانی کوئی کم نہ تھی کہ اس قبیلہ نے ایسے نازک حالات میں عہد شکنی کرکے اور مخالف طاقت کے ساتھ ہونے کا اعلان کرکے پریشانی میں بدرجہا اضافہ کر دیا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ایسی صورت میں ان کا معاملہ یقیناً پہلے دونوں قبیلوں سے بالکل مختلف ہو گیا تھا اور ان کے جرم کی سزا کو اصولاً" سخت تر ہونا ہی چاہئے تھا اور حقیقت یہ ہے کہ جو الفاظ ہم نے پہلے استعمال کیے ہیں یعنی ہمارے دل کا فیصلہ یہ ہے کہ خود پیغمبرخدا پر چھوڑ دیا گیا ہوتا تو آپ یہ سخت سلوک تجویز نہ فرماتے۔ یہ شاید بس دل ہی کا تقاضا ہے اور دل بھی وہ جو کسی بھی مجرم کی سخت سزا کو سن کر لرز جاتا ہے۔ لیکن اسلامی قانون میں سزا کا اصول ہمارے ان دلی تقاضوں کے کہیں بھی مطابق نہیں ہے۔ خود مسلمانوں کے جرائم جنہیں فروعی

حیثیت حاصل ہے ان کی سزا کی سختی کو آج کے لوگوں کے دل کہاں قبول کرتے ہیں۔ مثلاً چور کے ہاتھ کاٹنا اور اس سے بڑھ کر زنائے محصنہ کے مرتکب مرد یا عورت کا سنگسار کیا جانا' ذرا اپنے دل کے سامنے اس منظر کا تصور پیش کیجئے کہ ایک انسانی جسم پر پتھر پڑ رہے ہیں۔خون کے فوارے چاروں طرف بکھر رہے ہیں وہ بار بار اس گڑھے کے اندر سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے اور پتھروں کی بارش سے اسے پھر اس میں گرا دیا جاتا ہے۔ اس پر ہمارا آپ کا دل کیا محسوس کرے گا؟ دل کا لرزنا کیسا' ہم شاید اس منظر کو دیکھ کر غش کھا کر گر پڑیں۔ مگر اصول کے لحاظ سے یہی سخت سزائیں وہ ہیں جو سزا کے اصل مفاد کو پورا کرتی ہیں اور اسے ہر شخص عالم مشاہدہ میں اس وقت بھی دیکھ سکتا ہے کہ ہمارے ان ملکوں میں جہاں کی سزاؤں کو چور تفریح طبع کے طور پر بار بار کاٹ کر نکلتے ہیں کتنی چوریاں ہوتی رہتی ہیں اور حجاز میں جہاں شریعت اسلام والی سزا کا اندیشہ ہے چوریوں کا کس طرح سدباب ہو گیا ہے۔

ہمارے ایسے ہی دل کے تقاضے کو جو مجرموں کے بارے میں ترحم کا جذبہ محسوس کرتا ہے' قرآن نے زنا کار کی سزا سناتے ہوئے یہ کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ لا تاخذکم بھما رافۃ فی دین اللہ "تمہیں اطاعت الہٰی کے فرض کو انجام دینے میں ان زنا کار مرد اور عورت کے ساتھ کہیں جذبہ ترحم پیدا نہ ہو جائے"--- لہٰذا جو حکمت ان سزاؤں کی سختی کو درست قرار دیتی ہے وہی حکومت اسلامیہ کے ان بدترین باغیوں کی سزا کو صحیح قرار دیتی ہے اور اس لئے جناب سعد بن معاذ نے جو سزا تجویز کی اسے بلا شبہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منظور ہی نہیں کیا بلکہ اس فیصلہ کی تعریف فرمائی۔ ایسی صورت میں اصولاً" وہ ہمارے دل کا تقاضا کوئی چیز نہیں ہے اور ہمیں اس فیصلہ کی ذمہ داری سے حضرت رسول خداؐ کو بچانے کی کوشش بھی اصولاً" درست نہیں ہے جیسا کہ عام تاریخوں نے درج کیا ہے ' چاہے پیغمبر خداؐ ہی نے قبیلہ کو مطمئن کرنے کے لئے جناب سعد بن معاذ کا نام پیش فرمایا ہو اور چاہے جیسا علامہ طبری نے لکھا ہے اور اب ہمارے مورخین بھی کم از کم

ہندوستان کے لکھنے والے سب یہی لکھ رہے ہیں خود جماعت یہود نے سعد کے حکم بنانے کی خواہش کی ہو اور آپ نے اسے قبول فرمایا۔ بہرصورت جب سعد بن معاذ کے فیصلہ کو حضرتؐ نے تسلیم فرما لیا اور اس کے مطابق عمل کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا و رسولؐ کے نزدیک وہ جماعت اس سزا کی مستحق تھی اور ایسی صورت میں اگر سعد کا قدم درمیان میں آتا ہی نہ اور خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم یہی فیصلہ فرماتے تو بھی کیا تھا؟ کیا آپ نے فساد فی الارض کے مرتکب افراد کو اور ملک میں قتل و غارت برپا کرنے والوں کو ایسی سخت سزائیں خود نہیں دی ہیں؟ اور کیا قرآن مجید میں صراحتاً "اللہ اور رسول سے جنگ کرنے والوں" اور "فساد کی کوشش کرنے والوں" کو اس سزا کا مستوجب نہیں ٹھہرایا ہے کہ۔

ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدھم وارجلھم من خلاف او ینفوا من الارض

انہیں طرح طرح سے قتل کیا جائے یا انہیں سولی دی جائے یا ان کے ادھر ادھر سے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں یا (کم از کم) انہیں اس سرزمین سے نکال دیا جائے۔

دو اہم واقعے

اس ذیل میں تاریخ کے دو اہم واقعے ہمارے سامنے آتے ہیں جن سے ہمیں اس بحث میں واقعہ کی اصل نوعیت تک پہنچنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

پہلا واقعہ یہ ہے کہ جب محاصرہ کی شدت سے بنی قریظہ عاجز ہو گئے تو انہوں نے جنگ کا سلسلہ موقوف کر دیا اور کہا ہم کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "اچھا جو کہنا ہو کہو" انہوں نے اپنے ایک آدمی کو جس کا نام نباش ابن قیس تھا رسولؐ کے پاس بھیجا اور اس نے آپ سے درخواست کی کہ ہم اس شرط پر ہتھیار ڈالنے کو تیار ہیں کہ ہمارے ساتھ وہی سلوک ہو جو بنی نضیر کے ساتھ ہوا تھا کہ ہمارے تمام املاک اور سامان جنگ کے مالک آپ ہو جائیں اور ہمیں بس جانوں کی امان دے دیں کہ ہم یہاں سے اپنی

عورتوں اور بچوں کو لے کر نکل جائیں اور سامان جنگ کو چھوڑ کر جتنا مال اونٹوں پر بار ہو سکے وہ اپنے ساتھ لے جائیں۔ اس پر رسول خدا نے انکار فرما دیا۔ انہوں نے کہا' اچھا! بس عورتوں اور بچوں کے ساتھ ہم نکل کر چلے جائیں اور سامان کچھ بھی نہ لے جائیں ۔ آپؐ نے فرمایا' یہ کچھ نہیں۔ غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالو کہ جو چاہوں میں فیصلہ کروں۔ اس پر نباش ناامید ہو کر واپس گیا اور جا کر انہیں رسولؐ کے جواب کی اطلاع دے دی۔

(المغازی للواقدی جلد ۲ صفحہ ۵۰۱)

دوسرا اس سے بھی زیادہ اہم ابو لبابہ کا واقعہ ہے جو تمام تاریخوں میں متفق علیہ صورت سے درج ہے۔

ابولبابہ بن عبدالمنذر بھی قبیلہ اوس کے معزز افراد میں سے تھے جن سے بنی قریظه کے خاص تعلقات تھے۔ جب پیغمبر خدا نے انہیں قطعی طور پر جواب دے دیا کہ تمہاری کوئی شرط منظور نہیں ہے تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ اچھا! آپ ابولبابہ کو ہمارے پاس بھیج دیجئے۔ حضرتؐ نے انہیں بلا کر فرمایا کہ تمہارے حلیفوں نے پورے قبیلہ اوس میں سے تمہارا نام لے کر تمہیں بلایا ہے جا کر سن لو وہ کیا کہتے ہیں؟

ابولبابہ جو گئے تو وہ سب سمٹ کر ان کی طرف آ گئے اور انہیں سابقہ تعلقات جو قبیلہ اوس سے رہے ہیں اور جس جس طرح انہوں نے مختلف مواقع پر قبیلہ اوس کی مدد کی تھی یاد لائے اور کہا کہ اب محاصرہ کی شدت سے ہماری جان لبوں تک آ گئی ہے اور رسول خدا ہمارے قلعہ سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوتے جب تک ہم غیر مشروط طور پر اپنے کو ان کے فیصلہ پر چھوڑ کر ہتھیار نہ ڈال دیں۔ اب ہم تم سے رائے لینا چاہتے ہیں کہ کیا ہم محمدؐ کے فیصلہ پر انحصار کرکے ہتھیار ڈال دیں۔ تاریخیں کہتی ہیں کہ انہوں نے زبان سے کہا ۔"ہاں" اور اس کے ساتھ ہاتھ اپنے حلق پر پھیر کے اشارہ کیا کہ نتیجہ ذبح ہونے کے سوا کچھ نہیں ہے اور اس کے بعد ہی انہوں نے فوراً اپنی غلطی کا احساس کیا کہ میں نے پیغمبرؐ اور اسلام کے

ساتھ ایک طرح کی خیانت کی ہے جس کے نتیجہ میں پیغمبر خداؐ یا مسلمانوں کے مجمع میں آنے کے بجائے سیدھے مسجد میں جاکر انہوں نے اپنے کو ایک ستون مسجد سے بندھوا لیا اور گریہ زاری کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں توبہ و انابت کرنے لگے۔ حضرت پیغمبر خداؐ کو ان کی کیفیت معلوم ہوئی۔ فرمایا کہ اگر وہ سیدھے میرے پاس آجاتے تو میں ان کے لئے بارگاہ الٰہی میں مغفرت کی دعا کر دیتا مگر جب وہ میرے پاس نہیں آئے تو اب اللہ ہی ان کے بارے میں جو فیصلہ کرنا ہوگا وہ کرے گا۔ پندرہ دن تک وہ اسی عالم میں رہے یہاں تک کہ روایتیں بتاتی ہیں کہ کمزوری کی وجہ سے ان کی آواز نہیں نکلتی تھی اور ان کی بات مشکل سے سمجھ میں آتی تھی۔ اس کے بعد وحی الٰہی ان کے بارے میں آئی اور رسولؐ نے ان کی توبہ قبول ہونے کا اعلان فرمایا۔ لوگ جلدی سے آئے کہ انہیں اس ستون سے کھول کر الگ کریں مگر انہوں نے انکار کیا اور کہا جب تک رسولؐ خود مجھے آزاد نہیں کریں گے میں رہا نہیں ہوں گا آخر حضرتؐ خود تشریف لائے اور انہیں قبول توبہ کا مژدہ سناتے ہوئے اپنے ہاتھ سے رہا فرمایا۔

(واقدی جلد ۲ صفحہ ۵۰۵ و ۵۰۷)

سزا کی سختی پر تبصرہ

مذکورہ بالا دونوں واقعوں پر جب ہم غور کرتے ہیں تو حسب ذیل نتائج واضح طور پر برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ بنی قریظہ کی اس خواہش کو کہ ہمارے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو بنی نضیر کے ساتھ ہوا تھا اور پھر صراحت" ان کی اس خواہش کو بھی کہ ہمیں جان کی امان دی جائے اور صرف عورتوں اور بچوں کے ساتھ چلا جانے دیا جائے۔ حضرتؐ نے مسترد فرما دیا۔ اس کے بعد یہ کیونکر سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرتؐ بذات خود ان کے بارے میں فیصلہ فرماتے تو وہ اس سے مختلف ہوتا جو سعد بن معاذ نے فیصلہ کیا۔

۲۔ آپ کا یہ رجحان کہ آپ بنی قریظہ کو امان دینے کے لئے بالکل تیار نہیں ہیں عام طور پر اصحاب کو معلوم ہو چکا تھا اور اس لئے ابو لبابہ نے جو بنی قریظہ

کی خواہش پر وہاں بھیجے گئے تھے ان کے اس سوال پر کہ کیا ہم رسولؐ کے فیصلہ پر انحصار کرکے ہتھیار ڈال دیں زبان سے تو "ہاں" کہہ دیا مگر اشارہ سے ظاہر کر دیا کہ اس کا نتیجہ قتل ہونے کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اسی لئے زمانہ حال کے بعض مصنفین نے یہ خیال ظاہر کیا کہ قدیم تاریخوں میں "ہاں" کا لفظ یہاں پر غلط درج ہوا ہے۔ اصل میں انہوں نے "نہیں" کہا ہوگا۔ کیونکہ "ہاں" کے ساتھ گلے پر تلوار پھرنے کا اشارہ کا جوڑ نہیں ہے مگر ہمارے خیال میں یہ درست نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ تحریر میں تو لفظ آتا ہے۔ کہنے والے کا لب و لہجہ نہیں آتا۔ گلے پر چھرا پھرنے کے اشارہ کے ساتھ "ہاں" کہنے کا انداز ایسا ہو سکتا ہے جس کا مطلب "نہیں" ہوتا ہو اور اس طرح انہوں نے بنی قریظہ کو صحیح صورت حال بتا کر حق دوستی ادا کر دیا جس پر بعد میں وہ بتقاضائے ایمان پشیمان ہوئے۔ حالانکہ اس سے اسلام یا پیغمبرؐ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا تھا۔ اسی لئے رسول خدا نے بذات خود اسے کوئی سنگین جرم نہیں سمجھا اور فرمایا کہ میرے پاس آتے تو میں ان کے لئے بارگاہ الٰہی میں استغفار کر دیتا۔ بہرحال ان کے اس اظہار حقیقت سے جو انہوں نے بنی قریظہ سے کیا یہ نمایاں ہو جاتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارادہ ان کی نسبت اصحاب کے علم میں ایسا ہی تھا جیسا بعد میں سعد بن معاذ کے فیصلہ سے ہوا۔

۳۔ جب کہ انہوں نے ابو لبابہ کو مشورہ کے لئے بلایا تھا اور ابو لبابہ نے انہیں پیغمبر خداؐ کے فیصلہ پر انحصار کا نتیجہ صفائی کے ساتھ بتا دیا تھا تو پھر ان کے اس صریحی مشورہ کے خلاف انہوں نے ایک دم رسولؐ ہی کے فیصلہ پر انحصار کرکے ہتھیار کیوں ڈالے ہوں گے؟ لہٰذا قدیم مورخین کا یہ کہنا کہ انہوں نے رسولؐ کے فیصلہ پر انحصار کیا۔ اس واقعہ سے قطعی میل نہیں کھاتا۔

ان امور پر نظر کرتے ہوئے بحیثیت واقعہ ہمارے نزدیک ترجیح تو علامہ طبری ہی کے قول کو ہے کہ یہودیوں نے ہی جناب سعد بن معاذ کو حکم بنا کر ان کے فیصلہ پر انحصار کیا کیونکہ یہ دیکھا جا چکا ہے کہ انہیں قبیلہ اوس کے ساتھ اپنے روابط پر

پورا بھروسا تھا اور اس بھروسے کا ثبوت مل گیا اس سے کہ انہوں نے ابولبابہ کو جو قبیلہ اوس میں ایک معزز حیثیت رکھتے تھے مشورہ لینے کے لئے بلایا۔

ممکن ہے کہ انہیں اس طرح یہ دیکھنا بھی ہو کہ قبیلہ اوس اب بھی اپنی دوستی پر قائم ہے یا نہیں اور ان کے اس اعتماد میں قوت پیدا ہو گئی۔ جناب ابولبابہ کے اس عمل سے کہ انہوں نے انہیں صحیح صورت حال سے مطلع کر دیا کہ رسولؐ کا ان کے بارے میں کیا ارداہ ہے؟ اس کے بعد انہیں رسولؐ کے فیصلہ پر انحصار کے بجائے کوئی ایسی راہ ڈھونڈھنا تھی کہ انہیں امان مل سکے وہ جانتے تھے کہ ابولبابہ معزز حیثیت کے شخص سہی مگر قبیلہ کے سردار جناب سعد بن معاذ ان سے بڑی شخصیت رکھتے ہیں اور انہیں حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں رسوخ بھی زیادہ حاصل ہے اس لئے انہوں نے ابولبابہ کے رجحان سے یہ اندازہ کر لینے کے بعد کہ قبیلہ اوس کے دل میں ہماری جگہ باقی ہے اب جناب سعد بن معاذ کو اپنے بارے میں ثالث کے لئے تجویز کیا اس امید کے ساتھ کہ وہ ہمارے ساتھ دوستی کے حقوق کا لحاظ کرتے ہوئے نرمی ضرور برتیں گے۔ اور رسول خدا شاید انکی تجویز کو مسترد نہ فرمائیں گے۔ اس لئے سعد بن معاذ کا نام بحیثیت حَکَم کے تجویز انہوں نے ہی کیا اور رسول اللہؐ نے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ان کے اخلاص ایمانی پر اعتماد فرماتے ہوئے اسے منظور کر لیا مگر سعد نے فیصلہ جو کیا وہ بنی قریظہ کے توقعات کے خلاف تھا اور وہ تھا جو خالق کی طرف سے ان کے لئے مقدر ہو چکا تھا اور وہ اس کے مستحق تھے۔

اس لئے یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ خود رسولؐ پر معاملہ چھوڑ دیا گیا ہوتا تو رسولؐ اس سے مختلف کچھ فیصلہ فرماتے بلکہ یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسولؐ بھی یہی فیصلہ فرماتے۔

اب جو فیصلہ رسولؐ فرماتے وہ سعد بن معاذ کی زبان سے ہوا جس کے بعد قدیم مورخین کے بیان کے مطابق قبیلہ اوس کی زبان بندی ہو گئی اور علامہ طبری نیز حال کے اردو تاریخ نگاروں کی تحریر کے لحاظ سے خود بنی قریظہ کو چون و چرا

کا موقع نہ رہا۔ اس لئے کہ خود ان کے منتخب کردہ حکم نے یہ فیصلہ کیا۔

بنی قریظہ کا انجام

بدنصیب بنی قریظہ کا انجام بلا شبہ بڑا عبرت ناک ہوا۔ جب انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور مجبور ہو کر قلعہ کے دروازے کھول دیئے تو پیغمبر خدا کے حکم سے سب کی مشکیں باندھ لی گئیں اور ان سب کو ایک جگہ کر دیا گیا اور عورتوں اور بچوں کو نکال کر دوسری طرف۔ پھر حکم ہوا کہ ان کے تمام اموال' اثاثہ اور اسلحہ کو جمع کیا جائے۔

تاریخ نے اس موقع پر اسلحہ کی پوری تفصیل دی ہے جس سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے مقابلہ کی کیسی تیاری کی تھی۔ پندرہ سو تلواریں' تین سو زرہیں' دو ہزار نیزے اور پانچ سو مختلف قسم کی سپریں' اس سب کے علاوہ شراب کا بہت ذخیرہ بھی تھا جسے رسولؐ کے حکم سے بہا دیا گیا باقی اور تمام سامان باہر نکال کر لے آیا گیا۔

(واقدی جلد ۲ صفحہ ۵۰۹)

اب سعد بن معاذ کے فیصلہ کی ان کے بارے میں جو دراصل قدرت کا فیصلہ تھا تکمیل ہونا تھی۔

اس دن مردوں کو ایک مکان میں بھیج دیا گیا جو اسامہ بن زید کا تھا اور عورتوں اور بچوں کو ایک خاتون کے مکان میں جو بنت حارث کہلاتی تھیں اور پیغمبر خدا کے حکم سے کھجور کے ٹوکرے دونوں جگہ بھیج کر پھیلا دیئے گئے جن پر دونوں جگہ کے قیدی ٹوٹ پڑے اور سب نے شکم سیر ہو کر ان کھجوروں کو کھایا جو عربوں کی ایک عام اور دل پسند غذا تھی۔

(واقدی جلد ۲ صفحہ ۵۱۲)

اسلحہ جنگ اور سامان و اسباب کو بھی بنت حارث کے مکان میں بھیجا گیا اور اونٹ نیز مویشی سب درختوں کے نیچے چرنے کے لئے چھوڑ دیئے گئے۔ یہاں تک

کہ یہ رات گزری اور دوسرے دن کی صبح طالع ہوئی۔

اب حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بازار کی طرف تشریف لائے اور حکم دیا کہ جا بجا گڑھے کھودے جائیں۔ بہت سے اصحاب گڑھوں کے کھودنے میں مصروف ہو گئے اور حضرت کچھ مخصوص اصحاب کے ساتھ ایک جگہ بیٹھ گئے۔ اتنی دیر میں گڑھے تیار ہوئے اور بنی قریظہ کے لوگوں کا ایک ایک دستہ لایا جاتا رہا اور ان کی گردنیں قلم ہوتی رہیں اور اس کام کو حضرت علیؑ اور زبیر انجام دے رہے تھے۔

بنی نضیر کا سردار حیی بن اخطب خاص طور پر رسولؐ کے سامنے لایا گیا۔ حقیقتاً یہی تھا جس نے بنی قریظہ کو اس مہلکہ میں ڈالا تھا جس کی تفصیل پہلے آ چکی ہے۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد اس کی بھی گردن مار دی گئی۔

یہ سلسلہ دوپہر تک جاری رہا۔ اب دھوپ کی شدت اور گرمی کی زیادتی ہو گئی۔

رسولؐ کے طرز عمل سے بالکل یہ بات نمایاں ہے کہ یہ ایک ناخوشگوار فریضہ ہے جو مجبوراً ادا کیا جا رہا ہے ان جرائم کی شدت کی بنا پر جن کا انہوں نے ارتکاب کیا تھا مگر اس کے ساتھ کوئی انتقام یا دشمنی کا جذبہ قطعاً نہیں ہے چنانچہ ان لوگوں پر جو قتل کیے جا رہے ہیں رسولؐ کی طرف سے ترحم کے جذبات بھی کار فرما ہیں۔ آپ نے فرمایا بس اب گرمی زیادہ ہو گئی ہے انہیں سایہ میں لے جاؤ اور لیٹنے کا موقع دو اور ٹھنڈا پانی پلاؤ۔ کہ انہیں سکون ملے پھر جو باقی رہ گئے ہیں دوسرے وقت انہیں قتل کرنا ایسا نہ کرو کہ سورج کی گرمی اور ہتھیار کی گرمی دونوں کو ان پر اکٹھا کر دو"۔ چنانچہ اصحاب انہیں لے گئے' آرام کی جگہوں پر رکھا اور کھانا پانی پہنچایا۔ جب ٹھنڈا وقت ہوا تو رسولؐ پھر برآمد ہوئے اور باقی افراد کو بلا کر انہیں قتل کرایا۔

(واقدی جلد ۲ صفحہ ۵۱۴)

ان مقتولین کی تعداد ساڑھے سات سو تک بتائی گئی ہے۔ (واقدی جلد ۲ صفحہ ۵۱۸)

اموال غنیمت ' نیز عورتوں اور بچوں کو کنیزوں اور غلاموں کی حیثیت سے فروخت کر دیا گیا جن کی تعداد ایک ہزار تھی۔

(واقدی جلد ۲ صفحہ ۵۲۳)

اس میں پیغمبر خدا کی طرف سے یہ تاکید کی گئی کہ کسی ماں سے اس کے بچہ کو اس وقت تک جدا نہ کیا جائے جب تک وہ حد بلوغ تک پہنچ نہ جائے۔

(واقدی جلد ۲ صفحہ ۵۲۴)

جناب سعد بن معاذ کی قبولیت دعا اور وفات

سعد بن معاذ کی دعا کی حیرت انگیز قبولیت کا ثبوت ہے کہ قضائے الٰہی ان کے بارے میں ان کی خواہش کے مطابق بس اس منظر کے آنکھوں سے دکھا دینے کی منتظر رہی۔ اس کے بعد وہ زخم جو انہیں جنگ خندق میں آیا تھا پھٹ گیا جس سے خون جاری ہو گیا اور بند نہ ہوا۔ یہاں تک کہ انہوں نے وفات پائی۔ حضرتؐ نے ان کے غم کو اتنی اہمیت دی کہ آپ نے ردا دوش مبارک سے اتاری اور ان کی لاش کے ساتھ پیادہ پا چلتے رہے یہاں تک کہ قبر تک پہنچایا اور وہ دفن ہو گئے۔

(اعلام الوریٰ)

آپ نے ارشاد فرمایا کہ ان کی موت سے عرش خدا ہلنے لگا۔

(شذرات الذہب ' جلد ۱ صفحہ ۱۱)

کچھ چھوٹی مہمیں

بنی قریظہ کے خاتمہ کے بعد تھوڑے عرصہ تک کچھ چھوٹی چھوٹی مہمیں جاری رہیں جیسے۔

غزوہ ذی قرد

اسے مولوی عبدالباری ایم۔اے نے ذی الحج ۶ ہجری یا محرم ۷ ہجری میں بتایا

ہے مگر یہی تاریخ انہوں نے جنگ خیبر کی بھی لکھی ہے۔

(دعوت دہلی سیرۃ طیبہ نمبر ۱۶ ستمبر ۱۹۵۹ء ۱۲ ربیع الاول ۱۳۷۹ھ صفحہ ۱۸۳)

جو صلح حدیبیہ کے بعد ہے مگر دوسرے مورخین نے غزوہ ذی قرد کا وقوع ۶ ہجری کے ماہ ربیع الاول میں بتایا ہے۔ (اعیان الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۲۴۵) اور حدیبیہ کی صلح اس سال کے ماہ ذیقعد میں ہوئی ہے اور پھر ۷ ہجری کے شروع میں جنگ خیبر ہے۔

ذو قرد (ق اور ر دونوں کے فتحہ کے ساتھ) شام کی راہ مدینہ سے ایک منزل دور ایک چشمہ کا نام تھا وہیں یہ جنگ ہوئی تھی۔

(اعیان الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۲۴۵)

غزوہ دومتہ الجندل

یہ ایک پہاڑ کا نام ہے جو کوفہ اور دمشق کے درمیان ہے۔ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ حضرتؐ کو خبر ملی کہ یہاں ایک کثیر جمعیت اکٹھا ہو گئی ہے جس نے اس طرف سے گزرنے والے قافلوں کے لئے خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ یہ سن کر حضرتؐ ایک ہزار مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ ان کے تدارک کے لئے تشریف لے گئے۔ آپ کی آمد کی خبر سن کر ہی وہ پوری جماعت منتشر ہو گئی۔ حضرتؐ نے وہاں چند روز قیام فرما کر ضروری انتظامات فرمائے اور ایک مہینے سے بھی چند دن زیادہ کی مدت اس سفر میں گزارنے کے بعد مدینہ واپس ہوئے۔

(مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۲۵۰ - ۲۵۱)

غزوہ بنی لحیان

اس کے لئے محدث دہلوی نے بتایا ہے کہ وہ ۶ ہجری کے ربیع الاول یا جمادی الاول میں واقع ہوا اور بعض نے کہا ہے کہ ۵ ھ میں۔ نتیجتاً یہاں بھی بغیر جنگ مخالفین نے فرار اختیار کیا اور رسولؐ نے چودہ دن کے بعد مراجعت فرمائی۔

(مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۲۵۵، ۲۵۶)

غزوہ بنی مصطلق

تاریخ میں ہے کہ پھر پیغمبر خداؐ نے شعبان ۶ ھ تک مدینہ میں قیام فرمایا۔ اس

کے بعد غزوہ بنی مصطلق وقوع میں آیا۔

(تاریخ ابن خلدون مطبوعہ ۱۹۶۵ء جلد ۲ صفحہ ۷۸۱)

ابن العماد حنبلی نے بھی اس غزوہ کا ۶ ہجری کے واقعات میں ذکر کیا ہے۔

(شذرات الذہب جلد ا صفحہ ۱۱)

یہ وہ مہمیں ہیں جن میں خود پیغمبر خداؐ تشریف لے گئے اس لئے وہ اصطلاحا" غزوہ کہلاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ سرایاء ہیں یعنی ایسی مہمیں جن میں صحابہ میں سے کسی کو سردار بنا کر بھیج دیا گیا ہے ان میں کوئی خاص اہمیت ایسی نہیں ہے کہ ان کا یہاں کوئی تفصیلی تذکرہ کیا جائے۔

معرکہ حدیبیہ یا صبر و ایمان کا امتحان

حدیبیہ بالتخفیف (یعنی بغیر تشدید یاء) (اعیان الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۳۴۷)

حدیبیہ کے واقعہ کو معرکہ کہنے پر ان لوگوں کو جو اس کی نوعیت سے سطحی طور پر واقف ہیں تعجب ہو گا مگر میں اسے بہت بڑا معرکہ سمجھتا ہوں۔ اور حقیقتاً وہ بڑا معرکہ ہے۔ اس اعتبار سے کہ اس میں صبر و ثبات اور ایمان و استقامت کا اتنا بڑا امتحان ہوا جیسا کسی دوسرے اس معرکہ کار زار میں بھی نہ تھا جہاں جانوں کی بازی لگانا پڑتی تھی۔

اس کی تفصیلی کیفیت مجملاً ذیل میں درج کی جاتی ہے جس میں لازماً کچھ وہ واقعات درج ہوں گے جنہیں میں نے خود اپنی دوسری کتابوں میں درج کیا ہے اور ان پر تبصرہ بھی کیا ہے۔

واقعہ کا پس منظر

پہلے منظر اس معرکہ کا مسٹر کے۔ اے حمید بی۔ اے (لندن) بیرسٹر ایٹ لاء لاہور کے الفاظ میں سنئے۔

"اگرچہ مسلمانوں کی حالت پہلے سے بہتر ہو چکی تھی تاہم وہ باسانی مکہ نہیں جاتے تھے۔ ان کے دلوں میں ہر سال حج کی تڑپ اٹھتی اور نہایت بے قرار کرتی ایک روز حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں اور تمام صحابہ خانہ

کعبہ کا طواف کر رہے ہیں ' خواب سن کر مسلمان پہلے سے زیادہ بے چین ہو گئے"۔

(تاریخ مسلمانان عالم حصہ اول صفحہ ۷۹-۸۰)

یہیں یہ سمجھ لیجئے کہ اس خواب سے کسی طرح یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ منظر اسی سال سامنے آ رہے گا' اس لئے اگر بعد میں ناگزیر اسباب کی بناء پر اس سال راستے ہی سے واپسی ہو جائے تو ایمان بالرسالت کا مطالبہ یہی ہے کہ یہ یقین رکھا جائے کہ اب کی نہ سہی تو اس کے بعد یہ منظر سامنے آ کر رہے گا لیکن اس وقت کے مسلمانوں کی اکثریت اس نکتہ کو نہ سمجھ سکی اور اس طرح یہ معاملہ ایک بڑے ابتلاء کا ذریعہ بن گیا جس کی کیفیت بعد میں آوے گی۔

یہ بھی شاید اسی امتحان کے مقصد سے ایک حکمت الہی تھی کہ اس موقع پر ہمارے رسولؐ کے لئے جو عام طریقہ وحی کا تھا کہ ملک آئے اور پیغام الہی پہنچائے' یہ صورت اختیار نہیں کی گئی۔ یعنی یہ نہیں ہوا کہ فرشتہ نے آ کر یہ فرمان الہی رسولؐ تک پہنچایا ہو' کہ آپ اس سال جا کر مناسک حج کو انجام دیجئے بلکہ خالق نے خواب دکھلا کر یہ تحریک پیدا کر دی کہ مسلمان اپنے مدت سے چھپے ہوئے اضطراب کی بناء پر جو کعبہ کو دیکھنے کے اشتیاق سے ہے پیغمبر خداؐ سے اصرار کریں کہ بس اب جلدی تشریف لے چلئے اور پھر کشاں کشاں وہ سب صورتیں سامنے آئیں جن کے نتیجہ میں رسولؐ کی رواداری دنیا کے سامنے آئے اور مشرکین سے عدم تعرض کا ایک کافی مدت تک کے لئے معاہدہ ہو جس کے نتیجہ میں پرامن فضا میں اسلامی ترقی کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہوں۔ یہ سب اسباب اس ایک خواب سے فراہم ہوئے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مبہم انداز میں دیکھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے زمانہ حج کے آنے کا انتظار بھی نہ کیا اور قبل ہی بطور عمرہ پیغمبر خداؐ کو چلنے پر آمادہ کر دیا۔ چنانچہ حضرت یکم ذیقعد ٦ ھ کو مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔

(تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ٦٦)

ممکن ہے اس میں رسول خداؐ کی طرف سے بھی امن پسندی کا یہ پہلو مضمر ہو کہ ہم اس موقع پر جب تمام قبائل کا مکہ میں ہجوم ہوتا ہے آکر کچھ سیاسی مقصد حاصل کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس کے پہلے ہی جب کہ مکہ کی وادی خالی ہوتی ہے سکون و خاموشی کے ساتھ چاہتے ہیں۔ زیارت مکہ معظمہ کے آداب و رسوم انجام دے لیں۔

مسلمانوں کی جمعیت جو حضرتؐ کے ساتھ تھی چودہ سو آدمیوں کی تھی۔ (تاریخ ابن الوردی جلد ۲ صفحہ ۱۲۴) جیسا کہ خواجہ محمد لطیف صاحب نے لکھا ہے۔

"تلوار کے سوا کوئی اسلحہ کسی مسلمان کے پاس نہیں تھا اور تلوار ایک ایسا ہتھیار تھا جسے عرب کسی حالت میں اپنے جسم سے الگ نہیں کرتے تھے"۔

(اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد ۱ صفحہ ۱۲۰، ۱۲۱)

پھر یہ کہ آپ کے ساتھ ستر بدنے (قربانی کے اونٹ) تھے۔ (طبری جلد ۳ صفحہ ۷۳) جس سے صاف ظاہر تھا کہ آپ لڑائی کے لئے نہیں جا رہے ہیں مگر جب قریش کو رسولؐ کے آنے کی خبر پہنچی تو وہ خالد بن ولید کی قیادت میں "کراع الغمیم" کے مقام تک رسول کا راستا روکنے کے لئے نکل آئے۔

جیسا کہ ہم نے "شہید انسانیت" میں لکھا ہے کہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی ہمتیں اس کے قبل کے حاصل شدہ پے در پے فتوحات سے بڑھی ہوئی تھیں اور سامنے وہی شکست خوردہ جماعت تھی جو اس وقت جنگ کے لئے پہلے سے تیار بھی نہ تھی اس لئے یہ بہت آسان تھا کہ رسولؐ مقابلہ کا حکم دے دیتے اور فاتحانہ صورت سے مکہ میں داخل ہوتے مگر پیغمبر اسلامؐ کو امن پسندی کا ثبوت دینا تھا۔ جونہی گرد و غبار اٹھتا ہوا نظر آیا آپ نے فرمایا اس راستے کو چھوڑ دو، کسی دوسرے راستے سے آگے نکل چلو۔ چنانچہ دائیں جانب کا رخ کیا گیا اور آپ "حمض" کی پشت پر سے "ثنیۃ المرار" ہوتے ہوئے حدیبیہ کو جو راستہ جاتا ہے، ادھر متوجہ ہوئے۔

(طبری جلد ۳ صفحہ ۷۳)

مسٹر کے ۔ اے حمید لکھتے ہیں۔

"عربی قانون کے مطابق حج کے ایام میں ہر شخص کو حق حاصل تھا کہ وہ آزادی سے فریضہ حج ادا کرے مکہ ابھی نو میل کی مسافت پر تھا کہ یہ قافلہ حدیبیہ کے مقام پر قیام پذیر ہوا اور حضرت عثمان کو بطور سفیر مکہ روانہ کیا کہ حج کے شرائط اہل مکہ سے طے کرائیں"۔

(اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد ۱ صفحہ ۱۲۰،۱۲۱)

مگر جب عربی قانون کے مطابق ہر شخص کو حق تھا تو اس کے لئے کسی کو شرائط عائد کرنے کا کیا حق تھا اور پھر شرائط طے کرانے کے لئے کسی کو بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟

حضرت عمر کفار مکہ سے خوف زدہ تھے

بلکہ صحیح وہ معلوم ہوتا ہے جو تاریخ ابن وردی میں ہے کہ آپ نے ایک قاصد بھیجا۔ یہ اطلاع دینے کے لئے کہ ہم جنگ کے واسطے نہیں آئے صرف خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے آئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ پہلے آپ نے حضرت عمر کو بلایا کہ تم جا کرانہیں یہ اطلاع دو۔ انہوں نے مشرکین سے اپنے لئے خطرہ ظاہر کرتے ہوئے تعمیل ارشاد سے معذوری ظاہر کی۔ اب حضرتؐ نے جناب عثمان کو بلایا۔ وہ چونکہ بنی امیہ میں سے تھے تو وہ سیدھے اپنی برادری والوں کے پاس گئے اور ابو سفیان کو حضرتؐ کا پیغام پہنچا دیا۔ مشرکین نے کہا کہ تم طواف کرنا چاہو تو کر سکتے ہو مگر انہوں نے کہا' نہیں' میں بغیر رسول خداؐ کے طواف نہیں کروں گا۔ یہ سن کر انہوں نے حضرت عثمان کو قید کر لیا۔

(ابن الوردی طبع مصر ۱۲۷۵ھ جلد ۱ صفحہ ۱۲۵)

اسی مضمون کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس طرح لکھا ہے۔

خواجہ عالم روئے بعمر خطاب آورد ، گفت ترا بمکہ باید رفت و معقول ساخت کہ ما داعیہ جنگ نداریم و بزیارت عمرہ آمدہ ایم۔ عمر گفت یا رسول اللہ بر حضرت روشن ست کہ عداوت قریش با من درچہ درجہ است و شدت و غلظت من

بایں قوم درچہ مرتبہ اگر بر من دست یا بند بے شک زندہ نہ گزارند و در مکہ از بنی عدی کے نیست کہ مرا از شرایشاں حمایت کند و صیانت نماید۔ اگر عثمان بن عفان را فرستی مناسب ترمی نماید کہ وے نزد قریش عزیز تر است و اقارب و عشایر او در مکہ بسیار اند

(مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۲۸۱)

سرور کائناتؐ حضرت عمر کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تمہیں مکہ جانا ہے اور انہیں سمجھانا ہے کہ ہم جنگ کی خواہش نہیں رکھتے اور صرف عمرہ بجا لانے کے لئے آئے ہیں۔ عمر نے کہا یا رسول اللہؐ آپ پر ظاہر ہے کہ قریش کو مجھ سے کس درجہ دشمنی ہے اور میری سختی اس قوم کے خلاف کس حد تک رہی ہے۔ اگر میں ان کے ہاتھ آ جاؤں تو بلا شبہ زندہ نہیں چھوڑیں گے اور مکہ میں میرے قبیلہ عدی کا کوئی شخص نہیں ہے جو مجھے ان کے شر سے بچائے اور میری حفاظت کرے اگر عثمان بن عفان کو بھیجئے تو زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ قریش کو زیادہ عزیز ہیں اور ان کے قوم و قبیلہ والے مکہ میں بہت ہیں۔

معلوم ہوا کہ جناب عثمان کوئی شرائط طے کرانے نہیں بھیجے گئے تھے بلکہ صرف رسولؐ کی تشریف آوری کی نوعیت بتانے کے لئے گئے تھے۔ مسٹر کے۔ اے حمید لکھتے ہیں۔

"وہ اپنے عزیز ابان بن سعد کی حمایت میں مکہ گئے اور رسول اللہؐ کا پیغام سنایا۔ قریش نے ان کو نظربند کر لیا لیکن افواہ یہ پھیل گئی کہ اہل مکہ نے حضرت عثمان کو قتل کر دیا ہے۔اس سے مسلمانوں میں بہت ہیجان و جوش پیدا ہو گیا۔ اگرچہ وہ بغیر ہتھیار کے آئے تھے تاہم وہ مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔"

(تاریخ مسلمانان عالم جلد ۱ صفحہ ۸۰)

اگرچہ اس مصنف کا قلم عموماً" غلط راہوں پر جاتا ہے مگر یہاں اتفاقاً" نوعیت واقعہ کے اظہار میں اس کے قلم سے صحیح الفاظ نکل گئے ہیں برخلاف پہلے ان کے مورخین کے جنہوں نے اس کی نسبت براہ راست رسول خداؐ کی طرف دی ہے کہ

آپ کو قتل عثمان کی غلط خبر پہنچی تو آپ نے یہ طے کر لیا کہ اب ان سے جنگ کرنا ضروری ہے۔

(تاریخ ابن الوردی جلد ۱ صفحہ ۱۲۵)

صحابہ سے اس امر پر بیعت لی گئی کہ وہ جنگ سے فرار نہیں کریں گے

بعد میں جو بیعت لی گئی ہے وہ بھی در حقیقت اس کی مظہر ہے کہ مسلمان خود جنگ پر مصر تھے اور پر جوش طریقہ پر مطالبہ کر رہے تھے کہ بس اب حملہ کر دیجئے مگر اس کے پہلے احد کے معرکہ میں جو تلخ تجربہ ہو چکا تھا اس کے پیش نظر اب ضرورت سمجھی گئی کہ دوبارہ ان لوگوں سے بیعت کی تجدید کی جائے اس شرط کی صراحت کے ساتھ کہ وہ میدان جنگ سے فرار نہیں کریں گے۔

عام حالات میں ایسے بہادروں کے لئے جو ہمیشہ جان کی بازی لگاتے رہے ہوں اس قسم کی شرط باعث ننگ محسوس ہوتے ہوئے بار خاطر ہونا چاہیے تھی مگر کیا کیا جائے کہ اکثریت اپنے کردار کی زمین میں نشیب محسوس کر رہی تھی اس لئے جوش جنگ میں وہ اس شرط پر بیعت کرنے کے لئے بھی بلا تکلف تیار ہو گئی۔

اسی کو بعض لوگوں نے انداز تعبیر میں ذرا خوشنمائی پیدا کرنے کے لئے یوں کہا کہ یہ بیعت "موت" پر لی گئی جسے مسٹر کے۔ اے حمید نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے کہ۔

"ایک درخت کے نیچے چودہ سو آدمیوں نے بیعت کی کہ اگر ضرورت ہو تو اسلام پر جان دینے کے لئے تیار ہیں"۔

تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانہ ہی کے بعض راویوں نے "فرار" کے تلخ تذکرہ سے بچتے ہوئے اس تعبیر کو اختیار کیا تھا مگر جناب جابر بن عبداللہ انصاری ایک معزز صحابی نے اس پردہ کو بالکل چاک کر کے جو بات تھی وہ صاف کہہ دی۔

ابن الوردی رقم طراز ہیں۔

کان یقال بایعھم رسول اللہ علی الموت و کان جابر یقول لم یبا یعنا الا علی انا لا نفر

(تاریخ ابن الوردی جلد ۱ صفحہ ۱۲۵)

کہا جاتا تھا کہ پیغمبر خداؐ نے ان سے موت پر بیعتؓ لی اور جابر کہا کرتے تھے کہ رسولؐ نے ہم سے بیعت نہیں لی مگر اس بات پر کہ ہم بھاگیں گے نہیں۔

ابوالفدا کے الفاظ ہیں۔

کان الناس یقولون بایعھم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی الموت و کان جابر یقول لم یبا یعنا الا علیٰ اننا لا نفر

(تاریخ ابوالفداء)

لوگ کہتے تھے کہ رسولؐ نے ان سے موت پر بیعت لی اور جابر کہتے تھے کہ ہم سے بیعت نہیں لی مگر اس بات پر کہ ہم فرار نہیں کریں گے۔

اسی لئے قدیم ترین مورخ واقدی نے بطور اصل حقیقت اسی کو درج کیا ہے اور پہلے الفاظ کو قائل غیر معلوم کی طرف نسبت دے کر لکھا ہے۔ اسطرح:۔

فبایعھم علیٰ ان لا یفروا و قال قائل بایعھم علی الموت

(کتاب المغازی جلد ۲ صفحہ ۶۰۳)

حضرتؐ نے ان سے بیعت لی اس پر کہ وہ فرار نہیں کریں گے اور کسی نے یوں کہا کہ آپ نے ان سے موت پر بیعت لی۔

اور متاخرین میں شاہ عبدالحق دہلوی نے اس دوسری تعبیر سے صرف نظر ہی کر دیا اور پہلے ہی مضمون کو ذرا پر تکلف عبارت میں تحریر کر دیا کہ۔

پشت مبارک بدرخت نہاد و صحابہ را بہ بیعت دلالت کرد کہ ثابت قدم باشند و اگر جنگ واقع شود روئے نہ گردانند

(مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۲۸۲)

حضرت نے پشت مبارک درخت سے لگائی اور صحابہ کو بیعت کی طرف رہنمائی فرمائی کہ ثابت قدم رہیں اور اگر جنگ ہو جائے تو منہ نہ پھرائیں۔

غور کیا جائے تو اس تعبیر کا بھی "موت پر بیعت لی" مطلب یہی ہوتا ہے کہ موت سے بھاگیں گے نہیں کیونکہ جان جانے کا امکان تو جہاد کے میدان میں آ

جانے سے لازماً پیدا ہی ہو جاتا ہے۔ "اب جان دینے کے لیے تیار ہیں"۔ کے معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ میدان میں جانے کے بعد پھر جان بچانے کی کوشش نہیں کریں گے اور وہاں جا کر پھر جان بچانے کی کوشش کا مطلب فرار ہی ہو سکتا ہے اور اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ کیا یہ کہ تلوار آتی ہو تو سپر سے روکیں گے بھی نہیں یا وار پڑتا ہو تو اسے خالی بھی نہ دیں گے تو پھر جان دینے کے لئے تیار ہیں' کیا معنی؟ یہی کہ میدان سے فرار اختیار نہیں کریں گے۔

علامہ طبری تحریر فرماتے ہیں۔

فبا یعوہ تحت الشجرۃ علٰی ان لا یفروا عنہ ابداً"

(اعلام الوریٰ)

ان سب نے درخت کے نیچے آپ سے بیعت کی اس بات پر کہ وہ آپ کو چھوڑ کر کبھی فرار نہیں کریں گے۔

اس "کبھی" کے لفظ میں بڑی اہمیت ہے اس سے ظاہر ہے کہ عدم فرار کا عہد صرف اسی وقت جنگ سے جو وقوع ہی میں نہ آئی مخصوص نہ تھا بلکہ اس کے بعد بھی مدت العمر کسی بھی لڑائی سے فرار نہ ہونے کا عہد لیا جا رہا تھا۔

کیا صحابہ بیعت پر قائم رہے؟

اب اگر بد نصیبی سے تاریخ حنین میں پھر احد کا منظر پیش کر دے جس کے لئے آئندہ کے صفحات کا انتظار کرنا پڑے گا تو ماننا پڑے گا کہ اس وقت کی بیعت پر بھی بیعت کرنے والے برقرار نہیں رہے اور اس کے بعد مرضات الٰہی کے وعدے کا جو اس بیعت کی بنا پر اللہ کی جانب سے ہوا ہے انجام معلوم ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

مذکورہ صورتحال کو دیکھتے ہوئے کہ ادھر سے جناب عثمان اس اطلاع کے ساتھ بھیجے گئے کہ ہم صرف خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے آئے ہیں ہمیں حج کرنا نہیں ہے اور ان لوگوں نے جناب عثمان کو قید کر لیا جس پر یہاں یہ افواہ اڑ گئی کہ وہ قتل کر دیئے گئے اور اس کے بعد مسلمان مرنے اور مارنے پر تیار ہو گئے' اب کتنے بے

جوڑ ہیں مسٹر کے۔ اے حمید کے یہ الفاظ کہ ۔

"آخر حضرت عثمان کی وساطت سے اہل مکہ اور مسلمانوں کے درمیان ایک معاہدہ لکھا گیا"۔ (مسلمانان عالم جلد ۱ صفحہ ۸۱)

جب وہ وہاں قید تھے ان کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آنے جانے اور کچھ گفتگو کرنے کا موقع ہی نہ تھا تو ان کی "وساطت" کیونکر ہوئی اور اس "وساطت" کے ذریعہ کوئی معاہدہ ہونے کا کیا امکان رہا؟ بلکہ واقعہ یہ ہے جیسا کہ دوسرے مورخین نے لکھا ہے کہ انہوں نے اس بیعت کے واقعہ کے بعد خود اپنی طرف سے سہیل بن عمرو کو بھیجا اور اس نے شرائط صلح طے کیے۔

(ابن الوردی جلد ا صفحہ ۱۲۵ و ابو الفدا جلد ا صفحہ ۱۴۶ وغیرہ)

مورخین اکثر بیان واقعہ میں درمیانی کڑیاں چھوڑ دیتے ہیں اس لئے سہیل بن عمرو کے آنے کے بعد بس تحریر صلح نامہ کا حال لکھنے لگتے ہیں حالانکہ لازماً اس کے درمیان یہ کڑی ہے کہ اس نے آکر پہلے زبانی مشرکین کا یہ پیغام سنایا کہ آپ لڑنا نہیں چاہتے تو بلا وجہ لڑنا ہمیں بھی منظور نہیں ہے مگر اپنے جذبات کے لحاظ سے اپنی آنکھوں سے آپ کو مکہ میں داخل ہوتے اور آزادی کے ساتھ عبادت کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔یا جیسا کہ انہوں نے جناب عثمان کے پیغام پہنچانے پر کہا تھا کہ اس میں عرب میں ہماری سبکی ہوگی اور لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ آپ طاقت کے بل پر ہمارے علی الرغم مکہ میں داخل ہوئے لہٰذا اس سال بغیر مراسم زیارت انجام دیئے ہوئے واپس چلے جایئے اور ہمارے آپ کے درمیان ابھی سے قرار داد ہو جائے کہ آپ آئندہ سال آئیں گے اور مراسم عمرہ انجام دیں گے اس طرح کہ ہم تین دن کے لئے مکہ خالی کر دیں گے کہ آپ آزادی کے ساتھ اپنی عبادتیں جس طرح چاہیں انجام دے لیں۔

ان کے پیش نظر اس میں یہ مقصد تھا کہ اس طرح پہلے یہ چرچا ہو گا کہ ہم نے خود انہیں ایک سال پہلے یہ اجازت دے دی تھی کہ وہ اس طرح مکہ میں آکر اپنے رسوم ادا کریں۔ اس طرح اس سے ہماری کسی کمزوری کا ثبوت نہیں ہوگا۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یقیناً زبانی گفتگو میں اس پر تیار ہونے کا اظہار فرما دیا ہوگا پھر کتابت عہد نامہ کی نوبت آئی۔

صلح حدیبیہ کا اصل مقصد

غالباً" اس زبانی گفتگو میں مشرکین نے یہ محسوس کر لیا کہ حضرتؐ کسی وجہ سے اس وقت جنگ کرنا نہیں چاہتے اور اس وقت جنگ ہو جانے کو وہ اپنے لئے نقصان رساں خیال فرماتے ہیں۔ جس نکتہ کو بہت سے مسلمان اس وقت نہیں سمجھ رہے تھے اور بعد میں بہت عرصہ تک نہ سمجھے اسے پوری تفصیل کے ساتھ نہیں تو مجمل طور پر مشرکین کا نمائندہ سمجھ گیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جہادوں کی نوعیت بتاتے ہوئے جو ہم اس مسلمہ حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ ہمیشہ مشرکین چڑھائی کرکے آئے اور رسول خداؐ کو دفاعی حیثیت سے جنگ کرنا پڑی۔ جس پر پہلے حصہ میں کافی بسیط بحث آ چکی ہے۔ یہ ہمارا دعویٰ بڑی حد تک مجروح ہو جاتا' اگر اس وقت پیغمبر خداؐ جنگ کرکے فاتحانہ طور پر مکہ میں داخل ہوتے پھر یہ کہنے کو ہو جاتا کہ دیکھیے جب طاقت حاصل ہو گئی تو رسولؐ چڑھائی کرکے گئے اور دشمن پر حملہ آور ہوئے۔

مگر اس وقت جب یہ موقع آنے لگا تو پیغمبر خداؐ نے ایسے شرائط پر صلح کرکے واپسی اختیار کی جنہیں عام مسلمان اپنے وقار کے خلاف تصور کر رہے تھے اور اس واپسی کو اپنی شکست قرار دے رہے تھے مگر بعد میں آئے گا کہ خالق کریم نے اسے رسولؐ کی ایک بڑی کھلی ہوئی فتح قرار دیا۔

کم ظرف آدمی جب یہ سمجھ لیتا ہے کہ فریق مخالف کسی اپنے اصول کی بناء پر سہی اس وقت تلوار اٹھانے کے لئے آمادہ نہیں ہے تو پھر اس کی ہمت بڑھ جاتی ہے چنانچہ یہاں مشرکین کے نمائندہ نے یہ محسوس کر لیا تھا' اس کا ثبوت اس کے رویہ سے ملتا ہے۔ اگر صورت حال یہ ہوتی کہ مسلمانوں کے جنگ پر جوش و خروش سے خوف زدہ ہو کر انہوں نے سہیل بن عمرو کو بھیجا تھا تو اس کا تقاضا یہ ہونا چاہئے تھا کہ سہیل کی طرف سے عاجزانہ رویہ اختیار کیا جاتا اور اگر سمجھوتے

میں ادھر سے کوئی رکاوٹ پیدا بھی ہوتی تو وہ ایک طرح کی پسپائی اختیار کرکے اس رکاوٹ کو دور کرتا مگر یہاں صورت حال اس کے بالکل برعکس نظر آتی ہے یعنی جب صلحنامہ کی کتابت شروع ہوتی ہے تو مشرکین کا نمائندہ ہر ہر قدم پر جھگڑا ڈالتا اور رکاوٹ پیدا کرتا ہے اور پیغمبر خداؐ قدم قدم پر اس کی ہر بات کو تسلیم کرتے ہوئے صلح کی کارروائی کو آگے بڑھاتے ہیں۔

صلحنامہ حدیبیہ کے شرائط

مسٹر کے اے حمید جنہوں نے اس صلحنامہ کا سہرا بلا وجہ جناب عثمان کے سر باندھ دیا ہے صلحنامہ کا مسودہ لکھے جانے سے پہلے جیسے کسی ذریعہ سے اس کے شرائط پر مطلع ہو گئے چنانچہ وہ رقم طراز ہیں کہ۔

آخر حضرت عثمان کی وساطت سے اہل مکہ اور مسلمانوں کے درمیان ایک معاہدہ لکھا گیا جس کی شرائط حسب ذیل تھیں۔

۱۔ یہ عہد نامہ فریقین کے درمیان ایک سال تک قائم رہے گا۔ اس دوران میں جانبین مکہ مدینہ میں بے خوف و خطر آ جا سکتے ہیں۔

۲۔ عرب کے جو قبائل قریش سے ملنا چاہیں بلا خوف ان سے مل جائیں اور جو مسلمانوں سے ملنا چاہیں مسلمانوں سے مل جائیں۔ مسلمانوں سے ملنے والے قبائل کے حقوق وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں۔

۳۔ آئندہ سال مسلمانوں کو حج کی اجازت ہوگی' مگر وہ ہتھیار لگا کر مکہ میں داخل نہ ہو سکیں گے۔

۴۔ اگر قریش میں سے کوئی شخص مسلمان ہو کر مدینہ چلا جائے تو مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ اسے فوراً واپس کر دیں۔ اگر مسلمانوں میں سے کوئی شخص مرتد ہو کر قریش سے آ ملے تو قریش اسے ہرگز واپس نہ کریں گے۔

آخری شرط پڑھ کر حضرت عمر فاروق بھڑک اٹھے' مگر رسول اللہؐ نے سمجھا کر ان کی تسلی کر دی اور قریش کی شرائط مان لی گئیں۔ معاہدہ کا مسودہ حضرت علیؑ لکھنے بیٹھے"۔

(تاریخ مسلمانان عالم جلد ۱ صفحہ ۸۱)

اب یہ سوال بالکل کھلا ہوا ہے کہ جب بقول آپ کے حضرت عثمان کی وساطت سے معاہدہ لکھا جا چکا تھا تو اب حضرت علیؑ کیا چیز لکھنے بیٹھے؟ اس کے علاوہ آئندہ کے تفصیلات سے ظاہر ہوگا کہ حضرت عمر صرف آخری شرط پر نہیں بھڑکے تھے بلکہ وہ اس پورے طریق کار یعنی اس موقع پر بغیر حج کئے ہوئے واپس جانے اور صلحنامہ کرنے سب ہی سے اختلاف رکھتے تھے اور وہ تحریر معاہدہ کے پہلے رسولؐ کے سمجھانے سے سمجھ بھی نہیں گئے تھے بلکہ معاہدہ لکھے جانے کے بعد بھی وہ اس کے مخالف رہے اور ان کی ناراضگی اس سے برابر شدت کے ساتھ ظاہر ہوتی رہی اور نہ صرف وہ بلکہ مسلمانوں کی اکثریت اس سے ناراض تھی۔

اسلام میں جمہوریت نام کی کوئی چیز نہیں

اب اسے شوریٰ کو جزو دین کہنے والے اور اسلام اور پیغمبر اسلام کو سو فیصدی نظام جمہوری کا پابند بتانے والے حل کر سکتے ہیں کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین سے کسی سمجھوتے کے پہلے مجلس شوریٰ کیوں مرتب نہیں فرمائی اور پھر اکثریت کے خیالات کے ظاہر ہو جانے کے بعد اس کی پیروی کیوں نہیں فرمائی؟

حدیبیہ میں تو صاف یہی نظر آتا ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منجانب اللہ بذات خود اپنے کو صاحب اختیار جانتے ہیں اور عام مسلمانوں کی رائے کے خلاف اپنے فیصلہ پر قائم ہی نہیں رہتے بلکہ بتقاضائے ایمان و اسلام خود مسلمانوں کو اپنے فیصلہ کے سامنے سر جھکا دینے پر مجبور فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے مشرکین سے بات چیت میں کسی کو اپنے ساتھ شریک کیا اور نہ پھر ان کے شرائط کے باب میں کسی سے کوئی رائے لی اور نہ ان کی مخالفت کے ظاہر بظاہر ثبوت کے بعد اس کی کوئی پروا کی بلکہ شروع سے آخر تک ہر قدم صرف اپنی صوابدید کے مطابق اٹھایا جس کے پس پشت منشائے الٰہی کی تکمیل تھی جو خواہ بذریعہ وحی پہنچی ہو حالانکہ قرآن میں اس موقع کی کوئی آیت درج نہیں ہے جو طریق کار

کے متعلق آپ کو کسی ہدایت کی حامل ہو اور خواہ یہ وہ وحی باطنی ہو جس کا سلسلہ برابر مرکز سے قائم رہتا تھا جس سے فرشتے کا بھی کوئی دخل نہ تھا چہ جائیکہ کوئی انسان۔

صلح کے لئے صحابہ سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا

حدیبیہ کے معاملہ میں بہت نمایاں صورت یہ ہے کہ اس پوری کارروائی میں ادھر سے مشرکین کا نمائندہ سہیل بن عمرو ہے اور ادھر سے صرف دو شخصیتیں منظر عمل میں ہیں۔ ایک خود رسول خداؐ جو اصل کارفرما ہیں اور دوسرے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ جن کے ہاتھ سے صلحنامہ لکھا جا رہا ہے۔ باقی تمام مسلمان اور ان کے اہل الرائے افراد صرف تماشائی ہیں اور اپنی جگہ تلملا رہے ہیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اور کیوں ہو رہا ہے اور ادھر سے ان کی جانب قطعاً" اعتنا نہیں ہے کہ ان کے چہروں کے رنگ کیا ہو رہے ہیں اور ان کی آپس کی سرگوشیاں کیا ہیں اور ان کے چشم و ابرو کے اشارے کیا ہو رہے ہیں؟

کیا اس سے بڑھ کر مہمات دین میں جمہور کے جذبات کی بے وقعتی اور کچھ ہو سکتی ہے؟

اور ادھر سے سہیل بن عمرو بھی یہ محسوس کر رہا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ اس وقت سب کچھ مان لینے پر تیار ہیں تو گویا جتنا دبا سکتے ہو دبا لو اور ممکن ہے اس جہاں دیدہ مدبر کو مسلمانوں کے انداز سے بھی یہ نمایاں ہو رہا ہو کہ ان میں اس وقت بغاوت کے جراثیم حرکت میں ہیں تو اس وقت ان کے خون کو ذرا اور کھولا دیا جائے کہ شاید ان میں ایسی پھوٹ پڑے اور ان کی جماعت کے آدمی ان سے خود ایسے برافروختہ ہوں کہ ان میں خانہ جنگی ہو جائے اور اس طرح خود ان کے ہاتھوں ان کا مشن فیل ہو جائے۔ یہی سب محرکات ہو سکتے ہیں ورنہ عام حالات میں ان کا جنگ کے لئے پہلے سے تیار نہ ہونا اور پیغمبر خداؐ کے ساتھ اس جماعت کا ہونا جو اس کے پہلے ہر جنگ میں فتح حاصل کرتی رہی، اتنی تعداد میں جو اس کے پہلے شاید کسی غزوہ میں اکٹھا نہیں ہوئی ہے اور پھر اس پوری جماعت کا ابھی ابھی دوبارہ آخر دم تک

میدان میں ٹھہر کے یا دوسرے لفظوں میں مرنے مارنے کا عہد کرنا اس سب کے بعد اسے ایسی جسارت کیونکر ہو رہی تھی کہ وہ قدم قدم پر صلح کی آگے بڑھتی ہوئی کاروائی میں روڑے اٹکائے جس کے اظہار میں تمام مورخین متفق الکلمہ ہیں۔ سب سے پہلے جب حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے لکھانا چاہا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تو ادھر کا نمائندہ سہیل بن عمرو کہنے لگا جناب ہم اسے تو جانتے نہیں' وہ لکھئے جو ہمارے یہاں لکھا جاتا ہے۔ بسمک اللھم

یاد رکھنا چاہئے کہ اگر وہ یہ کہتے کہ اس کے بجائے آپ لات و عزی (اصنام) کے نام لکھئے تو یہ اصول کا سوال تھا۔ پھر سمجھوتہ ہونا غیر ممکن تھا مگر انہوں نے تو حقیقت میں صرف ایک نزاع لفظی سے کام لیا۔ اب یہ جذباتی اور پست ذہنیت والے افراد کا کام ہوتا کہ صرف اپنی بات کو بالا رکھنے کے لئے ان الفاظ پر اصرار کیا جاتا جو ادھر سے پیش ہو رہے ہیں اور فریق مخالف کے الفاظ کو منظور نہ کیا جاتا مگر رسول خدا ایسی تنگ نظری سے بری تھے۔ آپؐ نے فرمایا۔ "یہی لکھو جو سہیل کی خواہش ہے"۔

حقیقت میں یہ سہیل کی اپنے منصوبہ میں پہلی شکست تھی کہ رسولؐ اس بات پر نہ الجھے اور معاہدہ کی تحریر میں رکاوٹ پیدا نہ ہونے دی مگر جذباتی مسلمانوں کا اتنے پر خون کھول گیا کہ دیکھو رسولؐ نے ایک طرح اپنی ہار مان لی اور اس کمبخت کافر کی بات کو اونچا ہو جانے دیا مگر پھر شاید انہوں نے سمجھا ہو کہ خیر۔ یہ ایک بات تھی۔ آگے تو پیغمبرؐ یقیناً مضبوطی دکھائیں گے مگر دوسری منزل آئی اور وہ اس سے سخت۔

مسٹر کے اے حمید کے الفاظ یہ ہیں کہ۔

"معاہدہ کا مسودہ حضرت علیؑ لکھنے بیٹھے۔ مسلمانوں کے دستور کے موافق انہوں نے "اللہ کے نام سے جو رحمٰن ہے" لکھنا شروع کیا۔ اس پر سہیل جو اہل مکہ کے سفیر تھے معترض ہوئے اور کہا ہم رحمٰن کے قائل ہی نہیں۔ اس لئے لفظ رحمٰن کاٹ دیا جائے۔ سرکار نے جو مجسمہ انصاف تھے فوراً وہ لفظ کٹوا دیا۔ اس کے بعد

حضرت علیؑ نے لکھا کہ یہ عہد نامہ محمد رسول اللہؐ اور قریش کے درمیان لکھا گیا ہے۔ سہیل نے پھر اعتراض کیا کہ ہم تو انہیں رسول مانتے ہی نہیں۔ اس پر مسلمان تڑپ اٹھے مگر سرکار نے کہا کوئی مضائقہ نہیں۔ بے شک رسول اللہ کا لفظ کاٹ دیا جائے"۔

(تاریخ مسلمانان عالم جلد ۱ صفحہ ۸۱-۸۲)

اس میں ابتدائی سطروں میں یہ جز غلط معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ نے دستور کے مطابق بطور خود بسم اللہ لکھنا شروع کیا بلکہ جیسا ہم نے اس سے پہلے لکھا ہے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معاہدہ کا مضمون بول رہے تھے آپ نے فرمایا' لکھو بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم اور اس پر سہیل بن عمرو بول پڑا تاریخ کے الفاظ یہ ہیں۔

دعا علیا فقال اکتب بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم فقال سهیل ما اعرف هذا ولکن اکتب باسمک اللهم فقال صلی اللّٰہ علیه وسلم اکتب باسمک اللهم

(تاریخ ابن الوردی جلد ۱ صفحہ ۱۲۵' ابوالفدا' جلد ۱ صفحہ ۱۴۶)

آپ نے علیؑ کو بلایا اور کہا' لکھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' سہیل نے کہا میں اسے نہیں پہچانتا بلکہ لکھوایئے باسمک اللہ' اس پر حضرت نے فرمایا' اچھا باسمک اللہ ہی لکھو۔

شرطیں بھی ایسی تھیں جن میں بظاہر مشرکین ہی زبر دکھائی دے رہے تھے اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے دبتے چلے جاتے تھے۔ اس سال بغیر زیارت کعبہ کیے ہوئے واپس چلے جایئے آئندہ سال صرف تین دن کے لئے آئے گا۔ اس دوران میں جو یہاں سے بھاگ کر آپ کے پاس جائے آپ کو واپس کرنا ہوگا اور جو آپ کے پاس سے بھاگ کر ادھر آئے گا اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔

(تاریخ ابن خلدون طبع بیروت جلد ۲ صفحہ ۷۸۵)

ان میں سے ہر شرط وہ ہے جس کے رکھنے کی ہمت ایسی قوم کے نمائندہ کو

ہو ہی نہیں سکتی تھی جو ہر منزل پر شکست کھا چکی ہو مگر جیسا کہ پہلے ہی خیال ظاہر کیا جا چکا ہے، اس وقت اپنی پختہ کار سیاسی نظر سے ادھر کے نمائندہ نے یہ تاڑ لیا تھا کہ پیغمبرؐ اس وقت جنگ کرنے پر کسی نہ کسی وجہ سے آمادہ نہیں ہیں اس لئے وہ سمجھا کہ جتنا دبایا جا سکتا ہو اتنا دبا لیا جائے اور اس کا یہ اندازہ صحیح تھا کہ آپ جنگ اس وقت کسی قیمت پر بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے آپ دبتے چلے گئے مگر ایسا دبنا جس کے نتیجہ میں کامیابی تھی جس کے لحاظ سے خالق نے بدر، احد، خندق اور خیبر کے جنگی فتوحات کو "فتح مبین" نہ کہا اور جب ان شرائط پر صلح کر کے واپس تشریف لے جا رہے ہیں تو خالق کا اعلان پہنچ رہا ہے کہ۔

انا فتحنا لک فتحا مبینا ہم نے آپ کو بڑی کھلی ہوئی فتح عطا کی۔

صحابہ کے جذبات قوت ایمان پر غالب آ گئے

افسوس ہے کہ مشرکین کا نمائندہ جس راز کو کسی حد تک سمجھ گیا تھا کہ پیغمبرؐ اس وقت جنگ ہو جانے کو اپنے کسی اصول کی شکست سمجھ رہے ہیں اسے بہت سے مسلمان اس وقت نہ سمجھ سکے اور نہ سمجھنے کے بعد بھی رسولؐ کی صحت فیصلہ پر اعتماد کامل جو ایمان کا تقاضا ہے اگر ذہن و دماغ پر حاوی رہتا تو بھی صرف فکر و حیرت کا محل ہو سکتا تھا لیکن اعتراض و اختلاف اور شکست و تذبذب کی شکل پیدا ہونا منطقی حیثیت سے قطعاً" غیر ممکن تھی مگر صد حیف کہ جذبات کی شدت نے ایمان کے تقاضوں کو مغلوب کر لیا جسے تاریخ نے یوں لکھا ہے کہ۔

صحابہ قریب بہ ہلاکت حضرت عمر کو رسالت میں شک

دخلھم من ذالک امر عظیم حتی کادوا یھلکون

(الکامل ابن اثیر الجزری جلد ۲ صفحہ ۸۴)

لوگوں کے دلوں میں اس سے امر عظیم پیدا ہوا یہاں تک کہ قریب تھا کہ وہ ہلاکت میں مبتلا ہو جائیں۔

اور پھر ان سب تاریخوں ہی نے نہیں بلکہ صحاح حدیث نے بھی اس ابہام

کے پردہ کو چاک کر کے اس میں پیش پیش نظر آنے والی شخصیت کا نام دے دیا ہے چنانچہ صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۴۱ کتاب الجہاد میں ہے۔

فجاء عمر بن الخطاب فقال یا رسول اللّٰہ السنا علی الحق و ھم علی الباطل فقال بلٰی فقال الیس قتلانا فی الجنة و قتلاھم فی النار قال بلٰی قال فعلٰی ما نعطی الدنیة فی دیننا انرجع و لما یحکم اللّٰہ بیننا و بینھم فقال یا ابن الخطاب انی رسول اللّٰہ و لن یضیعنی اللّٰہ ابداً فانطلق عمر الی ابی بکر فقال له مثل ما فقال للنبی فقال انه رسول اللّٰہ و لن یضیعه اللّٰہ ابداً فنزلت سورة الفتح فقراھا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم علٰی عمر الی آخرھا فقال عمر یا رسول اللّٰہ او فتح ھو قال نعم۔

عمر بن خطاب نے آکر کہا یا رسول اللہؐ کیا ہم حق پر نہیں ہیں اور وہ باطل پر نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا، کیوں نہیں! کہا، کیا ہمارے مقتول بہشت میں اور ان کے مقتول دوزخ میں نہیں ہوں گے؟ فرمایا کیوں نہیں۔ کہا تو پھر ہم کیوں اپنے دین میں اس ذلت کو برداشت کریں؟ کیا ہم واپس جائیں در صورتیکہ اللہ نے ہمارے اور ان کے درمیان کوئی فیصلہ کن صورت پیدا نہیں کی ہے۔ حضرت نے فرمایا اے پسر خطاب اللہ کا پیغمبر ہوں اور اللہ مجھے کبھی نظر انداز نہیں کرے گا یہ سن کر عمرؓ ابوبکر کے پاس گئے اور وہی باتیں کہیں جو رسول خداؐ سے کہی تھیں۔ انہوں نے بھی کہا کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ انہیں کبھی نظرانداز نہیں کرے گا۔ اس پر سورہ انا فتحنا نازل ہوا تو رسول خداؐ نے وہ سورہ شروع سے آخر تک حضرت عمر کو سنایا تو انہوں نے کہا، اچھا تو وہ کیا کوئی فتح ہے؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں!

حضرت عمر فتح مبین کو نہ سمجھ سکے

مورخ دیار بکری لکھتے ہیں۔

عن عمر انه قال و اللّٰه ماشككت مند اسلمت الا يومئذ فاتيت النبى فقلت الست نبى اللّٰه حقا قال بلٰى قلت السنا على الحق وعدو نا على الباطل قال بلٰى قلت اليس قتلا نا فى الجنة و قتلا هم فى النار قال بلٰى قلت فلم نعطى الدنية فى ديننا قال انى رسول اللّٰه و لست اعصيه و هو ناصرى قلت او لست كنت تحدثنا انا سنأتى البيت فنطوف به قال بلٰى افاخبرتك انا ناتيه العام قلت لا قال فانك اتيه و مطوف به قال فاتيت ابابكر فقلت يا ابابكر اليس هذا نبى اللّٰه حقا قال بلٰى قلت فلم نعطى الدنية فى ديننا قال ايها الرجل انه رسول اللّٰه و لن يعصيه فاستمسك بغرزه فوا اللّٰه انه لعلى الحق المبين

(تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۳۲)

عمر کہتے ہیں کہ بخدا جب سے میں نے اسلام قبول کیا مجھے کبھی شک پیدا نہیں ہوا سوائے اس دن کے تو میں نے پیغمبرؐ کے پاس آکر کہا کہ کیا آپ اللہ کے سچے پیغمبر نہیں ہیں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں! میں نے کہا کیا ہم حق پر اور ہمارا دشمن باطل پر نہیں؟ کہا کیوں نہیں۔ میں نے کہا کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہمارے مقتول بہشت میں ہوں گے اور ان کے مقتول دوزخ میں؟ فرمایا کیوں نہیں، میں نے کہا پھر ہم اپنے دین میں اس ذلت کو کیوں قبول کریں؟ آپ نے فرمایا میں اللہ کا پیغمبرؐ ہوں اور میں اس کی نافرمانی نہیں کر سکتا اور وہ میرا مددگار ہے۔ میں نے کہا کیا آپ ہم سے یہ باتیں نہیں کہتے تھے کہ ہم عنقریب خانہ کعبہ میں داخل ہو کر اس کا طواف کریں گے؟ کہا کیوں نہیں مگر کیا میں نے تمہیں یہ بھی خبر دی تھی کہ یہ اسی سال ہوگا میں نے کہا نہیں، فرمایا تو (میں پھر کہتا ہوں) کہ تم وہاں پہنچو گے اور طواف کرو گے۔ وہ کہتے ہیں کہ پھر میں ابوبکر کے پاس گیا۔ میں نے کہا اے ابوبکر کیا یہ سچے رسول نہیں ہیں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں، میں نے کہا تو پھر ہم اپنے دین

میں اس ذلت کو کیوں برداشت کریں؟ انہوں نے کہا اے مرد! وہ بلاشبہ اللہ کے پیغمبر ہیں اور وہ اس کی ہرگز نافرمانی نہیں کریں گے تو تم ان کا دامن تھامے رہو کہ وہ یقیناً کھلے ہوئے حق پر ہیں۔

شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی اس پورے واقعہ کو فارسی زبان میں درج کیا ہے۔ اس طرح کہ۔

"نقل است از عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ کہ گفت در آمد دراں روز در دل من امر عظیم و مراجعت کردم با حضرت صلی اللّٰہ وسلم کہ ہر گز مثل آں نہ کردہ بودم و رفتم نزد رسول و گفتم آیا تو پیغمبر حق نیستی؟ فرمود بلے ہستم۔ گفتم نہ ما بر حقیم و مخالفان ما بر باطل گفت' بلے' گفتم پس چراما این ذلت و حقارت کشیم و بایں طور صلح نمودہ بازگردیم۔ آنحضرت فرمود اے پسر خطاب بدرستے کہ من فرستادہ خدایم و بے فرمان وے نمی کنم و وے ناصر و معین من است و مرا ضائع نخواہد گزاشت گفت عمر پس ہم چناں حزیں و اندوہگیں از پیش آنحضرت برخاستم و بنزد ابوبکر صدیق رفتم ہماں حکایت کہ بعرض حضرت رسانیدہ بودم باوے نیز گفتم وہماں جواب کہ آنحضرت گفتہ بود از ابوبکر نیز شنید"

(مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۲۸۶ ' ۲۸۷)

مگر جیسا کہ پہلے درج ہو چکا ہے حضرت عمر اپنی اس رائے اور اپنے ان جذبات میں منفرد نہ تھے بلکہ واقع یہ تھا جس کے بعض شواہد بعد میں درج ہوں گے کہ مسلمانوں کی اکثریت یا رائے عامہ ان کے موافق تھی چنانچہ ابن اثیر کے علاوہ جن کے الفاظ پہلے درج ہو چکے ہیں دوسرے مورخین نے بھی صاف اس وقت کی کیفیت کو تمام صحابہ کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے۔

رسول پاک نے صحابہ کی کثرت رائے کو ٹھکرا دیا
کیونکہ دین جمہوریت کے ماتحت نہیں

کان اصحاب رسول اللّٰہ یکرھون الصلح لانھم خرجوا لا یشکون فی الفتح لرؤیا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم انہ حلق راسہ و انہ دخل البیت فاخذ مفتاح الکعبۃ و عرف مع المعرفین فلما راء وا الصلح دخل الناس من ذالک امر عظیم حتی کادوا یھلکون

(المغازی للواقدی جلد ۲ صفحہ ۶۰۷)

اصحاب پیغمبر خدا صلح کو ناپسند کرتے تھے اس لئے کہ وہ جو نکلے تھے تو کوئی شک انہیں فتح میں نہ تھا۔ حضرت پیغمبر خدا کے اس خواب کی وجہ سے کہ آپ نے اپنا سر منڈوایا ہے اور آپ نے کعبہ میں داخل ہو کر کعبہ کی کنجی پر قبضہ کیا ہے اور عرفات جانے والوں کے ساتھ عرفات گئے ہیں تو جب انہوں نے صلح ہوتے دیکھی تو تمام لوگوں کے دلوں میں عظیم شک و شبہ کی کیفیت پیدا ہوئی یہاں تک کہ قریب تھا کہ سب ہلاکت میں پڑ جائیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عمر جو کہہ رہے تھے اس میں مسلمانوں کی اکثریت ان کے ساتھ شریک تھی مگر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور اس طرح یہ حقیقت پوری شدت اور قوت سے سامنے آگئی کہ پیغمبر خدا اپنے فیصلہ اور عمل میں قطعاً" کسی شوریٰ یا رائے جمہور کے پابند نہ تھے۔

بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ اہل حل و عقد کا خیال اور جمہور کا فیصلہ غلطی پر تھا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہی صحیح تھا اور اسلامی ترقی کے لئے بیش از بیش فوائد کا حامل تھا جس کا احساس پھر بعد میں ان حضرات کو بھی ہو گیا اور حضرت عمر کا آخر عمر کا جو بیان ہے اسے شاہ عبدلحق نے یوں درج کیا ہے۔

حضرت عمر اپنی گستاخی پر تمام عمر نادم رہے

گفت وے رضی اللہ عنہ عمرے است کہ از وسوسہ شیطان و کیدنفس کہ دراں روز در خاطر من گزشتہ بود استغفارمی کنم و باعمال صالحہ از صوم و صلوٰۃ و انفاق و تصدقات توسل می جویم تا کفارت آں برات من گردد

(مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۲۸۷)

آپ نے کہا کہ ایک بڑی مدت عمر کی گزری ہے کہ میں شیطان کے وسوسے اور نفس کی دسیسہ کاری سے جو اس دن میرے ذہن پر غالب ہوئی تھی مغفرت کا طلبگار اور نیک اعمال کے ساتھ جیسے نماز' روزہ ' خیرات' اس کے کفارہ کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ میں اس گناہ سے چھٹکارا پاؤں۔

اور تاریخوں میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔

(تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۲۲)

بہرحال یہ اعتراف خطا اور کفارے چاہے بعد میں مواخذہ اخروی سے بچا لیں مگر یہ حقیقت تو بہرحال اس سے ثابت ہو جاتی ہے کہ حق ہمیشہ جماعت کے ساتھ نہیں ہوا کرتا یعنی حق تابع جمہور نہیں ہے جمہور کو تابع ہونا چاہیے۔

صحابہ کے لئے صبر آزما مرحلہ' ابو جندل کا واقعہ

لفظی ہی طور پر صلحنامہ کے شرائط مسلمانوں کے مزاج کو برہم کیے ہوئے تھے کہ فوراً ہی عملی حیثیت سے صبر آزما مرحلہ ان کے نفاذ کا آگیا ایسا جو جذبات ہمدردی کو حرکت میں لانے کی بناء پر سخت ترین امتحان کی حیثیت رکھتا تھا۔ یعنی ابھی معاہدہ کی روشنائی خشک بھی نہ ہوئی تھی کہ اسی سہیل بن عمرو کا جس نے اس صلحنامہ میں مشرکین کی نمائندگی کی تھی لڑکا ابو جندل جو مسلمان ہو چکا تھا اور اس جرم کی سزا میں باپ اور دوسرے گھر والوں نے اسے پا بزنجیر کرکے قید کر رکھا تھا' اب یہ خبر سن کر کہ رسولؐ مکہ کے پاس پہنچ گئے ہیں کسی طرح نکل کر اسی لوہے میں جکڑے ہونے کی حالت میں افتاں و خیزاں بڑی امیدوں کے ساتھ رسولؐ کے

پاس پہنچ گیا اور اپنے آپ کو آپؐ کے قدموں پر ڈال دیا اور سمجھا کہ بس، مجھے گوشہ نجات اور گہوارہ عافیت مل گیا مگر یہاں رسولؐ اسی سہیل بن عمرو کے ساتھ یہ معاہدہ فرما چکے تھے کہ جو ادھر سے بھاگ کر آئے گا واپس کیا جائے گا۔ سہیل نے اس معاہدہ کی بناء پر کہا کہ میں تو اسے واپس لے جاؤں گا۔

علامہ طبرسی سے اس موقع کا بیان بڑے ہلکے الفاظ میں کیا ہے مگر وہ بھی اس موقع پر مسلمانوں کے جذبات اور رسولؐ کے تاثرات اور پھر آپ کے عمل کے متعلق ہمیں اور ہر پڑھنے والے کو بہت کچھ سمجھانے کے لئے کافی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

فجاء ابو جندل الی النبی صلی اللّٰہ علیہ و آلہ حتی جلس الی جنبہ فقال ابوہ سہیل ردہ علی فقال المسلمون لا نردہ فقال علیہ السلام بیدہ فاخذ بیدہ فقال صلی اللّٰہ علیہ و آلہ اللھم ان کنت تعلم ان ابا جندل لصادق فاجعل لہ فرجا و مخرجا ثم اقبل علی الناس و قال انہ لیس علیہ یاس و انما یرجع الی ابیہ و امہ و الی ارید ان اتم لقریش شرطھا

(اعلام الوریٰ)

ابو جندل حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا یہاں تک کہ آپ کے پہلو میں بیٹھ گیا تو اس کے باپ سہیل نے کہا کہ اسے مجھے واپس کیجئے۔ مسلمانوں نے کہا ہم اسے نہیں واپس کریں گے حضرتؐ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا جس پر اس نے بیٹے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ حضرتؐ نے (بارگاہ الہٰی میں) عرض کیا کہ خداوندا اگر تیرے علم میں ابو جندل سچا ہے تو اس کے لئے کشائش پیدا کر۔ پھر آپ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ فرمایا اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ اپنے باپ ماں ہی کے پاس تو جا رہا ہے اور مجھے منظور ہے کہ قریش سے جو شرط ہو گئی ہے اسے پورا کروں۔

علامہ ابن اثیر نے مسلمانوں کی عام حالت کے پس منظر میں جو اس وقت تھی

اس واقعہ کو زیادہ موثر انداز میں لکھا ہے کہ۔

فبینا النبی یکتب الکتاب اذ جاء ابو جندل بن سھیل بن عمر و یرسف فی الحدید قد انفلت الی رسول اللّٰہ فلما رای سھیل ابنہ ابا جندل اخذہ و قال یا محمد قد تمت القضیہ بینی و بنیلٔ قبل ان یاتیلٔ ھذا قال صدقت فاخذہ لیردہ الی قریش فصاح ابو جندل یا معشر المسلمین ارد الی المشرکین لیفتنونی عن دینی فزاد الناس شرا الی ما بھم فقال لہ رسول اللّٰہ احتسب فان اللّٰہ جاعل للٔ و لمن معلٔ و من المستضعفین فرجا و مخرجا انا قد اعطینا القوم عھودنا علی ذاللٔ فلا نغدر بھم

(کامل جلد ۲ صفحہ ۸۴)

اس دوران میں کہ جب ابھی پیغمبر خداؐ نے یہ دستاویز تحریر فرمائی تھی کہ ایک دم سہیل بن عمرو کا لڑکا ابو جندل لوہے میں جکڑا ہوا آگیا جو موقع پا کر وہاں سے بھاگ کر رسول خدا کی پناہ میں آیا تھا جب سہیل نے اپنے بیٹے ابو جندل کو دیکھا تو اسے پکڑ لیا اور کہا اے محمدؐ! مجھ میں اور آپ میں اس کے آنے کے پہلے تصفیہ ہو چکا ہے۔آپ نے فرمایا ٹھیک کہتے ہو چنانچہ وہ اسے پکڑ کر قریش کی طرف واپس لے چلا۔ اب ابو جندل نے چیخ کر کہا' اے گروہ اہل اسلام مجھے مشرکین کی طرف پلٹایا جا رہا ہے کہ وہ مجھے میرے دین سے برگشتہ کریں۔ اس پر جو مسلمانوں کی حالت تھی وہ اور زیادہ خراب ہو گئی۔ رسولؐ نے فرمایا صبر کرو کہ اللہ تمہارے لئے اور تمہارے ساتھ کے دوسرے کمزور مسلمانوں کے لئے کشائش اور نکلنے کا ذریعہ کچھ قرار دے گا۔ ہم نے ان لوگوں کے ساتھ اس بارے میں کچھ معاہدے کر لئے ہیں اس لئے ہم عہد شکنی سے مجبور ہیں۔

حضرت عمر جو اس فیصلہ کی صحت کو اب تک قبول نہ کر سکے تھے اس کے درپے تھے کہ عملی طور پر یہ فیصلہ درہم برہم ہو جائے چنانچہ یہ موقع انہیں غنیمت معلوم ہوا۔

ابو جندل نے حضرت عمر کی رائے قبول نہ کی

دیار بکری کا بیان ہے۔

فوثب عمر بن الخطاب یمشی الی جنب ابی جندل و یقول اصبر یا ابا جندل فانما هم المشرکون و انما دم احدهم کدم کلب و یدنی عمر قائم السیف منه یقول رجوت انه یا خذ السیف فیضرب به اباه فضن الرجل بابیه و فی روایة قال ابو جندل یا عمر! و ما انت با حری بطاعة رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم منی

(تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۲۲)

جناب عمر بن خطاب نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور ابو جندل کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور کہہ رہے تھے کہ اے ابو جندل ثابت قدم رہو کہ یہ لوگ تو مشرک ہیں اور ان میں سے ایک کا خون تو بس مثل کتے کے خون کے ہے اور عمر تلوار کے قبضہ کو اس کے قریب کر رہے تھے وہ کہتے ہیں کہ مجھے امید تھی کہ وہ تلوار ہاتھ میں لے لے گا اور اسے اپنے باپ پر چلا دے گا مگر اس شخص نے اپنے باپ کی زندگی کو عزیز کیا اور ایک راوی کے بیان میں ہے کہ ابو جندل نے کہا اے عمر! تم رسول اللہ ؐ کی فرمانبرداری کا حق مجھ سے زیادہ نہیں رکھتے۔

مسٹر کے اے حمید نے لکھا ہے۔

"عہد نامہ کی تکمیل کے بعد ابھی رسول اللہ ؐ حدیبیہ ہی میں مقیم تھے کہ اسی اہل مکہ رات کے وقت مسلمانوں کو قتل کرنے کے ارادہ سے ان کے لشکر میں آ گھسے جو سب کے سب گرفتار کر لئے گئے لیکن اس مجسم رحم نے معاف کر کے ان سب کو چھوڑ دیا اور خود سب مسلمانوں کو ساتھ لے کر مدینہ لوٹ گئے۔

(تاریخ مسلمانان عالم جلد ۱ صفحہ ۸۲)

جہاں تک میری نظر ہے مستند تاریخیں اس ذکر سے خالی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ گفتگوئے صلح کے قبل حضرت ؑ کے قریب مکہ پہنچنے کے فوراً بعد ہی کا واقعہ ہے

جس کا ذکر خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری نے اس طرح کیا ہے۔

".قریش کے چند سر پھرے نوجوان آنحضرتؐ پر حملہ کرنے کے لئے آ گئے جنہیں گرفتار کرکے سرکار رسالتؐ کے حضور میں پیش کیا گیا۔ آپ نے اس اقدام سے در گزر فرمایا اور انہیں رہا کر دیا"۔

(اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد ا صفحہ ۱۵۰)

حکم رسولؐ اور صحابہ کا سکوت

واپسی کے موقع پر مسلمانوں کی برہمی جو اس صلح سے تھی اس کا اثر پورے جاہ و جلال سے نمایاں تھا چنانچہ پیغمبر خداؐ نے معاہدہ کی تکمیل کے بعد اصحاب سے فرمایا کہ اٹھو' قربانیاں کرو اور سروں کے بال منڈوا کر واپس چلو۔ تو عالم یہ تھا کہ رسولؐ نے تین دفعہ حکم دیا اور مجمع کی اکثریت خاموش رہی۔ تقریباً" کوئی تعمیل کے لئے نہ اٹھا۔ آخر جب حضرتؐ نے ان کی طرف بے اعتنائی اختیار کرکے خود جا کر قربانی کی اور بال منڈوائے تو مجبوراً" دوسرے لوگ بھی کھڑے ہوئے اور کچھ نے بال منڈوائے اور اکثر نے بددلی سے تھوڑے تھوڑے ترشوائے اور رنج و صدمہ کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان میں سے ایک دوسرے کو قتل کر رہا ہے۔

(طبری جلد ۲ طبع جدید مصر ۱۳۶۱ھ صفحہ ۶۳۷)

تاریخ ابن الوردی میں ہے کہ پیغمبر خداؐ نے مدینہ کی جانب مراجعت کی اور اختتام سال تک وہاں قیام فرمایا۔ یہاں تک کہ ۷ ھ شروع ہوا۔

(ابن الوردی جلد ا صفحہ ۱۳۶)

صلح حدیبیہ کے اثرات

اس وقت مسلمان نادانی سے جس صلح پر انتہائی افسردہ بلکہ ناراض تھے' تھوڑے ہی عرصہ میں ان سب کی آنکھوں کے سامنے اس صلح کے خوشگوار نتائج آفتاب نصف النہار کی طرح سامنے آ گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ جنگ کی ناخوشگوار فضا اکثر صبر و سکون کے ساتھ حقیقتوں پر غور کرنے میں سد راہ ہوتی ہے اور نفرت کی شدت راہ جستجو میں پہاڑ بن کر کھڑی

ہو جاتی ہے۔ اب اس صلح کی بدولت جو فضا میں سکون ہوا تو بہت سے لوگوں کو قریب سے رسول خداؐ کے اخلاق دیکھنے کا موقع ملا۔ اسلام کی ترقی کے اسباب پر غور کرنا پڑا۔ باوجود انتہائی مزاحمتوں کے نور حق پھیلنے کا احساس کرنے کی توفیق ہوئی۔

اس کے علاوہ جیسا خواجہ محمد لطیف صاحب نے لکھا ہے۔

"جو مسلمان مشرکین کے پاس چلے جاتے تھے اور انہیں چوتھی شرط کے مطابق واپس نہیں کیا جاتا تھا وہ وہاں اپنی زبان سے بھی اور اپنے عادات و اخلاق سے بھی مستقل طور پر نشر و اشاعت اسلام کا ذریعہ تھے جو مکہ والے چند روز مسلمانوں میں رہ کر واپس ہوتے تھے اور مسلمانوں کے حسن سلوک اور اوضاع و اطوار کو بیان کرکے تبلیغ کے فریضہ کو انجام دیتے تھے"۔

(اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد ۱ صفحہ ۱۲۹)

نتیجہ یہ ہوا کہ اس ایک سال کی مدت میں مسلمانوں کی مردم شماری میں وہ اضافہ ہوا جو اس پوری مدت میں ابھی تک کبھی نہیں ہوا تھا چنانچہ حضرت امام جعفر صادقؑ کا قول ہے کہ

لم تنقض هذه المدة حتى كاد الاسلام يستولى علىٰ اهل مكة

یہ مدت گزرنے نہیں پائی یہاں تک کہ اسلام قریب تھا کہ تمام اہل مکہ پر چھا جائے۔

مسٹر کے اے حمید لکھتے ہیں۔

"یہ وہ زمانہ تھا جب بڑے بڑے سردار اسلام میں جوق در جوق داخل ہو رہے تھے۔ دنیا کے مشہور و معروف جرنیل خالد بن ولید نے اسلام قبول کیا۔ عمرو بن عاص جنہوں نے بعد میں مصر فتح کیا مشرف با سلام ہوئے"۔

(اعلام الوریٰ)

غزوہ خیبر

سن ۷ ہجری کے آغاز کے ساتھ اسلام کی یہ مہتم بالشان مہم سر ہوئی جس کے بعد یہود کی طاقت جزیرۃ العرب میں بالکل ختم ہو گئی۔

بعض تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وسط محرم میں غزوہ خیبر کے لئے نکلے۔

(تاریخ ابوالفدا جلد ا صفحہ ۱۴۷)

ایک قول یہ ہے کہ جمادی الاول میں یہ مہم درپیش ہوئی (اعیان الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۲۵۶) اور تیسرا قول یہ ہے کہ وہ ۶ ہجری کے ذی الحجہ ہی کا واقعہ ہے۔ (اعلام الوریٰ)

علامہ سید محسن امین عاملی لکھتے ہیں کہ خیبر مدینہ سے سات برید کی مسافت پر تقریباً ۴۸ گھنٹے کی راہ پر تھا۔ اس کا نام عمالقہ میں سے ایک شخص کے نام پر ہوا جس نے یہاں قیام کیا اور اس کے بھائی یثرب کے نام پر مدینہ کا نام ہوا اور دوسرا قول یہ ہے کہ خیبر کے معنی یہود کی زبان میں قلعہ کے ہیں اور یہ ایک بڑا شہر تھا جس میں بڑے مضبوط قلعے تھے اور کھیتیاں اور نخلستان۔

(اعیان الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۲۵۶)

اسی دوسرے قول کے مطابق خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری لکھتے ہیں کہ۔

"خیبر عبرانی لفظ ہے جس کا ماخذ لفظ خبرد ہے جو قلعوں کے معنی میں ہے۔ خیبر مدینہ منورہ سے جانب شوال آٹھ منزل یعنی ۹۲ میل کے فاصلہ پر یہودیوں کا ایک قصبہ تھا جہاں بہت سے قلعے تھے۔ اسی قصبہ کے نام پر اس کے متعلق یہودی نو آبادی کا نام خیبر تھا۔ یہ نو آبادِ ایک نخلستان ہے۔ یورپ کا سیاح مسٹر ڈائٹی (Diote) جس نے ۱۸۷۷ء میں عرب کی سیاحت کی ہے مہینوں خیبر میں رہا ہے۔ وہ اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے۔ "نخلستان خیبر کی زمین زرخیز ہے۔ قوم یہود کے یہاں بڑے بڑے مضبوط اور مستحکم قلعے بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے چند قلعوں کے آثار اب تک باقی ہیں اور قائم ہیں"۔

(اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد ا صفحہ ۱۵۰' ۱۵۱)

خیبر پر حملے کا پس منظر اور اس کی نوعیت

مسٹر کے اے حمید بی۔ اے (لندن) بیرسٹر ایٹ لاء لاہور لکھتے ہیں۔

خیبر مدینہ سے شام کی طرف تین منزل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں یہودیوں کی کئی ایک بستیاں قائم تھیں۔ یہودیوں کو خیبر کے فلک بوس قلعوں پر بہت ناز تھا۔ انہیں یقین تھا کہ ان کا ملک بہت زیادہ مستحکم اور مضبوط ہے۔ وہ غزوہ خندق کی شکست سے بہت پشیمان تھے اور دن رات اپنے ماتھے سے یہ کلنک کا ٹیکا اتارنے کی فکر میں رہتے تھے۔ انہوں نے کئی قبیلوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان سے خفیہ معاہدہ کیا کہ اگر وہ مدینہ فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہمیشہ کے لئے خیبر کی نصف پیداوار اپنے حلیفوں کو دیا کریں گے۔ مسلمانوں کو اس حملے کی تیاری کا پتہ چلا تو انہوں نے مجلس مشاورت قائم کر کے طے کیا کہ مدینہ کے باہر دشمن کا مقابلہ کیا جائے"۔

(تاریخ مسلمانانِ عالم حصہ اول صفحہ ۸۳)

اس میں اصل حقیقت کی بہت ہلکی جھلکیاں موجود ہیں۔ "وہ غزوہ خندق کی شکست سے بہت پشیمان ہوئے" اس سے پتہ چلتا ہے اس جماعت نے غزوہ خندق میں مشرکین کا ساتھ دیا تھا اور انہیں جو شکست ہوئی تھی اس شکست میں یہ بھی

شریک تھے۔ اب یہ سابق کے واقعات سے جو تاریخ کے صفحات پر درج ہو چکے ہیں ظاہر ہے کہ یہ مشرکین کا ساتھ دینے والے کوئی اور نہ تھے وہی مدینہ کے باشندہ قبائل تھے جنہوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومت کو سیاسی طور پر قبول کیا تھا۔یعنی انہوں نے اقتدار اسلامی کے زیر سایہ بحیثیت رعایا رہنا تسلیم کیا تھا۔ انہی قبائل میں سے جنہوں نے اس معاہدہ کے بعد مختلف اوقات میں مشرکین کے ساتھ ساز باز کیا' کچھ جلا وطن کئے گئے وہ خیبر گئے اور کچھ بھاگ کر گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی بیرونی جماعت نہ تھی جس سے مقابلہ کو بین الاقوامی موجودہ اصطلاحات کے رو سے "جنگ" کے نام سے تعبیر کیا جائے بلکہ یہ اپنے ہی قلمرو حکومت کے اندر کے وہ افراد تھے جو وفاداری کے تقاضوں پر پورے نہیں اترے اور انہوں نے مخالف جماعتوں کے ساتھ ساز باز کیا اور اب ان کی نوبت یہ پہنچی کہ "انہوں نے کئی قبیلوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان سے خفیہ معاہدہ کیا کہ اگر وہ مدینہ فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہمیشہ کے لئے خیبر کی نصف پیداوار اپنے حلیفوں کو دیا کریں گے"۔

تو اب ان کے خلاف جو "مہم" وقوع میں آئے اسے "تادیبی مہم" کی حیثیت حاصل ہو گی جسے موجودہ زمانہ میں "پولیس ایکشن" کہتے ہیں جس پر پہلے بھی روشنی ڈالی جا چکی ہے اور اس جگہ پر پھر اس کو واضح کرنا ضروری سمجھا گیا کیونکہ یہ حقیقت اکثر نگاہوں سے اوجھل ہے جس کی وجہ سے جب اس حقیقت کا اظہار کیا جاتا ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام لڑائیاں دفاعی حیثیت رکھتی تھیں کبھی آپ نے خود مخالف طاقت پر حملہ نہیں کیا تو اعتراض کے طور پر خیبر کی مہم کو پیش کیا جاتا ہے کہ یہاں یہودیوں پر تو خود رسولؐ نے حملہ کیا تھا مگر یہ خیال بالکل غلط ہے۔ وہ کسی مخالف جماعت کے مرکز پر حملہ نہ تھا بلکہ اندرون ملک کے امن کو قائم رکھنے کی ایک کاروائی تھی جو ہر منظم حکومت کا ایک لازمی فریضہ ہے۔

فوج اسلام کی روانگی اور محاذ جنگ

مسٹر کے اے حمید لکھتے ہیں۔

"چودہ سو مسلمان جن میں بیس خواتین تھیں اپنے گھروں کے بچاؤ کی خاطر مدینہ سے باہر نکلے منزل بمنزل خیبر کے قریب پہنچ گئے اور میدان میں خیمے نصب کر دیئے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ جب بنی غطفان یہودیوں کی امداد کے لئے نکلے تو مسلمانوں کو دیکھ کر واپس لوٹ گئے جہاں مسلمانوں نے خیمے نصب کیے تھے وہی جگہ سرکارؐ نے لڑائی کے لئے مقرر کی۔ خیموں کے ارد گرد یہودیوں کے دس عظیم الشان قلعے تھے جن میں دس ہزار فوج ہر وقت لڑنے کے لئے تیار رہتی تھی"

(تاریخ مسلمانان عالم حصہ اول صفحہ ۸۳، ۸۴)

علامہ طبری نے لکھا ہے کہ خیبر میں چودہ ہزار یہودی قلعہ بند تھے۔

(اعلام الوریٰ)

نبیؐ و علیؑ دونوں کی علالت

خالق کی طرف سے مسلمانوں کا ایک بڑا امتحان ہونا تھا کہ اس جنگ میں جب منزلیں طے کرکے دشمن کے قلعوں کے سامنے پہنچے اور ان کے بڑے اہم قلعہ کا محاصرہ ہوا تو حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مزاج ناساز ہو گیا اور درد شقیقہ کی تکلیف پیدا ہو گئی۔ (تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۴۸) اور آپ کے قوت بازو حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی جو اب تک ہر جنگ میں پیش پیش رہتے تھے آنکھیں دکھ رہی تھیں اور وہ شروع ہی سے اس جنگ میں ساتھ نہیں آ سکے تھے کیونکہ شدید طور پر آشوب چشم میں مبتلا تھے۔

(تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۴۳)

شروع میں کچھ ابتدائی لڑائیاں ہوئیں جن میں مسلمان فتح یاب ہوئے لیکن جب یہود کے سب سے اہم قلعہ کی باری آئی تو یہ منزل بڑی سنگلاخ ثابت ہوئی۔

ممکن ہے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر خود جنگ کے انتظامات میں حصہ لے رہے ہوتے تو اس قلعہ پر حملہ کو ملتوی رکھتے اس وقت تک کہ جب تک علیؑ اچھے ہو کر آ جائیں مگر آپ کا درد شقیقہ میں مبتلا ہو کر انتظامات جنگ سے کنارہ کش ہونا تھا کہ فتح کی امنگ رکھنے والے "مجاہدین" نے کہ جنہیں رسولؐ سے ایک طرح کی شکایت

تھی کہ ہمیں آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیتے' خود انتظامات جنگ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور قدم بھی اقدام کے لئے بڑھا دیا جس کے بعد جو ناگوار صورت پیش آئی وہ اتنی "طشت از بام افتادہ" ہوئی کہ تاریخ ہی نہیں کتب احادیث تک بھی پہنچ گئی اور عام کتب احادیث ہی نہیں صحاح ستہ میں آ گئی اور عام صحاح ستہ بھی نہیں بلکہ صحیح بخاری میں بھی جگہ پا گئی جسے انہی صحاح اور مستند تواریخ کے اقتباسات کی صورت میں پیش کیا جائے گا مگر دور حاضر کے ایک صاحب قلم نے جو تاریخ کچھ حقائق پر پردہ ڈالنے کے منصوبہ کے ماتحت ہی لکھی ہے۔ اس میں تمام مسلم واقعات کو نظرانداز کرکے یہ روئیداد اس طرح تحریر کی ہے۔

"محمود بن مسلمہ حملہ آور فوج کے افسر اعلیٰ منتخب کیے گئے اور انہوں نے قلعہ نطاۃ پر فوج کشی کی۔ متواتر پانچ دن تک پے درپے حملے کئے مگر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ چھٹے دن سرکار نے فوج کی پاسبانی حضرت عمر کے سپرد کی۔ آپ نے ایک یہودی جاسوس کو گرفتار کیا جس سے بہت سے خفیہ رازوں کا پتہ چلا جو لڑائی کے لئے از حد مفید ثابت ہوئے۔ حضرت عمر کے تقرر کے بعد سرکار نے حضرت علیؑ کو طلب فرمایا اور قلعہ ناعم پر حملہ کے لئے ہدایات دیں"۔

("مسلمانان عالم" حصہ اول صفحہ ۸۴)

جو شخص واقعات سے واقف ہو وہ پورا اندازہ کر سکتا ہے کہ کس تیزی کے ساتھ یہ مصنف حقیقتوں کے اظہار سے کترایا ہے۔

جانے پہچانے مورخین و محدثین کے متواتر طور پر بیان کردہ واقعات کو نظرانداز کرکے اس نے جو باتیں لکھی ہیں وہ متداول اور مستند تواریخ میں تو کہیں نظر نہیں آئیں۔ شاید اس نے بیان واقعات کی خانہ پری کے لئے کسی غیر معروف ماخذ میں ان کا سراغ لگایا ہو۔ پھر سوال یہ ہے کہ جب "قلعہ نطاۃ پر فوج کشی میں" پے درپے حملوں سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا تو اس قلعہ کا کوئی آخری نتیجہ سامنے آئے بغیر سرکارؐ نے حضرت علیؑ کو ایک دوسرے قلعہ یعنی ناعم پر حملہ کے لئے ہدایات کیوں دے دیں۔

محمود بن مسلمہ افسر اعلیٰ منتخب ہو گئے تھے تو پھر حضرت عمر کا تقرر کس منصب پر ہوا؟ پھر حضرت عمر کے تقرر کے بعد سرکارؐ نے حضرت علیؑ کو کس واسطے طلب فرمایا اور طلب فرمایا تو کہاں سے ؟ کیا وہ اس وقت اسی لشکر میں موجود تھے مگر طلب نہیں کئے گئے تھے یا لشکر میں موجود نہ تھے اور کہیں اور سے آپ کو طلب کیا گیا آخر آپ لشکر میں کیوں موجود نہیں تھے اور کہاں تھے؟

اس سب کو اس مورخ نے صرف اس لئے معما بنا دیا ہے کہ جو اصل حقیقت ہے اس کے لکھنے کے لئے اس میں وسعت قلب موجود نہ تھی۔

اب دوسری مستند تاریخوں نے جو قلعہ کی روداد لکھی ہے وہ ملاحظہ ہو۔

ابوالفدا جس نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درد شقیقہ میں مبتلا ہونے کا بھی اظہار کیا ہے اس نے اسی علالت پر مرتب کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھے ہیں۔

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر خود ہی علم لے کر جاتے رہے اور شکست ہوتی رہی

فاخذ ابوبکر الصدیق الرایة فقاتل قتالا شدیدا" ثم رجع فاخذھا عمر بن الخطاب فقاتل قتالا اشد من الاول ثم رجع فاخبر ذلك رسول اللہ

(تاریخ ابوالفدا' جلد ۱ صفحہ ۱۸۷)

تو (یعنی آپ کی علالت کی بنا پر) حضرت ابوبکر نے علم لے لیا اور جا کر سخت جنگ کی پھر واپس آ گئے تو اب اسے حضرت عمر نے لیا انہوں نے پہلے سے زیادہ جنگ کی مگر پھر واپس آنا پڑا تو اب اس کی اطلاع پیغمبر خداؐ کو دی گئی۔

ان الفاظ سے سمجھ میں یہ آتا ہے کہ ان صاحبوں کو علم حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیا ہی نہیں بلکہ چونکہ آپ علیل ہو گئے اس لئے موقع پا کر ان حضرات نے علم خود لے لیا اور جب دو دن شدید اور پھر شدید تر جنگ کے بعد بھی نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور دو صاحبان جو علم لے کر یکے بعد دیگرے گئے

انہوں نے اپنی سی بہت کوشش کی مگر قلعہ فتح نہیں ہوا اور بے نیل مرام واپس ہوئی تو اب رسولؐ کو اطلاع دینے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

اب جو پیغمبرؐ نے ارشاد فرمایا اس حدیث میں جس کا ذکر ابھی بعد میں آئے گا کہ لا عطین الرایة غدا "کل میں دوں گا علم" تو ان الفاظ کا مفہوم خوب سمجھ میں آ جاتا ہے یعنی ابھی تک تو دوسرے اشخاص نے بطور خود جدوجہد یا قسمت آزمائی فرمائی تھی، لیکن رسولؐ فرماتے ہیں کہ اب میں علم دوں گا اور میں دوں گا تو ایسے کو جس میں یہ یہ اوصاف ہوں گے۔ اب ان اوصاف کے بیان سے یقیناً یہ پہلو پیدا ہوتا ہے کہ ابھی تک ان اوصاف سے متصف انسان نہیں گیا ہے اور اب تاریخ کے اس فقرہ سے جو ہر دفعہ ہے کہ ثم رجع پھر وہ واپس آئے" ثم رجع "پھر وہ واپس آئے" اس کے بعد رسول کے اس ارشاد کے معنی سمجھ میں آتے ہیں کہ۔

لا یرجع حتی یفتح اللّٰہ علی یدیہ

وہ نہیں پلٹے گا جب تک کہ اللہ اسکے ہاتھوں پر قلعہ کو فتح نہ کر لے۔

حافظ نسائی کی روایت کے الفاظ خصائص میں یہ ہیں۔

فاخذ الرایة ابوبکر و لم یفتح له فاخذه من الغد عمر فانصرف و لم یفتح له و اصاب الناس شدة وجهد فقال رسول اللّٰه انی دافع لوائی غدا الی رجل یحب اللّٰه و رسوله و یحبه اللّٰه و رسوله لا یرجع حتی یفتح له

ابوبکر نے علم لے لیا اور قلعہ ان سے فتح نہ ہوا تو دوسرے دن عمر نے لیا۔ نتیجہ میں وہ بھی واپس آئے اور فتح حاصل نہ ہوئی اور لوگوں کو بڑی سختی اور زحمت سے دوچار ہونا پڑا تو اب رسول خداؐ نے فرمایا کہ میں اپنا علم کل اس مرد کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو دوست رکھتا ہے اور اسے اللہ اور اسکا رسولؐ دوست رکھتے ہیں وہ واپس نہیں آئے گا جب تک کہ اسے فتح حاصل نہ ہو جائے۔

متاخرین علمائے تاریخ و حدیث میں سے شاہ عبدالحق دہلوی تحریر فرماتے ہیں۔

چوں قلعه غموص از قلاع دیگر در استحکام زیاده بود فتح آں

بآسانی روئے ننمود آ ورده اند که روزے عمر رضی اللّٰه عنه علم برداشته با جمعے از حامیان حوزه اسلام بپائے قلعه آمد و چندانکه بذل مجهود نمود روئے مراد ندید روز دیگر ابوبکر صدیق رضی اللّٰه عنه رایت برگرفته و باطائفه از شجعان و ابطال بقتال و جدال ارباب ضلال مبادرت نموده مقاتلات عظیمه درمیان آورده بے نیل مقصود باز گشت و نوبت سوم باز عمر بن الخطاب بازمره از اصحاب محاصره و محاربه نمود و عنان مراد بدست نیا ورده مراجعت نمود

(مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۳۲۲)

چونکہ قلعہ غموص دوسرے قلعوں سے زیادہ مضبوط تھا' آسانی سے فتح نہ ہو سکا (مورخین) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمر علم اٹھا کر مرکز اسلام کے محافظ افراد کی ایک جماعت کے ساتھ قلعہ کی طرف گئے اور جتنی بھی کوشش کر سکتے تھے کی مگر مراد کا چہرہ نہ دیکھ سکے دوسرے دن حضرت ابوبکر نے علم لے لیا اور بہادروں اور سورماؤں کے ایک گروہ کو ساتھ لے کر گمراہ جماعت سے جنگ و پیکار کے لئے بڑھے اور بڑی سخت لڑائیاں لڑیں مگر بغیر حصول مقصد کے واپس آ گئے تیسری مرتبہ پھر حضرت عمر نے اصحاب کے ایک گروہ کے ساتھ جا کر گھیرا ڈالا اور جنگ کی مگر مراد کی باگ ہاتھ میں نہ لا کر واپسی اختیار فرمائی۔

یہ قلعہ قموص جسے اس عبارت میں "غموص" لکھا گیا ہے ان تمام قلعوں میں سب سے زیادہ مضبوط تھا اور مرکزی حیثیت رکھتا تھا جو ایک پہاڑ پر واقع تھا اور در حقیقت قموص نام اس پہاڑی کا تھا جس سے یہ قلعہ بھی مشہور ہو گیا۔

(معجم البلدان جلد ۷ صفحہ ۱۶۹ و تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۴۸ طبع مصر)

جیسا کہ فاضل متتبع سید سبط الحسن صاحب ہنسوی نے لکھا ہے۔

یہ قلعہ چونکہ اس پوری یہودی ریاست کا محفوظ کرنے والا باب تھا اس لئے اس قلعہ قموص پر خیبر کا اطلاق ہوتا تھا جیسا کہ علامہ زرقانی متوفی ۱۱۲۲ھ اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

الحصن المسمی بالقموص و کان من اعظم حصونهم کما فی الفتح و ھوا المعبر عنه بخیبر فی الحدیث الذی فوقه لکونه من اعظمها

(الزرقانی علی المواہب جلد دوم صفحہ ۲۳۰ طبع مصر)

قموص نامی قلعہ تمام قلعوں سے زیادہ مستحکم و عظیم تھا جیسا کہ فتح الباری میں ہے اور یہی قلعہ بسبب اپنی عظمت اور بزرگی اور استحکام کے اس خبر میں جس کا ذکر اوپر ہوا ہے خیبر کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(فاتح خیبر صفحہ ۹ - ۱۰)

ارشاد حضرت احمد مختار اور صحابہ رسولؐ کی کیفیت انتظار

گذشتہ عبارتوں میں مورخین و محدثین نے حفظ مراتب کا خیال رکھتے ہوئے کتنے ہی محتاط یا مہذب الفاظ صرف کیے ہوں مگر سب کا ماحصل یہی ہے کہ اس کے پہلے جتنی کوششیں قلعہ کے فتح کرنے کی ہوئیں سب ناکام رہیں اور ان سے مسلمانوں کو ایک طرح کی ذلت سے دوچار ہونا پڑا جس کے ذمہ دار اگرچہ حضرت پیغمبر خداؐ نہ تھے اس لئے کہ جیسا قبل میں آچکا بظاہر حضرتؐ کی ناسازی مزاج کی وجہ سے یہ سب اقدامات بطور خود کر لئے گئے مگر ان کا اثر پیغمبرؐ پر پڑنا لازمی تھا۔ اب بظاہر حضرتؐ کے درد سر کی تکلیف میں بھی کچھ کمی ہو گئی تھی اس لئے آپ اپنے خیمہ سے ممکن ہے پہلی دفعہ جب برآمد ہوئے ہوں تو ان دو تین دن کی کیفیت از خود دریافت فرمائی ہو یا کچھ مسلمانوں نے باحال پریشان خود ہی حضرتؐ سے اسے بیان کیا ہو جسے سننے کے بعد حضرتؐ نے یہ تاریخی اعلان فرمایا جو احادیث کے جوامع صحاح اور مستند تواریخ دونوں ہی میں موجود ہے' جس کے بالکل متفق علیہ الفاظ تو اتنے ہیں۔

فتح خیبر کے لئے پیغمبر اسلامؐ کا تاریخی اعلان

لا عطین الرایة غدا رجلا یحب اللّٰه و رسوله و یحبه اللّٰه و رسوله

ضرور بالضرور میں کل یہ علم اس آدمی کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو

دوست رکھتا ہوگا اور اللہ اور رسولؐ اسے دوست رکھتے ہوں گے۔

اگر صرف اتنے ہی الفاظ ہوں تو بھی ان میں وہ تمام پہلو مضمر ہیں جو بڑی اہم حقیقتوں کے روشن کرنے والے ہیں۔

عطائے علم پر تبصرہ

"کل اسے دوں گا"۔ اس "کل" کے حال میں "مستقبل" کی امید افزا خوش خبری کے ساتھ "ماضی" پر تاریخی تبصرہ بھی ہے اور اللہ اور رسولؐ کو دوست رکھنے کے جملہ میں ثبات قدم اور فتح و ظفر کے اس راز کا اظہار بھی ہے کہ یہ باتیں اللہ اور رسولؐ اور دوسرے لفظوں میں اس مشن کے ساتھ جو خدا اور رسولؐ کا نصب العین ہے یعنی دین حق کے ساتھ سچی الفت اور عشق ہی سے پیدا ہوتی ہیں اور جب تک دل کے اندر یہ چیز نہ ہو اس وقت تک کتنے ہی بلند بانگ دعوے کیے جائیں نہ خطرات کے برداشت کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ نہ قدموں میں ثبات آتا ہے اور پھر مدد الٰہی بھی شامل حال نہیں ہوتی۔

اور بندہ کی یہ صفت شوق و جذب کی جب ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ اور رسولؐ اسے دوست رکھتے ہیں۔ اسے عمومی طور پر ایک وصف ذات کی حیثیت سے بھی دیکھا جا سکتا ہے اور عین اس موقع کی خصوصیت سے بھی جس سے نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کے پہلے جن کے سپرد یہ علمداری کا منصب ہوا اور وہ مخلوق کی پسند تھی جو خالق اور اس کے رسولؐ کی پسند کے مطابق نہ تھی اور اس کا نتیجہ سب کے سامنے آگیا لہٰذا جب ایک جزئی معاملہ میں خالق اور اس کے رسولؐ کی مرضی کے بغیر اپنی پسند سے کام لے کر یہ زک اٹھالی تو اب آئندہ تو کبھی اس سے زیادہ وسیع دائرہ میں خدا و رسولؐ کی مرضی کو نظر انداز کر کے خود رائی سے کام نہ لینا چاہئے۔

علیؑ کی مدح میں رسولؐ کے خصوصی الفاظ

اب کچھ خصوصی الفاظ ہیں جو الگ الگ روایتوں میں یا تاریخوں میں مختلف طور پر وارد ہوئے ہیں مثلاً ابو الفداء میں ہے۔

اما واللّٰہ لا عطین الرایة غداً" رجلا یحب اللّٰہ و رسولہ و یحبہ اللّٰہ و رسولہ کرارا غیر فرار یا خذھا عنوة

(تاریخ ابوالفداء جلد ۱ صفحہ ۱۴۷)

معلوم ہونا چاہیئے کہ قسم اللہ کی میں لازمی طور پر یہ علم کل اس شخص کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول اسے دوست رکھتے ہیں۔ وہ بڑھ بڑھ کر حملے کرنے والا ہے ایسا جو بھاگنے والا نہیں اور وہ اس قلعہ کو قوت و طاقت کے ساتھ لے لے گا۔

اس میں شروع میں کلمہ تنبیہہ اور قسم کا اضافہ ہے اور اوصاف میں کرار غیر فرار کی صفت اور آخر میں اس کی کامیابی کا یقینی طور پر اعلان کہ وہ اس قلعہ کو فتح کرکے رہے گا۔

علامہ طبرسی کی روایت میں وہ الفاظ ہیں جو اس حدیث کے سلسلہ میں زباں زد خلائق ہیں۔

لا عطین الرایة غدا رجلا کرارا غیر فرار یحب اللّٰہ و رسولہ و یحبہ اللّٰہ و رسولہ لا یرجع حتی یفتح اللّٰہ علی یدہ

(اعلام الوریٰ)

اس میں اور ابوالفداء والی روایت میں بس اتنا فرق ہے کہ اس میں کلمہ تنبیہہ اور شروع والی قسم (اما واللہ) نہیں ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کرار غیر فرار کا وصف محبت خدا و رسولؐ کے بعد تھا اور یہاں اس کے پہلے ہے۔ وہاں آخر میں یا خذھا عنوة تھا کہ "وہ اس قلعہ کو قوت و طاقت کے ساتھ لے لے گا" اور یہاں ہے یفتح اللّٰہ علی یدہ "اللہ اس کے ہاتھ پر فتح عنایت کرے گا"

سیرت کے الفاظ یہ ہیں۔

لا عطین الرایة غدا رجلا یحب اللّٰہ و رسولہ یفتح اللّٰہ علی یدیہ لیس بفرار

(ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۱۸۷)

اس میں کرار غیر فرار کی صفت بیچ میں آنے کے بجائے آخر میں لیس بفرار آگیا ہے جس سے اس صفت پر زیادہ زور پڑتا ہے کہ وہ بھاگنے والا نہیں ہے"۔

اس سے ظاہر ہے کہ پہلے کی ناکامیوں کو ہم جس طرح بھی نرم سے نرم الفاظ میں ادا کریں گے مگر پیغمبرؐ کی نظر میں ان کی حیثیت یہی تھی جس کی نفی اب اس فرد سے جسے علم دینے والے ہیں آپ بڑے اطمینان و یقین کے انداز میں فرما رہے ہیں۔

خصائص نسائی میں ہے۔

انی دافع لوائی غدا الٰی رجل یحب اللّٰہ و رسولہ و یحبہ اللّٰہ و رسولہ لا یرجع حتی یفتح لہ

(خصائص امیرالمومنین لنسائی طبع نجف اشرف ۱۳۶۹ھ - ۱۹۴۹ء صفحہ ۷)

اس میں شروع میں لا عطین کے بجائے دافع لوائی کے الفاظ ہیں اور درمیان یا آخر میں کہیں کرار غیر فرار کا جز نہیں ہے۔

یہ اختلاف حدیث کے الفاظ میں کوئی معنوی اختلاف نہیں ہے بلکہ راویوں نے رسولؐ کے ارشاد کو اپنے اپنے لفظوں میں نقل کیا ہے ان میں چونکہ زیادہ تر راویوں کی زبان پر لا عطین ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ اصل لفظ جو رسولؐ نے ارشاد فرمایا تھا وہ یہی ہے۔ اس کے علاوہ یہ دو فقرے بالکل یقینی ہیں کہ یحب اللّٰہ و رسول و یحب اللّٰہ و رسولہ۔ متعدد راویوں نے کسی نے بیچ میں اور کسی نے آخر میں کرار را" غیر فرار کے مفہوم کو ادا کیا ہے اور وہ عطائے علم کے پس منظر کے اعتبار سے بھی واقعیت کے بالکل مطابق ہے اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ یہ فقرہ بھی حضرتؑ نے ارشاد فرمایا تھا جو کسی راوی کے ذہن سے اتر گیا اور اس

نے بیان نہیں کیا۔

صحابہ کی تمنائے علم کے لئے بے قراری

اب ؟ اب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اعلان کا یہ تو ایک فطری نتیجہ ہونا چاہئے کہ پوری جماعت کو شدید بے چینی کے ساتھ نتیجہ کا انتظار پیدا ہو جائے کہ دیکھئے یہ علم کس کو ملتا ہے؟ مگر منطق اور لغت و ادب سب کے رو سے ان افراد کو امید نہ ہونا چاہئے جو اس کے پہلے علم کو لے جا چکے ہیں مگر انسانی دل و دماغ کے اس تضاد کو کیا کیا جائے کہ اکثر دلی جذبات دماغ کے فیصلوں پر غالب آ جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس کے پہلے تاریخ کے فیصلوں پر غالب آ جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس کے پہلے تاریخ میں جو ایک فقرہ یہ بھی آیا ہے جو فطرت کے بالکل مطابق ہے یجبنھم و یجبنونہ (یعنی) روز یہ صورت پیدا ہوتی تھی کہ سردار لشکر فوج کو بزدل بتاتا تھا کہ انہوں نے کمزور دکھائی ورنہ قلعہ فتح ہو جاتا اور فوج سردار لشکر پر یہی الزام عائد کرتی تھی۔ تو اس صورت حال کی بناء پر اس وقت شاید یہ امید کی جاتی ہو کہ رسولؐ نے ان شکستوں کا ذمہ دار عام فوجیوں کو سمجھا ہو لہٰذا ایک تازہ دم جماعت کی معیت میں علم پھر انہی افراد میں سے کسی کو مل جائے جو اس سے پہلے جا چکے ہیں اور اس طرح فتح کا سہرا ان کے سر بندھ جائے حالانکہ الفاظ پیغمبر خداؐ میں اس تصور کی گنجائش کم ہے کیونکہ عطائے رایت فوجیوں کو نہیں ہوتا۔ سردار فوج ہی کو ہوتا ہے اور جسے رایت عطا کیا جائے اس کی صفات و کردار کو رسولؐ نے نمایاں کیا ہے مگر وہی بات کہ جذباتی تمنائیں عقل و منطق کی گہرائیوں میں جانے کی متحمل نہیں ہوا کرتیں۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو لیکن تاریخ واقعہ یہی بتاتی ہے کہ پوری فوج اسلام نے یہ رات تقریباً" پوری جاگ کر گزار دی اس اشتیاق و انتظار میں کہ صبح کو دیکھئے کیا ہوتا ہے؟ ایک پہلو سے تقریباً" اطمینان تھا کہ بہرحال ہم ہی میں سے کسی ایک کو یہ علم ملے گا اس لئے کہ وہ جو ہر میدان میں آگے رہا کرتا تھا اس وقت موجود ہی نہیں ہے اور آشوب چشم کی وجہ سے بلایا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کیفیت کو ہمارے مورخ علامہ طبری نے عجیب انداز میں بیان

کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

فغدت قریش یقول بعضهم لبعض اما علی فقد کفیتموه فانه ارمد لا یبصر موضع قدمه و قال علی علیه السلام لما سمع مقالة رسول الله اللهم لا معطی لم منعت ولا دافع لما اعطیت

(اعلام الوریٰ)

قریش کے لوگ آپس میں کہہ رہے تھے کہ علیؑ کے میدان میں آنے کا خطرہ تو ہے ہی نہیں کیونکہ ان کی آنکھیں اس شدت سے آئی ہوئی ہیں کہ وہ اپنے پیر رکھنے کی جگہ بھی نہیں دیکھ سکتے اور حضرت علیؑ تک جو پیغمبر خداؐ کے ان الفاظ کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے (بارگاہ الٰہی میں) عرض کیا' پروردگارا جسے تو محروم رکھنا چاہے اسے کوئی کچھ نہیں دے سکتا اور جسے تو دلوائے اسے کوئی ہٹا نہیں سکتا۔

ان مختصر الفاظ میں "تمنائے بے قرار" کے ساتھ اپنی مجبوری کے احساس سے ایک "حسرت و یاس" اور پھر فضل الٰہی سے ایک "امیدواری" کی وہ سموئی ہوئی کیفیت ہے جس کا اظہار کسی بسیط تقریر سے بھی مشکل ہی سے ہو سکتا ہے۔

حصول علم کے لئے ہر شخص خود کو نمایاں کرتا ہے

باقی ادھر کا کیا عالم تھا اسے مورخین الفاظ ذیل میں لکھتے ہیں۔

فتطاول المهاجر[illegible] فما منا انسان له منزلة عند الرسول الا و هو یرجو ان یکون صاحب اللواء

(ابوالفدا جلد ا صفحہ ۱۴۰)

(خصائص نسائی مطبوعہ نجف صفحہ ۷)

مہاجرین و انصار سب گردنیں اپنی لمبی کر کر کے نگراں ہوئے۔ اس کے بعد کوئی بھی شخص جس کا پیغمبر خداؐ کے یہاں کوئی مقام ہو سکتا تھا ایسا نہ تھا جو یہ امید نہ رکھتا ہو کہ وہی آج علمدار ہو۔

صبح خیبر کا منظر اور علیؑ کی طلبی بحالت آشوب چشم

جہاں رات اتنی بے چینی سے گزاری ہو وہاں کی صبح کے عالم کا کیا پوچھنا، یقین جاننا چاہئے کہ ابھی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خیمہ سے برآمد نہیں ہوئے کہ در خیمہ پر مسلمانوں کے ٹھٹھ لگ گئے اور جو جو وجیہ افراد اس منصب کے امیدوار ہو سکتے تھے وہ تمام مجمع کو چیرتے پھاڑتے آگے کی صف میں جا جا کر بیٹھے کہ پیغمبر خداؐ کی نگاہ ہم پر جا پڑے۔ اب اس موقع کا حال پھر پہلے علامہ طبری کے الفاظ میں دیکھئے۔

فاصبح رسول اللّٰه واجتمع الیه الناس قال سعد جلست نصب عینیه ثم جثوت علٰی رکبتی ثم قمت علٰی رجلی قائما رجاء ان یدعونی فقال ادعوا لی علیا فصاح الناس من کل جانب انه ارمد رمدا" لا یبصر موضع قدمه فقال ارسلوا الیه وادعوه

(اعلام الوریٰ)

صبح ہوئی اور پیغمبر خداؐ کے پاس تمام لوگ جمع ہوئے۔ سعد بن وقاص کا بیان ہے کہ میں بالکل آپ کی آنکھوں کے سامنے بیٹھا۔ پھر گھٹنے کے بل اونچا ہو کر بیٹھ گیا پھر سیدھا کھڑا ہو گیا اس امید میں کہ حضرت مجھ کو بلا لیں مگر آپ نے فرمایا کہ علیؑ کو میرے پاس بلا لاؤ۔ یہ سننا تھا کہ سب لوگ چاروں طرف سے چیخنے لگے کہ ارے انہیں تو آشوب چشم ہے۔ ایسا کہ اپنے پیروں کے نیچے کی زمین نہیں دیکھ سکتے۔ آپؐ نے فرمایا کہ جو بھی ہو کسی کو ان کے پاس بھیجو اور انہیں بلاؤ۔

اس کے بعد اب دوسری تاریخوں کے بیانات ملاحظہ فرمائیے۔

حافظ نسائی نے بریدہ سے روایت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

فلما اصبح رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم صلی الغداة ثم جاء قائما ودعا باللواء فما منا انسان له منزلة عند رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم الا و هو یرجو ان یکون صاحب اللواء فدعا علی بن ابی طالب رضی اللّٰه عنه

(خصائص امیرالمومنین مطبوعہ نجف صفحہ ۷)

صبح ہوئی تو رسول خداؐ نے صبح کی نماز ادا فرمائی اس کے بعد تشریف لا کر کھڑے ہو گئے اور علم طلب فرمایا تو کوئی آدمی ہم میں سے ایسا نہ تھا جسے پیغمبرؐ کے یہاں کوئی مقام حاصل ہو مگر یہ کہ وہ امید رکھتا تھا کہ وہی علمدار ہو گا لیکن حضرت نے علیؑ بن ابی طالبؑ کو طلب فرمایا۔

سعد بن وقاص اور عمر ابن خطاب کی حسرت

دیار بکری رقمطراز ہیں۔

روی ان الناس لما اصبحوا غدوا الی رسول اللّٰہ واجتمعا علٰی بابہ و فی المنتقٰی لما کان من الغد تطاول لھا ابوبکر و عمر و قریش و یرجو کل واحد ان یکون ھو صاحب ذالک و عن سعد بن ابی وقاص قال جئت فبرکت بحذاء النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ثم قمت و وقفت بین یدیہ و عن عمر بن الخطاب انہ قال ما احببت الا مارۃ الا ذالک الیوم ثم خرج النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم من خیمتہ و قال این علی بن ابی طالب فقیل ھو یشتکی عینیہ فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم ارسلوا الیہ من یا تی بہ

(تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۴۸)

روایت میں ہے کہ جب صبح ہوئی تو ہم لوگ سویرے ہی پیغمبر خداؐ کی طرف روانہ ہوئے اور آپ کے دروازہ پر جمع ہو گئے اور کتاب منتقٰی میں ہے کہ جب دوسرا دن ہوا تو ابوبکر اور عمر اور تمام قریش نے گردنیں بلند کیں اور ہر ایک امید کر رہا تھا کہ وہی رسول کے اعلان کا مصداق ہو اور سعد بن ابی وقاص کا بیان ہے کہ میں آیا اور رسولؐ کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا پھر اٹھا اور آپ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور عمر بن خطاب کا بیان ہے کہ مجھے سوا اس دن کے کبھی سرداری کی خواہش نہیں ہوئی۔ پھر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے خیمہ سے برآمد ہوئے

اور فرمایا علیؑ بن ابی طالبؑ کہاں ہیں؟ کہا گیا کہ ان کی تو آنکھیں دکھ رہی ہیں۔
حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کو بھیجو کہ وہ انہیں لے آئے۔
بریدہ اسلمی کی روایت میں عام مجمع کی کیفیت کو چھوڑ کر دو ہی شخصیتوں کے نام لئے گئے ہیں۔
فلما کان من الغد تطاول لها ابوبکر و عمر فدعا علیا
(تاریخ طبری مطبع حسینیہ مصر جلد ۳ صفحہ ۹۳)
جب دوسرا دن ہوا ابوبکر اور عمر گردنیں لمبی کر کے اس کے امیدوار ہوئے مگر حضرتؐ نے علیؑ کو بلوایا۔
بس اب آخر میں ایک قدیم ترین مورخ واقدی کا بیان درج کیا جاتا ہے جس میں خاص انفرادیت پائی جاتی ہے۔
قعد الناس الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلما اخذ القوم رایاتهم اخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برایته فهز ها و دعاربه ثم اعطا ها علی بن ابی طالب
(کتاب المغازی للواقدی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۵ء جلد ۱ صفحہ ۳۹۱)
لوگ آ کر حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے جب تمام لوگ اپنے اپنے جھنڈوں سمیت آ گئے تو حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم کو ہاتھ میں لے کر اسے جنبش دی اور اپنے پروردگار سے دعا مانگی۔ پھر اسے علیؑ بن ابی طالبؑ کے حوالے کر دیا۔

حضرت علیؑ کی آمد، رسولؐ کے لعاب دہن کا اعجاز

علامہ طبری نے لکھا ہے۔
فاتی به یقاد فوضع راسه علی فخذه ثم تفل فی عینیه فقال فکان عینیه جزعتان ثم اعطاه الرایة

(اعلام الوریٰ)

علیؑ کو ہاتھ پکڑ کر لایا گیا تو حضرت نے ان کا سر اپنے زانو پر رکھ کر آنکھوں میں اپنا لعاب دہن ڈال دیا تو فوراً آنکھیں صحیح و سالم ہو گئیں اس کے بعد ان کو اپنا علم دے دیا۔

اب مادی سائنس کے پرستار اس کی جو چاہیں توجیہہ کریں مگر یہ واقعہ تو مسلم ہے جسے تمام دوسرے مورخین بھی یونہی لکھ رہے ہیں۔

سیرت میں ہے۔

فدعا رسول اللّٰہ علیا رضوان اللّٰہ علیہ و ھو ارمد فتفل فی عینیہ ثم قال خذ ھذہ الرایۃ فامض بھا حتی یفتح اللّٰہ علیک

(ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۱۸۷)

حضرت پیغمبر خداؐ نے حضرت علیؑ کو بلایا اس عالم میں کہ وہ آشوب چشم میں مبتلا تھے تو ان کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن ڈالا پھر فرمایا اب یہ علم لے کر جاؤ کہ اللہ تمہارے ہاتھوں فتح کی صورت نصیب کرے۔

طبری نے لکھا ہے۔

فدعا علیا وھوا رمد فتفل فی عینیہ و اعطاہ اللواء

(تاریخ طبری مطبوعہ مطبع حسینیہ جلد ۳ صفحہ ۹۳)

تاریخ ابوالفداء میں ہے۔

و کان علی بن ابی طالب غائبا فجاء وھوا رمد قد عصب عینیہ فقال لہ رسول اللّٰہ ادن منی فدنا منہ فتفل فی عینیہ فزال وجعھما ثمہ اعطاہ الرایۃ

(تاریخ ابوالفداء جلد ۱ صفحہ ۱۴۷)

علیؑ بن ابی طالبؑ وہاں موجود نہ تھے وہ آئے تو اس حال میں کہ آشوب چشم کی وجہ سے دونوں آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ حضرت نے فرمایا میرے قریب آؤ۔ وہ قریب گئے تو آپ نے اپنا لعاب دہن ان کی دونوں آنکھوں میں ڈال دیا تو ان کی تکلیف دور ہو گئی پھر آپ نے انہیں علم عطا فرمایا۔

خصائص نسائی میں بریدہ کی ایک روایت میں ایک جز کا اضافہ ہے۔ اس طرح کہ

فتفل و مسح فی عینیہ فدفع اللواء

(خصائص امیرالمومنینؑ طبع نجف صفحہ ۷)

تھوکا اور اپنا ہاتھ ان کی آنکھوں پر مل دیا۔ اس کے بعد علم دیا۔

ظاہر ہے کہ تاریخ کا کام صرف اس واقعہ کا اظہار ہے۔ آپ اس پر کوئی بحث کہ لعاب دہن کا یہ اثر کیونکر ہوا کہ اس سے آنکھیں فوراً روشن ہو گئیں؟ تاریخ کے حدود سے خارج ہے۔ مذہبی زبان میں اسے رسولؐ کا معجزہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کے لعاب دہن میں خالق نے یہ حیرت انگیز تاثیر ودیعت فرمائی تھی۔

رسولؐ علیؑ کو اسلحہ جنگ سے آراستہ کرتے ہیں

مورخ دیار بکری نے لکھا ہے کہ علیؑ شفایاب ہو گئے تو رسولؐ نے اپنی فولادی زرہ ان کے زیب جسم فرمائی اور ذوالفقار ان کی کمر میں لگائی اور پھر علم عطا فرمایا۔

(تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۴۹)

علامہ ابن القیم تحریر کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ! کیا میں ان سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک کہ وہ ہمارے ایسے نہ ہو جائیں یعنی اسلام قبول نہ کر لیں۔ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ پہلے پرامن طریقہ پر جا کر ان کی حدود میں ٹھہرو' پھر انہیں دعوت اسلام دو اور انہیں بتاؤ کہ ان پر اللہ کی طرف سے کیا فریضہ عائد ہے۔ بخدا تمہارے ذریعہ سے کسی ایک کی ہدایت ہو جائے۔ یہ ہر قیمتی شے سے تمہارے لئے زیادہ قیمت رکھنے والی چیز ہے۔

(زاد المعاد فی ہدی خیر العباد مطبوعہ مطبع نظامی کانپور نصف اول صفحہ ۳۸۴)

اسلامی جنگ کا معیار فتح

اس سے اسلامی فتح کا معیار ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں نصب العین کسی ملک پر

قبضہ کرنا نہیں ہے بلکہ خلق خدا کو پر امن طریقہ پر راہ راست کی طرف دعوت دینا ہے اگر وہ خود خونریزی پر آمادہ نہ ہو جایا کریں تو جنگ کا سوال ہی نہیں جنگ تو اس لئے ہوئی کہ انہوں نے دعوت اصلاح کا مقابلہ ہتھیاروں سے کرنا چاہا تو مجبوراً ان کے دفعیہ کے لئے ہتھیار ہاتھ میں اٹھائے گئے۔

حضرت علیؑ کی پیش قدمی اور مرحب سے مقابلہ

حضرت علیؑ کا اپنی معذوری سے وہ احساس مجبوری۔اور رسولؐ کی حدیث کو سننے کے بعد وہ بارگاہ الٰہی میں عاجزانہ عرض داشت اور پھر خلاف توقع اس طرح طلب کیا جانا اور پھر غیر معمولی صورت سے مرض کا دفعیہ اور علمداری کے منصب کا عطا ہونا۔ اس کے بعد یہ کیفیت جوش مسرت اور ولولہ شجاعت میں بالکل فطری حیثیت رکھتی ہے جسے علامہ طبری نے بھی لکھا ہے کہ علم پانے کے بعد حضرت علیؑ دوڑتے ہوئے میدان کی طرف روانہ ہوئے۔

(اعلام الوریٰ)

اس دوڑنے کی سی کیفیت کا ذکر سیرت ابن ہشام (جلد ۲ صفحہ ۱۸۷ طبع مصر) اور تاریخ خمیس (جلد ۲ صفحہ ۴۹ طبع مصر) وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

فوج والے تو ابھی یہ منظر دیکھنے میں مصروف تھے اور بے تابانہ اشتیاق کے ساتھ نتیجہ کے منتظر۔ لہٰذا میدان میں جانے کی تیاری کس نے کی تھی؟ مگر سالارِ فوج اب وہ ہوا ہے جسے کسی تیاری کی ضرورت نہیں۔ وہ فوراً آگے بڑھتا ہے تو ساتھ کون جائے؟ جابر کا بیان ہے کہ آپ اتنے جلدی روانہ ہو گئے کہ ہمیں ہتھیار لگانا مشکل ہو گئے اور سعد بن وقاص نے پکار کر کہا۔

یا ابا الحسن اربع حتی یلحقکَ الناس

(اعلام الوریٰ)

اے ابو الحسنؑ ذرا ٹھہریے کہ اور لوگ پہنچ جائیں۔

سلمہ کہتے ہیں۔

و انا خلفه نتبع اثرہ

(سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۱۸۷ و تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۴۹)

ایک جگہ جابر کا بیان یہ ملتا ہے کہ لوگ کہہ رہے تھے "یا علیؑ! رحم کیجئے' یعنی اتنی جلدی نہ کیجئے"

حضرت امیرؑ نے قلعہ کے سامنے جا کر نیزہ اپنا زمین میں گاڑ دیا جس کا محولہ بالا تمام ماخذوں میں ذکر ہے۔ ممکن ہے یہ اشارہ ہو اس بات کے اعلان کا کہ آج میدان میں آنے والا بغیر قلعہ فتح کیے واپس جانے والا نہیں ہے۔ ان تیوروں ہی سے قلعہ والوں میں ہلچل مچ گئی۔

خیبر والوں کا سب سے بڑا مایہ ناز سورما تو مرحب تھا جو غالبا اس قلعہ میں حاکم کی حیثیت رکھتا تھا مگر اس کا چھوٹا بھائی حارث بھی اپنی جگہ بڑا بہادر سمجھا جاتا تھا اور اب تک مسلمانوں کی فوج کے مقابلہ کے لئے وہی کافی سمجھا جاتا رہا تھا چنانچہ فطری طور پر آج بھی میدان میں وہی نکلا۔ اس کے علاوہ عنتر وغیرہ کچھ اور بہادروں کے نام بھی تاریخ میں آئے ہیں۔

ان میں سے یکے بعد دیگرے ہر ایک نے حضرت علیؑ کا مقابلہ کیا اور علیؑ کی تلوار سے اس کا خاتمہ ہوا۔ ان سب کے بعد چار و ناچار خود مرحب ہی میدان میں آ سکتا تھا چنانچہ وہ نکلا۔

چونکہ اسی کی اہمیت زیادہ تھی اس لئے تواریخ نے اسی سے مقابلہ کی کیفیت ذرا تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔ علامہ طبری لکھتے ہیں۔

فخرج الیہ مرحب فی عادیۃ الیہود فبارزہ فضرب رجلہ فقطعھا و سقط

(اعلام الوریٰ)

مرحب یہودیوں کی خاص طاقتور جماعت کے ساتھ میدان میں آیا تو آپ نے اس سے مقابلہ کیا اور تلوار اس کے پیر پر لگا کر اسے کاٹ دیا جس سے وہ گر گیا۔

مگر دوسری روایت اس کے خلاف یہ ہے کہ آپ نے سر پر تلوار لگائی چنانچہ شیخ

عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں۔

مرحب پیش دستی نمود خواست کہ تیغے بر سر علیؑ زند پس امیر کبیر سبقت جستہ ذوالفقار برسر آں ملعون غدار فرود آورد چنانکہ از سر خود و دستارش گزشتہ تا بحلق و بروایتے تابہ رانہائے وے و بروایتے تابقا بوس زین او رسید و دونیم ساخت

(مدارج النبوۃ مطبوعہ نو لکشور جلد ۲ صفحہ ۳۲۵)

مرحب نے سبقت کرکے چاہا کہ حضرت علیؑ کے سر پر تلوار لگائے مگر جناب امیرؑ نے سبقت کرکے ذوالفقار اس غدار ملعون کے سر پر ایسی ماری کہ اس کے خود اور پگڑی میں سے گزر کر حلق تک اور ایک روایت کے مطابق اس کی رانوں تک اور ایک روایت کے مطابق اس کے گھوڑے کی زین تک پہنچ گئی اور دو ٹکڑے کر دیئے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محدث دہلوی کے پیش نظر کئی روایتیں ہیں جو اس بارے میں کہ تلوار سر پر لگائی گئی تھی متفق ہیں۔ ہمارے یہاں شہرت عام بھی اسی کو حاصل ہے چنانچہ ملا رفیع باذل نے بھی حملہ حیدری میں اپنے پرزور انداز میں اسی کو نظم کیا ہے۔

دوسرے مستند مورخین کے تصریحات بھی اسی کے مطابق ہیں۔ طبری میں ہے۔

ضرب حیدری کی گونج

فضربہ علی علٰی ھامتہ حتی عض السیف منہا باضراسہ و سمع اھل العسکر صوت ضربتہ

(تاریخ طبری مطبع حسینیہ مصر جلد ۳ صفحہ ۹۳)

حضرت علیؑ نے اس کے سر پر تلوار لگائی یہاں تک کہ تلوار کاٹتی ہوئی اس کے دانتوں تک پہنچی اور اہل لشکر نے اس ضرب کی آواز کو سنا۔

دیار بکری نے معالم التنزیل کے حوالہ سے لکھا ہے۔

اراد مرحب ان یضرب علیا فسبقه علی فعلاه بالسیف و ھو ذوالفقار فتترس مرحب فوقع السیف علی الراس فقده والحجر والمغفرو العما متین و فلق ھامنه حتی اخذ السیف فی الاضراس

(تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۵۰)

مرحب نے چاہا کہ حضرت علیؑ پر ضرب لگائے مگر آپ نے سبقت کرکے اپنی تلوار جو ذوالفقار تھی اس کے سر پر بلند کی مرحب نے سپر سے روکا تو تلوار سپر پر پڑی اور اسے کاٹ دیا اور پتھر کو کاٹا اور خود کو اور دو عماموں کو اور اس کے سر کو شگافتہ کیا یہاں تک کہ تلوار اس کے دانتوں میں پہنچ گئی۔

اس سب کے بعد سمجھ میں نہیں آتا کہ علامہ طبری نے یہ کیونکر لکھ دیا کہ حضرت نے تلوار اس کے پیر پر لگائی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ممدوح نے یہ مقام کسی ماخذ کو سامنے رکھ کر تحریر نہیں کیا بلکہ بس اپنے ذہن پر اعتماد کرکے یاد پر لکھ دیا اس لئے جنگ خندق میں عمرو بن عبدود کے مقابلہ میں حضرت علیؑ نے جو ضرب لگائی تھی اور وہ اس کے پیروں پر تھی وہ اشتباہ کے طور پر مرحب سے متعلق ہو گئی جسے خطائے "بزرگاں" میں محسوب کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

حضرت علیؑ کی حیرت انگیز طاقت کے مظاہرے اور فتح خیبر کی تکمیل

مرحب کے قتل ہونے کے بعد علامہ طبری نے تو معلوم نہیں کیوں؟ غیر معمولی اختصار سے کام لے کر صرف اتنا لکھ دیا ہے کہ۔

حمل علی والمسلمون علیھم فانھزموا

حضرت علیؑ اور مسلمانوں نے ان پر حملہ کر دیا تو انہوں نے شکست کھائی۔

مگر دوسرے مورخین نے جنگ کے حالات کافی تفصیل سے لکھے ہیں جن میں کی بعض باتیں چاہے موجودہ زمانہ والوں کی عقل میں نہ آئیں مگر مورخین نے بلا تفریق فرقہ انہیں درج کیا ہے جیسے حضرت علیؑ کے ہاتھ سے ایک یہودی کی ضرب سے سپر کا چھوٹ کر گرنا، کسی یہودی کا اسے لے کر بھاگنا اور پھر آپ کا غضبناک ہو

کر ایک جست لگا کر خندق کے پار جانا اور قلعہ کے آہنی دروازہ کو اکھاڑ کر ہاتھ میں بطور سپر لے لینا اور جنگ میں مصروف ہونا۔

(مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۳۲۵)

یا دوسری روایت کے الفاظ کے لحاظ سے قلعہ کے پاس جو ایک دروازہ تھا اسے ہاتھ میں اٹھا کر سپر بنا لینا اور جنگ کے اختتام کے بعد تک اسے ہاتھ میں لیے رہنا اور تکمیل فتح حاصل ہونے کے بعد اس دروازہ کو ہاتھ سے پھینکنا' پھر آٹھ آدمیوں کا مل کر اس دروازہ کو پلٹنے کی کوشش کرنا اور ان سب کا اس کوشش میں ناکام ہونا۔

(ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۱۸۷' ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۹۱)

یا یہ کہ دروازہ پتھر کا تھا جو چار گز لمبا اور دو گز چوڑا تھا اور ایک گز بلندی پر نصب تھا' اسے آپ نے اکھاڑ کر پس پشت پھینک دیا اور قلعہ میں داخل ہو گئے۔ (تاریخ یعقوبی ابن واضح کاتب عباسی مطبوعہ نجف ۱۳۸۴ھ ۱۹۲۴ء جلد ۲ صفحہ ۴۶) وغیرہ وغیرہ۔

یہ روایات بلا تفریق فرقہ مورخین اسلام صدر اول سے اب تک برابر درج کرتے آئے۔

اب ابن خلدونی طریقہ تحلیل و تجزیہ سے کوئی منقولات سے ہٹ کر خالص عقلی اصول پر روایات سے نتیجہ نکالنے کی کوشش کرے تو بھی اسے اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ کوئی ایسا غیر معمولی مظاہرہ جرات و ہمت اور شجاعت کا اس میدان خیبر میں حضرت علیؓ بن ابی طالبؑ سے وقوع میں آیا تھا جس کی وجہ سے اس قسم کی روایتیں زباں زد خلائق ہو گئیں ورنہ آخر خود حضرت علیؓ کے لئے خیبر کی مہم کے علاوہ کسی اور معرکہ میں اس طرح کی باتیں کیوں راویوں کی زبان پر نہیں آئیں اور حضرت علیؓ کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے آخر کبھی بھی اس طرح کی چیزیں کیوں کسی بھی راوی نے جو ان کا عقیدتمند بھی ہو کیوں بیان نہیں کیں؟ پھر یہ کہ تاریخیں نہ دیالمہ کے زیر اثر تحریر ہوئیں نہ فاطمی سلاطین مصر کے زیر سایہ نہ صفوی یا قاچاری شاہان ایران کے دور کی پیداوار ہیں بلکہ یہ تاریخیں آخر زمانہ بنی

امیہ سے لے کر بنی عباس کے عہد کی ہیں یا بنی امیہ کے بعد والے مغربی قلمرو مملکت میں تحریر ہوئیں جہاں شیعی اثرات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل حقیقت اتنا وزن رکھتی تھی کہ اسے ماحول اور سرزمین کا کوئی دباؤ مغلوب و مضمحل نہیں کر سکا۔

مسٹر کے اے حمید بی اے (لندن) بیرسٹر لاہور نے جنگ خیبر کے تفصیلات کو باوجودیکہ اجمال کی بہت دبیز تہوں میں چھپایا ہے پھر بھی ان کو اتنا لکھنا ہی پڑا ہے کہ -

"سرکارؐ نے حضرت علیؓ کو طلب فرمایا اور قلعہ ناعم پر حملہ کے لئے ہدایات دیں- حضرت علیؓ نے میدان میں وہ کارہائے نمایاں دکھلائے جن کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ قلعہ ناعم کی فتح کے بعد حضرت علیؑ نے قلعہ قموص کو سر کیا- اسی طرح مسلمانوں نے یکے بعد دیگرے کئی قلعے فتح کر لیے۔

(تاریخ مسلمانان عالم حصہ اول صفحہ ۸۴)

علامہ طبری تحریر فرماتے ہیں کہ ایک مخبر نے جا کر رسول خداؐ کو خوشخبری دی کہ علیؑ قلعہ کے اندر داخل ہو گئے- یہ سن کر رسول خداؐ قلعہ کی طرف متوجہ ہوئے- ادھر سے حضرت علیؑ استقبال کے لئے نکلے- رسولؐ نے فرمایا کہ تمہارے کارنامہ کی پوری اطلاع مجھے ہوئی اللہ تم سے راضی ہے اور میں بھی تم سے خوش ہوں- یہ سننا تھا کہ علیؑ رونے لگے- رسولؐ نے فرمایا' یا علیؑ! روتے کیوں ہو؟" عرض کیا یہ گریہ مسرت ہے اس بات پر کہ اللہ اور رسولؐ مجھ سے خوش ہیں-

(اعلام الوریٰ)

صفیہ کی اسیری اور پیغمبر خدا کی دلجوئی

جنگ کے اختتام پر جو لوگ اسیر کئے گئے ان پر رئیس یہود حیی بن اخطب کی بیٹی صفیہ بھی تھیں- حضرت علیؑ نے بلالؓ کو بلا کر فرمایا' کہ انہیں خود رسول خداؐ کے پاس لے جانا کہ جو وہ مناسب سمجھیں وہ ان کے ساتھ سلوک کریں- اس سے ظاہر ہے کہ خود حضرت علیؑ کے بھی یہ پہلو زیر نظر تھا کہ رئیسان قوم کی خواتین

کے ساتھ وہ برتاؤ نہیں کیا جا سکتا جو عام قیدیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

صفیہ کو اقربا کی لاشوں کے پاس سے گزارنا رسولؐ کو ناگوار ہوا

بلالؓ انہیں لے چلے مگر ادھر سے جدھر ان کے عزیزوں کے لاشے پڑے ہوئے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر ان کی حالت بہت غیر ہو گئی۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ معلوم ہوا تو بلال پر بہت ناراض ہوئے فرمایا اے بلال! کیا تمہارے دل سے رحم بالکل سلب ہو گیا ہے؟ پھر آپؐ نے ان کے لئے یہی مناسب سمجھا کہ خود ان سے شادی فرمائیں۔ علامہ طبرسی کی تصریح ہے کہ اعتقها و تزوجها آپؐ نے انہیں آزاد کیا اور ان سے شادی کی"۔

(اعلام الوریٰ)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے ساتھ شاہزادیوں کا سا برتاؤ کیا یعنی یہ نہیں ہوا کہ کنیز کی صورت سے بحق ملکیت ان میں تصرف کیا گیا ہو بلکہ ایک آزاد عورت کی طرح ان کا عقد ہوا جس میں تراضی طرفین لازمی چیز ہے۔

تاریخِ اسلام

جلد چہارم

○ از قلم ○

سید العلماء مولانا سید علی نقی النقوی مرحوم

ناشر:
امامیہ دار التبلیغ
362-C گلی 12 جی 6/2 اسلام آباد

○ ملنے کا پتہ ○

عباس بک ایجنسی
رستم نگر درگاہ حضرت عباس لکھنؤ
فون نمبر : (R) 647590 (o) 647596
فیکس نمبر : (0522) 647910

فہرست تاریخ اسلام جلد چہارم

نمبر	مضمون	صفحہ
183	فدک	389
184	مہاجرین حبشہ کی مراجعت	394
185	منبر رسول	396
186	عمرۃ القضاء	397
187	پیغمبر اسلام کے خطوط اور ان کے اثرات	399
188	جنگ موتہ	407
189	پس منظر	410
190	مشرکین کی بد عہدی	421
191	عزم روانگی اور بعض صحابہ	426
192	عفو عام کا تاریخی اعلان	441
193	تطہیر کعبہ یا بت شکنی	450
194	تبلیغی مہمیں	456
195	غزوہ حنین	458
196	ایک باحمیت خاتون کا غصہ	465
197	جنگ اوطاس و طائف	467
198	مال غنیمت پر پیغمبر خدا کا خطبہ	468
199	غزوہ تبوک	471
200	رسول خدا کی جان لینے کا منصوبہ	473
201	تبلیغ سورہ برائت	478
202	واقعہ مباہلہ	482
203	فتح یمن	485
204	حجۃ الوداع	487
205	جانشینی علی کا اعلان	493
206	خلیفہ دوم کی مبارکباد	506
207	مدینہ کی طرف واپسی اور لشکر اسامہ کی تیاری	508
208	رسول کی علالت اور زندگی کے آخری لمحات	513
209	نقل مکان اور امامت نماز کا منصوبہ	515
210	نفسیاتی کرب و اذیت	519
211	آخری وصیتیں	526
212	زندگی کا آخری دن اور وفات	527
213	مدینہ میں کہرام	530

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلٰوۃ علٰی سید الانبیآء والمرسلین محمدن المصطفٰے خاتم النبیین والہ الطیبین الطاہرین المعصومین !

فدک

جنگ خیبر کی فتح کا اثر تھا کہ اطراف کے یہودیوں پر اسلام اور پیغمبراسلامؐ کی شوکت و سطوت کا رعب چھا گیا چنانچہ فدک والوں نے بغیر کسی جدال و قتال کے اپنی املاک حضرت رسول خداؐ کے سپرد کر کے مصالحت کر لی۔

اس سلسلہ میں برادر محترم مولانا سید محمد صاحب گوپال پوری نے اپنے ایک رسالہ میں جو ابھی غیر مطبوعہ ہے' کافی معلومات فراہم کی ہیں۔ چونکہ ممدوح نے یہ رسالہ مناسب موقع پر اشاعت کے لئے مجھے مرحمت فرمایا تھا۔ اس لئے بغرض رفاہ عام اس کے اس حصہ کے مندرجات کو میں اپنی کتاب کا جز بنا کر پیش کر رہا ہوں جو فدک کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے سردست وافی و کافی معلوم ہوتا ہے۔

اصل رسالہ اب خود ممدوح کے پاس پہنچ چکا ہے جو امید ہے کہ محفوظ ہوگا۔ تکمیل فائدہ کے لئے اصل کتابوں کی مطابقت کے بعد صفحہ کے حوالہ میں نے ذیل حواشی میں درج کر دیئے ہیں۔

یاقوت حموی تحقیق لفظ فدک میں لکھتے ہیں۔

فدکٌ بالتحریکٌ و اخرہ کاف قریۃ بالحجاز منھا و بین المدینۃ یومان و قیل ثلثۃ افاء اللّٰہ علی رسولہ فی سنتہ سبع صلحا

فدک حجاز کی ایک بستی ہے جو مدینہ سے دو یا تین دن کے راستے پر ہے۔ اسے اللہ نے اپنے پیغمبر کو سن ۷ ہجری میں بر بنائے صلح بطور فے عطا فرمایا تھا۔

(معجم البلدان طبع مصر ۱۳۲۴ھ سن ۱۹۰۶ء جلد ۶ صفحہ ۳۴۲)

فیئی کے معنی اس کے بعد درج کئے جائیں گے۔

ابن شہاب زہری کی روایت ہے کہ یہ مخریق یہودی کے املاک تھے- (۱) برقہ- (۲) اعواف - (۳) صافیہ- (۴) میسب- (۵) حسنی- (۶) مشربہ ام ابراہیم- (۷) دلال' یہ کل سات قطعات تھے- ان میں بہت سے نخلستان تھے- ۷ ہجری تک یہ علاقہ کفار خیبر کے اور دیگر یہود کی ملکیت میں تھا جنگ خیبر کے بعد حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ چند مصالحتی شرائط پر ملا- اس پر کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی- اس لئے یہ پیغمبر اسلامؐ کا خالصہ تھا جس کی پیداوار حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ضروریات میں بھی صرف فرماتے تھے اور اس سے محتاجوں کی اعانت بھی فرماتے تھے۔

ان سات قطعوں کے نام فروع کافی میں حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی حدیث میں بھی وارد ہیں-

(فروع کافی مطبوعہ ایران ۱۳۱۵ ھ صفحہ ۲۴۷ کتاب الوصایا باب صدقات النبیؐ)

ابن ابی الحدید معتزلی شرح نہج البلاغہ میں لکھتے ہیں-

عن الزهری قال بقیت بقیة من اهل خیبر تحصنوا فسالوا رسول اللّٰهؐ ان یحقن دماء هم ویسیرهم ففعل فسمع ذالك اهل فدك فنزلوا علٰی مثل ذالك وکانت للنبیؐ خاصة لانه لم یوجف علیها بخیل ولا رکاب

"زہری سے روایت ہے' انہوں نے کہا بچے ہوئے خیبریوں نے جو قلعہ بند ہو گئے تھے' پیغمبر اسلامؐ سے جان کی اماں چاہی اور شہر چھوڑ دینے کا وعدہ کیا تو پیغمبر اسلامؐ نے ان کی درخواست منظور کر لی- فدک والوں کو یہ خبر ملی تو انہوں نے بھی یہی درخواست پیش کی جسے حضورؐ نے قبول کر لیا اس لئے فدک سرکار دو عالمؐ کی خاص ملکیت قرار پایا کیونکہ اس پر فوج کشی نہیں ہوئی تھی-

(شرح ابن ابی الحدید' ط مصر' جلد ۴' صفحہ ۷۸)

تاریخ طبری میں بھی اس کی تصریح ہے- وہ لکھتے ہیں-

"فکانت فدك رسول اللّٰهؐ خاصة عنهم
لم یجلبوا علیها بخیل ولا رکاب"

"فدک خاص پیغمبر خداؐ کا تھا اس لئے کہ مسلمانوں نے اس پر سواروں اور

پیادوں کی شکل میں حملہ نہیں کیا تھا"۔

(تاریخ طبری، ط مصر، جلد ۳، صفحہ ۹۸)

سیرت ابن ہشام کے بھی الفاظ یہ ہیں کہ۔

"فکانت خیبر فیما بین المسلمین وکانت فدك خالصة لرسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لانهم لم یجلبوا علیها بخیل ولا رجال"

"خیبر مسلمانوں کے درمیان مشترک مال غنیمت کی حیثیت رکھتا تھا اور فدک خاص رسول خداؐ کا تھا اس لئے کہ مسلمانوں نے سواروں اور پیادوں کی صورت میں اس پر فوج کشی نہیں کی تھی"۔

(السیرة النبویة" لابن ہشام القسم الثانی، الجز الثالث والرابع الطبعه الثانیة بصر ۱۳۷۵ھ - ۱۹۵۵ء، صفحه ۳۳۷)

یہ حکم قرآن مجید کی اس نص پر مبنی ہے کہ۔

"ما افاء اللّٰه علٰی رسوله من اهل القرٰی فا ادخفتم علیه من خیل ولا رکاب ولکن اللّٰه یسلط رسله علٰی من یشاء واللّٰه علٰی کل شئی قدیر"

"جو اللہ نے اپنے رسول کو مال غنیمت میں عطا کیا اس لئے کہ تم نے اس پر سواروں اور پیادوں کی شکل میں فوج کشی نہیں کی مگر اللہ اپنے پیغمبروں کو قابو دیتا ہے جس پر چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

علامہ فخرالدین رازی نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے۔

"فذکر اللّٰه الفرق بین الاعرف وهوان الغنیمة ما تعبتم انفسکم فی تحصیلها واوخفتم علیها بخیل ورکاب بخلاف الفیئی فانکم ماتحمکتم فی تحصیله تعبا فکان الا مرفیه مفوضًا الی الرسول یضعه حیث یشاء

"خداوند عالم نے مال نمنیمت اور فئی میں فرق بیان کیا ہے کہ مال غنیمت وہ

ہے جس کے حاصل کرنے میں تم نے زحمت و مشقت برداشت کی ہے اور سواروں اور پیادوں کے ساتھ فوج کشی کی ہے۔ برخلاف فئی کے کہ اس کے لئے تم نے کوئی زحمت نہیں اٹھائی تو اس میں اختیار کلیۃ رسول کو ہے جس طرح چاہیں اسے صرف کریں"۔
(تفسیر کبیر' جلد ۸' صفحہ ۱۲۵)

یہی فدک وہ تھا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ۔

"وات ذا القربیٰ حقه

"صاحب قرابت کو اس کا حق دے دیجئے"۔

تو حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہراؑ کو بلا کر فدک کی ملکیت کی تحریر ان کے لئے لکھ دی۔

اس کا کتب اہل سنت میں بھی تذکرہ موجود ہے۔

(الدر منثور فی التفسیر بالماثور للسیوطی' جلد ۳' صفحہ ۲۷۹)

اور یہی علمائے شیعہ کی متفقہ روایت ہے۔ علامہ طوسیؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"فلما فرغ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وآله من خیبر حقد لواء ثم قال من یقوم علیه فیها فذلحقه وهو یرید ان بیعت الی حوائط فدکٔ فقام الیه قال انا فقال له عنه قام سعد فقال امسط عنه ثم قال یا علی قم الیه فخذه فاخذه مبعث به الی فدکٔ فصالحهم علی ان یحقن ومات فکانت حوائط فدکٔ لرسول اللّٰهؐ خاصا خالصا فنزل جبریل فقال ان اللّٰه عزو جل یا مرکٔ ان توتی ذاالقربیٰ حقه فقال یا جبریل ومن قراباتی وما حقها قال فاطمة فاعطها حوایطها حوایط فدکٔ ومااللّٰه ولرسوله فیها فدعا رسول اللّٰه فاطمة علیها السلام وکتب لها کتابا"

"جب حضرت پیغمبر خداؐ خیبر کی مہم سے فارغ ہوئے تو آپ نے ایک علم مرتب فرمایا پھر کہا کون اٹھتا ہے کہ اسے اپنے استحقاق کی بناء پر ہاتھ میں لے اور آپ کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس کو فدک کے علاقہ کی طرف روانہ فرمائیں تو بعض علم لینے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ آپ نے فرمایا تم ہٹ جاؤ' پھر سعد کھڑے ہوئے'

آپ نے انہیں بھی ہٹا دیا۔ پھر خود فرمایا کہ علیؑ تم کھڑے ہو اور اسے لو چنانچہ انہوں نے لیا۔ آپ نے انہیں فدک کی طرف روانہ فرما دیا تو آپ نے ان سب سے صلح کی اس شرط پر کہ انہیں جان کی امان دی جائے گی۔ اس طرح فدک کے علاقوں کی جائیداد خاص رسول اللہؐ کی ہوئی۔ اس پر جبرئیل نازل ہوئے اور کہا کہ خداوند عالم کا یہ حکم ہے کہ آپ ذی القربیٰ کو اس کا حق دے دیجئے۔ آپ نے کہا، اے جبرئیل یہ ذی القربیٰ کون ہیں اور ان کا حق کیا ہے؟ کہا فاطمہ ! آپؐ ، انہیں ان کے حق میں یہ فدک کے احاطے اور جو کچھ ان میں اللہ اور اس کے رسولؐ کا حق ہے سب دے دیجئے تو اس پر رسول خداؐ نے جناب فاطمہؑ کو بلایا اور ایک تحریر لکھ دی"۔ (اعلام الوریٰ، مطبوعہ طہران طبع جدید، صفحہ ۱۰۸، ۱۰۹)

مہاجرین حبشہ کی مراجعت

جناب جعفر بن ابی طالبؑ کی سرکردگی میں مکہ معظمہ سے حبشہ کی طرف بہت سے اصحاب نے ہجرت کی تھی۔ ان اصحاب میں بہت سے وقتاً فوقتاً واپس آتے رہے تھے مگر جناب جعفرؓ اور کچھ اصحاب اب تک ملک حبش میں تھے۔

حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی واپسی کے لئے عمر بن امیہ ضمری کے ہاتھ نجاشی بادشاہ کو خط روانہ فرمایا تھا چنانچہ یہ سولہ آدمی باقی ماندہ عورتوں اور بچوں کے ساتھ جناب جعفرؓ کی سرکردگی میں واپس ہوئے۔

(محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ شیخ محمد الخضری' جلد ا' طبعہ ثالثہ' صفحہ ۱۹۲' مصر)

حسن اتفاق ہے کہ خیبر کی فتح کے بعد اسی دن یہ لوگ اب اپنے اس نئے وطن میں پہنچے جو مسلمانوں کے لئے مدینہ میں بنا ہوا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسرت جو فتح خیبر سے ہوئی تھی' اس سے دوبالا ہو گئی۔

حضرتؐ نے جعفرؓ کو اپنے سینے سے لپٹا لیا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔ آپ فرما رہے تھے کہ مجھے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ مجھے خیبر کے فتح ہونے کی خوشی زیادہ ہے یا جعفرؓ کے آکر ملنے کی۔

(مقاتل الطالبین' جلد ۳' صفحہ ۶' مطبوعہ عراق ۱۳۵۳ھ)

(تاریخ ابو الفداء جلد ا' صفحہ ۱۲۸)

کسی مصنف پر کبھی بدحواسی کی کیفیت بھی طاری ہو جاتی ہے' اس کا ایک نمایاں ثبوت یہ ہے کہ مسٹر کے اے حمید بی اے (لنڈن) بیر سٹرایٹ لاء لاہور نے حدیبیہ کے بعد جنگ خیبر سے پہلے جنگ موتہ کا حال درج کر ڈالا ہے۔

(مسلمانان عالم' حصہ اول' صفحہ ۸۲-۸۳)

جس میں جناب جعفرؓ بن ابی طالب شہید ہوئے ہیں جس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے اور جنگ خیبر کے تذکرہ کے بعد لکھا ہے۔

"سرکار ابھی خیبر میں مقیم تھے کہ حبش سے حضرت جعفرؓ بن ابی طالب آ پہنچے۔ آپ کے ساتھ بہت سے مہاجرین اور بادشاہ حبش کا ایک سفیر خاص طور پر سرکار کی خدمت میں آیا۔ اور بادشاہ حبش کی طرف سے حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی چنانچہ بادشاہ حبش بھی مسلمان ہو گیا۔ (مسلمانان عالم' حصہ اول صفحہ ۸۴)

یہ بات بھی غلط ہے کہ سرکار ابھی خیبر میں مقیم تھے بلکہ تاریخ میں صراحت سے درج ہے کہ۔

"ثم سار الى المدينة ولما قدمها وصل اليه من الحبشة
بقية المهاجرين ومنهم جعفر بن ابى طالب"

"اس کے بعد حضرتؐ مدینہ کی طرف روانہ ہوئے اور جب مدینہ تشریف لائے تو حبش کے باقی ماندہ مہاجرین آ کر پہنچے جن کے ساتھ جعفرؓ بن ابی طالب بھی تھے"۔ (تاریخ ابوالفدا' جلد ا' صفحہ ۲۸)

منبر رسولؐ

اس سال کی، بعض مورخین کے نزدیک ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حضرت پیغمبر خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ پڑھنے کے لئے منبر بنوایا

اس سے پہلے حضرتؐ ایک درخت کے تنے سے لگ کر جو مسجد میں تھا خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

اس منبر میں صرف دو زینے اور اس کے اوپر عرشہ تھا جس پر آپ تشریف فرما ہوتے تھے۔

عرصہ تک حضرتؐ کے بعد بھی منبر ایسا ہی رہا، پھر بعد میں شاہان بنی امیہ کے دور میں اس میں اضافہ کر کے عرشہ کے نیچے چھ زینے کئے گئے۔

(تاریخ امیر حیدر احمد شہابی طبع مصر، جلد ۱، صفحہ ۱۳)

دوسرا قول یہ ہے کہ منبر ۸ ہجری میں بنا ہے۔ ابن جریر نے اسی کو ترجیح دی ہے۔
(ھوالثبت عندنا، تاریخ طبری، جلد ۳، صفحہ ۸۹)

عمرة القضاء

مشرکین کے سدراہ ہونے کی وجہ سے صلح حدیبیہ کے موقع پر جس عمرہ کو رسولؐ خدا نے ترک کر دیا تھا' شرائط صلح کے مطابق دوسرے سال پیغمبرؐ خدا نے تمام مسلمانوں کے ساتھ ذیقعدہ ۶ ہجری میں ادا فرمایا۔

قریش نے قرارداد کے مطابق تین دن کے لئے مکہ خالی کر دیا اور حضرتؐ نے تمام مسلمانوں کے ساتھ جو گزشتہ ساتھ تھے' مکہ میں داخل ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کیا اور دوسرے احکام عمرہ عمل میں لائے۔ پھر حسب قرارداد تین دن کے بعد مکہ کو چھوڑ دیا' اسی کو "عمرة القضاء" کہا جاتا ہے۔

اس طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں مکہ میں داخلہ کا منظر دکھا کر جو بشارت ہوئی تھی اور قرآن میں جسے ان الفاظ میں دہرایا گیا تھا کہ۔

"واللہ لتد خلن المسجد الحرام' امنین محلقین رؤسکم ومقصرین"

"خدا کی قسم تم لوگ مسجد الحرام میں داخل ہو گے باطمینان اس طرح کہ کچھ اپنے سروں کو منڈوا سکیں گے اور تھوڑے بال یا ناخن ترشوائیں گے"۔

تاریخ کی نگاہ کے سامنے پوری ہو گئی۔

اس موقع کی تصویر جو ولیم میور نے کھینچی ہے' خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری نے اپنی اردو زبان میں یوں درج کیا ہے۔

"وہ منظر عجیب و غریب تھا جو اس وقت وادی مکہ میں نظر آ رہا تھا۔ ایسا منظر جو دنیا کی تاریخ میں آپ اپنی نظیر ہے۔ قدیم شہر تین روز کے لئے اپنے تمام باشندوں سے خالی ہو گیا ہے جس میں بلند و پست سب ہی شامل ہیں۔ ایک ایک مکان ویران ہے اور وہ نئے لوگ جو مدتوں سے جلاوطنی میں دن گزار رہے تھے۔ خوشی خوشی اپنے بچپن کے خالی مکانوں کی طرف دوستوں کے ساتھ لمبے لمبے قدم بڑھاتے ہوئے چلے آ رہے ہیں اور تھوڑے ہی وقت کے اندر عمرہ بجا لا رہے ہیں۔ شہر کے بیرونی باشندے بلندیوں پر چڑھ کر نوواردوں کی آمدورفت کو دیکھ رہے ہیں۔ جو رسول اللہؐ کی قیادت میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہے ہیں اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کر رہے ہیں"۔

(Life of Mohammad) خواہ مسلمان اس خصوصیت سے بے خبر ہو گئے ہوں مگر اس وقت مشرکین اس خبر سے باخبر تھے کہ بارگاہ رسالت کا خاص دروازہ حضرت علیؑ کی ذات ہے چنانچہ جیسا کہ مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

"تین دن کے بعد حضرت علیؑ کے پاس آئے اور کہا محمدؐ سے کہہ دو کہ شرط پوری ہو چکی۔ اب مکہ سے نکل جائیں، حضرت علیؑ نے آنحضرتؐ سے عرض کی۔ آپ اسی وقت روانہ ہو گئے۔

(سیرۃ النبی حصہ اول، طبع چہارم مطبع معارف اعظم گڑھ، صفحہ ۵۰۴)

پیغمبر اسلامؐ کے خطوط فرمانروایان وقت کے نام اور ان کے اثرات و نتائج

طبری نے ان خطوط کا بیان سن ۶ ہجری کے اواخر میں کیا ہے اور اس کے بعد سن ۷ ہجری کے واقعات کو شروع کیا ہے۔

لیکن ہمارے شفیق بزرگ خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری نے (خداوند عالم ان کو علالت سے شفاء عطا فرمائے) "اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ" حصہ اول کے گیارھویں باب کا خاص عنوان بھی قرار دیا ہے۔ "حکمرانوں کو دعوت اسلام سن ۷ ہجری بمطابق ۶۲۸ء" جس میں نہایت عمدہ انداز سے ان مکاتیب کا تمہیدی پس منظر تحریر کیا ہے جس کا بنیادی مضمون یہ ہے کہ۔

"سرکار رسالت محمد مصطفیؐ وارواح العالمیہ لہ الفداءؑ فقط عرب کے لئے نہیں بلکہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ اس لئے حضورؐ نے اسلام کو "دنیا کے واحد دین" کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ صلح حدیبیہ کے بعد سن ۶ ہجری تک عرب کا اکثر حصہ حلقہ اسلام میں آ چکا تھا' اس لئے رسولؐ اللہ نے فیصلہ کیا کہ ان تمام حکمرانوں کو جن کے مقبوضات عرب سے ملحق تھے' دعوت اسلام دیں' یہ دعوت ان حکمرانوں کو انفرادی طور پر نہیں بلکہ ان کی وساطت سے ان کی رعایا کے لئے بھی تھی جس کے وہ نمائندہ اور حکمران تھے۔

ان حکمرانوں کی فہرست یہ ہے۔

۱۔ کسرائے ایران
۲۔ قیصر روم
۳۔ نجاشی بادشاہ حبشہ
۴۔ حاکم بحرین
۵۔ حاکم عمان
۶۔ مقوقس تاجدار مصر
۷۔ حاکم یمامہ
۸۔ منذر بن حارث حاکم شام
۹۔ حاکم نصریٰ

خواجہ صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"رسول اللہؐ کا وہ دعوت نامہ جو حضورؐ نے مقوقش مصر کو لکھا تھا اب تک مصر کے شاہی کتب خانہ میں محفوظ ہے اور جو دعوت نامہ ہرقل کو لکھا تھا وہ قسطنطنیہ کے کتب خانہ میں موجود ہے"۔

(اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ، جلد اول، صفحہ ۱۴۰)

طبری نے لکھا ہے کہ ذی الحجہ میں چھ قاصد روانہ کئے گئے۔ تین ایک ساتھ مقوقس اور حارث بن ابی شمر غسانی اور قیصر روم کے پاس اور چوتھا قاصد ہوزر بن علی حنفی (حاکم یمامہ) کے پاس۔ پانچواں کسریٰ شہنشاہ ایران کے پاس اور چھٹا نجاشی بادشاہ حبشہ کے پاس۔

ان کے علاوہ پھر ایک ساتویں قاصد کا ذکر ہے جو منذر بن عائذ حاکم بحرین کے پاس بھیجا گیا اور آٹھواں جعفر بن جلیہ اور عبید بن جلیہ کے پاس جو دونوں بھائی مشترک طور پر عمان کے حاکم تھے۔

ان سب خطوط کا پورا متن تو ہمیں ابھی تک زیر نظر مستند اور قدیم ماخذوں میں نہیں ملا مگر چند خطوط کی عبارت طبری نے درج کر دی ہے۔

حضرتؐ کا مکتوب ہرقل قیصر روم کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"من محمد رسول اللہ الی ھرقل عظیم الروم السلام علی من اتبع

الھدٰی امابعد اسلم تسلم واسلم یؤتک اللّٰہ اجرا مرتین وان تتولی فان اثم الاکافرین علیک"

"خط ہے اللہ تعالٰی کے پیغمبر محمدؐ کی طرف سے روم کے صاحب اقتدار ہرقل کے نام۔

سلام ہو اسے جو ہدایت کی پیروی کرے' اسلام لے آؤ تو تمہارے لئے سلامتی ہو گی اور تم اسلام لاؤ تو تمہیں دہرا ثواب ہو گا اور اگر تم روگردانی کرو گے تو دوسرے تمام لوگوں کا گناہ بھی تم پر ہو گا۔

(تاریخ الرسل الملوک مطبوعہ ہالینڈ' صفحہ ۱۵۶۵)

یہ مختصر جملہ کہ "اسلم تسلم" اس اعجازی شان کا ہے جو حضرتؐ کے کلام کی منجانب اللہ خصوصیت تھی' جس کے لئے ارشاد ہوا ہے۔

"اعطیت جوامع الکلم"

"مجھے اللہ کی طرف سے جامعیت رکھنے والے الفاظ عطا ہوئے ہیں"۔

مکتوب بنام منذر بن الحارث بن ابی شمر الغسانی فرمانروائے دمشق

"سلام علی من اتبع الھدٰی وامن بہ انی ادعوک الٰی ان تومن باللّٰہ وحدہ لا شریک لہ یبقی لک ملکک"

"سلام اس پر جو ہدایت کے در پے رہے اور اس پر ایمان لائے۔ میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ ایک اکیلے اللہ پر ایمان لاؤ جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس صورت میں تمہارا ملک تمہارے لئے برقرار رہے گا"۔

(تاریخ طبری' صفحہ ۱۵۶۸)

مکتوب بنام شہنشاہ ایران

"من محمد رسول اللّٰہ الیٰ کسریٰ عظیم فارس سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ وامن باللّٰہ و رسولہ و اشھدان لا الٰہ الا اللّٰہ وانی رسول اللّٰہ الی الناس کافۃ لینذر من کان حیا اسلم تسلم فا ان ابیت فعلیکَ اثم المجوس"

"یہ خط ہے اللہ کے پیغمبر محمدؐ کی طرف سے فارس کے صاحب اقتدار کسریٰ کے نام، سلام اسے جو ہدایت کی پیروی کرے اور اللہ اور اس کے پیغمبر پر ایمان لائے اور گواہی دے کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود برحق نہیں اور یہ کہ میں تمام انسانوں کی طرف اللہ کی جانب سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں تاکہ ہر اس شخص کو جس میں زندگی ہے، غضب اللہ سے ڈراؤں، اسلام لے آؤ تو تمہارے لئے سلامتی ہوگی اور اگر تم روگردانی کروگے تو تمام آتش پرستوں کا گناہ بھی تم پر ہوگا"۔

(تاریخ طبری، صفحہ ۱۵۷)

اپنے مضمون کے لحاظ سے ہرقل قیصر روم والے خط سے تقریباً متحد ہے اس موقع پر ہمیں جس بات کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان تمام خطوط میں جو حکمرانوں کے نام لکھے گئے ہیں۔ جہاں تک قدیم اور مستند ماخذوں سے پتا چلتا ہے۔ کہیں بھی یہ نہیں ہے کہ اگر تم نے اسلام قبول نہ کیا تو پھر تمہارے خلاف فوج کشی کی جائے گی اور تمہارے ملک پر قبضہ کر لیا جائے گا جو مادی اقتدار رکھنے والے حکمرانوں کے خطوط کا انداز ہوا کرتا ہے بلکہ ان میں خود انہیں اسلام کو دین حق کی حیثیت سے قبول کر لینے کی دعوت دی گئی ہے۔

جس کے نتیجہ کو پیغمبرانہ انداز میں بتایا گیا ہے کہ اگر تم نے ایسا کیاتو تمہارے لئے علاوہ آخرت میں انجام بخیر ہونے کے دنیا میں بھی سلامتی نصیب ہوگی۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو صرف پاداش میں آخرت ہی کا ہولناک تصور پیدا کیا ہے کہ تم پر تمہارے ہی نہیں۔ تمہاری پوری قوم کے گناہوں کی ذمہ داری ہوگی۔ کیونکہ

"الناس علی دین ملوکھم" کے مشہور مقولہ کے مطابق بادشاہ کا اثر پوری قوم پر پڑتا ہے۔ اور کہیں پیغمبرانہ لب و لہجہ ہی میں تباہی کی اطلاع دی گئی ہے۔ جو ظالمانہ اقتدار کا آخر میں منجانب الٰہی مقدر ہوتا ہے۔

ہم نے قدیم ماخذوں سے جو خطوط کا متن تحریر کیا ہے اور ان کے انداز تحریر کے جس پہلو پر توجہ دلائی ہے اسے مصر کے بعض جدید اہل قلم نے بھی محسوس کیا ہے جیسے ڈاکٹر جمال الدین رمادی جنہوں نے اپنی کتاب "الاسلام فی المشارق والمغارب" (مطبوعہ مطبع الشعب ۱۹۶۰ء) میں ان خطوط کا متن لکھنے سے پہلے بطور تمہید لکھا ہے۔

"جدید بالذکران الاسلام دین الحریة والاخاء والمساواة لایعرف الظلم الی ھبادئید سبیلا ولا الطغیان الٰی تعالیمه طریقا فھودین السماحة وسجاحة الخلق وصفاء الطبع وفقاء الطویة ولم یکن حدالسیف اواسنه الرحاح سببا لا نتشاره فی یوم من الایام فالرسول قدکتب الٰی مخنلف الملوك والاقیال والا مراء یدعوھم الٰی الاسلام"

"قابل ذکر یہ امر ہے کہ اسلام آزادی، اخوت باہمی اور مساوات کا دین ہے۔ ظلم کو اس کے اصول میں داخل ہونے کا راستہ نہیں ملتا۔ اور حدود سے تجاوز کا اس کی تعلیمات میں گزر نہیں تو وہ رواداری، نرمی اخلاق، صفائے طبیعت اور پاکیزگی نیت کا دین ہے۔ اور تلوار کی دھاریں یا نیزوں کی انیاں اس کی اشاعت کا کسی ایک دن میں بھی دور زمانہ کے دنوں میں سے سبب نہیں تھیں۔ چنانچہ پیغمبر خدا نے مختلف بادشاہوں، حاکموں اور امیروں کو خطوط لکھے جن میں انہیں اسلام کی طرف دعوت دی ہے"۔

پھر خطوط کا مضمون درج کرنے کے بعد صفحہ ۳ میں لکھا ہے۔

"ھکذا کان الرسول الکریم یرسل الی الکتب الی الملوك والا سوة والاقیال من اجل ھدایة الناس ونشر الاسلام ولم تکن ھذالکتب وسائل صنف وارھاب او ذرائع للبطش والسلیل"

"اس طرح پیغمبر اکرمؐ بادشاہوں، قیصروں اور حاکموں کو خط بھیجتے تھے وہاں کے لوگوں کی ہدایت اور اسلام کی اشاعت کے لئے، اور یہ خطوط سختی اور دہشت انگیزی کی خاطر یا حملہ آوری اور جنگجوئی کا ذریعہ نہ تھے"۔

بعد کے مسلمان اگر اس پر غور کرتے تو ان کی سمجھ میں آنا چاہئے تھا کہ فتح ممالک کا اسلام میں یہ تصور نہیں کہ دوسرے ملکوں پر بحیثیت زمین کے قبضہ کیا جائے۔ بلکہ فتح ممالک کے معنی یہ ہیں کہ اس ملک والوں کو تم ہمنوا بنا لو۔ پھر خود بخود وہ ملک تمہارا ہو جائے گا۔ جس میں جبر کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا بلکہ انہیں محاسن اسلام سے متاثر کر کے اختیاری طور پر ہی یہ مقصد پورا ہوتا ہے۔

رد عمل

جن اہل اقتدار کو خط لکھے گئے تھے ان کا رویہ مختلف رہا۔

شہنشاہ ایران خسرو پرویز نے اس خط کے پہنچنے پر غضبناک ہو کر توہین آمیز انداز اختیار کیا اور خط کو پھاڑ ڈالا۔ اس پر حضرتؐ نے اخبار بالغیب کے انداز میں فرمایا کہ اس نے میرا خط چاک کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی سلطنت کو پارہ پارہ کرے گا۔

مصر کے بادشاہ مقوقس نے آپ کے خط اور قاصد کے لئے اعزاز و اکرام کا طریقہ اختیار کیا اور آپ کی خدمت میں تحائف بھیجے۔

ان سب سے بہتر تاثر نجاشی بادشاہ حبشہ کا تھا جس نے حقانیت رسولؐ کا اعتراف تو جناب جعفر طیارؓ سے گفتگو کے بعد ہی کر لیا تھا اور آخر میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان بھی کر دیا۔ چنانچہ اس کی وفات پر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لئے دعائے مغفرت فرمائی اور روایات اہل سنت میں ہے کہ غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی۔

منذر بن سلوی حاکم بحرین اور جعفر و عبید حاکمان عمان نے بھی اسلام قبول

کیا۔

پیغمبر خداؐ نے ان میں نہ ان لوگوں کی سلطنت میں کوئی دخل دیا جو اسلام قبول کر چکے تھے۔ اور نہ ان پر کوئی فوج کشی کی جنہوں نے اسلام لانے سے انکار یا سکوت اختیار کیا تھا۔

صرف حاکم بصرہ شراجیل غسانی نے یہ کیا کہ بین الاقوامی قانون اور انسانیت کے تقاضے کے بالکل خلاف آپ کے قاصد حارث بن عمر کو سرزمین موتہ پر قتل کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں جنگ موتہ واقع ہوئی جس کا تفصیلی تذکرہ ابھی آئے گا۔

ہرقل قیصر روم کے لئے ایسی روایات ہیں جن سے اس کا اسلام کی طرف مائل ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ بلکہ حامد عبدالقادر نے اپنی کتاب "الاسلام ظہورہ و انتشارہ فی العالم" (طبع مصر) صفحہ ۲۳۳ میں لکھا ہے۔

"یکاد یکون المجمع علیه بین مورخی العرب ان هرقل کان راغبا الی الاسلام وانه تحدث مع ابی سفیان فی شان النبیؐ فی حدیث طویل"

"عرب مورخین کے درمیان تقریباً بالکل متفق علیہ ہے کہ ہرقل اسلام کی طرف رغبت رکھتا تھا اور اس نے ابو سفیان سے حضرت رسولؐ کے بارے میں ایک گفتگو کی جس کا واقعہ کافی طولانی ہے"۔

پھر اس پورے واقعہ کو بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس نے اور دوسرے قرائن سے عرب مورخین نے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ ہرقل اسلام کی طرف مائل تھا لیکن بعد کے مورخین کو اس روایت کو قبول کرنے میں تامل ہے۔ اور جو چیز اس کے ماننے سے روکتی ہے۔ وہ ہرقل کا وہ طرز عمل ہے جو اس کے بعد رہا جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ مسلمانوں سے شدید مخالفت رکھتا تھا۔ چنانچہ شام، فلسطین اور مصر میں مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے فوجیں جمع کیں۔ اور مقوقش کی اسلام کی طرف رغبت نمایاں ہوئی تو وہ اس پر غضبناک ہوا اور اسے قسطنطنیہ بلوا کر ملک سے نکلوا

دیا پھر موتہ کی جنگ بھی ہے۔

آخر میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان دونوں فریق کی باتیں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ وہ ذاتاً حقانیت اسلام سے متاثر ہوا تھا۔ مگر اس نے رومیوں کی رائے عامہ کو اس کے خلاف پایا اور خود اپنے اقتدار کے لئے خطرہ محسوس کیا۔ اس لئے وہ شدت کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو گیا۔ (الاسلام، ظہورہ و انتشارہ فی العالم، طبع مصر، صفحہ ۲۱۸)

جنگ موتہ

(یہ جنگ جمادی الاول ۸ ہجری میں ہوئی)

(مقاتل الطالبین، صفحہ ۷، العبر فی خبر من غبر طبع کویت، ۱۹۶۰ء، جلد ۱، صفحہ ۹، تاریخ طبری صفحہ ۱۶۱۰)

علامہ سید محسن امین عاملی نے اس لفظ کا انضباط کیا ہے اس طرح کہ م مضموم اور پھر حمزہ ساکن جس کے بعد ت ہے۔ اس طرح اصل تلفظ اس کا "مؤتہ" ہوتا ہے۔ (اعیان الشیعہ، جلد ۲، صفحہ ۲۷۰)

جو عربی کے علم قائدہ تعطیل کے مطابق موتہ (واوٗ معروف کے ساتھ) مشہور ہو گیا ہے۔

یہ سرزمین بلقاء کی بستیوں میں سے ایک بستی کا نام تھا جو موجودہ زمانہ میں شرق اردن کے ملک میں داخل ہے۔

(حاشیہ ڈاکٹر صلاح الدین المنجد بر کتاب العبر، جلد ۱، صفحہ ۹)

سریہ یا غزوہ؟

عام طور پر یہ جنگ "غزوہ موتہ" کے نام سے مشہور ہے مگر اصطلاحاً "غزوہ" وہ ہوتا ہے جس میں خود حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے گئے ہوں اور اس جنگ میں جیسا کہ آئندہ حالات سے معلوم ہو گا۔ حضرتؐ خود تشریف نہیں لے گئے

تھے بلکہ دوسرے اشخاص کو سردار بنا کر بھیجا تھا' اس لئے اصطلاحاً" اسے "سریہ" کہنا چاہئے۔

اس جنگ کی دور رس سیاسی اہمیت

قرآنی احکام اور پیغمبر خدا ﷺ کی پوری سیرت کی بناء پر یہ ہم بہت اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ کہ خدا اور رسولؐ کا اصل مقصد فتح ممالک اس معنی میں تھا جسے غیروں ہی نے نہیں بلکہ شاید بعد کے صاحب اقتدار مسلمانوں نے بھی غلط طور پر سمجھا۔ یا دوسروں کو سمجھایا اور اس لئے ملک ایران وغیرہ پر جو بعد میں فوج کشی ہوئی' اسے ہم مسلمانوں کا عمل سمجھتے ہیں۔ اسلام پر اس کی ذمہ داری عائد کرنا ہم درست نہیں سمجھتے۔ لیکن سلطنت روم سے جو تصادم ہوا۔ اس کے اسباب بلاشبہ پیغمبر اسلام ﷺ کے ہی سامنے پیدا ہو گئے تھے۔ اور ان کا کشاں کشاں ان بڑی لڑائیوں تک پہنچنا۔ جن کے ذریعہ سے ملک روم فتح ہوا' اسباب و علل کے طبعی تقاضے کی رو سے بالکل خلاف توقع نہ تھا۔

یہ اور بات ہے اور اسے ہم تاریخ کی بد نصیبی سمجھ سکتے ہیں کہ ان آویزشوں کا آغاز ہونے کے کچھ ہی مدت بعد حضرت پیغمبر خداؐ کی وفات ہو گئی۔ اور پھر اقتدار اس مرکز سے ہٹ گیا جو براہ راست پیغمبر خداؐ کے طریقہ کار کا تحفظ کر سکتا تھا۔ اس لئے ملک شام پر قبضہ ہونے کے بعد ایسے عناصر برسراقتدار ہو گئے۔ جنہوں نے اسلامی سلطنت کو خود رومی سلطنت کا مثنیٰ بنا کر اس کے حریف مقابل کی حیثیت سے کھڑا کر دیا۔

اس طرح یہ بات سامنے نہ آئی کہ اگر پیغمبر خداؐ یا ان کی تعلیمات کے حقیقی وارث خود ان لڑائیوں کو لڑ کر فتح حاصل کرتے۔ تو ملک شام میں صحیح حقانیت کے جلوہ ریز کردار کے ساتھ اس قسم کی سلطنت قائم ہوتی۔ جس کے نتیجہ میں پاس کے ملک روم کی عیسائی طاقت جس میں قبول حق کی صلاحیت یقیناً پائی جاتی تھی۔ متاثر ہو کر یمن کی طرح اسلام کی طاقت کے سامنے نہیں بلکہ حقانیت کی گرویدہ ہو کر خود

اپنے دل و دماغ کے ساتھ مسخر ہو جاتی۔ تو اس کے بعد کی نہ حروب صلیبیہ ہوئیں اور نہ یورپ کی طاقتوں کی طرف سے مسلمانوں کی فتوحات کے جو قرضے آج تک کسی نہ کسی شکل میں وصول کئے جا رہے ہیں' یہ سلسلہ جاری ہو گا۔ مگر اب اسے ہم "آہ و حسرت" کے ساتھ اپنی جگہ سوچ لینے کے سوا دنیا کے سامنے پیش نہیں کر سکتے۔ اس لئے تاریخ نگاری کے فریضہ کو انجام دینے کے لئے ناگزیر ہے کہ بس اس سلسلہ تصادم کی پہلی کڑی یعنی جنگ موتہ کے حالات ہی کو تحریر کریں۔ جو اکثر مورخین کے بیان کے مطابق سن ۸ھ کے ماہ جمادی الاول میں ہوئی ہے۔

باقی کڑیاں واقعی ہمارے نزدیک تاریخ اسلام کا جزو ہیں جو مختلف اوراق میں سامنے آئیں گی۔

(العبر اللذہبی' طبع کویت ۱۹۶۰ء' جلد ا صفحہ ۹' دفینۃ الاسلاف و تحیتہ الاخلاف شہاب الدین بن بہاؤالدین المرجانی مطبوعۃ قرآن (ترکیہ) صفحہ ۱۲۸' تاریخ الاسلام حسن ابراہیم حسن' جلد ا' ۱۳۵۲ھ بمطابق ۱۹۳۹ء' صفحہ ۱۷۶)

پس منظر

جیسا کہ خواجہ محمد لطیف صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"اس زمانہ میں عرب کے شمال میں مشرق رومی سلطنت پھیلی ہوئی تھی۔ اس وسیع علاقہ کا صدر مقام قسطنطنیہ تھا۔ رومیوں اور ایرانیوں نے عرب سے اپنے ملحقہ علاقوں کی سرحدوں پر چھوٹی عرب ریاستیں قائم کی ہوئی تھیں۔ جو ان کی باج گزار تھیں اور ان کے اور عرب کے درمیان "اسٹیٹ" کا کام دیتی تھیں۔

عرب کے شمالی علاقہ میں رومی سرحد پر جو عرب آباد تھے۔ وہ غبان قبیلہ سے تھے' وہ عیسائی بھی ہو چکے تھے اور انہوں نے رومی تمدن بھی اختیار کر لیا تھا۔ اور اس اجنبی تمدن پر نازاں تھے۔ مشرق کی طرف جو عرب آباد تھے وہ ایران کی ساسانی حکومت سے متاثر تھے۔ ایرانیوں کی دینداری کا دم بھرتے تھے اور انہوں نے ایرانی مذہب اور ایرانی تہذیب و تمدن کو اپنایا تھا۔

("اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ" جلد اول' صفحہ ۱۸۶-۱۸۳)

یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے جو خطوط مختلف ممالک سے سربراہوں کو لکھے تھے' ان میں ایک خط حاکم بصرہ شراجیل غسانی کے نام تھا اور صرف یہ ایک فرمان ایسا تھا جس نے عرب کے بین الاقوامی اور تقریباً ہر دور کے بین الانسانی تقاضے کے خلاف آپ کے قاصد کو قتل کرا دیا تھا اور یہ واقعہ سرزمین

موتہ پر پیش آیا تھا۔

دکتور حسن ابراہیم حسن نے اس حاکم کے نام کی صراحت نہیں کی ہے بلکہ لکھا ہے۔

لما ارسل الرسول الی الغسانۃ یدعو ھم الی الاسلام قتلوا رسول النبیؐ"

"جب حضرتؐ نے غسانیوں کے پاس قاصد بھیجا انہیں اسلام کی دعوت دیتے ہوئے تو انہوں نے پیغمبر کے قاصد کو قتل کر دیا"۔

(تاریخ الاسلام السیاسی' جلد ا' صفحہ ۱۷۶)

جمہور مورخین کے برخلاف محمد خضری بک لے جو اپنے زمانے میں جامعہ مصر میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔یہ لکھا ہے کہ یہ قاصد حارث بن عمیر ازدی تھے شرجیل کے پاس بھیجے ہی نہیں گئے تھے۔ بلکہ یہ ہرقل کے نام خط لے جا رہے تھے اور راستہ میں شرجیل بن عمرو غسانی نے ان کو پکڑ کر قتل کر دیا۔

(محاضرات تاریخ الامم الاسلامیۃ مطبوعہ مطبع استقامۃ مصر' سن ۱۹۷۶ء' صفحہ ۲۸)

ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر یہ واقعہ پیش نہ آیا ہوتا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی جانب سے کوئی فوج کشی اس سرزمین پر بھی نہ فرماتے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ خطوط تو آپ نے سب ہی اس وقت کے نمایاں فرمانرواؤں کو لکھے تھے۔ اور سوائے ایک دو کے کوئی بھی اسلام نہیں لایا تھا بلکہ ملک فارس کے کسریٰ نے آپ کے خط کو توہین آمیز طریقہ پر چاک کر دیا تھا۔ مگر آپ نے ادھر فوج کشی کا حکم نہیں دیا۔ پھر روم کی طرف آپ فوج کشی کا حکم کیوں دیتے جبکہ حدیث و تاریخ ہی سے نہیں' قرآن سے بھی یہ ثابت ہے کہ مسلمان ذہنی و جذباتی طور پر فارس کے مقابلہ میں رومیوں سے زیادہ قریب تھے۔ اس لئے جب رومیوں پر فارس کو فتح حاصل ہوئی تو مسلمانوں کو سخت صدمہ ہوا اور ان کی تسلی کے لئے ایک مستقل سورہ' سورہ روم نازل ہوا جس کا آغاز اس سے ہے کہ۔

غلبت الروم ○ فی ادنی الارض و ھم من بعد غلبھم سیغلبون ○ فی بضع سنین○للہ الامر من قبل ومن بعد○ویومئذ یفرح المومنون ○

بنصر اللّٰہؕ ینصر من یشاءؕ و ھو العزیز الرحیم ○ (سورہ روم آیت ۲ تا ۵)

"رومی لوگ قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے مگر وہ اس دفعہ مغلوب ہونے کے بعد بہت جلد پھر غالب آئیں گے۔ اللہ کے قبضہ میں ہر بات ہے پہلے بھی، اور بعد میں بھی اور اس دن مومنین اللہ کی مدد سے خوش ہوں گے۔ وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے اور وہ قوت والا بڑا عزت والا ہے"۔

(سورہ روم نمبر ۲ تا ۵)

مگر قاصد کا قتل کرنا ایک ایسا سخت ناروا اقدام تھا جس پر خاموشی اختیار کرنا اپنی جماعت کی بالکل بے حسی کا ثبوت پیش کرتا تھا۔ اس لئے آپ نے تین ہزار کی فوج اس سمت بھیجنے کے لئے مرتب فرمائی اور زیادہ تر مورخین کی بیان کردہ ترتیب کے مطابق اس فوج کا پہلا سردار جناب زید بن حارثہ کو بنایا۔ جو اگرچہ ظاہری حیثیت سے ایک آزاد کردہ غلام تھے مگر سابقین الی الاسلام میں سے ہونے کی بناء پر انہیں یہ اعزاز عطا فرمایا گیا۔ بعد میں اپنے محل پر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ارشاد آئے گا جس سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اس وقت ان صحابہ کو جو "خاندانی عرب" کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس منصب کا عطا کیا جانا زید بن حارثہ کو بہت شاق گذرا تھا مگر رسولؐ نے اسلامی اقدار عزت و کرامت کا عملی تحفظ فرماتے ہوئے اس مخالفانہ جذبہ کی کوئی ہمت افزائی نہیں فرمائی اور اپنے فیصلہ پر قائم رہے۔

(تاریخ طبری، صفحہ ۲۱۱ مقاتل الطالبین، صفحہ ۷)

پھر اگر زید قتل ہو جائیں تو جناب جعفر بن ابی طالبؑ کو جو کچھ ہی روز قبل ملک حبش سے واپس ہوئے تھے، سرداری کے لئے نامزد فرمایا تھا اور اگر وہ شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ۔ آپ نے فرمایا کہ جو بن پڑے اس وقت وہ کرنا۔ عام شہرت مورخین میں یہی ہے مگر ہمارے یہاں ابان بن عثمان کی روایت میں جو امام جعفر صادقؑ سے وارد ہوئی ہے۔ یہ ہے کہ آپ نے پہلا سردار جناب جعفرؑ کو قرار دیا تھا اور جب وہ شہید ہو جائیں تو زید اور پھر عبداللہ بن رواحہ۔

(اعلام الوریٰ طبرسی)

ان دونوں سے الگ بعض سنی مورخین نے جناب جعفر کو سب سے آخر میں ڈال دیا ہے۔

(تاریخ الاسلام للدکتور' حسن ابراہیم حسن' جلد ا' صفحہ ۴۴' الطبعتہ الاولی صفحہ ۱۸۶)

شراجیل خود تو کوئی چیز نہ تھا' اس کے لئے اتنی فوج بہت تھی مگر اس کے پس پشت پوری سلطنت روم کی طاقت تھی۔ اس بناء پر کہ وہ ان کا باجگزار تھا چنانچہ اس نے مسلمانوں کے اقدام کی اطلاع پاتے ہی سلطنت روم سے مدد کی درخواست کی جو منظور کی گئی۔ اور ادھر سے ایک لاکھ کی فوج مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے بھیج دی گئی جس کے سامنے یہ تین ہزار فوج گویا مٹھی بھر آدمیوں کی ایک جماعت بن گئی۔

ایک مغربی مستشرق نے جس کا نام عربی تلفظ کے لحاظ سے "جان با جوت غلوب" ہے' اپنی کتاب میں جسے ایک عراقی صاحب قلم فری حماد نے "الفتوحات العربیۃ الکبریٰ" کے نام سے عربی کی طرف منتقل کیا ہے اور وہ بغداد سے شائع ہوئی ہے۔ لکھا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے جو اب تک ہمیشہ خداوندی امداد پر بھروسہ کرتے رہے تھے کوئی جاسوسی نظام قائم نہیں کیا تھا جو دشمنوں کی نقل و حرکت کی اطلاع دیتا رہتا اس لئے انہیں دشمنوں کی اس عظیم فوجی تیاری کی جو وہ سرزمین بلقاء میں کر رہے تھے' اس وقت تک خبر نہ ہوئی جب تک کہ وہ جومنان تک نہیں پہنچ گئے۔ اور ایک سالار فوج نے انہیں رکنے کا حکم دیا اور دو دن مسلمان سرداروں میں اس نئی صورت حال کے بارے میں بحث و مباحثہ میں گذر گئے۔ (صفحہ ۱۴۶)

جنگ یا قربانی؟

تین ہزار کا مقابلہ ایک لاکھ کی فوج سے اب تک کے معیار کے لحاظ سے منفرد نوعیت رکھتا تھا۔ اور وہ بھی غیر متوقع طور پر کیونکہ ذہن میں بس شراجیل غسانی کی عسکری طاقت تھی۔ جس کے لئے مسلمانوں کی تین ہزار کی فوج کافی تھی۔ یہ تصور ہی نہ تھا کہ شہنشاہ روم ہرقل کا مقابلہ پڑ جائے گا۔

ایک روایت تو یہ ہے کہ وہ خود فوج کے ساتھ موجود تھا اور اس میں ایک لاکھ خاص رومی تھے۔ اور ایک لاکھ اس کی عرب رعایا کے آدمی تھے جو متعدد قبائل کے تھے اور عیسائی ہو چکے تھے۔ اس طرح دو لاکھ کی فوج کا مقابلہ تھا۔

(تاریخ طبری، صفحہ ۱۶۱۱، الدار فی اختصار المغازی والسیر لابن عبدالبر مطبوعہ سن ۱۳۸۶ھ، ۱۹۶۶ء، صفحہ ۲۲۲)

مسلمانوں کو اس صورت حال کا علم ہوا تو انہوں نے معان میں دو دن تک توقف کیا اور طریق کار کے متعلق تبادلہ خیال کرتے رہے۔

کہا جاتا ہے کہ جناب زید بن حارثہ جماعت کا دل لینے کے لئے یا کسی اور نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم ابھی مقابلہ پر نہ آئیں اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس پیش آمدہ صورت حال کی اطلاع دیں، پھر جو ہدایت ہو اس پر عمل کریں۔ مگر عبداللہ بن رواحہ نے جوش میں بھری ہوئی تقریر کے ساتھ اختلاف کیا اور کہا ہم نے کبھی دشمن کا مقابلہ تعداد لشکر کے برتے پر نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس دین کی قوت پر کیا ہے جس کے ساتھ خدا نے ہمیں سرفراز کیا ہے اور اگر ہم دشمن پر غالب نہ بھی آ سکے۔ تب بھی شہادت کا مرتبہ تو حاصل ہو ہی گا جو ہمارا نصب العین رہا ہے۔ پورا مجمع ان کا ہم آواز ہو گیا اور اس طرح وہ تجویز مسترد ہو گئی اور اسی موجودہ تعداد کے ساتھ اس فوجی سیلاب کے مقابلہ پر آنا طے کر لیا گیا۔

جنہوں نے اسے تفصیل کے ساتھ درج نہیں کیا ہے، انہوں نے بھی یہ لکھا ہے کہ عبداللہ بن رواحہ نے ہی مسلمانوں کی جماعت کو جو تین ہزار تھی مقابل کی دو لاکھ فوج سے جنگ کو آمادہ کیا تھا۔

(وثیقۃ الاسلاف، صفحہ ۱۳۰)

چنانچہ موتہ کے میدان میں جسے ہم موت کی وادی کہہ سکتے ہیں، سب آ گئے اور اس جمع قلیل کو بطور لشکر مرتب کیا گیا۔

مشہور ترتیب کے مطابق سب سے پہلے جناب زید بن حارثہؓ نے علم لشکر لیا اور بڑی بہادری سے مقابلہ کر کے راہ حق میں جان کی قربانی پیش کی۔ پھر جناب

جعفر بن ابی طالبؓ کی باری آئی۔ آپ نے سخت جنگ کی۔ یہاں تک کہ شوق شہادت میں اپنے سرخ رنگ کے گھوڑے سے کود پڑے اور اس کے پاؤں قلم کر دیئے۔ تاریخ لکھتی ہے کہ مسلمانوں میں وہ سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے جنگ میں اپنے گھوڑے کو پے کیا۔ پھر پیادہ پا فوج کے اندر گھس گئے یہاں تک کہ آپ کا لڑتے لڑتے داہنا ہاتھ قطع ہو گیا تو آپ نے علم کو بائیں ہاتھ سے سنبھال لیا۔ یہ ہاتھ بھی قطع ہو گیا تو علم کو سینہ سے لگا لیا اور اسی عالم میں دنیا سے سدھارے۔ ان کی عمر ۳۳ یا ۳۴ سال تھی امام محمد باقرؑ سے روایت ہے کہ آپ کے جسم پر ۵۰ زخم لگے جس میں سے ۳۰ صرف چہرے پر تھے۔

(وتیتہ الاسلاف' صفحہ ۱۳۰)' (تاریخ طبری' صفحہ ۱۶۱۴)

(تاریخ ابن خلدون' جلد ۲' مطبوعہ بیروت سن ۱۹۵۶ء' صفحہ ۸۰۰)

(الدار لابن عبدالبر' صفحہ ۲۳۳)' (اعلام الوریٰ)

اہل سنت کے یہاں عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ ان کے جسم پر تیروں اور تلواروں کے نوے (۹۰) سے کچھ اوپر زخم لگے تھے جن میں سے کوئی پشت کی طرف نہ تھا۔ (وتیتہ اسلاف' صفحہ ۱۳۹)

ابن سعد نے لکھا ہے کہ ایک رومی نے ان پر ایسی ضرب لگائی کہ جسم دو (۲) ٹکڑے ہو گیا۔ ان میں سے ایک ٹکڑے کے زخموں کا شمار کیا گیا تو ۳۰ سے زیادہ زخم تھے اور ایک قول یہ ہے کہ مجموعی طور پر جسم پر نیزوں اور تلواروں کے بہتر (۷۲) زخم تھے۔ (طبقات کبریٰ' جلد ۲' صفحہ ۱۲۹)

اب رسولؐ کے نامزد کردہ صرف ایک سردار عبداللہ بن رواحہ باقی تھے۔ انہوں نے بھی اپنی پیش رووں کی پیروی کی اور وہ بھی درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

ان کے علاوہ بھی کچھ سپاہی فوج اسلام کے شہید ہوئے جن کے نام ابن عبدالبر نے درج کئے ہیں۔ (الدار' صفحہ ۲۲۲)

ذہبی کا بیان ہے کہ یہ شہید ہونے والے ۸ آدمی تھے۔

(العبر' جلد ا' صفحہ ۹)

خالد بن ولید کا کارنامہ

اب رسولؐ کا مقرر کیا ہوا کوئی عملدار یا سردار باقی نہیں رہ گیا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس وقت ایک غیر معروف شخص نے علم ہاتھ میں اٹھا لیا اور مسلمان جماعت سے مخاطب ہو کر کہا کہ اب تم کسی کو منتخب کر کے یہ ذمہ داری سپرد کرو۔ اس پر از خود یا دوسروں کے کہنے سے خالد بن ولید نے فوج کی کمانڈ ہاتھ میں لی اور باقی ماندہ اسلامی فوج کو زندہ بچا لے جانے کا منصوبہ ذہن میں بنا کر اس طرح جنگ شروع کی کہ تھوڑا تھوڑا پیچھے ہٹ ہٹ کر دشمنوں کے مورچہ سے علیحدہ ہوتے گئے اور بالاخر موقع پا کر اپنی جماعت کو واپس لے گئے۔ طبری کے الفاظ یہ ہیں۔

"دافع القوم وحاشی بهم ثم انحاز و تحيز عنهم حتى انصرف بالناس"

"فوج مخالف سے مقابلہ شروع کیا اور انہیں الجھائے رکھا پھر ہٹے اور ان سے کنارہ کش ہوئے۔ یہاں تک کہ تمام لوگوں کو واپس لے گئے"۔

(تاریخ الامم و الملوک' صفحہ ۱۶۱۲)

ابن خلدون کے الفاظ مختصر ہیں۔

"فانحاز بالمسلمین"

"وہ مسلمانوں کو لے کر (اس فوج سے) الگ ہو گئے"۔

(تاریخ ابن خلدون' جلد ۲ صفحہ ۸۰۱)

یہی الفاظ بالکل ابن عبدالبر کے ہیں۔

(الدار' صفحہ ۲۳۳)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان مسلمانوں کو جنہوں نے زید بن حارثہ کے مناسب مشورہ کو قبول نہ کرتے ہوئے' میدان میں مر جانے کا عزم ظاہر کیا تھا۔ اب سمجھانے میں کامیاب ہو گئے کہ اب مقابلہ سے کوئی فائدہ نہیں ہے لہٰذا واپس جانا چاہئے چنانچہ یہ لوگ مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے اور غنیمت ہے کہ روم کے لشکر نے تعاقب نہیں کیا مگر ان سب سے قدیم تر مورخ ابن سعد نے ایک راوی کی

آنکھوں دیکھی کیفیت جو درج کی ہے وہ یہ ہے کہ۔

"فاخذ اللواء فانکشف الناس فکانت الھدنة فنقبھم
مشرکون یفقتل من قتل من المسلمین"

"خالد نے علم لشکر لیا تو مسلمان میدان سے ہٹ گئے۔ اس طرح شکست ہو گئی تو کافروں نے ان کا پیچھا کیا اور بہت سے مسلمان قتل ہوئے"۔

(الطبقات الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۴۹)

یورپین مستشرق "جان باجوت غلوب" نے اپنی کتاب میں جس کے عربی ترجمہ کا نام "الفتوحات العربیة الکبریٰ" ہے اور جسے مکتبہ المثنٰی بغداد نے شائع کیا ہے اپنی مادی ذہنیت کے ماتحت خالد بن الولید کے کارنامہ کو اس طرح لکھا ہے۔

"کان خالد بن الولید و قد بخول اخیر الوالا سلام یقاتل بین المسلمین وکان اکثر حیرة فی الضیادة العسکری من زید و جعفر و قد یکون اقل تشرقا منھما الی الجنة و عند ما تونی القیادة فی ھذه اللحظة من الانکسار افلم ان یسیطر لشخصیة القویة ال سرة علٰے من بقی من المسلمین وثبت احد الانصار الرایه فی الارض فالتف حولھا المسلمون واخذ خالد تیاء حزبھم قلیلًا مع الا حتفاظ بالنظام حتی السحه من المیدان دون ان لاحق بدالدوم الذین کانو اقد اجھد وا کل الاجھاد" (صفحہ ۹۸)

"خالد بن ولید جو آخر میں مسلمان ہو گئے تھے مسلمانوں کی فوج میں جنگ کر رہے تھے اور وہ فوجی قیادت کے اصول سے زید اور جعفر سے زیادہ واقفیت رکھتے تھے اور کہا جا سکتا ہے کہ جنت میں جانے کا شوق ان لوگوں سے کم رکھتے تھے انہوں نے جب شکست کے اس لحہ میں قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی تو وہ اس امر میں کامیاب ہو گئے کہ اپنی طاقتور پابند فرمان بنانے والی شخصیت سے باقی ماندہ مسلمانوں پر چھا جائیں۔ انصار میں سے ایک نے علم کو زمین میں گاڑ دیا اور یہ تمام

مسلمان اس کے گرد سمٹ آئے اور خالد انہیں لے کر ذرا ذرا سا پیچھے ہٹتے رہے۔ نظم و حمیت کو قائم رکھتے ہوئے یہاں تک کہ وہ میدان جنگ سے باہر نکل آئے۔ اور وہی لوگ چونکہ جنگ میں تھک بہت چکے تھے اس لئے انہوں نے ان کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی"۔

حاشیہ پر لکھا ہے۔

"تقول احدی الروایات العربیة ان الروم لم یلحقوا بجیش المسلمین لا نهم ظنوآ ان خالد ایخدمهم حتی یرمی لهم الی الصحرآء"

"عربوں کی ایک روایت کہتی ہے کہ رومی لوگ اس لئے تعاقب کر کے مسلمانوں کے لشکر تک نہیں پہنچے کہ انہوں نے خیال کیا کہ خالد انہیں دھوکا دے کر لے جانا چاہتے ہیں تاکہ انہیں ریگستان میں ڈال دیں"۔

اب ملاحظہ ہو کہ جناب خالد بن ولید کے اس کارنامہ کو اس وقت کے دوسرے مسلمانوں نے کس نظر سے دیکھا تھا؟ وہ تاریخ کے اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ جب یہ شکست خوردہ فوج مدینہ کے قریب پہنچی تو مسلمان بجائے استقبال کے گویا "واپس جاؤ" کے نعرے لگاتے ہوئے شہر سے نکلے اور عالم یہ تھا کہ لوگ ان کے چہروں پر خاک ڈالتے تھے کہ اے فرارِیو! تم خدا کی راہ سے بھاگ آئے۔

(الطبقات الکبریٰ، جلد ۲، صفحہ ۱۲۹، طبری، صفحہ ۱۶۱۸)

مسلمانوں کے یہ جذبات وقتی ہی نہ تھے بلکہ طبری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیفیت مستقل طور پر عرصہ تک قائم رہی۔ یہاں تک کہ ان اشخاص نے جو اس واپس شدہ جماعت میں داخل تھے گھروں سے نکلنا چھوڑ دیا۔ چنانچہ ان میں سے ان کی بیوی ام المومنین جناب ام سلمہ رضوان اللہ علیہا کے پاس آئیں تو جناب ام سلمہؓ نے فرمایا کہ کیا بات ہے، یہ لوگ پیغمبرؐ خدا کے ساتھ نماز جماعت میں شریک ہونے کے لئے مسجد میں نہیں آتے تو ایک خاتون نے کہا۔

"واللہ ما یستطیع ان یخرج کلما خرج صاح الناس افررتهم فی سبیل اللہ حتی قعد فی بیة فما یخرج"

"خدا کی قسم وہ گھر سے نکل نہیں سکتے۔ ادھر نکلے اور لوگ چیخنے لگتے ہیں۔ ارے تم لوگوں نے راہ خدا سے فرار اختیار کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ خانہ نشین ہو گئے ہیں اور گھر سے نکلنا موقوف کر دیا ہے"۔

(طبری، صفحہ ۱۶۱۸، طبع کراچی جلد ۱ صفحہ ۳۸۴)

اب یہ عالم کی نیرنگی ہے کہ عام افراد بیچارے اس جماعت میں شامل تھے خانہ نشین ہونے پر مجبور ہو جائیں۔ اور جو اس جماعت کا سرکردہ اور اس واپسی کا اصل ذمہ دار ہو، وہ کچھ مزید ان بااختصاص کی "می پرانند" والی کامیاب کوشش سے اپنے اس کارنامہ پر "سیف اللہ" کا مصداق بن جائے جسے تاریخ ساز راویوں نے خود رسول خداؐ کی طرف نسبت دے دی کہ آپ نے عین اس معرکہ میں خالد کو دعائے خیر سے نوازتے ہوئے اس خطاب سے سرفراز فرمایا۔ لیکن اگر اس نقل کی کچھ بھی اصل ہوتی تو آخر بروقت اس جماعت کے بارے میں مسلمانوں کے وہ جذبات کیوں ہوتے اور قائم رہتے جو صفحہ تاریخ پر درج ہیں۔

مگر واقعیت کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کچھ مورخین اسے "فتح" سے تعبیر کرتے ہیں اور اسے خالد بن الولید کا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ جیسے ذہبی جنہوں نے تمام تفصیلات کو نظرانداز کر کے مجملاً نتیجہ جنگ اس طرح لکھا ہے کہ۔

"اخذ الرایة خالد بن الولید من غیر امرة فجال لبا واستنطهر علی المشرکین و تحیز بالمسلمین وھی اول مشاھدہ فی الاسلام"

"خالد بن ولید نے بغیر امیر ہونے کی حیثیت کے علم لے لیا تو اسے چکر دیا اور مشرکوں کے مقابلہ میں غلبہ حاصل کیا اور مسلمانوں کو میدان سے علیحدہ کر لیا اور یہ اسلام میں سب سے پہلا ان کا کارنامہ تھا"۔

(العبر، صفحہ ۹)

اور لاہور کے مسٹر کے، اے حمید کہ جنہوں نے تاریخ نویسی نہیں، بلکہ تاریخ تراشی کر کے ایک یہ کمال دکھایا ہے کہ جنگ موتہ کا حال خیبر کے پہلے لکھ ڈالا ہے اور پھر روئداد جنگ اس طرح لکھی ہے۔

"ایک لاکھ فوج لے کر حاکم موتہ مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے نکلا۔ زید بن حارثہ مسلمانوں کے سپہ سالار تھے جو لڑائی میں کام آئے۔ اس کے بعد عبداللہ بن رواحہ کا تقرر عمل میں آیا مگر وہ بھی شہید ہو گئے۔ پے در پے تین سپہ سالار جنگ میں شہید ہو گئے"۔

یہاں تو صرف اتنا ہے کہ جناب جعفر کا نام نہیں لیا گیا ہے مگر اتنا ہی نہیں بلکہ پھر جنگ خیبر کے بعد انہوں نے جناب جعفر کی حبشہ سے واپسی کا حال درج کیا ہے کہ "سرکار ابھی خیبر ہی میں مقیم تھے کہ حبش سے حضرت جعفر بن ابی طالب آ پہنچے"۔

لیجئے! اب تو بات صاف ہو گئی کہ جنگ موتہ میں جناب جعفر کی کوئی شرکت ان کے نزدیک نہیں ہے۔ اس کے برخلاف خالد بن الولید کے کارنامہ کے تحریر کرنے کی جب باری آئی تو پھر زور قلم ملاحظہ ہو۔

"تین سپہ سالار جنگ میں شہید ہوئے۔ خالد بن ولید کے سوا کوئی ایسا شخص نظر نہ آتا تھا جو اس کام کو سنبھال سکے۔ خالد نے اپنے تقرر کے بعد فوج کو دستوں میں تقسیم کیا۔ ہر دستے کا ایک سردار مقرر کیا اور فوج کو تربیت دے کر اس شان سے حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ عیسائیوں کو شکست فاش ہوئی۔ خالد جانباز کی نو تلواریں اس معرکے میں ٹوٹیں۔ رسول خدا نے فتح کی خوشی میں سپہ سالار کو "سیف اللہ" کا خطاب عطا فرمایا۔

(تاریخ مسلمانان عالم' جلد ا' صفحہ ۸۳)

اب یہ فیصلہ کیجئے کہ حقیقت پسندی کی اس بات پر قہقہے لگانا چاہئیں' یا ماتم کرنا چاہیے؟

مشرکین کی بدعہدی اور بنائے مخاصمت

صلح حدیبیہ میں پیغمبر اسلام ﷺ اور اہل مکہ کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا' اس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ قبائل عرب میں سے جو چاہے وہ پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ حلیف ہو جائے یعنی ان کے ساتھ ساتھی ہونے کا معاہدہ کر لے اور جو قبیلہ چاہے' وہ مشرکین قریش کے ساتھ ہو جائے۔ اس دفعہ کی بناء پر عرب کے دو قبیلے خزاعہ اور بکر دونوں طرف تقسیم ہو گئے' اس طرح کہ خزاعہ نے پیغمبر خداؐ کے ساتھ ہونا پسند کیا اور وہ آپ کے حلیف ہوئے اور بنی بکر نے قریش مکہ کے ساتھ ہونا پسند کیا اور وہ ادھر ہو گئے۔ ان دونوں قبیلوں میں مدتوں سے آپس میں جنگ ہوتی رہتی تھی' اس لئے یہ لوگ ہمیشہ مسلح رہا کرتے تھے۔ اور ایک دوسرے کے مقابلہ کے لئے تیار لیکن اب مرکزی طاقتیں جو دو قرار پا گئی تھیں۔ یعنی مسلمان اور مشرکین قریش اور ان میں حدیبیہ کی مصالحت سے دس سال کے لئے عدم جنگ کا معاہدہ ہو گیا تھا۔ اس لئے قبیلہ خزاعہ نے مطمئن ہو کر اب ہتھیار کھول دیئے اور ایک سال اس طرح پرامن طریقہ پر گزر گیا' یہاں تک کہ پیغمبر خدا ﷺ اب اس معاہدہ کے مطابق اس عمرہ کو بھی انجام دے چکے جسے پہلی دفعہ ترک کر کے صلح حدیبیہ کی بنا پر واپس ہوئے تھے۔ مشرکین نے بھی حسب معاہدہ تین دن کے لئے مکہ کو خالی کر دیا۔ اور کوئی تعرض نہ کیا جس کا تذکرہ اس سے قبل ہو چکا ہے۔

اس سے قبیلہ خزاعہ والے اور بھی زیادہ مطمئن اور اپنے حریف کی طرف سے غافل ہو گئے مگر ان کی اس غفلت سے فائدہ اٹھا کر اسی ۸ھ میں جبکہ موتہ کے واقعہ کو جمادی الثانی اور رجب کے دو مہینے گزارے تھے۔

(طبری صفحہ ۲۱۸ کامل ابن اثیر بیروت ۱۳۸۵ھ ۱۹۶۵ء جلد ۲ صفحہ ۲۳۹)

بنی بکر کے ایک گروہ نے ایک ایسے خون کا بدلہ لینے کے بہانہ سے جو زمانہ جاہلیت میں ہوا تھا اور جس کے لئے اسلام میں یہ اصول قائم ہو چکا تھا کہ اسلام لانے کے بعد' قبل اسلام جو کچھ ہوا ہو' وہ سب نظر انداز ہو گا اور اس کے بدلا لینے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا' ان پر اچانک جبکہ وہ ایک چشمہ کے کنارے مقیم تھے' حملہ کر کے قتل عام کر دیا۔

مسٹر کے اے حمید نے نہ معلوم کہاں سے یہ لکھ دیا ہے کہ

" سرکار کے حج سے لوٹ جانے کے کچھ عرصہ کے بعد' بنو خزاعہ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے کہ بنو بکر نے ان پر حملہ کر دیا۔ قریش نے اسلحہ اور آدمیوں سے ان کی امداد کی اور بدعہدی کے مرتکب ہوئے۔ ان کو کعبتہ اللہ میں پناہ بھی نہ ملی اور بے دریغ قتل کئے گئے۔

(تاریخ مسلمانان عالم حصہ اول صفحہ ۸۵)

ہمارے پیش نظر مورخین نے یہ لکھا ہے کہ حملہ ہونے کے بعد اپنی جان بچانے کے لئے مکہ کے اندر آ کر انہوں نے حرم کعبہ میں پناہ لی تھی۔ یہاں پناہ لینے کے بعد دوسرے لوگوں نے حملہ آوروں کو نصیحت بھی کی کہ اب حرمت کعبہ کو برباد نہ کرو اور خونریزی ختم کرو مگر پھر بھی حملہ آوروں نے خزاعہ کے ایک آدمی کو جس کا نام منبہ تھا قتل کر ہی دیا جس کے بعد یہ لوگ شہر کے مختلف مکانوں میں جا جا کر مخفی ہو گئے اور اس طرح اپنی جان بچائی۔

(الدار فی اختصار المغازی و السیر صفحہ ۲۲۴)

چند آدمیوں نے بھاگ کر اپنی جان بچائی اور مدینہ پہنچ کر سرکار سے فریاد کی اور معاہدہ کے مطابق امداد کے طالب ہوئے۔

علامہ طبری رحمتہ اللہ نے اس باہمی تصادم کا ایک خاص پس منظر بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قبیلہ خزاعہ رسولؐ کی طرف تھا اور بنی کنانہ قریش کے حلیف تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ کنانہ کا ایک آدمی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ کی ہجو کے اشعار پڑھ رہا تھا۔ خزاعہ والے آدمی نے منع کیا۔ وہ نہ مانا اور اسی پر دونوں قبیلوں کا ٹکراؤ ہو گیا۔ (اعلام الوریٰ مطبوعہ مطبع حیدری تہران ۱۳۳۸ھ صفحہ ۱۱۲)

کچھ آدمی بنی خزاعہ کے زندہ بچ نکلے جن میں سے چالیس آدمی عمرو بن سالم کی سرکردگی میں حضرت پیغمبر خدا کے پاس فریادی کی حیثیت سے گئے اور مسجد میں اس وقت پہنچے جب حضرتؐ نماز صبح سے فارغ ہوئے تھے اور ابھی تعقیبات ختم کر کے بیت الشرف کی طرف مراجعت نہیں فرمائی تھی۔ اس نے پہنچتے ہی یہ شعر پڑھنا شروع کر دیئے جن میں مخالف قبیلہ کی سفاکی اور اپنی تباہی کا موثر انداز میں اظہار کیا۔

(طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۳۴)

ان ہی حضرات کا پہلا شعر تحریر ہے۔

لھم انی راشد محمد   حلف ابنیا و ابیہ الاترا

اور چھٹا شعر

ان قریشا اخلفوک الموعدا   و نقضوا میثاقک الموکدا

آخر میں ہے۔

ھم بیتنونا بالوتیۃ   فقتلو فار کعا و سجدا

(تاریخ طبری صفحہ ۱۶۲۱ - ۱۶۲۳)

"پروردگار میں حضرت محمد مصطفیؐ کو واسطہ دیتا ہوں اپنے اور ان کے درمیان والے پرانے معاہدہ کا۔ حقیقت امر یہ ہے کہ قریش نے آپ سے وعدہ خلافی کی اور جو پرزور عہد و پیمان آپ کے ساتھ تھا اسے توڑ دیا اور وہیں قتل کر دیا۔ اس حالت میں کہ ہم رکوع و سجود میں مصروف تھے۔ (یعنی جنگ کا کوئی تصور نہیں رکھتے تھے)

حضرت اتنے اشعار سن کر بے تاب ہو گئے اور فرمایا۔

حسبك یا عمروؓ ۔ "بس اے عمرؓ کافی ہے"

(اعلام الوریٰ صفحہ ۱۱۲)

دوسری روایت یہ ہے کہ اشعار سنتے ہی آپ کی زبان سے جو جملہ نکلا' وہ یہ تھا کہ۔

قد نصرت یا عمرو بن سالم
بس تمہاری مدد ہو گئی ہے عمرو بن سالم

(طبری صفحہ ۱۶۲۲)

پھر بھی اتمام حجت کے بغیر آپ نے حملہ نہیں فرمایا بلکہ اپنا نمائندہ کفار قریش کے پاس بھیجا اور انہیں لکھا کہ میری فرستادہ شرطوں میں سے کسی ایک کو منظور کرو۔

۱۔ بنی خزاعہ کے مقتولوں کا خوں بہا دو۔
۲۔ بنو بکر کی حمایت سے ہاتھ اٹھا لو۔
۳۔ اعلان کر دو کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

کفار مکہ نے تیسری شرط مان لی بعد میں وہ اپنے کئے پر پچھتائے اور انہوں نے ابو سفیان کو تجدید معاہدہ حدیبیہ کے لئے دربار رسالت میں بھیجا۔

(اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد اول صفحہ ۱۶۵)

طبری اور دوسری تاریخوں سے جو میرے سامنے ہیں' اس درمیانی لڑی یعنی اپنے نمائندہ کو بھیج کر ان شرطوں کے پیش کرنے اور ان کے تیسری شرط کو ماننے کا پتا نہیں چلتا بلکہ بنی بکر کے حملہ آور ہونے پر ان کی مدد کرنے سے انہیں خود یہ احساس ہوا کہ جو معاہدہ ہوا تھا' ہم نے اسے توڑ دیا۔ اسی پر وہ پشیمان ہوئے اور انہوں نے ابوسفیان کو مدینہ بھیجا کہ وہ معاہدے کی تجدید کی کوشش کرے۔

(الدار صفحہ ۱۱۷' طبری صفحہ ۱۶۲۳'

المختصر فی اخبار البشر لابی الفرار طبع مصر جلد ا صفحہ ۱۴۳)

چونکہ ابو سفیان کی بیٹی جناب ام حبیبہ پیغمبرؐ خدا کے حبالہ عقد میں آ چکی

تھیں۔ اب ابوسفیان جو مدینہ سے آیا تو سیدھا اپنی بیٹی ام حبیبہ کے یہاں گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مہم میں اس کی مددگار ثابت ہوں گی مگر وہاں معاملہ بالکل دگرگوں دکھائی دیا کہ اس نے جو بستر پر بیٹھنا چاہا تو ام حبیبہ نے بستر سمیٹ لیا اور کہا یہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بستر ہے اور آپ مشرک ہونے کی وجہ سے نجس ہیں۔ اس لئے اس بستر پر نہیں بیٹھ سکتے۔

(ابوالفداء جلد ا صفحہ ۱۴۳ ' الدار صفحہ ۲۲۵-۲۲۶)

اس کے بعد ظاہر ہے کہ جناب ام حبیبہ سے کسی تعاون کی امید باقی نہیں رہی اور وہ اپنا سامنہ لے کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اس واقعہ سے اس حقیقت کا پتا چلتا ہے کہ مشرکین کی نجاست کا مسئلہ جو اب مسلمانوں کی ایک اقلیت کے یہاں کا مسئلہ سمجھا جاتا ہے' شروع میں مسائل اسلام سے واقف تمام افراد' یہاں تک کہ پیغمبر خدا کے گھر میں رہنے والی عورتوں تک کو معلوم ہو چکا تھا اور مسئلہ حیثیت رکھتا تھا۔ مجبوراً" اس نے صحابہ اور پھر اہل بیت علیہم السلام کو ذریعہ بنانا چاہا مگر انہوں نے اس سلسلہ میں کسی امداد کی سید نہ دلائی جس کے بعد وہ ناکام و نامراد مکہ کی طرف واپس گیا۔

عزم روانگی اور بعض صحابہ کی مخبری

حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ معظمہ کی طرف روانگی کا عزم کر لیا مگر آپ چاہتے یہ تھے کہ مکہ میں اچانک پہنچیں۔ اور مشرکین کو اس کا علم نہ ہونے پائے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ رسولؐ کے اس منصوبہ کے خلاف اہل بدر والے معزز طبقہ صحابہ میں سے ایک بزرگوار حاطب بن طبقہ نے ابولہب کی لونڈی سارہ کے ہاتھ ایک خط قریش کی طرف روانہ کر دیا کہ رسول خداؐ فلاں دن، فلاں وقت، فلاں راستے سے تمہاری طرف روانہ ہو رہے ہیں اور وہ عورت عام راستے کو چھوڑ کر مکہ کی طرف روانہ ہوئی۔

قدرت کی جانب سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی۔ آپؐ نے حضرت علی بن ابی طالبؑ اور جناب مقداد اور بقولے حضرت علیؑ کے ساتھ زبیر اور بقولے تینوں آدمیوں کو مامور فرمایا کہ جاؤ اور اس سے خط برآمد کرو۔ یہ لوگ روانہ ہوئے اور اس سمت میں چلے جس طرف جانے کی رسول خداؐ نے ہدایت فرمائی تھی۔

(طبقات ابن سعد جلد ا صفحہ ۱۳۴)،

(ابو الفدا جلد ا صفحہ ۱۴۳)، (الدار صفحہ ۲۲۷)

دوسری سمت پر پیغمبرؐ خدا کی جانب سے حارثہ بن نعمان کچھ نگہبانوں کے ساتھ پہرے پر مقرر تھے۔ مگر وہ عورت اتنی چالاکی سے نکلی تھی کہ ان پہرے داروں کو اس کی خبر نہ ہوئی تھی۔ رسولؐ کے فرستادہ افراد نے پہرہ داروں سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا ہم نے کسی کو ادھر جاتے نہیں دیکھا مگر ایک خارکش جو لکڑیاں بٹور رہا تھا، اس سے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ میں نے ایک سیاہ فام عورت کو ادھر جاتے دیکھا ہے۔ اس پر تیز رفتاری سے ادھر روانہ ہوئے اور اسے راستے میں جا کر روک لیا اس نے قطعی انکار کیا اور تلاشی کے بعد بھی وہ خط برآمد نہیں ہوا مگر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے سخت تیور جو اس نے دیکھے تو اپنے بالوں کے جوڑے میں سے خط نکال کر پیش کر دیا اور اب اسے لا کر رسول خداؐ کی خدمت میں پیش

کر دیا گیا۔

(الدار صفحہ ۲۲۷)

آپ نے فوراً خاطب کو بلا کر ان سے جواب طلب کیا۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ میں اللہ اور رسولؐ پر ایمان رکھتا ہوں۔ ذرا بھی شک و شبہ کا شائبہ نہیں ہے مگر مکہ میں میرا کوئی قوم قبیلہ نہیں ہے اور میرے اہل و عیال وہاں موجود نہیں تو میں نے چاہا کہ میں وہاں کے باشندوں پر ایک احسان کر دوں کہ وہ وقت پر میرے اس احسان کو یاد رکھیں اور میری حفاظت کریں۔

اگر رسولؐ کا فوجی سیاست پر عملدرآمد ہوتا تو ظاہر ہے کہ اس جرم کی کتنی سخت سزا ہوتی۔ یہ جواب ظاہر ہے کہ کوئی معقول عذر کی حیثیت نہیں رکھتا' کیونکہ جتنے منافق تھے سب ایسی ہی دنیوی مفادات کے تحفظ کی خاطر سیاست نفاق سے کام لیتے ملے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ اس پر تیار تھے کہ ان کی گردن مار دیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ واللہ اس نے نفاق اختیار کیا ہے۔ (ابو الفدا جلد ۱ صفحہ ۱۴۳' الدار صفحہ ۲۲۷) مگر رسول خداؐ نے منع فرمایا اور صرف اتنی سزا دی کہ فرمایا' اسے مسجد سے نکال دو۔ پرجوش مسلمان اسے دھکے دینے لگے اور دھکیل کر مسجد سے نکالنے لگے جس پر اس نے ملتجیانہ نگاہوں سے پھر رسولؐ کو دیکھا فرمایا اچھا واپس لے آؤ' فرمایا دیکھو اب کی تمہیں چھوڑے دیتا ہوں۔ آئندہ ایسی حرکت کبھی نہ کرنا۔

(اعلام الوریٰ مطبوعہ مطبع حیدری تہران ۱۳۳۸ھ صفحہ ۱۱۳)

مکہ کی طرف روانگی

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مہم کے خلاف جو مخبری ہوئی تھی وہ خالق کی طرف سے جب ناکام بنا دی گئی تو اب رسول خداؐ نے مزید تاخیر مناسب نہ سمجھی اور آپ روز چہار شنبہ ۱۰ ماہ رمضان سن ۸ ھ کو مدینہ سے روانہ ہو گئے (طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۳۵ البدایہ والنہایہ لابن کثیر طبع مصر ۱۳۵۱ھ ۱۹۳۲ء جلد ۴ صفحہ ۲۸۵) جو یکم جنوری ۶۳۰ء کے مطابق قرار دی گئی ہے۔ (اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد ۱ صفحہ ۱۶۵) لیکن عبدالباری صاحب ایم اے۔ فتح مکہ کی تاریخ ۸ رمضان سن

۸ھ درج کر دی ہے۔ (دعوت دہلی سیرت طیبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۷۹ھ صفحہ ۱۸۴ "رسولؐ کی جنگی اسکیم") جو مذکورہ تاریخی بیان کے لحاظ سے غلط قرار پائی ہے بے شک ہمارے علماء میں سے علامہ طبرسی نے لکھا ہے کہ۔

خرج رسول اللهؐ يوم الجمعة حسين صلى العسر
مضتا من شهر رمضان

حضرت پیغمبر خداؐ مدینہ سے برآمد ہوئے روز جمعہ نماز عصر پڑھنے کے بعد جبکہ ماہ رمضان کی دو تاریخیں گزری تھیں۔

(اعلام الوریٰ طبع تہران ۱۳۳۸ھ صفحہ ۱۱۴)

اور مورخ ابن کثیر نے بھی بعض روائتیں اس کے موافق درج کی ہیں۔

(البدایة والنہایة جلد ۳ صفحہ ۲۸۵)

اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ فتح مکہ کی تاریخ ۸ ماہ رمضان صحیح ہو۔ حضرت کے ساتھ اس مہم میں دس ہزار مسلمان شریک تھے۔

(طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۳۵)

قصر صوم کا لزوم

امام محمد باقرؑ نے بیان فرمایا کہ رسول خداؐ جب مدینہ سے روانہ ہوئے تو روزے سے تھے مگر جب مقام کراع الغمیم تک پہنچے تو آپ نے حکم دیا کہ سب لوگ روزہ کھول ڈالیں--- خود حضرت نے بھی روزہ افطار فرمایا اور بہت سے لوگوں نے افطار کر لیا مگر کچھ لوگوں نے روزہ نہیں کھولا' حضرتؐ نے فرمایا کہ وہ گنہگار ہیں۔

(اعلام الوریٰ طبع جدید تہران صفحہ ۱۱۴)

مورخین اہل سنت میں سے ابن کثیر دمشقی نے پہلے تو بس اتنا لکھا کہ۔

حتى اذا كان بالكديه بين عسفان و انج افطر

جب حضرت عسفان اور انج کے درمیان مقام کدیہ میں پہنچے تو روزہ کھول دیا۔

لیکن بعد میں صحیح مسلم کے حوالہ سے وہی فقرہ درج کیا ہے کہ جب معلوم ہوا کہ بعض لوگوں نے روزہ نہیں کھولا تو فرمایا۔

لولئک العصاۃ - یہ لوگ گنہگار ہیں۔

(البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ صفحہ ۲۸۶-۲۸۷)

مگر جمہور اہل سنت چونکہ اب تک سفر میں روزہ کے قصر کو رخصت یعنی جائز مانے جا رہے ہیں۔ عزیمت یعنی لازمی پابندی کے قائل نہیں ہیں' غالباً" اس رجحان کی بنا پر ابن سعد نے مذکورہ بالا واقعہ میں بھی رسولؐ خدا کی زبانی یہ اعلان کرا دیا ہے کہ جس کا دل چاہے' روزہ کھول ڈالے اور جس کا دل چاہے روزہ قائم رکھے۔

(طبقات جلد ۲ صفحہ ۲۳۵)

مگر ظاہر ہے کہ صحاح ستہ کی حدیث میں رسولؐ کے اس اعلان کے ہوتے ہوئے کہ روزہ نہ کھولنے والے گنہگار ہیں۔ ابن سعد کی یہ نقل کسی طرح صحیح نہیں قرار رہ سکتی۔

ابو سفیان کا اسلام یا استسلام

پہلے مسٹر کے' اے حمید بیرسٹر کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

" ابھی اہل مکہ تیاریوں میں مصروف تھے کہ سرکار دس ہزار فوج کے ساتھ مکہ کے قریب پہنچ کر خیمہ زن ہوئے۔ ابو سفیان رسولؐ خدا سے ملنے کے لئے آ رہے تھے کہ سرکار کے چچا حضرت عباس سے ملاقات ہوئی۔ استفسار کرنے پر حضرت عباسؓ نے جواب دیا کہ رسول خداؐ دس ہزار فوج کے ساتھ فوج کشی کے ارادہ سے تشریف لائے ہیں۔ ابوسفیان نے پوچھا تو اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ حضرت عباس نے جوابدیا کہ میرے خیال میں ہتھیار ڈال دو۔ ورنہ تمہاری خیر نہیں۔

ابو سفیان حضرت عباس کے ہمراہ رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشرف با سلام ہو گئے۔ وہاں سے ابو سفیان نے مکہ مراجعت کی اور قریش کو یقین دلایا کہ فاتح عرب کا مقابلہ آسان نہیں۔

(تاریخ مسلمانان عالم جلد ا صفحہ ۸۷)

یاد رکھنا چاہئے کہ عربی میں ہتھیار ڈالنے کو "استسلام" کہتے ہیں۔ اب حضرت عباس کے مشورہ پر کہ "ہتھیار ڈال دو" جب ابو سفیان خدمت رسولؐ میں آئے تو

جسے کہا جا رہا ہے "مشرف با سلام ہوئے" وہ اسلام ہے یا استسلام ہے؟ اس کا ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے اوراس حقیقت کو واشگاف انداز میں حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام نے آل ابو سفیان کے بارے میں نمایاں کیا' ان الفاظ میں کہ۔

ما اسلموا ولکن استسلموا وامدوا الکفر

انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا' بلکہ استسلام اختیار کیا تھا او رکفر کو دل میں چھپا لیا تھا۔

(نہج البلاغہ مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۱۷)

دوسرے مورخین نے بھی ابو سفیان کے مسلمان ہونے کو جناب عباس کی تحریک کا نتیجہ بتایا ہے اور یہ کہ وہی اسے رسول اللہؐ کے پاس لائے اور اس کی سفارش کی۔

(طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۳۵)

بخاری کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوسفیان اور اس کے ساتھی جب معلومات حاصل کرنے باہر نکلے تھے تو اتفاق سے لشکر اسلام کے پہرہ داروں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے اور رسولؐ کی خدمت میں حاضر کئے گئے۔ اس وقت ابو سفیان نے اسلام قبول کیا۔

(صحیح بخاری جلد ۳ صفحہ ۳۹)

ابن اثیر لکھتے ہیں کہ رسولؐ کی خدمت میں آنے کے بعد بھی وہ آپ کی رسالت کی گواہی پر تیار نہ تھے مگر جناب عباس کے متنبہ کرنے پر کہ گواہی نہ دو گے تو پھر جان کی خیر نہیں' مجبوراً حضرتؐ کی رسالت کی گواہی بھی دی۔

(کامل جلد ۲ طبع بیروت ۱۳۸۵ھ' ۱۹۶۵ء صفحہ ۲۴۵)

بلکہ جیسا کہ اس کے بعد بیان ہوگا جب جناب عباس ابو سفیان کو لے کر فوج اسلام کے آگے بڑھنے کے وقت ایک بلندی پر کھڑے ہو گئے اور سامنے فوج کے دستے گروہ در گروہ آتے رہے۔ باوجودیکہ ابو سفیان اس سے پہلے توحید اور رسالت کا اقرار کر چکا تھا' پھر بھی اس وقت اس نے فوج اسلام کی شان و شوکت

دیکھ کر عباس سے کہا کہ تمہارے بھتیجے کی بادشاہت بہت بڑی ہو گئی ہے۔ جناب عباسؓ نے ٹوکا اور کہا یا ابوسفیان اتنا حسد! "ارے وہ نبوت ہے"۔ تو اس نے کہا' "اچھا یوں ہی سہی"۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ دل سے اس نے اسلام قبول نہیں کیا تھا وہ بس حالات کے دباؤ سے اظہار اسلام کر رہا تھا۔

اس صورت حال پر تبصرہ "شہید انسانیت" میں مختلف جگہ ایسے مکمل انداز سے ہو گیا ہے کہ جناب پروفیسر خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری بھی اسی کو الگ مقامات سے مرتب کرکے درج کرنے پر مجبور ہوئے ہیں اور اسی کو ہم اب ان کے یہاں سے ذیل میں درج کر رہے ہیں تاکہ اس کتاب میں یہ جز تشنہ نہ رہے۔

جب ابوسفیان ' حضرت عباس کو لے کر دربار رسالت میں حاضر ہوا تو اس وقت کی تصویر کشی علامہ شبلی نے اس طرح کی ہے۔

ابو سفیان کے پچھلے تمام کارنامے سب کے سامنے تھے اور ایک ایک چیز اس کے قتل کی دعویدار تھی۔ اسلام کی عداوت' مدینہ پر ہر بار حملہ' قبائل عرب کا اشتعال' آنحضرتؐ کے خفیہ قتل کرنے کی سازش' ان میں سے ہر چیز اس کے خون کی قیمت ہو سکتی تھی لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور چیز (عفوِ نبیؐ) تھی۔ اس نے ابو سفیان کے کان میں آہستہ سے کہا کہ خوف کا مقام نہیں چنانچہ عباس نے سفارش کی اور ابوسفیان نے اسلام قبول کیا۔

(سیر قطبی جلد ا صفحہ ۲۷۲)

اس واقعہ سے ہر انسان یہ بات سوچنے پر مجبور ہے کہ فوج کی ہیبت سے آدمی سر جھکا سکتا ہے' ہاتھ روک سکتا ہے' ہتھیار ڈال سکتا ہے۔ زبان بند کر سکتا ہے بلکہ اپنا گلا تک کاٹ سکتا ہے مگر اپنے دل میں تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا۔ اپنے قلب میں یقین کی صفت پیش نہیں کر سکتا اور اپنی نفرت کو محبت میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ وہ نفرت اور دشمنی جو ان حدود تک پہنچ چکی تھی جن کا مظاہرہ گزشتہ واقعات سے ہو چکا۔ کیا فوجی مظاہرے کے اثر سے دشمنی محبت و عقیدت سے تبدیل ہو سکتی تھی۔ اس سے عام فطرت کے مطابق کیا سمجھا جا سکتا ہے؟ صرف اتنا کہ وہ

دشمن، جو پھنکارے مارتے ہوئے اژدھے کی طرح سامنے موجود تھا، اب مار آستین بن کر خفیہ ریشہ دوانیوں کے لئے آزاد ہو گیا اور کوئی شبہ نہیں کہ دشمن کی یہ صورت اس صورت سے زیادہ خطرناک ہے جبکہ وہ خنجر بکف گلا کاٹنے کے لئے سامنے کھڑا ہو۔

اس طرح کے لوگ جو غلبہ سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے تھے، ان کی نفسیاتی کیفیت وہی تھی جو ہر دبی ہوئی اور شکست خوردہ قوم کی ہوتی ہے یعنی نفرت، دشمنی، غصہ، جذبہ انتقام اور اس کے ساتھ ساتھ ڈر جس کے نتیجہ میں وہ کھل کر اپنی عداوت کا اظہار تو نہیں کر سکتے تھے مگر برابر موقع کے منتظر تھے کہ کسی طرح ہم اسلام کو نقصان پہنچا دیں اور اگر اس کو ختم نہ کر سکیں تو کم از کم اس کی امتیازی خصوصیات کو تبدیل کر دیں جو اس نے قائم کی ہیں اور جن سے ہمارے اقتدار کو صدمہ پہنچا ہے اور اسلام کے پردے میں ہی سہی ان امتیازی حدود کو قائم کر دیں جو اسلام سے پہلے عرب میں تھیں۔

سرکار رسالتؐ کی زندگی میں ان کے اس مقصد کی تکمیل مشکل تھی ان سب کی بڑی احتیاط کی جاتی تھی۔ ان کو عام مسلمانوں کے ساتھ خلط ملط نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ نہ ان کو مسلمانوں پر حاکم بنایا جاتا تھا بلکہ اکثر تحفے تحائف دے کر ان کی دل جوئی بھی کی گئی ہے کہ یہ لوگ اپنے ظالمانہ انداز بھول جائیں اور یہ نہیں تو ان کی آئندہ نسلیں اسلام میں رہ کر امن و امان کی زندگی اختیار کریں اور سچے مسلمان ہو جائیں مگر ان کے جذبات وہی رہے اور اگر ذرا اسلام پر کوئی مصیبت پڑتی تو ان کے چہرے خوشی سے کھل جاتے اور کبھی جذبات دبی زبان سے کھل بھی جاتے چنانچہ ہم ایسے مواقع کی اپنی اس تاریخ میں نشان دہی کرتے رہیں گے۔

(اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد اول صفحہ ۱۶۷ تا ۱۷۰)

اس پورے مضمون کو جو تقریباً ۴ صفحات پر حاوی ہے جس کا دل چاہے، زیادہ تر "لعیون الفاظھا" ہماری کتاب "شہید انسانیت" میں پڑھ لے۔

(مطبوعہ الہ آباد صفحہ ۵۹ - ۶۰ - و صفحہ ۹۳)

پیغمبرؐ خدا کے امن پرور اعلانات و مکہ کی طرف شاندار پیشقدمی

ابو سفیان نے ایک رات قیام کرنے کے بعد مسلمانوں کے نظم و ضبط اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اخلاص و عقیدت کا حال اپنی آنکھ سے دیکھا کہ صبح کی نماز کے لئے حضرت وضو کے لئے جو بیٹھے تو مسلمان ٹوٹے پڑ رہے تھے کہ کوئی قطرہ آپ کے وضو کا ان کے چلو میں آ جائے اور جسے ذرا بھی کامیابی ہو گئی' اس نے وہ پانی برکت کے خیال سے اپنے منہ پر مل لیا۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل پیغمبرؐ اسلام کے سامنے ہو رہا تھا جنہوں نے توحید کا علم قائم کیا تھا۔ معلوم نہیں اس کے بعد مسلمانوں کے ایک طبقہ نے توحید کا کوئی نیا سبق کس مدّ سے حاصل کیا جو تعظیم پیغمبرؐ خدا کے کسی ایسے مظاہرے کو داخل شرک سمجھنے لگے۔

ابوسفیان کے دل پر اس منظر سے ایسی دہشت چھائی کہ اس نے کہا' میں نے قیصر اور کسریٰ کے دربار بھی دیکھے ہیں مگر یہ جاہ و جلال میری نظروں نے کبھی نہیں دیکھا۔ (البدایۃ والنہایۃ جلد ۳ صفحہ ۲۹۱)

نماز کے بعد اس نے پیغمبرؐ خدا سے اجازت مانگی کہ اب مجھے مکہ جانے دیجئے کہ میں وہاں کے لوگوں کو اپنے تاثرات سے آگاہ کروں۔

جب وہ چلنے لگا تو بعض مورخین کے بیان کے مطابق خود پیغمبرؐ خدا نے جناب عباس سے فرمایا کہ ذرا اسے مسلمان فوج کی شان دکھلا دیجئے۔ اس پر حضرت عباس نے کہا یا رسول اللہ! یہ آدمی ہے ذرا امتیاز کا شوقین۔ تو کچھ ایسا فرما دیجئے کہ یہ مکہ میں جا کر کچھ اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کا موقع پا جائے۔ حضرتؐ نے فرمایا۔

من دخل دار ابی سفیان فھو امن

جو ابو سفیان کے گھر میں پناہ لے لے گا اس کے لئے امان ہے۔

ابو سفیان نے خود حیرت اور بالیدگی کی سموئی ہوئی کیفیت میں پوچھا' "میرے گھر میں؟!" فرمایا' ہاں ہاں تمہارے گھر میں' مگر ذرا ہی وقفہ کے بعد فرمایا۔

و من دخل دار حکیم بن حزام فهوا من

جو حکیم بن حزام کے گھر میں داخل ہو جائے اس کے لئے بھی امان ہو گی۔

بات یہ ہے کہ ابوسفیان کا گھر مکہ کے ایک سرے پر تھا اور حکیم بن حزام کا گھر دوسرے سرے پر تھا۔ تو اس گھر کو جائے پناہ بنانے میں ایک طرف کے علاقہ والوں کو آسانی ہوئی اور دوسرے گھر کا نام لینے سے دوسری سمت والوں کی اور پھر اس پر اکتفا نہیں۔ فرمایا۔ "جو مسجد حرام (کعبہ کے اطراف) میں داخل ہو جائے' اس کے لئے بھی امان ہے"۔ اور بس اتنا بھی نہیں بلکہ ارشاد فرمایا۔

و من اغلق یا بہ فھو امن

جو خود اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے اس کے لئے بھی امان ہے۔

(کامل لابن الاثیر جلد ۲ صفحہ ۲۴)

ظاہر ہے کہ اب امان تو عام ہی ہو گئی مگر سب سے پہلے اپنا نام لے کر جو اعلان ہوا' اسے خصوصیت کے ساتھ ایک ایک سے بیان کرنے کا موقع مل جانے سے ابوسفیان کی آزادی کا ایک سامان ہو گیا۔ اس کے بعد جناب عباس آگے بڑھے اور ابو سفیان کو روک کر فرمایا کہ ٹھرو ذرا لشکر اسلام کا منظر دیکھ لو' پھر مکہ جاکر بیان کرنا اور ابو سفیان کو لے کر بیرون مکہ ایک پہاڑی پر جو موڑ کے اوپر واقع تھی کھڑے ہو گئے جس کے نیچے قریب سے فوج کے دستے گذرنے والے تھے۔

فتح مکہ کے سلسلہ میں علامہ ابن ابی الحدید معتزلی کا ایک بڑا پرزور قصیدہ ہے' جو عربی ادب کے شاہکاروں میں سے اور جناب تاج العلماء مولانا سید علی محمد (ابن سلطان العلماء ابن غفران مآب") نے جو عربی کے ادیب اور بہت بڑے مجتہد ہوتے ہوئے ملک کے اس وقت کے سیاسی تقاضوں کا تصور پیدا ہونے سے بہت قبل بلکہ جناب آرزو لکھنوی کی پیدائش سے بہت پہلے جو خالص اردو لکھنے کے موجد سمجھے جاتے ہیں' خالص اردو یا ہندوستانی زبان میں لکھنے کی ابتداء فرمائی' انہوں نے اس دور کے ادبی پیرایہ میں اس قصیدہ کا ترجمہ بلکہ شرح تحریر فرمائی ہے۔ اس میں ابو سفیان کے اسلام لانے اور پھر لشکر اسلام کا نظارہ کرنے کے واقعہ سے متعلق جو

حصہ ہے اسے بطور ایک قدیم شاہکار اور یادگار کے اس مقام پر درج کیا جاتا ہے اگرچہ بنظر اختصار درمیان درمیان سے حملہ ء حیدری کے اشعار اور اکثر عبارت آرائی کی خاطر جو بہت جملے صرف ہوئے ہیں' انہیں حذف کرکے نفس واقعہ کو سلسلہ سے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

ابو سفیان تجسس میں آیا اور عباس کے ذریعہ سے حضرت کی خدمت میں آ کے ایمان لایا اور امان لی مگر دل کا مالک خدا تھا چنانچہ فاضل معتزل لکھتے ہیں۔

خطا رائی اعلیٰ لسنما مرتضا عد فلما رائی ان لا نجاۃ تحد را

پس اڑ گیا ابو سفیان آسمان پر' جب وہاں نجات نہ پائی تو پھر زمین پر ٹھہرا۔

و حاذر غربی و مشرقی مذکو هزرت فالقی المشرقی مذکرا

خلاصہ یہ کہ اپی ہوئی دو دھاری تلوار کی باڑھ دیکھ کے سہم گیا۔ پہلے تو اسلام کا نام سن کر بغلیں جھانکنے لگا پھر۔۔ اسلام قبول کیا۔

واعطی یدالم یعطھا عن محبہ و قول ھدی ما قالہ متبخترا

بیعت کے لئے بہ کراہت ہاتھ تو بڑھا دیا لیکن دل سے کب منظور تھی اور عہد وفا تو کیا مگر وفاداری کا کب خیال تھا۔

فکنت بذالٔ العفواوبی و بالعلی حق و بالاحسان احری و جدرا

اور از بسکہ آپ اولیٰ بعفو و احسان تھے تو اس وجہ سے آپ نے اس کی پردہ پوشی فرمائی۔

لا فضحت یا خفی العداوۃ ناطقا تعظیمہ من متبترا

حیف صد حیف اے ابو سفیان کہ ظاہر میں تو نے وہ تعظیم و تکریم کی حضرت کی اور باطن میں عداوت بڑھا لی ان سے۔

و حسبلٔ ان تدعی ذلٔ مبافقا و تبطن ضدا للذی ظللت مظھرا

ورنہ کیا ہم نے تیر ننگ و عار کو کہ ظاہر و باطن تیرا یکساں نہ ہو منافقوں میں تیرا شمار ہو۔

جب حضرت نے اسے رخصت کیا تو منظور نظر اقدس یہ ہوا کہ وہ کروفر اور جاہ و حشم لشکر ظفر پیکر کا دیکھتا جائے تاکہ پھر رعب سے بغاوت و شقاوت نہ کر سکے۔ پس حضرات نے حضرت عباس کو حکم دیا کہ وہ اسے ساتھ لے جا کے ایک ٹکرے پر کھڑے ہوں تاکہ لشکر خدا کا سیاہا اس روسیاہ کی نظر سے گزرے اور ادھر جب مہاجر و انصار وفا شعار در دولت پر جمع ہو چکے تو حضرت نے سواری طلب فرمائی۔ ایک ناقہ کوہ تن قصوی نامی حضرت کے سامنے آیا اور حضرت نے نور طور کی طرح جس پر جلوہ فرمایا۔ جلو مین بے شمار پیادہ سوار تنگ و دو میں تھے۔ ادھر نوجوان کا شور و غوغا' ادھر گھوڑوں کو ہنہنانے سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔

قلب لشکر میں سید مختار تھے' گرد و پیش ہالے کی طرح مہاجر و انصار تھے۔ راہ خدا میں سرفروشی پر سب تیار تھے اور روبرو حضرت کے حیدر کرار تھے۔ یہاں پر کوئی مثال کب کھپتی ہے' ہاں چاند کے سامنے کے تارے کی تشبیہ البتہ کچھ پھبتی ہے۔ دست خدا میں نشان زر فشاں تھا۔ ڈاب میں ذوالفقار پر کہکشاں کا گمان تھا۔

اس کروفر سے لشکر خدا چلا' یہاں تک کہ ابو سفیان کا سامنا ہوا' سب سے پہلے خالد بن الولید کو بھینٹ بنایا تھا۔ اور اس کے ہمراہیوں کو ہراول ٹھہرایا تھا۔ ہزار سوار جرار نے اس کے پیچھے پرا جمایا تھا۔ ہاتھ میں اس کے بہت بڑا علم تھا۔ زرفشاں جس کا پرچم تھا۔ ہر ایک کے بدن میں زرہ' کمر میں تلوار' سر پر خود پشت پر سپر' ہاتھ میں نیزہ تھا' ہشت زمین پر چین بجبین ایسے غیظ و غضب میں بھرے بیٹھے تھے کہ جیسے بپھرا ہوا شیر۔ جب ابو سفیان سے چار آنکھ ہوئی تو سب لشکر نے تکبیروں کا ایک نعرہ مارا اور تیروں کی طرح سامنے سے نکل گئے۔ ابو سفیان نے عباس سے کہا کہ یہ لشکر رسول خدا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ابھی فوج رسول خدا کجا' یہ تو لشکر خالد ہے' تمہارا ولید جس کا والد ہے۔ یہ سن کے ابو سفیان ہنس کے کہنے لگا کہ اللہ اللہ! دو دن میں یہ بے باپ کا بدتمیز چھوکرا تمہاری فوج میں افسروں میں محسوب گیا۔ پھر زرہ پوش زبیر عوام تھے کہ جو مثل نہنگ دام تھے' سر پر نورانی خود لئے تھے۔ زرہ چار آئینہ بدن میں آراستہ کئے تھے۔ ہر بات جرات کی سراسر تھی۔

ہر دم سینہ اور بازوؤں پر نظر تھی- کھجور کے درخت کا سا بھالا ہاتھ میں اٹھایا تھا- پیش صف ان کے جھوم جھوم کے چلنے نے مست ہاتھی کی چال کو بھی بھلایا تھا- سامنے ان کے ایک دیبائے چین کا پھریرا اڑتا جاتا تھا' سایہ اس کا زمین کی بہار دکھاتا تھا اور ان کے پشت پر سریان سے سوار بڑے سورما نہایت جرار تھے- بدن میں زرہ آراستہ کئے تھے- ہاتھوں میں بڑے بڑے نیزے لئے تھے- پرتلوں پر تلواریں لٹکائے تھے' سروں پر خود رکھے بازوؤں پر کمانیں لگائے تھے- گھوڑوں پر پاکھروں کی عجیب شان تھی- بے مثل و لا جواب بے گمان تھی'-- اس شان و شوکت سے وہ لوگ بھی آئے- ابو سفیان کو دیکھ کر اللہ اکبر کا نعرہ زبان پر لائے- اس نے کہا کہ کیا یہ لشکر حضرتؐ ہے جو اس کا ایسا احتشام ہے- عباس نے کہا نہیں فقط یہ فوج زبیر عوام ہے-

پھر ایک اور جماعت آئی- ان سے اس دہشت پرخار نے عجیب زینت پائی- ان کے آگے سن رسیدہ ' جہاں دیدہ' آزمودہ کار' مرد دیندار حضرت ابو ذر غفار تھے-چمکتی ہوئی لوہے کی ٹوپی سر پر دیئے تھے- فولادی قبا زیب بدن کئے تھے- طبیعت جہاد پر بہت مائل تھی- ایک تیغ بے دریغ الماس رنگ گلے میں حمائل تھی- ان کی نورانی پیشانی ایمان سے چمک رہی تھی-- دست حق پرست میں ایک نشان تھا- اگر وہ گرد برد میدان غبار سے کالی رات کی طرح تیرہ و تار تھا تو بجائے کہکشاں تھا- ان کے عقب میں ہی غفار تھے- کل وہ پانچ سو سوار تھے-- اس رنگ ڈھنگ سے ابو سفیان کے سامنے آئے اور نعرہ حیدری اللہ اکبر زبان پر لائے ظاہر تو افسران کے پیر تھے- مگر حقیقت میں یہ سب کڑے کمان کے تیر تھے' --- ابو سفیان نے کہا یہ کون بزرگوار ہے؟ عباس بولے کہ یہ مصاحب خاص پیمبر بوذر- دیندار ہے' پھر بنی کعب آئے- وہ نیا رنگ لائے-- پھر قوم مزینہ سے ہزار سوار آئے-- پھر ٹڈی دل کی طرح جہینہ کا لشکر آیا اس نے اور ہی رنگ دکھایا-- آخر الامر بہت دیر کے بعد لشکر خاص حضرت آیا جس کے کروفر کے بیان کی طاقت طاق ہے-- حضرت کے پشت سر سپاہ تھی اور روبرو حضرت آئے- خدا کا سایہ جلو میں ' عجیب

قدرت خدا دکھائی دیتی تھی۔ وہ سہانا وقت' نورانی صورت' سفید لباس' زمین سے آسمان تک نور کا تنق بندھ گیا تھا"۔

اس موقع پر تاریخ کا یہ بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ لشکر اسلامی کی اس شان کو دیکھ کر ابو سفیان نے بیساختہ جناب عباس سے کہا۔

لقد اصبح ملك ابن اخيك ليوم عظيما

تمہارا بھتیجے کا ملک تو اب بہت بڑا ہو گیا ہے۔

انہوں نے فوراً اس کا منہ بند کیا اور کہا۔

يا ابا سفيان انها النبوة

ارے ! یہ سلطنت نہیں ہے' نبوت ہے۔

اس نے ناچار کہا فنعم اذن اچھا تو پھر اب یہی سہی

(البدایہ والنہاتیہ جلد ۳ صفحہ ۲۹۰' تاریخ یعقوبی طبع بیروت ۱۳۷۹ھ ۱۹۶۰ء صفحہ ۵۹' تاریخ طبری صفحہ ۱۶۳۲' طبقات ابن سعد جلد ۲)

یاد رکھنا چاہئے کہ یہ فرق اس کے بعد ہمیشہ قائم رہا جو راسخ العقیدہ مسلمان تھے' وہ نبوت مانتے تھے اور جو سیاسی اثرات کے ماتحت مسلمان ہوئے تھے یا ایسے مسلمانوں کے وارث تھے' وہ ہمیشہ اسے سلطنت ہی سمجھتے رہے۔

عام مورخین نے تو لکھا ہے کہ انصار کے دستہ کے بعد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ اصحاب کی جماعت کے ساتھ تشریف لائے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۳ صفحہ ۲۹۲)

مگر علمائے شیعہ میں سے علامہ طبرسی کا بیان ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنفس نفیس انصار مدینہ کے دستہ میں تھے

(مد رسول الله صلى الله عليه و آله فى الانصار)

(اعلام الوریٰ صفحہ ۱۱۶)

اگر ایسا تھا تو یہ اپنے پناہ دینے والوں کے حق کا خاص احترام "خلق عظیم" کا ایک کرشمہ تھا کہ دیکھو جب میں اپنے اصلی وطن میں داخل ہو رہا ہوں تو بھی تمہاری وفاداری اور حسن سلوک کو نہیں بھولا ہوں اور یہ نہ سمجھنا کہ اب میں مکہ

میں داخل ہو کر پھر مکہ والا ہو جاؤں گا بلکہ میں اب مدنی ہوں اور مدنی ہی رہوں گا۔

چونکہ یہ دستہ انصار کا تھا لہٰذا حضرت کا علم انصار کے علمدار سعد بن عبادہ کے ہاتھ میں تھا، مگر انہوں نے صحیح طور پر اس فتح کے موقع پر رسولؐ کے موقف کو سمجھا نہیں تھا، اس لئے ان کی نظر جو ابو سفیان پر پڑی تو جنگجویانہ انداز میں للکار دیا کہ۔

یا ابا سفیان الیوم یوم الملحمة الیوم تستحل الحرمة

اے ابو سفیان ! آج ہنگامہ والا دن ہے، آج بڑی حرمتیں یعنی بڑی شان والوں کی درگت بننے والی ہے۔

بعض مورخین کہتے ہیں کہ اس کے بعد پیغمبر خداؐ نے فوج مرتب فرمائی اور اس وقت علم لشکر سعد بن عبادہ کو دیا تو انہوں نے بطور رجز کہا۔

الیوم ملحمة الیوم تمسجل الحرمة

(تاریخ ابن خلدون قسم ۲ جلد ۲ صفحہ ۸۰۶)

بعض تاریخوں میں ہے کہ ابو سفیان یہ سن کر صفوں کو چیرتا حضرت رسول خداؐ کے پاس پہنچ گیا اور رکاب کو بوسہ دے کر کہا آپ نے سنا سعد کیا کہہ رہے ہیں۔ اور ان کے الفاظ دہرا دیئے۔

بعض مورخین نے ابوسفیان کا اس موقع پر ذکر نہیں کیا ہے۔ بہرحال رسولؐ کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا غلط ہے۔ سعد کا کہنا کوئی چیز نہیں۔ آج تو لائق احترام چیزوں کی حرمت قائم ہونے کا دن ہے آج کعبہ کو اس کی عظمت واپس ملے گی۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۳ صفحہ ۳۹۲)

اس کے ساتھ آپ نے سعد کے ہاتھ سے علم واپس منگا لیا اور حضرت علیؑ کے سپرد فرما دیا۔ (ابن خلدون قسم ۲ جلد ۲ صفحہ ۸۰۶) چنانچہ حضرت علیؑ نے علم اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

طبری کے الفاظ ہیں۔

فقال رسول اللّٰہ لعلی بن ابی طالب ادرکہ فخذ الرایة فکن انت الذی قد

خل بھا

پیغمبر خداؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا- جاؤ خبر لو- علم ان سے لے لو- اور تم ہی اسے لے کر مکہ میں داخل ہونا-

ابن خلدون نے لکھا ہے-

فامر عليا ان يا خذوا الواية عنه

پیغمبر خدا نے حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ علم ان سے لے لیں-

(تقیہ الجزء الثانی صفحہ ۴۳)

ایسا ہی تاریخ ابو الفداء جلد ا صفحہ ۱۵۱ میں ہے-

پر عظمت داخلہ

جیسا کہ مسٹر اے کے حمید نے بھی لکھا ہے- "شہر میں داخلہ کے وقت رسولؐ خدا کے آگے' حضرت علیؑ اسلامی جھنڈا اٹھائے ہوئے تھے-- جلوس سیدھا کعبہ میں داخل ہوا- صحن میں کھڑے ہو کر سرکار نے یہ آیت پڑھی-

" شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحیم ہے- اللہ ہی آسمان اور زمین کا مالک ہے- اللہ نے تم سے بہت سی باتوں کا وعدہ کیا تھا جو پوری ہو کر رہیں گی- اللہ تمہارے دشمنوں پر غالب ہے اور اللہ ہر بات پر قادر ہے-

(الکامل لابن الاثیر جلد ۲ صفحہ ۲۵۲' تاریخ مسلمانان عالم حصہ اول صفحہ ۸۸)

اس وقت سر مبارک پر سیاہ عمامہ تھا جو اب سادات بنی فاطمہ کی جو عمامہ پہنتے ہوں' علامت ہے-

دوسرے مورخین لکھتے ہیں کہ حضرت کعبہ کے دروازہ پر پہنچ کر ٹھہرے دونوں بازو دروازے کے ہاتھ سے تھامے اور فرمایا-

لا اله الا اللّٰه وحده انجز وعده و نصر عبده و نصر الاحزاب وحده

کوئی خدا نہیں سوا اللہ کے' اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندہ کی مدد کی اور تن تنہا تمام متفقہ طاقتوں کو شکست دے دی-

(اعلام الوریٰ صفحہ ٦٨)

عفو عام کا تاریخی اعلان

اس اعلان کا ذکر بعض مورخین نے "بتوں سے خانہ کعبہ کی طہارت" کے بعد کیا ہے مگر زیادہ مورخین اس کا تذکرہ پہلے کرتے ہیں' اس لئے ہم بھی احساس کر رہے ہیں۔

مسٹر اے کے حمید لکھتے ہیں کہ۔

"سرکار نے نماز ادا کی' بعد میں چاہ زمزم پر پہنچے اور وہاں کے پانی سے اپنی پیاس بجھائی۔ اس کے بعد ایک اعلان جاری کیا کہ جو دنیا کی تاریخ میں نمایاں خصوصیت رکھتا ہے۔ فرمایا۔ "آج کے دن تم کو کوئی خطرہ نہیں اے جماعت قریش آج خدا نے تمہارے جاہلانہ غرور کو خاک میں ملا دیا اور تمہاری جدی لن ترانیاں خاک میں مل گئیں' سن رکھو' خدا نے تم کو خاک سے پیدا کیا ہے اور پھر خاک میں ملا دے گا۔ خدا کے نزدیک شریف وہ ہے جو خدا سے ڈرے اور جس کے عمل شریفانہ ہوں۔ اے روسائے شہر میں نے تم کو آزاد کیا اور تم سے کسی قسم کا مواخذہ نہیں کروں گا۔"

(تاریخ مسلمانان عالم حصہ اول، صفحہ ۸۸)

تعجب ہے کہ ہمارے محترم خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری نے اس موقع پر صرف اتنا لکھ دیا ہے کہ "نماز شکر ادا فرمائی اور اہل شہر کو اکٹھا کرکے ایک فصیح و بلیغ تقریر فرمائی جس میں اللہ کی توحید پر قائم رہنے' شرک سے بچنے اور انسانی اخوت کو ملحوظ رکھنے کی تلقین فرمائی۔ (اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد اول صفحہ ۱۷۰)

اس میں معلوم نہیں کس وجہ سے اس عام معافی کا بالکل تذکرہ نہیں ہوا ہے جو فتح مکہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کردار کا نہایت درجہ اہم پہلو ہے جسے دنیا کے تمام اقوام کے سامنے اس تحدی کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے کہ

فاتوا بسيرة من مثله

اسے علامہ طبری طاب ثراہ نے بڑی مکمل صورت میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ۔

ودخل صناديد قريش الكعبة و هم يظنون ان السيف لا يرفع

فاتی رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ و آلہ البیت واخذ بعضادتی الباب ثم
قال لا الہ الا اللّٰہ انجزو عدہ و نصر عبدہ و غلبہ الاحزاب وحدہ ثم قال ما
تظنون و ما انتم قائلون فقال سھیل بن عمرو نقول خیرا و نظن
خیرا اخ کریم و ابن عم قال فانی اقول لکم کما قال الی یوسف
لاتثریب علیکم الیوم یغفر اللّٰہ لکم و ھو ارحم الراحمین الا ان کل
دم و حال و ماضرۃ کان فی الجاھلیۃ فانہ موضوع تحت قدمی الاسد
انۃ الکعبۃ و سقایۃ الحاج فانھا مردود تان الٰی اھلیھا الا ان مکہ محرمۃ
بتحریم اللّٰہ لم تحل بعد کان قبلی و لم تحل لی الا العاعۃ من من نھار
فعی محترمۃ الا ان تقوم الساعۃ لا یختلی خلاما ولا یقطع شجرھا
ولا ینفر صید ھا ولا تحل لقطتھا الا طنشد ثم قال الا لبئس جیران
النبی کنتم لقد کذبتم و طردتم و اخر جتم و فلدتم ثم ما رضیعتم
حتی جئتمونی فی بلادی تقاتلو منی فی ذھیر افانتم اسطلقاء
فخرج القوم وکاتم الشرا و امنا القبور و دخلہ فی الاسلام۔

اور قریش کے بڑے آدمی کعبہ میں آئے اور ان کا زیادہ گمان یہ تھا کہ وہ تہ تیغ ہونے سے بچ نہیں سکتے۔ اب رسول خدا کعبہ کی طرف تشریف لائے اور آپ نے دروازے کے دونوں پہلو ہاتھوں سے پکڑے پھر کہا کوئی خدا نہیں سوا اللہ کے' اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندہ کی مدد فرمائی اور وہ تنہا تمام مخالف جماعتوں پر غالب آیا۔ پھر فرمایا بتاؤ۔ تمہارا اب کیا گمان ہے کیا کہتے ہو تو سہیل بن عمرو نے کہا ہم اچھا ہی کہتے ہیں اور اچھا ہی گمان رکھتے ہیں۔ آپ ایک شریف بھائی ہیں اور چچا کے بیٹے ہیں۔ فرمایا' اچھا میں تم سے وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی حضرت یوسف نے کہا تھا کہ تم پر اب اس وقت مجھے کوئی الزام دینا نہیں ہے اللہ تمہیں معاف کرے اور وہ تمام رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحیم ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ ہر خوں اور مال کا مطالبہ اور فخر جو جاہلیت کے دور کا ہے' وہ سب میرے پیروں کے نیچے (پامال) ہے۔ سوا کعبہ کی تولیت اور حاجیوں کی سیرابی کے یہ عہدے انہیں

کو واپس کئے جاتے ہیں جن کے پاس تھے۔ آگاہ ہونا چاہئے کہ مکہ اللہ کی طرف سے محترم ہے۔ اس میں کوئی خونریز اقدام میرے پہلے کبھی حلال نہیں تھا اور میرے لئے بھی تھوڑی دیر کے لئے آج حلال ہوا ہے۔ اور اب قیامت تک کے لئے اس کی حرمت قائم و دائم ہے اس کے درخت کو کاٹا نہیں جا سکتا اور اس میں کسی شکار کو چھیڑا نہیں جا سکتا اور اس میں گری پڑی چیز کا اٹھانا جائز نہیں سوا اس کے جو مالک کو ڈھونڈ کر اس تک پہنچانا چاہتا ہو' پھر فرمایا پیغمبر کے کتنے میرے پڑوسی تم تھے' تم نے جھٹلایا۔ گھر سے نکلوایا ہر طرح شکست دینے کی کوشش کی۔ پھر اس پر بھی اکتفا نہیں کی یہاں تک کہ تم میرے شہر میں جا کر مجھ پر حملہ آور ہوئے اور جنگ کے لئے چڑھائی کر گئے۔ اس سب کے بعد بھی جاؤ تم سب کو چھوڑ دیا۔ اس اذن کو سن کر سب لوگ نکلے اور یہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے قبروں سے دوبارہ زندہ ہو کر باہر نکلے ہیں اور اب وہ سب دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

(اعلام الوریٰ صفحہ ۱۱۸)

اس میں دو جزء تاریخی حیثیت سے بہت ہی اہم ہیں۔

ایک یہ کہ حضرتؑ نے جو ان کی فرد قرار داد جرم مرتب کرکے انہیں سنائی ہے' اس میں فرماتا ہے کہ "تم میرے شہر جا کر مجھ پر حملہ آور ہوئے اور جنگ کے لئے چڑھ کر گئے"۔۔ یہ فقرہ آغاز جنگ اسلامی اور بالخصوص جنگ بدر کے پس منظر پر جس کے متعلق بڑی بسیط بحث ہماری اس تاریخ کے حصہ اول میں آئی ہے' اتنی تیز روشنی ڈالتا ہے کہ اس کے بعد شک و شبہ کی تاریکی کو سر چھپانے کی جگہ باقی نہیں رہتی۔

دوسرے آخر کا یہ جملہ کہ اس اعلان کے بعد وہ لوگ مسلمان ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ معافی کا اعلان ان کے اظہار اسلام کے پہلے تھا یعنی یہ عفو و کرم غیر مسلم جماعت کے ساتھ ظہور میں آیا تھا۔

دوسرے مورخین نے اس کے اجزاء کو منتشر طور پر ذکر کیا ہے۔ ابن الوردی نے جو حضرت کا سوال ماترون انی فاعل ؟ کیا سمجھتے ہو میں تمہارے ساتھ کیا

کروں گا" اور اس کا جواب اخ کریم و ابن اخ کریم ""شریف بھائی اور شریف بھائی کے بیٹے" اس کے بعد بلا فاصلہ لکھا ہے۔

قال فاذ ھبوا فانتم الطلقآء" جاؤ تم سب کو چھوڑے دیتا ہوں۔

(تاریخ ابن الوردی طبع مصر ۱۲۸۵ھ جلد ا صفحہ ۱۳۰)

ابو الفداء نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ بس وہ سوال لکھا ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا اور اس کا جواب کہ ہمیں اچھا ہی گمان ہے۔ اخ کریم و ابن اخ کریم اور بس اس کے بعد رسول کا ارشاد۔

فاذھبوا فانتم الطلقآء "اچھا جاؤ تم سب کو چھوڑ دیا"

(تاریخ ابن الفداء جلد ا صفحہ ۱۵۲)

اب اثیر نے بھی ایسا ہی کیا ہے اور حضرت کے ارشاد انتم الطلقآء کے بعد یہ اضافہ کیا ہے۔

فعفا عنهم و کان الله قدا مکنه منهم وکا نواله
فینا فلنلك ستمی اهل مکه الطلقاء

اس طرح آپ نے انہیں معاف کر دیا حالانکہ اللہ نے آپ کو ان پر پورا قابو دے دیا تھا اور وہ اب آپ کے سامنے بطور مال غنیمت موجود تھے' اسی لئے مکہ کے باشندوں کا نام ہو گیا طلقآء یعنی ایسے غلام و کنیز جو آزاد کر دیئے گئے۔

(کامل جلد ۲ صفحہ ۲۵۲)

مسعودی نے فتح مکہ کا ذکر بہت مختصر ہے۔ اس طرح کہ اس سال کا اہم واقعہ بت شکنی کو قرار دیتے ہوئے بس یہ لکھا ہے کہ

قال النبی صلی الله علیه وسلم یا معشر قریش ما ترون انی فاعل بکم قالوا خیرا اخ کریم و ابن اخ کریم قال اذھبوا فانتم الطلقاء

(مروج الذھب جلد ا صفحہ ۲۱۸)

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے گروہ قریش تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا۔ انہوں نے کہا نیک خیال ہے۔ شریف بھائی اور

شریف بھائی کے بیٹے فرمایا اچھا جاؤ سب کو چھوڑے دیتا ہوں۔

بالکل اسی طرح کا تتبع صرف ایک لفظ کا فرق یعنی ما ترون کے بجائے ما تظنون کے ساتھ ہمارے زمانہ کے ماضی قریب کے مورخ خضری بک نے کہا ہے۔

یعقوبی نے وہ سوال درج کیا ہے کہ تمہارا میرے متعلق کیا گمان ہے اور جواب ما نظن الا خیر اخ کریم و ابن عم کریم --- کو ہم و ابن عم کریم ---- اس صراحت کے ساتھ یہ جواب سہیل بن عمرو نے دیا۔ وہی سہیل جو حدیبیہ کی صلح میں شرکت کا نمائندہ تھا۔ پھر ایک طولانی تقریر حضرتؐ کی درج کی ہے جس میں حرمت حرم وغیرہ کا ذکر ہے اور کچھ خاص اسلامی آئین کے اصول جیسے قتل شبہ محمد کی سزا اور یہ مشہور مسئلہ ہے کہ الولد للفراش و للعاهر الحجر (یعنی بچہ اصل شوہر کا قرار دیا جائے گا اور زنا کار کے لئے صرف پتھر ہوں گے) اور پھر آخر میں یہ جملے لکھے ہیں۔

الا لبئس الجیران کنتم فاذا هبوا فانتم الطلقآء

ارے! کتنے برے پڑوسی تم تھے۔ اچھا جاؤ! تم سب کو چھوڑے دیتا ہوں۔

(تاریخ ابن واضح طبع بیروت جلد ۲ صفحہ ۶۰)

بغیر لحاظ طوالت میں نے متعدد تاریخوں کے اقتباسات بعینیہ پیش کر دیئے ہیں اس غرض سے کہ میں جو چیز ان میں محسوس کرتا ہوں' اسے ناظرین بھی براہ راست محسوس کریں۔

اس میں جو فقرہ سب کے یہاں متفقہ طور پر موجود ہے' وہ ہے اذهبوا فانتم الطلقآء جاؤ تم سب کو چھوڑے دیتا ہوں۔

یہ طلقآء طلیق کی جمع ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کو بحیثیت اسیر جنگ پکڑا جائے جو اس کے بعد غلام یا کنیز کی حیثیت سے فریق مخالف کی ملکیت ہوتا تھا اور پھر رحم کھا کر اسے چھوڑ دیا جائے۔

اس لفظ کے اندر معانی کے اعلان کے ساتھ تحقیر اور سرزنش دونوں موجود ہیں۔ اس لئے یہ لفظ ہمیشہ کے لئے ان کے دامن پر داغ بن کر رہ گئی جیسا کہ ابن

اثیر کی عبارت ہے جو سابقہ صفحات میں درج ہوئی ہے کہ اس کے بعد مکہ والوں کا لقب ہو گیا - طلقاء -- یہاں تک کہ یہی لفظ اپنے حدود تہذیب میں بطور سخت دشنام کے امیرالمومنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے ان خطوط میں جو امیر شام معاویہ کے نام لکھے ہیں۔ مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے کبھی یوں کہ ما للطلقاء و ابناء الطلقاء والمفاضلة بین المهاجرین بھلا انہیں جو خود بھی طلقآء ہیں اور اولاد طلقآء ہیں' یہ حق کہاں پہنچتا ہے کہ وہ مہاجرین کے درمیان فضیلت کے بارے میں بات کریں۔ اور کبھی جب امیر شام نے لکھا کہ ہم اور آپ برابر والے ہیں تو آپ نے تحریر فرمایا لیس الطلیق کالصریح ارے جو طلیق ہو' وہ بڑے کھرے کے برابر کیونکر ہو سکتا ہے۔ دوسرا جز جو اسی طرح تقریباً سب ہی نے لکھا ہے' وہ آپ کا ان سے مخاطب ہو کر یہ سوال ہے کہ تمہارا میرے متعلق کیا گمان ہے'-- اور پھر ان کا جواب کہ ہمیں سوائے اچھائی کے کوئی گمان نہیں۔

فطری طور پر آپ نے جب یہ فرمایا کہ تمہارا میرے متعلق کیا گمان ہے میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا تو آپ کے ذہن میں ان کے وہ تمام مظالم تھے جو انہوں نے آپ پر کئے تھے لیکن یہ تصور بالکل نہیں کرنا ہے کہ آپ نے یہ سوال بڑے نرم لہجہ میں اور میٹھے انداز میں کیا ہوگا بلکہ یہ سوال دل کے ایک بڑے تلاطم میں ہے جس کا اثر چہرہ پر بھی ہونا چاہئے اور لب و لہجہ پر بھی۔ اس کے جواب میں ان کا یہ کہنا کہ ہمیں بس اچھا ہی گمان ہے آپ شریف بھائی اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں۔ جو انقلاب زمانہ سے ایک جابر و ظالم کی طرف سے مجبوراً" چاپلوسی کی نشاندہی کر رہا ہے' فطری طور پر غم و غصہ میں اضافہ کرنے کا باعث ہونا چاہئے۔ کہ آج ہم بھائی اور بھتیجے سب ہو گئے اور کل بھائی بھتیجے کچھ نہ تھے' جب ہم کو گھر سے نکالا تھا اور طرح طرح کے مظالم کئے گئے تھے۔ چنانچہ اس فطری ناگواری سے بالکل مطابق ہیں وہ فقرے جو علامہ طبری نے لکھے ہیں کہ حضرت نے اپنی تقریر میں اس کے بعد ان کے مظالم انہیں یاد دلائے کہ پیغمبر کے کتنے بڑے پڑوسی تم تھے' تم

نے جھٹلایا۔ گھر سے نکلوایا۔ بری طرح شکست دینے کی کوشش کی۔ پھر اس پر بھی اکتفا نہ کی، یہاں تک کہ تم میرے شہر میں جاکر مجھ پر حملہ آور ہوئے اور جنگ کے لئے چڑھائی کرکے گئے"۔ کیا کوئی شبہہ ہے کہ یہ فقرے ایسے جوش و خروش، گرج اور کڑک کے ساتھ کئے جا رہے ہوں گے جن سے مسلسل ان کے احساس پر کیسے تازیانے، دل و دماغ پر بجلیاں گر رہی ہوں گی۔ ان فقرات کے ساتھ نرم و ملائم لہجہ کا تصور نہیں ہو سکتا۔ یہ فقرات تفصیل کے ساتھ تو علامہ طبری کے یہاں ہیں مگر ایک جملہ جو اس سب پر حاوی ہے، یعقوبی کے یہاں بھی موجود ہے کہ "کتنے میرے پڑوسی تھے تم"--- یہی جملہ اس سرزنش کا جو اعلام الوریٰ میں مکمل درج ہے، نقطہ آغاز ہے۔

اس سب کے ساتھ کتنا بے جوڑ ہے یہ جزا کہ حضرتؑ نے فرمایا۔ "میں تم سے وہ کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے کہا تھا اپنے بھائیوں سے کہ تم پر اب کوئی الزام نہیں ہے۔ اللہ تمہیں معاف کرے اور وہ تمام رحم و کرم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحیم ہے" --- یہ جملے وہ ہیں جن میں نرمی، شفقت اور ملائمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے جو اس پوری روح کے خلاف ہے جو سابق کے متفق علیہ جملوں میں تھی اور اگر یہ جملے حضرت نے فرمائے ہوں، تو پھر وہ تمام سرزنش اور ان کے گذشتہ مظالم کو یاد دلانا اور پھر اذھبوا انتم الطلقاء کا سخت اور توہین آمیز جملہ ان پورے واقعات کو رد کرنا پڑے گا۔ اسلئے میں محسوس کرتا ہوں اور یقین کے درجہ تک ایسا سمجھتا ہوں کہ راویوں میں کچھ راوی وہ تھے جنہیں ان نو مسلموں کے ساتھ ہمدردی تھی اور وہ انہیں کسی نہ کسی طرح مغفرت کا پروانہ دلوانا چاہتے تھے اور یہ کوشش اسلاف کے بارے میں اس جملے سے شروع ہوئی کہ لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم و ھو ارحم الراحمین اور ختم ہوئی ان کے اخلاف یزید ایسے شخص کے لئے فتح قسطنطنیہ اور بحری مہم پر جانے والوں کے لئے مغفور لھم والی روایت ہے۔ اس راوی نے اس سوال و جواب کے بعد کہ تمہارا میرے بارے میں کیا خیال ہے۔ اور یہ کہ ہم تو صرف اچھا گمان

رکھتے ہیں' اس واقعہ کا تتمہ یہ چسپاں کرنا ضروری سمجھا کہ ان کے اس جواب کے بعد رسول کے رحم و کرم میں جوش پیدا ہو گیا اور آپ نے یہ فرمایا کہ میں تم سے وہ کہتا ہوں جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ اب کسی کو کیا حق ہے کہ ان لوگوں کی مغفرت میں کوئی شک کرے۔ جبکہ اس جماعت کے علماء نے برادران یوسف کی ان کے تمام مظالم کے باوجود جو انہوں نے یوسف پر کئے' انبیاء کے زمرہ میں شامل کیا ہے تو اب مکہ کے ان ظالموں کے لئے رسولؐ کے ارشاد کے بعد وہی نہیں ' تو اس کے لگ بھگ ہی درجہ مانا جائے گا جو برادران یوسف کا تھا۔

دوسرے راوی جنہیں اس جماعت کے ساتھ ایسا کوئی رشتہ نہ تھا کہ ان کے جرائم کو ہلکا کریں' انہوں نے وہ سب کچھ بیان کر دیا جس میں رسولؐ کے دہن مبارک سے اس جماعت پر غیظ و غضب کی بجلیاں گرتے محسوس ہوتی ہیں۔ بعد کے مورخین وہ چاہے ہمارے علامہ طبری یا ان کا پیشرو کوئی صاحب قلم ہوئے ان کے سامنے اب ان راویوں کا بیان بھی تھا اور ان راویوں کے بھی یہ متفقہ بیانات تھے۔ انہوں نے ان دونوں کے تضاد پر متوجہ نہ ہوتے ہوئے سب اجزاء کو سمو کر پیش کر دیا۔ لیکن اب بہرکیف اس پہلو کی طرف توجہ ہو گئی ہے اور نہیں "اسپرٹ" کے لحاظ سے ان اجزا میں بالکل نیا پن نظر آتا ہے اور ہم نے بتایا کہ انتم الطلقاء والے الفاظ بالکل متفق علیہ ہیں۔ اور برادران یوسف والے تذکرہ کے لکھنے والے کم افراد ہیں اور جن کو اس برادران یوسف والی تمثیل سے دلچسپی تھی وہ بھی انتم الطلقاء والے فقرہ کو نظرانداز نہیں کر سکے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد وہابی گروہ کے سب سے بڑے پیش رو علامہ ابن القیم جوزیہ نے جو الفاظ لکھے ہیں وہ یہ ہیں۔

یا معشر قریش ماترون انی فاعل بکم قالوا خیراً اخ کریم و ابن اخ کریم قال فانی لقول لکم کنبا قال یوسف لاخوتہ لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا و انتم الطلقاء

(زاد المعارفی هذی خیر العباد طبع مصر جلد ۲ صفحہ ۴۵)

اے گروہ قریش! تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا کروں گا؟ انہوں نے کہا اچھا گمان ہے۔ آپ فیاض بھائی اور فیاض بھائی کے بیٹے ہیں۔ فرمایا اچھا تو میں تم سے وہ کہتا ہوں جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا کہ تم پر آج کوئی الزام نہیں جاؤ سب کو چھوڑے دیتا ہوں۔

نجدی وہابیوں کے مورث اعلیٰ محمد بن عبدالوہاب نجدی نے بالکل انہی الفاظ کو لے لیا ہے اور اس محل پر لفظ بلفظ یہی عبارت لکھ دی ہے۔

(مختصر سیرۃ الرسول طبع مصر)

اب جبکہ ہمارا روایتی ذوق برادرانِ یوسف کے ذکر کے ساتھ انتم الطلقاء کو بالکل چسپاں محسوس نہیں کرتا اور یہ الفاظ متفق علیہ ہیں تو ہم مجبور ہیں کہ انہیں صحیح و ثابت تسلیم کریں اور برادران یوسف والے فقرات کو الحاق قرار دیں اور علامہ ابن خلدون کے محاکمہ تاریخ کے مطابق اس کو ضعیف ہی نہیں بلکہ غلط اور موضوع قرار دیں۔

اس لئے خود ابن خلدون نے جن کے اموی رجحانات طشت ازبام ہیں یہاں اپنے روایتی ذوق سے مجبور ہو کر درمیان سے اس "برادرارن یوسف" والے ذکر کو حذف کر دیا ہے اور سوال و جواب کے بعد بلا فاصلہ وہی مسلم الثبوت اور متفق علیہ جملہ لکھ دیا ہے اس طرح کہ۔

یا معشر قریش و یا اهل مکة ما ترون انی فاعل فیکم قالوا خیرا اخ کریم ثم قال اذ هبوا فانتم الطلقاء اور اس آخری جملہ کے مضمرات کو انتہائی نمایاں بنا دیا ہے اپنے ایک فقرہ سے کہ و نقهم علی الاسلام

(تاریخ ابن خلدون جلد ۲ صفحہ ۴۵)

ہر ایک ذرا سا بھی عربی دان اور فقہ سے و قرآن سے واقف آدمی "عتق" کے معنی جانتا ہے۔ عتق کے معنی ہیں غلام یا کنیز کو آزاد کرنا۔ لہٰذا اس فقرہ کے معنی یہ ہوئے کہ وہ لوگ آئینی طور پر سب زن و مرد کنیز و غلام کی حیثیت اختیار

کر چکے تھے۔ جن کو پیغمبرؐ نے ان کے اقرار اسلام کی قیمت پر آزاد کر دیا۔

عصر جدید میں ماضی قریب کے مصری مورخ شیخ محمد خضری بک نے بھی جن سے واقعہ کربلا کے سلسلہ میں بہت تمہید نوازی کی ہے بالکل اسی کا تتبع کیا ہے اور سوا آخری جملہ کے جو واقعہ کا جزء نہیں بلکہ ابن خلدون کے اس حذف شدہ جملہ پر ایک طرح تبصرہ کی حیثیت رکھتا ہے باقی بعینہ وہی لفظیں لکھ دی ہیں۔ یعنی سوال و جواب کے بعد اذ هبوا فانتم الطلقاء

(محاضرات تاریخ امم الاسلام جلد ۱ صفحہ ۱۹۶)

تطہیر کعبہ یا بت شکنی

فتح مکہ کا انتہائی اہم واقعہ بت شکنی ہے۔ جبکہ پہلے آیا ہے۔ علامہ شبلی کے لفظوں میں اسلام کے سب سے بڑے مورخ مسعودی نے اس سال کا سب سے اہم واقعہ فتح مکہ کو نہیں بلکہ بت شکنی ہی کو قرار دیا ہے۔

(مروج الذہب جلد ۱ صفحہ ۴۰۸)

مگر معلوم نہیں کیوں مسٹر اے کے حمید نے یوں لکھا ہے کہ "سب سے پہلا کام جو سرکار نے کیا وہ کعبہ سے بتوں کا اخراج تھا"

(تاریخ مسلمانان عالم صفحہ ۸۸)

اس میں معلوم نہیں کیوں "بتوں" کے ساتھ یہ رعایت برتی گئی ہے کہ ان کے لئے "شکست" کے بجائے "اخراج" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ حالانکہ جن جن مورخین نے "بتوں" کا نام لیا ہے ان سب نے بالاتفاق ان کے توڑے جانے کا ذکر کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی نوعیت کچھ "ما وراء الفطرت" قرار دے دی ہے جس کا ذکر اب کسی وجہ سے بھی آئے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ محدثین اور سیرت نبوی کے مصنف نے تاریخ کی بہت سی کڑیاں جو راویان حدیث کے ذریعہ سے ان تک پہنچیں محفوظ کی ہیں لیکن ان میں تاریخی ذوق کی کمی کی وجہ سے ماہ و سال کی مطابقت اور واقعات کے تاریخی پس منظر سے موافقت کی کمی ہے اور مورخین نے کچھ باتیں حالات زمانہ کے سیاسی

تقاضوں پر نظر سے دبائی ہیں-- اس لئے صحیح تاریخ واقعہ کو امکانی حد تک مرتب کرنے کے لئے ان دونوں کو سمونے کی ضرورت ہے چنانچہ اس محل پر محقق ہند شاہ عبدالحق دہلوی نے جو بیک وقت محدث اور مورخ دونوں حیثیت رکھتے تھے یہی کام کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

تہی چند بزرگ در موضعی بلند نہادہ بودند کہ دست بانہانمی رسید و در بعضی روایات آمدہ کہ بت بزرگ ایشاں بود کہ ہبل نام داشت۔

علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بعرض رسانید کہ یا رسول اللہ پای مبارک بر کتف من نہ و ایں اصنام را فرود آر - آنسرور فرمودیا علی ترا طاقت برداشت بانبوت نیست تو پائی برکتف من نہ وایں کار بکن۔ علی امتثال الامر پای کتف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنہاد و آنہارا فروگند تندریں حالت حضرت ازوی پرسید کہ خود را چگونہ می یابی گفت یا رسول اللہ چناں می بینم کہ حجت مکشوف شدہ وگویا سرمن بساق عرش رسیدہ است و ہرچہ دست دراز می کنم بدست من می آید' حضرت فرمود ای علی خوشاوقت تو کہ کار حق می کنی وجندا حال من کہ بار حق می کشم آوردہ ان کہ چوں علی تباں را بر زمین انداخت و قطعہ قطعہ ساخت خود را از دوش آنحضرت بر زمین در روایتی آمدہ کہ خود را از نزدیکی کعبہ بیند اخت از جہت ادب و شفقت بر آنحضرت و چوں بر زمین افتاد تبسمی فرمود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم از وے پرسید کہ چہ چیز ترا بخندہ آورد گفت آنکہ خود را از چنیں جائے بلند اندا ختم و ہیچ من نرسید آنحضرت فرمود گلوالم بتو رسد و حال آنکہ بردارندہ تو محمد باشد و فرمود آور دندہ جبرئیل۔

کچھ بڑے بت ایک اونچے مقام پر رکھے تھے کہ ہاتھ ان تک نہیں پہنچتا تھا اور بعض روایتوں میں ہے کہ ان میں کا سب سے بڑا بت وہ تھا جس کا نام ہبل تھا۔

حضرت علیؑ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ اپنا پیر میرے کندھے پر رکھئے اور ان بتوں کو نیچے گرا دیجئے۔

حضرت نے فرمایا یا علیؑ! تم میں نبوت بار اٹھانے کی طاقت نہیں ہے-- تم پیر

میرے کندھے پر رکھو اور اس کام کو انجام دو۔ علیؑ نے تعمیل ارشاد کی بناء پر رسول خدا ﷺ کے کاندھے پر پاؤں رکھا اور انہیں نیچے گرا دیا۔ اس موقع پر آنحضرتؐ نے ان سے پوچھا کہ اپنے کو کیسا پاتے ہو؟ کہا یا رسول اللہؐ ایسا دیکھ رہا ہوں کہ پردے اٹھ گئے ہیں اور گویا میرا سر عرش کے پائے تک پہنچا ہوا ہے۔ اور جس شے کی طرف ہاتھ بڑھاؤں وہ میرے دسترس میں ہے۔ حضرتؐ نے فرمایا اے علی خوشا بحال تمہارے کہ تم حق کا کام کر رہے ہو اور خوشا بحال میرے کہ میں حق کا بار اٹھائے ہوں۔ بیان کیا گیا کہ جب حضرت علی نے بتوں کو زمین پر پھینکا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تو اپنے کو حضرت کے کاندھے سے ایک دم زمین پر گرا دیا اور ایک روایت میں ہے کہ اپنے کو کعبہ کے پاس باہر گرا دیا۔ ادب کے خیال سے اور آنحضرتؐ کی زحمت کے لحاظ سے اور زمین پر گرے تو مسکرا دیئے۔

رسول خدا ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا چیز تمہاری ہنسی کا سبب ہوئی؟ انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے کو اتنی اونچی جگہ سے نیچے گرایا اور مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ حضرت نے فرمایا تمہیں کیونکر تکلیف ہو سکتی ہے درانحالیکہ اٹھانے والا تمہارا محمدؐ اور اتارنے والے جبرئیل۔

اس میں جو اجزا حضرت علیؑ سے متعلق ہیں ان میں سے کچھ اہم قدیم محدثین میں امام احمد بن حنبل کے مشہور آفاق مسند میں مسند علیؑ کے ذیل میں دو مقام پر درج پاتے ہیں اور حافظ ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی جو مصنفین صحاح ستہ میں سے ایک ہیں اسے اپنی کتاب خصائص علویہ میں درج کرتے ہیں جن کے متفقہ الفاظ حضرت علیؑ کی زبانی یہ ہیں۔

قال لی اجلس و اصعد علی منکبی فذھب لا نھض بد فرائی منی ضعفا منزل و جلس لی نبی اللہ صلی اللہ علیہ و مسلم و قال اصعد علی منکبی قال مضعدت علی منکبہ قال فنصص حب قال فانہ یحیل اتی لو شفت نسلت من السماء حتی صعدت علی البیت و علیہ تمثال صفراء بخامن فجعلت ازاولہ عن یمینہ و عن شمالہ و بین

يديه و من خلفه حتى اذا اسمكنت منه قال لى رسول اللهؐ اقذف به فقذفت به فتكسر كما تتكسرا القرارير

(مسند احمد مطبوعہ مصر ۳۶۶ھ جلد ۷ صفحہ ۵۸ و خصائص نسائی مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۵۴)

حضرتؐ نے مجھ سے فرمایا کہ بیٹھو اور میرے کاندھے پر بلند ہوئے تو میں چلا کہ آپ کو لے کر اٹھوں تو آپ نے مجھ میں کمزوری محسوس کی تو اتر پڑے اور پیغمبر خداؐ خود میرے لئے بیٹھے اور فرمایا تم میرے کاندھے پر چڑھو آپ کا بیان ہے کہ حضرت مجھے لے کر کھڑے ہو گئے۔ آپ کا بیان ہے کہ مجھے ایسا تصور ہو رہا تھا کہ اگر میں چاہوں تو آسمان سے جو چاہوں لے لوں یہاں تک کہ میں خانہ کعبہ کے اوپر بلند ہو گیا اور اس پر ایک زرد پیتل کی مورت تھی تو میں اس کو حرکت دینے لگا اس کے دائیں سے اور اس کے بائیں سے اور اس کے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے یہاں تک کہ جب میں نے اسے بالکل ہلا دیا تو حضرت نے مجھے فرمایا کہ بس اب اس کو گرا دو میں نے اس کو اوپر سے نیچے پھینکا تو وہ اس طرح ٹوٹی جیسے شیشے ٹوٹتے ہیں۔

بس جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا اس واقعہ کا ارتباط فتح مکہ کے موقع سے گم ہو گیا ہے حالانکہ درایتی حیثیت سے سوائے فتح مکہ کے کوئی اور موقع اس بت شکنی کا ہو ہی نہیں سکتا۔

مورخین جس طبقہ کا نام ہے' انہوں نے بت شکنی کے واقعہ کو ایک معجزہ کی صورت ۔ے پیش کر دیا ہے کہ خانہ کعبہ کے گرد تین سو ساٹھ بت تھے جو سیسے یاسوانگے سے دیوار کعبہ میں جڑے ہوئے تھے۔ جناب رسالت مابؐ جس بت کی طرف سے گزرتے تھے ایک چھڑی سے جو آپ کے ہاتھ میں تھی اس کی طرف اشارہ فرماتے تھے اور یہ آیت پڑھ دیتے تھے کہ۔

جآء الحق و زهق الباطل ان الباطل كان زهوقا

حق آیا اور باطل مٹ گیا۔ بلا شبہ باطل مٹنے والی چیز ہی تھا۔

بس اس کے ساتھ وہ بت منہ کے بل زمین پر آ رہتا تھا بغیر اس کے کہ کوئی

شے اس سے چھو بھی جائے۔

(تاریخ ابن خلدون جلد ۲ صفحہ ۸۰۸ تاریخ الوردی جلد ۱ صفحہ ۱۲۰)
(الدارنی اختصار الغازی دلیر والسیر صفحہ ۲۳۴)

لیکن اگر حکمت زبانی اس کی متقاضی ہوتی کہ رسولؐ اس بارے میں صرف اعجاز سے کام لیں تو آنے اور خانہ کعبہ میں داخل ہونے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ آپ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے مدینہ ہی سے اگر یہ آیت پڑھ کر یا بغیر آیت پڑھے بھی اس قصد سے اشارہ فرما دیتے تو تمام کے تمام سرنگوں ہو کر ریزہ ریزہ ہو سکتے تھے۔

بہرحال یہ مورخین ہیں جن پر اموی و عباسی سیاستوں کا اثر شاید محدثین سے بھی زیادہ تھا لیکن حضرت علیؑ کی بت شکنی ایسا زبان زد خاص و عام واقعہ تھا کہ آزاد زبانوں اور ذہنوں پر جاری و ساری رہا چنانچہ علامہ ابن ابی الحدید معتزلی نے اپنے قصیدہ میں جس کا بسیط اقتباس پہلے درج ہو چکا ہے اس واقعہ کا خود حضرت امیرؑ کو مخاطب کر کے بڑے کیف آور طریقہ پر ذکر کیا ہے جسے مثل سابق تاج العلماء اعلیٰ اللہ مقامہ کے ترجمہ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔ و کسرت اصنا ما طعنت حماتھا بسمر الوشیج الو شیخ اللدن حتی تکسرا آپ کی برچھی بتوں میں نہیں گڑی بلکہ گویا ان کے حامیوں کے پرخچے اڑا دیئے۔ ذوالفقار نے آپ کے مشرکوں کو نہ چھوڑا اور گندم گوں نیزہ نے آپ کے بتوں کو توڑا۔

رقیت با مسمیٰ غارب احدقت بہ ملائلۃ تیلون الکتاب المسطرا
بلند ہوئے آپ اس عالی شان شانے پر کہ جس کے گرد حلقہ زدہ تھے ملائیکہ مقربین اور تلاوت کر رہے تھے قرآن مجید کو۔

بغارب خیر المرسلین وامشرف الانام و ازکی فاعل و طئی الثریٰ
دوش مبارک پر اس نبیؐ کے کہ سب نبیوں سے افضل تھے اور تمام دنیا میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔

فسبح جبریل و قدس ھیبۃ و ھلل اسرافیل و عباو کبرا
یہ حال دیکھ کے حضرت جبرئیل و اسرافیل پھولوں نہ سماتے تھے اور مارے

خوشی کے بے ساختہ اور بے تحاشہ تکبیریں کہتے تھے اور بہر بن مو' سے شکر خدا ادا کرتے تھے۔

فیارتبة لو شئستا تلمسر السها　　بها لم یکن ما رھنه متعذرا

اللہ اللہ کیا رتبہ پایا آپ نے اور کس بلند مقام پر پہنچے کہ اگر وہاں سے سہا (ستارے) کو چھونا چاہتے تھے تو بے تکلف چھو لیتے۔

و ما قد صدیه ای قدس و طئنها　　و ای مقام قمنما فیه انومرا

" اے مبارک پاؤں ' واہ کیا کہنا کس نورانی مقام پر تم ٹھہرے کہ جہاں جبرئیل کے بھی پر جلتے تھے۔

و حیث الومیفر الشعشانی فائض- من المصدر الا علی تبارک مصدرا

اور اس مقام پر کہ جہاں مبدار فیاض سے برابر فیضان نور کے باعث ایک تتق نور کا بندھا ہوا تھا۔

فلیس سواع بعد ھا بعمظم　　ولا اللات مسجود الھاو معنمرا

آپ کی بت شکنی کے بعد پھر کسی لات و منات کی پرستش نہ ہوئی اور سوم و عزیٰ کی عزت نہ رہی۔

(ارشادیہ یعنی چودھویں رات کا چاند معروف بواعظ جونپوریہ)

مسلمان شہداء

یہ فتح مکہ کی مہم بغیر کسی جنگ کے پایہ تکمیل تک پہنچی مگر حق کی راہ میں تین بے گناہوں کا خون زمین پر اس ذیل میں بھی بہہ گیا- علامہ طبری علیہ الرحمتہ نے لکھا ہے کہ یہ تین مسلمان انفاق سے پیچھے رہ گئے تھے اور راستہ بھول کر کافروں کے حلقہ میں پہنچ گئے اور قتل کر ڈالے گئے۔ (اعلام الوریٰ صفحہ ۱۱۹)

اس کے علاوہ خالد بن الولید جس راہ سے داخل مکہ ہوئے ' وہاں مشرکین نے کچھ مزاحمت کی اور جنگ ہوئی تو مشرکین میں سے ۲۸ آدمی قتل ہوئے اور مسلمان صرف دو شہید ہوئے۔ (تاریخ ابن الوردی جلد ۱ صفحہ ۱۳۰)

تبلیغی مہمیں

مکہ میں سکون کے بعد حضرتؐ نے اطراف مکہ میں کچھ دستے روانہ کئے جنہیں جنگ کرنے کی اجازت نہیں بلکہ انہیں صرف توحید الٰہی کی طرف دعوت پر مامور کیا تھا۔ الفاظ تاریخ کی صراحت یہ ہے کہ

یدعون الی اللّٰہ عز و جل و لم یارھم بقتال

وہ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیں اور حضرتؐ نے انہیں جنگ کی اجازت نہیں دی تھی۔

(اعلام الوریٰ صفحہ ۱۱۹)

جتنے سردار بھیجے گئے تھے، سب نے اس اصول پر عمل کیا مگر خالد بن ولید جس قبیلہ کی طرف بھیجے گئے تھے۔ وہ ان کے قبیلہ بنی مخزوم سے جنگ کر چکا تھا اور ان کے چچا کو قتل کر چکا تھا۔ حالانکہ اسلامی اصول یہ ہے زمانہ جاہلیت کی باتوں کا قصاص اسلام کے بعد لینا درست نہیں ہے مگر خالد نے اس اصول کو توڑ دیا اور ان کے مردوں کو قتل کیا اور جنہیں اسیر کیا انہیں بھی قتل کرا دیا۔ ان میں کا ایک آدمی موقع پا کر نکلا اور اس نے پیغمبر خداؐ کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ حضرت یہ سن کر گریہ فرمانے لگے اور ہاتھ اٹھا کر بارگاہ الٰہی میں عرض کیا۔

اللھم انی ابراء الیک مما فعلہ خالد

پروردگارا میں تجھے گواہ کرتا ہوں کہ میں خالد کے فعل سے بیزار ہوں۔

پھر آپ نے حضرت علیؑ کو بلا کر کافی مقدار میں سونا دیا اور فرمایا جا کر انہیں خون بہا دے کر راضی کر دو۔

(اعلام الوریٰ صفحہ ۱۱۹)

کاش مسلمان اسلام لانے کے بعد خالد کے حالات پر جو زمانہ پیغمبرؐ میں تھا، نظر رکھتے اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد انہیں افواج اسلام کی سپہ سالاری کا ذمہ دار عہدہ تفویض نہ کرتے تاکہ مقاصد اسلامی کو ایسا اہم نقصان نہ پہنچتا کہ اسلام دوسروں کی نگاہ میں خارجیت کا مترادف قرار پا جائے۔

قیام مکہ

فتح مکہ کے بعد حضرتؐ بروایتے دس دن اور بروایتے پندرہ دن اور بروایتے سترہ دن یا اٹھارہ دن مقیم رہے مگر آٹھ دس روایتیں سب متفق ہیں کہ اس تمام مدت میں حضرت نماز قصر کے ساتھ ادا فرماتے رہے۔

(طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۳۹ رسالہ ای الجندی العرق من کتاب عیون الاثر الاستاذ السید فرط طبع القاهرہ سن ۱۳۸۷ھ ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۵۳)

اس لئے کہ یہ مدت تذبذب میں گذری تھی۔ آپ نے نیت اقامت عشرہ کی نہیں فرمائی لہٰذا قصر کا حکم جاری رہا جو فقہ امامیہ کے مطابق ہے۔

غزوہ حنین

اس کے بعد حنین کی جنگ ہوئی۔ یہ حنین مکہ اور طائف کے درمیان ایک مقام ہے اور اس طرح اوطاس جس کا ذکر اس کے بعد آئے گا چونکہ یہ جنگیں ان جگھوں پر ہوئی تھیں لہٰذا ان کا نام جنگ حنین اور جنگ اوطاس ہوا اور چونکہ یہ مقابلہ قبیلہ ہوازن سے تھا اس لئے اس کو غزوہ ہوازن بھی کہتے ہیں۔

مورخین کے الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ مکہ معظمہ ہی سے حضرت رسولؐ اس رزم کے لئے روانہ ہوئے اس لئے کہ قبیلہ ہوازن نے مکہ کی فتح کا حال سننے کے بعد پوری جنگی تیاری کر کے حملہ کا منصوبہ بنا لیا جبکہ رسولؐ مکہ ہی سے ان پر حملہ کے لئے روانہ ہوئے۔

(زادالعاد ابن تیمم صفحہ ۸۳)

اور اب مسلمانوں کی جماعت کافی ہو گئی تھی جن میں سے دس ہزار تو وہ تھے جو مدینہ سے آپ کے ساتھ آئے تھے اور دو ہزار مکہ سے آپ کے ساتھ ہوئے۔ اس کثرت تعداد کو دیکھ کر بعض صحابہ کی زبان سے نکل گیا اب آج ہماری تعداد ایسی کم نہیں ہیں کہ ہم مغلوب ہو جائیں۔

ابن سعد نے لکھا ہے۔

فقال ابوبکرؓ لا تغلب الیوم من قلة

حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ اب آج قلت تعداد سے ہم مغلوب نہ ہوں گے۔
اور بعض نے اسے اختلافی قرار دیا ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ تھے یا کوئی اور۔

(اعلام الوریٰ صفحہ ۱۲۰ رسالہ الی الجندی العربی من کتاب ابن الاثیر الاسد و سید جلد طبع القاهره ۱۳۸۷ھ ۱۹۶۷ء صفحہ ۵۳)

جس نے بھی کہے ہوں بہرحال یہ الفاظ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گراں گزرے جس کی طرف قرآن مجید نے بھی نتیجہ جنگ کے سامنے آنے کے بعد اشارہ فرمایا۔

و یوم حنین اذا عجبتکم کثر تکم فلم تغن عنکم شیئا
و صناقت علیکم الارض بما رحبت ثم ولیتم مدبرین

(سورہ براءت آیت ۲۵)

اور حنین کے موقع کو یاد کرو' جب تمہاری کثرت نے تمہیں مغرور کر دیا تو اس نے تمہیں کچھ فائدہ نہ پہنچایا اور تم پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہو گئی پھر تم نے پیٹھ پھرا کر فرار اختیار کیا۔

اس کی تفصیل تاریخ میں درج ہے کہ ادھر سے مالک بن عوف نصر بن اپنے ساتھ والے قیس و ثقیف کے قبیلوں کو لے کر نکلا۔ رسول خداؐ نے ایک صحابی اور صحابی زادے عبداللہ بن ابی حدبرد کو خبر لانے کے لئے روانہ فرمایا۔ انہوں نے جا کر سنا کہ مالک بن عوف اپنی جماعت سے کہہ رہا ہے کہ اے ہوازن کہ بہادرو! تم تمام عرب میں سب سے زیادہ طاقتور اور ساز و سامان سے لیس ہو۔ اور ہمارے مد مقابل کا ابھی تک سامنا ایسے لوگوں سے رہا جو سچے معنی میں مردان جنگ نہ تھے۔ اب تمہارا کام ہے کہ جب ان کے سامنے جاؤ تو اپنی تلواروں کے نیام توڑ دو اور ایک دم حملہ کر دو۔ ابن ابی حدرد یہ سن کر آئے اور رسولؐ خدا کو اطلاع دی چونکہ اس میں ذرا فریق مخالف کے جوش و خروش کا اظہار تھا جو اپنی جماعت والوں کے لئے ہراس کا باعث ہو سکتا تھا۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے جو بات کو سیاسی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے۔ رسولؐ خدا کو یہ خیال خود بھلانا چاہا کہ یا رسول اللہؐ! ابن ابی حدرد جو

لکھ رہا ہے اس کی سماعت نہ کیجئے۔ اس پر حضرت نے ان کی سرزنش کی اور فرمایا ابن ابی حدرد اپنے قول میں بالکل سچا ہے۔

(اعلام الوریٰ صفحہ ۱۲۰ رسالہ الی الجندی العربی عن کتاب عیون الاشی القاہرہ سن ۱۳۸۷ھ صفحہ ۵۳)

سلمان آگے بڑھے تو نتیجہ وہ ہوا جس کا ذکر ابھی قرآن مجید کی لفظوں میں آ جائے۔ مجبورا" مورخین کو بھی بالاتفاق اسے لکھنا پڑتا ہے چنانچہ حافظ ذہبی نے بڑی بے دردی کے صاف گوئی کرتے ہوئے لکھ دیا ہے۔

فدکی یومئذ المسلمون الادبار و ثبت

مع النبی صلے اللہ علیہ وسلم رجال

تمام مسلمانوں نے آج کے دن پیٹھ دکھائی اور چند آدمی تھے جو رسولؐ کے ساتھ برقرار رہے۔ (العبر فی اخبار من غیر طبع کویت صفحہ ۱۱۹)

جناب جابر بن عبداللہ انصاری نے اس کی روئیداد یہ سنائی ہے کہ ہم لوگ چلتے رہے یہاں تک کہ جب حنین کی وادی (پہاڑوں کی درمیانی راہ) میں پہنچے وہاں بہت طولانی نشیب راستہ تھا اور وہ لوگ پہلے سے اس وادی میں ادھر ادھر چھپ گئے تھے۔ بس ایک دم مروان جنگی کے بڑے بڑے رسالے ہاتھوں میں تلواریں' لوہے کے گرز اور نیزے لئے ہوئے ٹوٹ پڑے اور (جیسا کہ ان کے سردار نے مخبر کے بیان کے مطابق انہیں ہدایت کر دی تھی) وہ ایک ساتھ حملہ آور ہو گئے۔ اس پر تمام آدمی (مسلمان فوج والے) پسپا ہوئے' اس طرح کہ ایک دوسرے کی طرف مڑ کر نہ دیکھتے تھے۔ اور رسولؐ خدا دائیں جانب بڑھے اس عالم میں کہ آپ کے مرکب کو صرف ۹ جاں باز جو کہ بنی ہاشم سے تعلق رکھتے تھے گھیرے ہوئے تھے۔

علامہ ابن قیم جوزیہ نے لکھا ہے کہ مہاجرین میں سے صرف حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ اس معرکے میں رکے رہے تھے اور پیغمبر خداؐ کے عزیز حضرت علیؑ اور عباس اور ابو سفیان بن حارث بن عبدالمطلب وغیرہ۔

(زاد العاد ابن قیم صفحہ ۸۶)

بعض مورخین نے اس موقع کا منظر یہ لکھا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب خاص رسولؐ خدا کے آگے تلوار کھینچے ہوئے کھڑے تھے۔ عباس بن عبدالمطلب آپ کے مرکب کی نیام پکڑے تھے فضل بن عباس داہنی طرف اور مغیرہ بن حارث بن عبدالمطلب بائیں طرف تھے۔

(الامام علی لشیخ جواد مغنیہ صفحہ ۲۲۳)

فاھزم جمھور المسلمین و لم یلو احد علیٰ احد

جمہور اہل سلام نے پسپائی اختیار کی اس طرح کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔

(النار فی اختصار لمغازی والسیر صفحہ ۲۳۹)

آخر میں پھر فتح ہوئی اس کے ہاتھوں جس کے ہاتھ پر ہر مہم معرکہ کی فتح مقدر تھی۔ اسے امام الخائلہ میں القیم ہی کے قلم سے ملاحظہ کیجئے۔

وہ لکھتے ہیں۔

رجل عن ھوازن علے جمل له احمد بیده رایة سودائی و فی راس رمح طویل امام ھوازن و ھوازن خلفه اذا ادرکٔ طعن برمحه و اذا فاتط الناس رفع رمحه لمن و راه فاتبعون فیھا ھو کذلکٔ اذا ھوئی علیه علی بن ابی طالب و رجل من الانصار یرید انه قار فاتی علی فضرب عرقو بی الجمل فوقع علی عجزه فضرا حزبة اطن قد منصف لساعة فانحقف من رجله قال فاحتمله الناس قال وو ما راجعت راجة الناس من هزیمنهم حتی و جدر الاساق عند رسول الله صلے الله علیه وسلم

قبیلہ ہوازن کا ایک شخص اپنے سرخ رنگ کے اونٹ پر قبیلہ ہوازن کے آگے تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ جھنڈا تھا۔ ایک بڑے لمبے نیزے کے سرے پر اور ہوازن کی فوج اس کے پیچھے تھی۔ جب فوج کا ایک دستہ اس کے قریب پہنچتا تھا وہ اپنے نیزہ کو جھکا دیتا تھا اور جب یہ دستہ آگے بڑھ جاتا تھا تو وہ نیزہ کو پیچھے کر لیتا تھا اس دوران علی بن ابی طالب اور انصار میں سے ایک بہادر دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ حضرت علی نے بڑھ کر اس کے دونوں پیروں پر تلوار لگائی۔ تو وہ اپنے

کولھوں کے بل گر گیا۔ انصاری نے چھلانگ لگا کر خود اس شخص پر تلوار لگائی جس نے اس کے پیر کو قطع کر دیا۔ آدھی پنڈلی تک وہ تو وہ اپنے پیر پر گھسیٹ کر چلنے لگا اور لوگ ادھر کے اسے اٹھا لے گئے۔ فرار شدہ آدمی ابھی واپس نہیں آئے تھے تو بخدا کہ انہیں دشمنوں کے قیدی رسولؐ خدا کے سامنے صاف نظر آئے۔

(زاد المعاد صفحہ ۱۸۶ - ۱۸۷۰ء' تاریخ طبری صفحہ ۱۶۶۲)

غور و فکر کا ایک بڑا لمحہ فراہم ہو گیا۔ وہ یہ کہ اس جنگ میں فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہونے والے یا ہتھیار ڈالنے والے افراد کثرت سے شریک تھے تو وقت کی سختی نے ان میں سے بہت سوں کے دلوں کے اندر چھپے ہوئے جذبوں کو نمایاں کر دیا جن سے پتا چل گیا کہ بے بسی کے عالم میں اس اظہار اسلام یا ظاہری اتحاد عمل کی کوئی اصلیت نہیں ہے' اس لئے ان افراد پر مسلمانوں کو کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔

بعض مورخین کا تو بیان ہے کہ اس شکست کے بہت بڑے ذمہ دار یہی لوگ تھے کیونکہ ابوسفیان اپنے ساتھیوں کے ساتھ سب سے آگے تھا اور اس نے مشرکین کے جان توڑ حملہ کے ساتھ فوراً ہی اپنے ساتھ والوں کے ساتھ راہ فرار اختیار کی جس کے بعد "مڈبھیڑیا دھسانی" مزاج کی وجہ سے پوری جماعت کے قدم اکھڑ گئے اور اس شکست سے خوش ہو کر ابو سفیان چیخ اٹھا کہ لا تنتہی ھزیمتھم دون البحر "بس اب سمندر کے ادھر ان کی پسپائی رک نہیں سکتی"

(الامام علی طبع بیروت صفحہ ۱۳۲)

کچھ مورخین نے اس جملہ کے ساتھ کہ اب سمندر کے ادھر ان کا فرار رک نہیں سکتا صراحت کی ہے کہ اب تک اس کے ترکش میں ازلام یعنی وہ پانسے جو زمانہ شرک کی یادگار تھے' موجود تھے۔

(تاریخ طبری صفحہ ۱۶۶۱ کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۲۶۳)

صفوان بن امیہ کے سوتیلے بھائی کلدہ نے کہا۔

الابطل السحر الیوم بس آج کا جادو ختم ہو گیا۔

اس پر صفوان نے بھی یہ اعتراض نہیں کیا کہ ارے ! یہ کیا کفر کا جملہ کہتا ہے بلکہ قبیلہ وادی عصبیت کے جذبہ کو بیدار کرتے ہوئے کہا۔

اسکت فص اللّٰہ فاکٔ فوا اللّٰہ لئن یربتنی رجل من قریش

احب الی من ان تربتی رجل من بنی ھوازن

ارے خاموش رہ۔ خدا تیرا منہ توڑے بخدا قریش کا ایک آدمی میرا سرپرست بنے، اس سے بہتر ہے کہ قبیلہ ہوازن کا کوئی شخص میرا مالک و سرپرست بنے۔

(طبری ۱۶۶۱ کامل جلد ۲ صفحہ ۲۶۳)

مطلب یہ تھا کہ اس جنگ میں جو قبیلہ ہوارین سے ہے، اگر انہیں فتح ہوئی تو قبیلہ ہوازن ہم پر مسلط ہو جائے گا۔ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ محمدؐ کا جو ہمارے قبیلہ قریش ہی کے آدمی ہیں، ہم پر تسلط ہو۔

شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ جو قبیلہ بنی عبدالدار میں تھا اوراس قبیلہ کے کئی علمدار حضرت علیؑ کے ہاتھ سے قتل ہوئے تھے جن میں خود اس کا باپ بھی تھا اس نے ارادہ کیا کہ حضرت رسولؐ خدا کو شہیدوں کے باپ کے خون کا بدلہ لے۔

(کامل جلد ۲ صفحہ ۲۶۳)

یہ خاص نازک موقع تھا جس میں حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ اپنے مرکب پر دونوں رکابوں پر زور دے کر کھڑے ہو گئے اور پہلے تو خداوند عالم سے فتح و نصرت کی دعا مانگی اور پھر مجمع اصحاب کو ایک روایت کے مطابق حدیبیہ والی بیعت یاد دلا کر اور دوسری روایت کے مطابق انصار مدینہ اور بالخصوص خزوج کو للکار کر انہیں ان کی اس کمزوری پر سختی کے ساتھ متنبہ فرمایا اور جناب عباس کو جن کی آواز بہت بلند تھی فرمایا کہ وہ مسلمانوں کو پوری طاقت سے صدا دیں۔ اس سب کا اثر تھا کہ بھاگی ہوئی مسلمانوں کی جماعت سمٹ کر حضرت کی آواز پر آنے لگی۔

اس موقع پر دو مصرعے ہیں جو حضرتؐ کی زبان مبارک پر آئے ہیں اور چونکہ کبھی حضرتؐ نے شعر نظم نہیں فرمایا، اسلئے وہ دو مصرعے جزو تاریخ بن گئے۔

انا النبی لا کذب　　انا ابن عبدالمطلب

"میں نبی ہوں - جھوٹا نہیں ہوں - میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں"

(طبری صفحہ ۱۶۹۲ کامل جلد ۲ صفحہ ۲۶۴۰)

اس موقع پر چاہے تاریخ اور حدیث نے نہ بتایا ہو مگر عقلا" الفاظ رسول ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ مسلمانوں کی حمایت میں فوج اسلام کی اس شکست پر حدیبیہ کی طرح حضرت کی حقانیت کے بارے میں شک و شبہ کا دور دورہ ہو گیا تھا- ورنہ اس فرمانے کی ضرورت کیا تھی کہ میں نبی ہوں- غلط گو نہیں ہوں- ۔

ایک باحمیّت خاتون کا غصہ

میدان حنین سے یہ فرار "مجاہدین اسلام" کا کتنا شرمناک تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ اتفاق سے ایک خاتون ام سلیم بنت ملحان اپنے شوہر ابو طلحہ کے ساتھ اس جنگ میں آ گئی تھیں اور ہاتھ میں "داشتہ آید بکار" کے طور پر ایک خنجر بھی لے آئی تھیں۔ وہ اس موقع پر ابو طلحہ کے اونٹ کو سنبھالے ہوئے جنگ کا نقشہ دیکھ رہی تھیں۔ رسولؐ خدا ادھر سے گذرے اور فرمایا ام سلیم! تم یہاں کہاں کھڑی ہو!

انہوں نے کہا حضور! آپ ان مشرکوں سے جنگ کیجئے اور مجھے اجازت دیجئے کہ میں ان بدنصیب مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کروں جو آپ کو چھوڑ کر بھاگے چلے جا رہے ہیں کیونکہ وہ یقیناً قتل کے مستحق ہیں۔

رسولؐ نے اس کی اس بات کو رد نہیں فرمایا کہ وہ واجب القتل ہیں بلکہ فرمایا لویکفی اللّٰہ یا ام سلیم جس کا مطلب ہماری زبان میں یہ ہوا کہ جانے دو! اے ام سلیم! اللہ ان سے سمجھے گا۔ (طبری صفحہ ۲۴۳)

انجام فتح مظفر

آخر میں شکست نے فتح کی صورت اختیار کی جس کے لئے قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

فانزل اللّٰہ سکینة علی رسوله و علی المومنین و انزل جنودا" تروها
اللہ نے اپنا سکون و اطمینان اتارا اپنے پیغمبر اور سچے مسلمانوں پر اور وہ فوجیں اتاریں جنہیں تم نے آنکھوں سے نہیں دیکھا۔

اس طرح یہ دوسرا موقع تھا کہ افواج ملائکہ رسولؐ کی نصرت کے لئے بھیجے گئے مگر جنگ بدر میں اور اس جنگ میں یہ فرق بتایا گیا ہے کہ بدر میں ملائکہ نے جنگ بھی کی تھی اور اس موقع پر صرف مسلمانوں کی تقویت قلب کے لئے ملائکہ نازل ہوئے تھے۔

بہرحال نتیجہ مشرکین کے توقعات کے اتنا خلاف نکلا کہ ان کا شدید جانی نقصان ہوا اور مسلمانوں کا نقصان نہ ہونے کے برابر رہا۔ یعنی ادھر کے ستر(۷۰) سے زیادہ قتل ہوئے اور مسلمانوں میں سے صرف چار آدمی شہید ہوئے۔ یہ معرکہ ۱۰ شوال کو وقوع میں آیا۔ (دفیتہ الاسلام صفحہ ۱۷۴)

کثرت سے لونڈی غلام اور اموال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔

(اعلام الوریٰ صفحہ ۱۳۳)

ایک روایت میں ہے کہ چار ہزار قیدی اور بارہ ہزار اونٹ اور اس کے علاوہ بے شمار نقد و جنس مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

بعض مورخین اموال غنیمت کی مقدار اس سے بھی زیادہ بتاتے ہیں' اس طرح کہ ۲۴ ہزار اونٹ چالیس ہزار سے زیادہ بھیڑ بکریاں اور تقریباً ایک من چاندی۔ (ابن الوریٰ جلد ۱ صفحہ ۱۳۳)

جنگ اوطاس و طائف

حنین کے شکست خوردہ مشرکین دو گروہوں میں بٹ گئے ۔ صحرائی عرب اور ان کے ساتھ بہت سے اور لوگ اوطاس گئے اور قبیلہ ثقیف اور ان کا ساتھ دینے والوں نے طائف میں جا کر پڑاؤ ڈالا اور دونوں گروہوں کے اپنی اپنی جگہ مورچہ بندی شروع کر دی۔ حضرت نے ابو عامر اشعری کو تھوڑی فوج کے ساتھ اوطاس کی طرف بھیجا اور انہوں نے جا کر جنگ کی یہاں تک کہ وہ شہید ہو گئے تو ان کے چچا زاد بھائی ابو موسیٰ اشعری نے علم لشکر سنبھالا اور فتح حاصل کی۔

شوال کے مہینے میں طائف کی طرف خود حضرت متوجہ ہوئے اور وہاں دس دن سے زیادہ محاصرہ رکھا۔ (تاریخ ابی الفدا جلد ۱ صفحہ ۱۵۳)

آخر کو جنگ ہوئی جس میں ان کے سردار کو حضرت علی بن ابی طالبؑ نے قتل کیا اور باقی افراد نے شکست کھائی۔

(تاریخ ابن الوردی جلد ۱ صفحہ ۱۳۳)

مال غنیمت کی تقسیم پر کچھ انصار کی برہمی
اور
پیغمبر خدا کا معجز آفرین خطبہ

اوطاس اور طائف کی مہموں کے بند ہونے کے بعد جب اطمینان حاصل ہوا تو حضرتؐ نے ان کثیر اموال غنیمت کو جو حنین سے اب تک حاصل ہوئے تھے جتنے اس کے پہلے غزوات اسلامی میں کبھی نہیں ملے تھے ان نو مسلموں پر جنہوں نے فتح مکہ میں اظہار ایمان کیا تھا تقسیم فرما دیا۔ یہاں تک کہ کافی تعداد میں ایسے لوگ تھے جنہیں سو سو اونٹ ملے۔ اس پر انصار کے ایک طبقہ میں چہ میگوئیاں ہوئیں اور بعض نے کہا کہ اپنی قوم کے لوگ مل گئے تو اب ہمارا کوئی خیال نہیں' حالانکہ مصیبت کے وقت ہمیں کام آنے والے ہیں۔

حضرت کو اس کا علم ہوا تو آپ نے حکم دیا کہ انصار سب جمع ہو جائیں اور اس مجمع میں انصار کے باہر کا کوئی آدمی نہ آئے پھر آپ غضبناک صورت سے تشریف لائے اور حضرت علیؑ آپ کے پیچھے پیچھے تھے۔ آپ نے ان کے بیچوں بیچ میں جا کر تقریر فرمائی اور ان کے پہلے کی حالت اور پھر آپ کی تشریف آوری سے ان میں جو انقلاب پیدا ہوا' اسے یاد دلایا' آپ نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے کہ میرے آنے سے پہلے تم سب ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں میں باہمی الفت پیدا کر دی؟ انہوں نے کہا بے شک ایسا ہی ہے۔ پھر فرمایا کہ کیا ایسا نہیں کہ میرے آنے سے پہلے تم اقلیت میں تھے' میرے آنے کے بعد تم اکثریت

میں ہو گئے؟ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا اور ہر بات کو وہ مانتے رہے۔
اب آپ نے انداز کلام بدلا۔ فرمایا میری بات کا تم جواب کیوں نہیں دیتے۔ انہوں نے کہا ہم کیا جواب دے سکتے ہیں؟ آپ کے احسانات تو ہم پر بے شمار ہیں۔ آپ نے فرمایا نہیں اگر تم چاہو تو میرے جواب میں یہ کہہ سکتے ہو کہ آپ ہمارے پاس اس عالم میں آئے کہ آپ کی قوم والوں نے آپ کو نکال دیا تھا اور وہ سب آپ کو جھٹلا رہے تھے' ہم نے آپ کو پناہ دی اور آپ کی تصدیق کی۔ آپ ہمارے پاس خوف و دہشت کے عالم میں آئے۔ ہماری بدولت آپ کو امن کا گوشہ ملا۔ ابھی آپ اتنا کہنے پائے تھے کہ ان میں چاروں طرف سے گریہ و زاری کی صدائیں بلند ہو گئیں اور بڑے بوڑھے اور معزز افراد دوڑ کر آپ کے ہاتھوں' پیروں اور گھٹنوں کے بوسے لینے لگے اور کہا اللہ اور رسولؐ کے فیصلہ سے ہم کہیں ناراض ہو سکتے ہیں خود ہمارے اموال بھی آپ کے اختیار میں ہیں۔ انہیں بھی آپ چاہیں تو ان قوم والوں پر تقسیم فرما دیجئے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے جنہیں یہ مال دیا ہے۔ ان کی تالیف قلب منظور تھی' اور تمہیں میں نے تمہارے خلوص و ایمان کے حوالے کیا۔ کیا تم اس سے خوش نہیں ہو کہ دوسرے لوگ بھیڑ' بکریاں' اونٹ لے کر جائیں اور تم خود رسولؐ کو اپنے حصہ میں لے کر واپس ہو۔ ظاہر ہے کہ ان الفاظ سے ان میں بالیدگی پیدا ہوئی۔ اب حضرت نے مزید سرمایہ فخر ان کے لئے فراہم کیا۔ فرمایا "انصار میرے خاص بھروسے والے ہیں۔ اگر دنیا ایک طرف جائے اور انصار دوسری طرف تو میں انصار ہی کی طرف جاؤں گا۔ خداوندا انصار کو بخش دے۔ انصار کی اولاد اور اولاد در اولاد کو بخشش سے مالا مال فرما۔

(اعلام الوریٰ صفحہ ۱۳۵-۱۳۶)

تاریخ کی صراحت ہے کہ اس پر انصار میں گریہ کا شور ہوا اور عالم یہ ہوا کہ داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں اور سب چیخ چیخ کر کہنے لگے کہ ہم پیغمبر خداؐ کو اپنے حصہ واپس لینے پر بالکل راضی و خوشنود ہیں۔

(کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۲۷۲)

جنھوں نے تفصیل سے یہ واقعہ نہیں لکھا ہے انہوں نے بھی مجملاً" پورا واقعہ اور خاص طور پر وہ جملے آخر کے جن سے انصار بہت متاثر ہوئے۔' نقل کئے ہیں۔

(ابوالفداء جلد ا صفحہ ۱۵۵)

علامہ ابن کثیر نے اس واقعہ کو اس کی مختصر اور بسیط تمام صورتوں کے ساتھ متعدد طریق سے اپنی کتاب کے چار صفحوں میں درج کیا ہے۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۳ صفحہ ۳۵۵-۳۵۹)

غزوۂ تبوک

سرزمین شام پر جو سلطنت روم میں داخل تھی، رسولؐ کے قاصد کے قتل کئے جانے اور پھر موتہ کی جنگ کے بعد سے سلطنت روم کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے تصادم کا آغاز ہو گیا تھا۔

اب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع ملی کہ قیصر روم نے فوجیں جمع کی ہیں اور مدینہ پر حملہ کا ارادہ ہے۔ چونکہ بظاہر سلطنت روم سے مقابلہ تھا جس کا تجربہ جنگ موتہ میں ہو چکا تھا اس لئے فراہمی لشکر میں غیر معمولی اہتمام کیا گیا۔ تمام قبائل عرب کے پاس جو دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے، جہاد پر ترغیب و تحریص کے لئے خطوط روانہ ہوئے، اور عتاب بن اسد کو جنہیں مکہ میں بطور گورنر مقرر کیا گیا تھا، خط بھیج کر اہل مکہ کو رومیوں سے جنگ پر آمادہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ پھر تمام مسلمانوں کو جمع کر کے حضرتؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور ان سے مالی امداد کے لئے اپیل کی گئی چنانچہ جو صاحب حیثیت افراد تھے، انہوں نے دل کھول کر امداد کی اور ایسے غریب مسلمانوں کے لئے جن کے پاس اتنا پیسہ نہ تھا کہ وہ ضروریات سفر فراہم کریں، سامان فراہم کیا گیا۔۔ اس مالی امداد میں مومنین کے ساتھ منافقین اور مولفتہ القلوب نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

خالق کو تو معلوم تھا ہی کہ اس مہم میں جنگ ہونا نہیں ہے، اس لئے میدانوں

کا سر کرنا جس کا کام تھا' اسے اس مہم میں ساتھ نہیں لے جایا گیااور مدینہ میں چھوڑ دیا۔ بس فقط چھوڑا ہی نہیں بلکہ یہ تاریخی جملہ بھی ارشاد فرمایا کہ

لابد للمدینه منی و منلؑ مدینہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ یا میں رہوں یا تم رہو۔

منافقین اور بدخواہوں کو تو چہ می گوئیوں کے لئے کچھ بہانہ چاہئے۔ انہوں نے کہنا شروع کیا کہ رسولؐ علی سے ناراض ہیں۔ اس لئے اب کی اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ یہ چرچا اتنا بڑھا کہ حضرت علیؑ کو حقیقت حال کا انکشاف رسولؐ کی زبان سے کرانے کے لئے مدینہ سے نکل کر رسولؐ کی خدمت میں جانا پڑا اور جو زخم زبان پہنچ رہے تھے' ان کے سبب سے اپنی اذیت کا اظہار کیا جس پر حضرت نے دوسرا تاریخی جملہ ارشاد فرمایا جو یکساں طور پر حدیث اور تاریخ دونوں کا جزو ہے۔

اما ترضی ان تکون منی بمنزلة هرون من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی

کیا تم اس سے خوش نہیں ہو کہ تم کو مجھ سے وہ نسبت ہے۔جو ہارون کو موسیٰ سے تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

(التنبیہ والاشراف المسعودی صفحہ ۲۳۶)

جاتے وقت والا جملہ

انه لا بد للمدینة منی اومنک

اور اب دوسرا جملہ ' ان دونوں نے ہمیشہ کے لئے آپ کے جانشین رسولؐ ہونے کی حقیقت کو نمایاں سے نمایاں کر دیا۔

حضرت حدود شام میں تبوک کے مقام پر شعبان کے آخر تک۔ ٹھہرے اور پھر ماہ رمضان کے کچھ دن وہیں گزارے۔ اس دوران میں یہ بھی نہیں کہ آپ نے ہر قل قیصر روم کو جو بقولے حمص اور بقولے دمشق میں اس وقت موجود تھا' اپنی نقل و حرکت سے بے خبر رکھا ہو بلکہ اس دوران میں آپ کی اس سے کچھ خط و کتابت رہی۔

(التنبیہ والاشراف صفحہ ۲۳۶)

یہ سلطنت روم سے بے خوفی کا عملی مظاہرہ مسلمانوں میں اخلاقی مضبوطی اور اطراف و جوانب کے لوگوں پر اسلامی طاقت کے استحکام کا اثر قائم کرنے کا ذریعہ ہوا جس سے چاروں طرف اسلام اور مسلمانوں سے مرعوبیت کا اثر پھیل گیا۔ چنانچہ ادھر سے ادھر کے چھوٹے چھوٹے صاحبان اقتدار آ آ کر پیغمبر اسلامؐ کے پاس آ کر جزیہ دینے پر تیار ہوئے۔ گویا بجائے سلطنت روم کے باجگذار ہونے کے اسلام کے باجگذار ہو گئے جن میں ایلہ اور جرباء اور اذرح کے نام تاریخ میں موجود ہیں۔

(التنبیہ والاشراف صفحہ ۲۳۶)

اس حکمت عملی کا جو رسولؐ نے یقیناً ھرنان الہٰی اختیار فرمائی تھی رسولؐ کے بعد والے فتوحات کی کامیابی میں بڑا دخل تھا اور اس سے خالق کے اس مقصد کو تقویت پہنچی جو اس نے پیغمبرؐ کو خصوصیت خاص رعب و ہیبت کی عطا فرمائی تھی، جس نے فتح و ظفر کی زمین کو دراصل آپ کے لئے اور جمہتری نتیجہ کے طور سے آپ کے نام پر آگے بڑھنے والوں کے لئے ہموار بنا دیا جس کا اظہار خود پیغمبر خداؐ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ نصرت بالرعب اللہ کی طرف سے میری مدد رعب و ہیبت کے ہوتی رہے"۔

رسولؐ خدا کی جان لینے کا منصوبہ

مخالفین اسلام اب پیغمبر خداؐ کے فتوحات سے چوندھیا گئے تھے سلطنت روم کے مقابلہ میں پیغمبرؐ خدا کی بذات خاص تشریف لے جانے کے سابق جنگ موتہ کا انجام دیکھتے ہوئے انہیں بڑی امید وابستہ تھی کہ اس جنگ سے رسولؐ زندہ سلامت واپس نہیں آ سکتے لیکن انہیں بڑی مایوسی ہوئی جب آپ کو سرزمین مقبوضہ روم میں کافی طولانی قیام کے بعد بھی کوئی گزند نہ پہنچا اور آپ صحیح و سالم اپنے مستقر کی طرف واپس تشریف لے جا رہے ہیں تو اب انہوں نے طے کر لیا کہ ہم رسولؐ کو زندہ واپس جانے نہیں دیں گے۔ اس کے لئے انہوں نے منصوبہ بنایا کہ تاریکی شب میں جب آپ پہاڑ کی گھاٹی سے گذر رہے ہیں تو ایسی ترکیب کریں کہ آپ گہرے کھڈ میں گر جائیں۔

قدرت کی لاسلکی سے رسولؐ کو اس کا علم ہو گیا۔ چونکہ یہاں سے دو راستے تھے۔ ایک ذرا دور کا میدانی راستہ تھا اور ایک نزدیک کا گھاٹی کا راستہ تھا۔

حضرتؐ نے عام مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ میدانی راستے سے جائیں کہ اس میں بہت سے آدمی ایک ساتھ گزر سکتے ہیں اور حضرتؐ خود اس گھاٹی کے راستے سے روانہ ہوئے۔

تمام مسلمان اس میدانی راستے کی طرف مڑ گئے مگر یہ لوگ جنہوں نے منصوبہ بنایا تھا' آپ کے پیچھے اسی راستے سے چلے۔ حضرتؐ نے جناب حذیفہ یمانی اور عمار بن یاسر کو حکم دیا کہ وہ پازیادہ ساتھ چلیں۔ عمار ناقہ کی مہار ہاتھ میں لیں اور حذیفہ پیچھے سے اسے ہنکائیں اس دوران میں پیچھے سے ان لوگوں کے مرکبوں کے پیروں کی آہٹ ملی' جنہوں نے پیغمبر خداؐ کے حکم کے خلاف عمل کرکے وہ راستہ اختیار نہیں کیا تھا اور اپنے منصوبہ کے تحت آپ کے ساتھ ساتھ آئے تھے۔

حضرتؐ اس عدول حکمی پر غضبناک ہوئے اور حذیفہ کو حکم دیا کہ جا کر ان لوگوں کو واپس کرو' وہ حضرتؐ کے حکم سے ایک خاص قسم کی لاٹھی لئے ہوئے بڑھے اور ان کے مرکبوں کے منہ پر وہ لاٹھی مار مار کر انہیں پیچھے کی طرف موڑا اور ان لوگوں کو دیکھا کہ وہ ڈھاٹا باندھے' منہ چھپائے ہوئے ہیں۔

مثل مشہور ہے کہ "چور کا دل ہی کتنا ہوتا ہے" حذیفہ کے اس طرح لاٹھی مار مار کر بھگانے سے وہ سمجھے کہ ان کا منصوبہ کھل گیا ہے اور ان پر رعب ایسا چھایا کہ وہ بے تحاشا بھاگ کر فوری فوج میں جو کہ دوسرے راستے سے جا رہی تھی' جا کر اس کے سر میں شامل ہو گئے۔ حذیفہ واپس آئے۔ رسولؐ نے فرمایا اے حذیفہ! پس اب تم مرکب کو تازیانہ لگا کر تیزی سے بڑھا اور تم عمار! پا پیادہ چلو اور اب آپ بہت سے لوگوں کے ساتھ اس راستے کو طے کرکے گھاٹی سے باہر نکل کے فوج کے باقی لوگوں کا انتظار فرمانے لگے جو اس طولانی راستے سے آ رہے تھے اور ابھی یہاں نہیں پہنچے تھے۔ حضرتؐ نے حذیفہ سے فرمایا کہ تم نے پہچانا کہ یہ لوگ کون تھے؟ انہوں نے عرض کیا وہ لوگ خود تو ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے اس

لئے پہچانے نہیں جا سکتے تھے مگر میں فلاں فلاں شخص کے مرکب کو پہچانتا ہوں۔ فرمایا جانتے ہو؟ ان کا منصوبہ کیا تھا؟ انہوں نے کہا نہیں' یا رسول اللہؐ! فرمایا ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ میرے پیچھے پیچھے آئیں اور جہاں راستہ تنگ ہو اور انہیں موقع ملے وہ مجھے کھڈ میں گرا دیں۔ حذیفہ اور عمار نے کہا۔ پھر یہ لوگ تو یا رسول اللہؐ واجب القتل ہیں۔ جب آپ کے پاس آئیں تو ان کی گردن مارنے کا حکم دے دیجئے۔ فرمایا نہیں' مجھے یہ پسند نہیں کہ لوگوں میں ایسا چرچا ہو کہ محمد اپنے اصحاب کو قتل کراتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا تم دونوں ان اشخاص کے ناموں کو راز میں رکھنا اور اعلان نہ کرنا۔

تاریخ کے علاوہ کتب رجال اور حالات صحابہ کی کتابیں بتاتی ہیں کہ اس واقعہ کی وجہ سے حذیفہ صاحب سر رسول اللہ یعنی پیغمبرؐ کے راز کے حامل کہے جاتے تھے اور انہوں نے عمر بھر رسولؐ کی ہدایت پر عمل کیا اور ان لوگوں کی شخصیت کا اظہار نہیں کیا۔

خود اس سے بھی ظاہر ہے کہ یہ لوگ بس وہ عبداللہ ابی راس المنافقین کی پارٹی کے افراد نہ تھے جن کا نفاق عموما" طشت از بام ہو چکا تھا' بلکہ ان میں کچھ معزز شخصیتیں شامل تھیں جن پر پردہ پڑا ہوا تھا اور تاریخ میں تابعین میں کے ایک بڑے وسیع النظر محدث اور مورخ اعمش کا صراحتا" یہ قول ہے کہ یہ بارہ آدمی تھے جن میں سات قریش میں کے تھے۔

(اعلام الوریٰ صفحہ ۱۱۶)

مسعودی نے اس واقعہ کو مجملا" اس طرح نقل کیا ہے کہ۔

فی انصرافه من هذه الغزلة هم عدة من المنافقين با عتياله صلى الله عليه وسلم ليلا والقائه فى السنة و هم المعروفون باصحاب العقبة فحال اللّٰه بنيه و بين ما اراد و انبيه و ظهره عليهم و قد اتينا على شرح خير هم و اسمائهم فى كتاب (الاستذكار) عنه ذكرنا هذه العزة

اس غزوہ سے واپسی میں کچھ منافقوں نے رات کے وقت بے خبری میں آپ کی جان لینے کا اور آپ کو کھڈ میں ڈالنے کا ارادہ کیا۔ اور یہ جماعت تاریخ میں اصحاب عقبہ (گھاٹی والے لوگ) جو نام سے مشہور ہے مگر اللہ ان کے مقصد میں سد راہ ہو اور اس نے آپ کو ان منصوبوں سے مطلع کر دیا اور ہم نے ان کے واقعہ کی تفصیل اور ان کے نام کتاب الاستنکار میں اس غزوہ کے حالات میں درج کئے ہیں۔

التنبیہ الاشراف صفحہ ۲۳۶)

افسوس ہے کہ مورخ مذکور کی کتاب "الاستنکار" جس کا انہوں نے حوالہ دیا ہے ہمارے علم میں اب اس کا کہیں وجود نہیں ہے اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان ناموں کی فہرست کیا ہے؟

پھر ایک بات یہ قابل غور ہے کہ جب ان ناموں کا حذیفہ کے سینہ میں بطور راز رہنا ہمیں متواتر معلوم ہے تو یہ فہرست کسی راوی کی اپنے ذہن اور قیاس سے مرتبہ کی ہو سکتی ہے جس کا فنی طور پر کوئی وزن بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ایک عجیب بات بعض کتابوں میں یہ درج ہے کہ حضرت عمرؓ نے کئی بار حذیفہ سے پوچھا کہ میں تو اس گروہ میں نہ تھا؟ اور انہوں نے ان کے چھیڑنے کے باوجود سختی کے ساتھ رسولؐ کے راز کو راز رکھا اور ہمیشہ اس سوال کے جواب سے مناسب انداز میں کترا گئے اور کوئی وضاحت نہیں کی۔

مراجعت۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ مدینہ واپس تشریف لائے جس پر حضرت کے الفاظ میں ایک خاص اظہار مسرت کی کیفیت محسوس ہوتی ہے ممکن ہے وہ اس لئے بھی ہو کہ عام طور پر منافقین اس مہم کو بڑا پر خطر محسوس کرتے تھے اور آپس میں کہتے تھے کہ اب یہ زندہ واپس تھوڑی آئیں گے اور ممکن ہو انہیں منصوبہ کے ناکام ہونے کا بھی احساس ہو جو آپ کی جان لینے کے لئے کیا تھا اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ مدینہ میں آنے کے بعد شائد اتنی طولانی جدائی مدینہ سے اب تک نہیں ہوئی تھی جتنی

اس مرتبہ ہوئی اور پھر اس میں انصار کی دلجوئی بھی تھی کہ مجھے تمہارا ہی شہر پسند ہے چنانچہ جب آپ داخل ہو رہے تھے تو خوش ہو کر فرمایا " هذه طيبة " لو یہ طیبہ کی سرزمین آ گئی۔ اور کوہ احد کی طرف اشارہ کرکے فرمایا اس پہاڑ کو ہم سے محبت ہے اور ہم کو اس سے محبت ہے۔

(اعلام الوریٰ صفحہ ۱۳۱)

ہمارے نزدیک ان باتوں کو اس گفتگو کا تتمہ سمجھا جا سکتا ہے، جو مال غنیمت کی تقسیم پر کچھ انصار کے اظہار ناگواری کے موقع پر ہوئی تھی، جب حضرت نے فرمایا تھا کہ وہ مال و دولت لے کے واپس ہوں گے اور تم خود رسولؑ کو اپنے ساتھ لے کر واپس جاؤ گے تو تمہارے نزدیک کون نفع میں ہے؟

اب تمام کیفیات سے اس کا اظہار ہو رہا تھا کہ آپ کو اب مکہ سے وہ وابستگی نہیں ہے جو مدینہ سے قلبی لگاؤ ہے۔

تاریخ کی صراحت ہے کہ یہ تبوک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا آخری غزوہ تھا اور عام مسلمان تو اس وقت اس شدت کی گرمی میں اس دور دراز کے سفر کی اہمیت محسوس نہیں کر رہے تھے مگر آج مورخ اس کی قدر و قیمت محسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تبوک کی مہم میں ہمت و عزم کے ساتھ روم کی سرحد پار کرکے ان کے قلمروئے مملکت میں اتنے طویل عرصہ تک قیام اور اطراف و جوانب کے امیروں کے سر اطاعت خم کرنے سے جزیرہ نمائے عرب یا قلمرو اسلامی کو کسی حملہ کا خطرہ نہیں رہا۔

(حیوٰۃ محمد۔ محمد حسین ہیکل مطبوعہ مصر ۱۳۵۴ھ صفحہ ۱۴۶)

ایک بڑے موذی سے چھٹکارا

بتوک سے حضرتؐ کی واپسی کے بعد راس المنافقین عبداللہ بن ابی کی موت ہو گئی اور مسلمانوں کو اس بہت بڑے "مار آستین" سے نجات ملی۔

تبلیغ سورۂ برائت

سن ۹ ھ میں سورہ برائت اترا جس میں آئندہ سے مشرکین کا داخلہ مکہ میں بند کیا گیا تھا۔ تاریخ و حدیث کی متفق علیہ حقیقت ہے کہ پہلے رسول خداؐ نے سورہ کی ان آیات کو حضرت ابوبکرؓ کے سپرد کیا اور پھر پیغام ربانی کی بناء پر آپ نے ان سے واپس لے کر حضرت علیؑ کے سپرد کیا۔ اس پیغام کے الفاظ کیا تھے؟ ایک روایت یہ ہے کہ اس میں نام کی صراحت تھی کہ ان آیتوں کو یا آپ پہنچایئے یا علیؑ ابن ابی طالبؑ۔

(اعلام الوریٰ صفحہ ۱۳۱)

دوسری روایت یہ ہے کہ پیغام یہ تھا کہ۔

لا یبلغ هذا الا انت او رجل من اهلك

اسے بس یا تو آپ خود پہنچایئے یا ایسا شخص جو آپ کے اہل میں سے ہو۔

(تاریخ یعقوبی طبع بیروت ۱۳۷۹ھ ۱۹۶۰ء صفحہ ۷۶)

اگر یہ لفظیں ہیں تب بھی عمل رسولؐ سے ثابت ہوا کہ "اہل" کا عنوان پہلی فرد پر منطبق نہ تھا۔ حضرت علیؑ ہی اس کے مصداق ہو سکتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اس کے لئے حضرت علی ہی ایسا جری اور فصیح اللسان خطیب ہونا چاہئے تھا اور پھر ایسا جس کی ہیبت ان کے دلوں پر قائم ہو کہ وہ اس وقت کی

دنیائے شرک کے حلقہ میں کھڑے ہو کر صرف سورہ کی تلاوت ہی نہ کرے بلکہ بحیثیت ذمہ دار مفسر کے خود اپنے لفظوں میں پر ہیبت "حکم نادری" کیا؟ "فرمان جبروتی" سنا دیں جسے مصری مورخ نے اس طرح لکھا ہے کہ۔

وقف علی فی الناس و هم یودون مناسك الحج فتلا علیهم هذه الایات من سورة التوبة فلما اتم تلاوتها وقف هنیهة ثم صاح بالناس - ایها الناس - ایها الناس انه لا یدخل الجنة کافر ولا یحج بعد العام مشرک ولا یطوف بالبیت غریق و من کان له عند رسول اللهٔ عهد الی مدته۔ صاح علی با الناس بهذه الاوامر الاربعة ثم اجل الناس لربعة اشهر بعد ذلک الیوم فیرجع کل قوم الی ما منهم و بلادهم و من یومئذ لم یحج مشرك و لم یطف بالبیت عریان و من یومئذ و ضع الاساس الذی تقوم علیه الدوله الاسلامیة

حضرت علیؓ مجمع میں کھڑے ہوئے جب کہ وہ لوگ مناسک حج ادا کر رہے ہیں تو آپ نے سورہ توبہ کی ان تمام آیتوں کو پڑھ کر سنایا۔ جب تلاوت ختم کر چکے تو ذرا دیر رک کے پھر بلند آواز سے مجمع کو مخاطب کیا اے لوگو! (مجمع مخاطب ہوا تو فرمایا' اے لوگو! یقین مانو کہ بہشت میں کوئی کافر نہیں جائے گا اور اس سال کے بعد سے کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور اب خانہ کعبہ کا کوئی برہنہ طواف نہیں کرے گا اور جس کا پیغمبر خدا سے کوئی معاہدہ ہو وہ بس اتنی مدت تک کے لئے۔

حضرت علیؓ نے چیخ چیخ کر یہ چار حکم سنائے پھر ان تمام لوگوں کو آج کے بعد سے چار مہینے کی مہلت دی کہ ہر گروہ اپنے مقام اور اپنے ملک تک جہاں سے آئے تھے وہاں واپس پہنچ جائیں اور بس آج کے دن پھر کسی مشرک نے حج نہیں کیا اور کسی نے برہنہ حالت میں کعبہ کا طواف نہیں کیا اور آج کے دن سے وہ بنیاد قائم ہوئی جس پر اسلامی حکومت کی عمارت قائم ہوئی۔

پھر لکھتے ہیں۔

والحرص علی ان یدوك العرب جمیعا هذا الاساس هوالذی دعا

عليا الى ان لا يكتفى بقرائة هذه الايات من براء ة يوم الحج على ما اتفقت عليه الروايات بل جعل يقرؤها على الناس من بعد ذالك فى منازلهم على ما جاء ت به روايات كثيرة

اور خواہش کرتا ہوں کہ تمام عرب اس بنیاد کو سمجھ لیں حضرت علیؓ کے لئے یہ بات ہوئی کہ انہوں نے صرف سورہ برائت کے ان آیات کو پڑھ دینے پر اکتفا نہیں کیا جس پر تمام روایتیں متفق ہیں بلکہ جیسا کہ بہت سی روایتوں میں ہے' وہ گھروں پر جا جا کر لوگوں کے سامنے ان آیتوں کو پڑھ پڑھ کر سنانے لگے۔

(حیات محمدؐ - محمد حسین ہیکل مطبوعہ قاہرہ ۱۳۵۴ھ ص ۴۵۷-۴۵۸)

بیرونی قبیلوں پر ان فتوحات کا اثر

ان پے در پے فتوحات کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کی دھاک اطراف و جوانب کے قبیلوں پر بیٹھ گئی چنانچہ قبیلہ بنی ثقیف کی ایک ممتاز شخصیت عروہ بن مسعود ثقفی نے آ کر اسلام قبول کیا اور اس کے بعد وہاں کے دس آدمی عمائد میں سے آ کر مسلمان ہوئے جس کا اثر پورے قبیلہ پر پڑا۔

اب نجد کے بنی تمیم کے سرکش لوگ اور بڑے بڑے رؤساء عطاء ابن حاجب۔ زرقان ابن بدر۔ قیس بن عاصم۔ عینہ بن حصن فزاری اور عمرو بن ایتم بھی آ کر مسلمان ہوئے۔

بنی طے کا وفد آیا جس میں زید الخیل اور عدی بن حاتم تھے۔ ابن اسحاق کی روایت یہ ہے کہ پہلے حاتم طائی کی بیٹی اسیر ہو کر آپ کے پاس آئی۔ آپ نے اس کے باپ حاتم کی ضرب المثل فیاضی کی بنا پر اس کی بیٹی کی بڑی عزت کی اور غیر معمولی مراعات سے کام لیا' جس کا اس کے دل پر اثر پڑا اور اس نے جا کر اپنے بھائی عدی بن حاتم کو آپ کی خدمت میں بھیجا۔ اس کا حضرت نے اتنا اعزاز و اکرام کیا کہ اپنے ہاتھ سے مسند کے طور پر ایک گدا اس کی طرف بڑھایا کہ وہ اس پر بیٹھے۔

(تاریخ طبری صفحہ ۱۷۱۰ زاد المعاد ابن قیم جلد ۲ صفحہ ۲۰۵)

بعض مورخین نے صراحتاً لکھا ہے کہ حضرت خود زمین پر بیٹھے اور اسے مسند پر بٹھایا۔

(زاد المعاد ابن قیم جلد ۲ صفحہ ۲۰۵)

اس نے بہ طیب خاطر اسلام قبول کیا۔

ظاہر ہے کہ یہ تو حالات کا دباؤ تھا جو یہ سب اسلام لا رہے تھے مگر ہر ایک کی قلب ماہیت ایک دم تھوڑی ہو سکتی ہے چنانچہ عمر بن مبدی کرب ایک بڑا نامی گرامی سورما عرب کا وہ بھی آکر دائرہ اسلام میں داخل ہوا مگر تھوڑی ہی دیر میں ایک مسلمان کا گلا پکڑے ہوئے پیغمبر خداؐ کے سامنے لایا اور کہا اس بدمعاش نے میرے باپ کو قتل کیا تھا' اس سے میری داد دلوایئے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصول اسلامی کے مطابق جواب دیا کہ جو کچھ جاہلیت میں ہو چکا' اس کا بدلہ اسلام اختیار کرنے کے بعد نہیں لیا جا سکتا۔ یہ سن کر وہ برہم ہوا اور دوبارہ اسلام سے منحرف ہو گیا اور لوٹ مار میں مصروف ہو گیا جس کی سرکوبی کو حضرت علی بھیجے گئے' جس پر پہلے تو اس نے بڑا طنطنہ دکھلایا' پھر اس کے کچھ ساتھی قتل اور عورتیں' بچے اسیر ہوئے تو اس نے راہ فرار اختیار کی اور دوبارہ آکر مسلمان ہوا۔

(اعلام الوریٰ صفحہ ۱۳۴)

واقعہ مباہلہ

انہی وفود کے سلسلے کی ایک اہم کڑی اہل نجران کا وفد ہے جس کے ذیل میں مباہلہ کا واقعہ وقوع میں آیا۔

یمن میں مقام نجران عیسائیوں کا مرکز تھا۔ یہاں کے لوگوں نے پہلے خط و کتابت کی اور پھر اپنے پادریوں اور راہبوں کا ایک وفد مرتب کرکے روانہ کیا۔

یہ لوگ اس تصور میں کہ وہ بڑے عرب کے صاحب اقتدار کے پاس جا رہے ہیں تو انہیں وہ لباس پہن کر جانا چاہئے جو بادشاہوں کے دربار کے لائق ہے۔ حریر و دیبا کے کپڑے پہن کر رسولؐ کے پاس حاضر ہوئے۔

یقیناً اگر یہ قیصرو کسریٰ کے نمائندے ہوتے اور یہ ریشم وغیرہ کا لباس ان کا عام لباس ہوتا تو حضرتؐ اس لباس کے ساتھ ان سے گفتگو میں توقف نہ فرماتے مگر چوں کہ وہ اپنے معیار کے مطابق روحانی جماعت کے افراد تھے جنہیں پر تکلف لباس سے بذات خود کوئی سروکار نہیں تھا بلکہ وہ حضرتؐ کو ایک دنیوی بادشاہ تصور کرکے اپنے خیال کے موافق آپؐ کے دربار کے تقاضوں کے لحاظ سے اس لباس کو پہن کر آئے تھے' لہٰذا اس لباس کے ساتھ حضرتؐ کا مظاہرہ اخلاق فرمانا ان کی غلط فہمی کے پردہ کو چاک کرنے کا باعث نہیں ہو سکتا تھا اور بتقاضائے منصب رسالت آپؐ کو ان کی اس غلط فہمی کے دور کرنے کی ضرورت تھی لہٰذا جب وہ اس لباس

میں حضرتؐ کے پاس آئے تو حضرت نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ فرمائی۔

چونکہ حضرت کے محاسن اخلاق کا تذکرہ وہ بتواتر سنے ہوئے تھے، اس لئے اس بے رخی کا جو ان کے ساتھ ہوئی، سبب تلاش کرنے کی انہیں فکر ہوئی جس کے لئے پہلے اصحاب سے معلوم کرنا چاہا مگر وہاں مطلب برآوری نہ ہوئی انہی کے کہنے سے حضرت علی ابن ابی طالب سے رجوع کیا، یا یہ کہ انہیں اصحاب کے ان کی اس صورتحال کے بارے میں حضرت علیؑ سے دریافت کیا۔

(زاد المعاد ابن قیم جلد ۲ صفحہ ۳۹)

آپ نے اس راز کی نشاندہی کی کہ تم اس لباس میں جو رسولؐ کے پاس آئے تھے، اس کی وجہ سے حضرتؐ نے تم سے اس طرح بے رخی اختیار فرمائی۔ اسے ان کے ضمیر نے قبول کیا اور انہوں نے ان کپڑوں کو اتار کر اپنے عام زاہدانہ لباس پہنے اور اب رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرتؐ نے کشادہ پیشانی کے ساتھ ان سے گفتگو فرمائی اور اب انہوں نے حضرتؐ سے دینی مسائل اور خصوصیت کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اسلامی تصور کو دریافت کیا۔ سورۂ آل عمران کا زیادہ حصہ اسی واقعہ سے متعلق ہے۔ طویل گفتگو کے بعد اس سلسلے کی آخری کڑی پیش آئی وہ یہ کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے لئے کوئی باپ نہ ہونے کو ان کے لئے خدا کے بیٹے ہونے کا ثبوت قرار دیا تو قرآن مجید کی یہ آیت اتری کہ۔

ان مثل عیسیٰ عند اللّٰہ کمثل آدم خلقه من تراب ثم قال له کن فیکون عیسیٰ کی مثال تو اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے انہیں تو مٹی سے پیدا کیا پھر اشارہ قدرت ہوا کہ وجود میں آجائیں تو وہ وجود میں آگئے۔

اس کے بعد وہ لاجواب تو ہو گئے مگر ماننے کے لئے پھر بھی تیار نہیں ہوئے۔

تو قرآن مجید کی یہ آیت اتری۔

فمن حاجك فیه من بعد ما جائك من العلم فقل تعالوا ندع ابنائنا و ابنائکم و نسائنا و نساء کم و انفسنا و انفسکم ثم نبتهل فنجعل لعنة اللّٰه علی الکٰذبین

اب جو ان علمی دلائل کے بعد بھی حجت کرتا رہے تو کہہ دیجئے کہ آ جاؤ، ہم دونوں فریق اپنے اپنے بیٹوں کو بلائیں اور اپنی اپنی عورتوں کو اپنے اپنے نفوس کو پھر اللہ سے لو لگا کر اللہ کی لعنت قرار دیں جھوٹوں پر۔

چنانچہ دوسرے دن موقف مباہلہ میں حضرت تشریف لائے ان چار ہستیوں کو ساتھ لئے ہوئے جن کو رسولؐ کے ساتھ ملا کر مسلمانوں میں محاورہ "پنجتن پاک" کا ہو گیا ہے۔ وہ ہیں علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ کہا جاتا ہے کہ ان کے سب سے بڑے مذہبی رہنما نے اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا تھا کہ دیکھو! کل اگر محمدؐ اپنے اصحاب یعنی پیرووں کی جماعت کو ساتھ لے کر آئیں تو مباہلہ کر لینا لیکن اگر اپنے گھر والوں کو ساتھ لے کر آئیں تو کبھی مباہلہ نہ کرنا۔

جب یہ حضرات رسولؐ کے ساتھ آئے، نصاریٰ نے دریافت کیا یہ کون ہیں؟ اور معلوم ہوا کہ یہ سب ان کے دل کے ٹکڑے ہیں۔ ایک انتہائی عزیز بیٹی، دوسرے گود کے پالے چچا زاد بھائی اور داماد یعنی اسی بیٹی کے شوہر ہیں اور دو نواسے ہیں اسی بیٹی کے بچے ہیں۔ بس انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ ہم مباہلہ نہیں کریں گے۔ اور وہ جزیہ دینے کے لئے تیار ہو گئے جس کے لئے ایک دستاویز مصالحت کی لکھی گئی اور وہ اس معاہدہ کی تکمیل کے بعد واپس چلے گئے۔

فتح یمن

مباہلہ کی روحانی جنگ میں رسول اسلامؐ کی فتح جس میں حضرت علی ابن ابی طالب کی شخصیت امتیازی طور پر مخالف حلقوں میں نمایاں ہو گئی تھی' اس کا اثر پورے یمن پر پڑنا ضروری تھا اور یہ خدا اور رسولؐ کی حکیمانہ موقع شناسی ہے کہ اس اصول کے مطابق کہ لوہے پر ضرب اس وقت لگاؤ جب وہ گرم ہو' فوراً انہی حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو دعوت اسلامی کے لئے یمن بھیج دیا گیا۔

وہی اسلامی سورما جو بدر و احد و خندق و خیبر کے خونریز فتوحات میں عسکری فتح کا نشان بن گیا تھا' اب مباہلہ کے بعد بغیر تلوار کے جنگ میں بھی فتح و ظفر کا نشان ثابت ہوا' چنانچہ یمن میں علیؑ فتح کے لئے کھینچی ہوئی تلوار لے کر نہیں گئے' نہ فوج و لشکر ساتھ لے گئے۔ بلکہ صرف تیغ زبان اور کردار کا لشکر ساتھ لئے ہوئے تشریف لے گئے جس کے نتیجہ میں پورا ملک یمن چند روز میں فتح ہو گیا۔

تاریخ کی صراحت ہے کہ آپ نے بس رسولؐ کا خط پڑھ کر سنایا جو ظاہر ہے کسی تمہیدی تقریر کے ساتھ ہوگا اور ایک دن میں پورے قبیلہ ہمدان نے اسلام قبول کیا۔

(تاریخ ابو الفدا جلد ا صفحہ ۱۵۸)

اور اسطرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعد کے مسلمانوں کے لئے ایک مثال

قائم کر دی کہ اسلام یں فتح ممالک کا مفہوم کیا ہے؟ اس کے خلاف جو ہو عسکری طاقت سے، وہ کسی ملک کی سابقہ حکومت کے مقابلہ میں، مسلمانوں کی فتح ہو سکتی ہے۔ اسلام کی فتح اسے نہیں کہا جا سکتا۔

یمن کا قبیلہ ہمدان جس نے اس موقع پر حضرت علیؑ کی دعوت پر لبیک کہی تھی، یہ اس کے بعد بھی ہمیشہ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کا جاں نثار رہا۔ اور ان جنگوں میں جو آپ کو اپنے مخالفین سے لڑنا پڑیں، یہ قبیلہ آپ کا بڑا مضبوط بازو تھا۔

یہ اس وقت بھی جب اسلام لایا تھا، اتنا نمایاں امتیاز رکھتا تھا کہ بخاری کی روایت کے مطابق جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کا وہ خط جس میں وہاں کی روئیداد درج تھی پڑھوا کر سنا تو بے ساختہ پہلے سجدہ شکر میں سرزمین پر رکھا اور پھر سر اٹھایا تو فرمایا۔

علی همدان السلام

(طبری صفحہ ۱۷۳۲ - اعلام الوریٰ صفحہ ۱۳۷)

پھر حضرت علی نے اپنے دور میں متعدد بار نظم و نثر میں اس قبیلہ کو اس طرح سند وفاداری دی ہے جس کو سن کر آج جیسے ہمارا دل بھی پکار اٹھتا ہے کہ

علی همدان السلام

حجتہ الوداع

ہجرت کا دسواں سال یہی بعد میں رسولؐ کی زندگی کا آخری سال ثابت ہوا۔ اسی سال کے آخر میں یہ حج ہوا جس کے بعد پیغمبر خداؐ مدت کم وار دنیا میں زندہ رہے اس لئے اس حج کا نام بعد میں "حجتہ الوداع" ہو گیا جیسا کہ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ۔ خواہ اس لئے کہ آپ کو اس کے بعد پھر کوئی حج کرنے کا موقع نہیں ملا تو گویا آپ کی کعبہ سے رخصت تھی اور یا یہ کہ آپ نے مسلمانوں کو "الوداع" کہا اور یہ اطلاع دی کہ اب میں دنیا سے جانے والا ہوں۔

(اعیان الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۳۲۹)

بہرصورت اس سال کا جب ذیقعد کا مہینہ ہوا تو پیغمبر خداؐ نے حج کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ یہ ہجرت کے بعد سے آپ کا پہلا حج تھا۔ ہجرت سے پہلے آپ کا قیام ہی مکہ معظمہ میں تھا لہٰذا بلا شبہ آپ نے حج کیا تھا مگر ہجرت کے بعد سے ابھی تک آپ کے مکہ معظمہ کی طرف دو تین سفر تو ہوئے مگر وہ زمانہ حج میں نہ تھا اس لئے انہیں اصطلاحی طور پر عمرہ کہنا درست ہے۔ حج کہنا صحیح نہیں ہے۔ حج جس کا نام ہے وہ اب کی بار ہو رہا تھا۔

تمام مسلمانوں میں اس کا اعلان ہو گیا اور یہ خبر اطراف وجوانب میں بھی پھیل گئی، تو ادھر ادھر کی بھی مخلوق کثرت سے پیغمبر خداؐ کے ساتھ فریضہ حج کو

انجام دینے کے لئے امنڈ پڑی اور ۲۴ یا ۲۵ ذیقعد کو حضرت مدینہ منورہ سے اس جم غفیر کے ساتھ روانہ ہوئے۔

(ارشاد شیخ مفید صفحہ ۷۹ اعلام الوریٰ صفحہ ۱۳۸)

ابھی حضرت علیؑ یمن سے واپس نہیں آئے تھے۔ وہیں آپ کو حضرتؐ کے منصوبہ حج کی اطلاع ملی تو آپ براہ راست وہاں سے قربانی کے جانوروں کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ جب حضرت رسول خداؐ مکہ میں پہنچے اور طواف اور سعی فرما چکے تو حکم الہی اترا۔

و اتموا الحج والعمرة للّٰہ الخ

اس آیت سے حج تمتع کا قانون نافذ ہوا اور حضرتؐ نے اعلان فرمایا کہ بس اب آج سے عمرہ حج کا جز بن گیا۔ دریافت کیا گیا' یہ حکم اسی سال ہے یا ہمیشہ کے لئے یہ حکم ہے' تو حضرت نے زور دے کر کئی کئی دفعہ فرمایا کہ یہ ہمیشہ کے لئے ہے۔ عمرہ حج کا جز قیامت تک کے لئے ہے۔

(الدرر صفحہ ۲۷۸)

بے شک جیسا کہ قرآن مجید میں صراحت ہے کہ یہ حج تمتع کا حکم..... ان کے لئے ہے جو دور' دراز سے مکہ آئیں۔ وہ پہلے عمرہ کرکے اس کے احکام بجا لائیں پھر اس احرام کو ختم کر دیں جس کے ساتھ تمام پابندیاں جو علیحدہ تھیں' وہ ختم ہو جائیں گی۔ پھر مقررہ تاریخوں پر حج کا احرام باندھیں اور یہی حج تمتع کا طریقہ ہے جو فقہ جعفری میں دور والوں کے لئے لازمی طور پر معین ہے۔ اور اہل سنت بھی اسے درست سمجھتے ہیں' اس لئے زیادہ تر اس پر عامل ہیں۔

بعض اصحاب کے دل کو یہ بات اسی وقت نہیں لگی اور اس پر معترضانہ جملے زبان پر لائے جس پر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم اس حکم پر کبھی ایمان نہیں لاؤ گے۔

(ارشاد صفحہ ۸۱)

اس حج کی ایک بڑی خصوصیت کا اعلان رسولؐ نے ان الفاظ میں فرمایا کہ۔

ان الزمان قد استدار کھیئة یوم خلق السموات والارض

دیکھو اب زمانہ گردش کرکے اس نقطہ پر آ گیا ہے جس صورت پر وہ آسمان و زمین کی خلقت کے دن تھا۔

اس ارشاد پیغمبرؐ میں وحی زبانی کے ان الفاظ پر نظر ہے جو کسی کی ممانعت سے قبل بطور تمہید ارشاد ہوئے تھے کہ۔

ان عدة الشھور عند اللّٰہ اثنا عشر شھرا یوم
خلق السموات والارض منھا اربعة حرم

یقیناً مہینوں کی تعداد اس دن سے کہ جب آسمان و زمین کی تخلیق ہوئی تھی، اللہ کے نزدیک بارہ ہے۔ ان میں سے چار محترم مہینے ہیں۔

اب اس آیت کی روشنی میں ارشاد رسولؐ کی تشریح مصر کے ایک مفکر نے اس طرح کی ہے کہ۔

وہ لوگ جو بھی عمل اختیار کرتے یعنی مہینوں کے تعین میں گڑ بڑ۔ اس کی دو صورتیں تھیں۔ ایک محرم کو آگے بڑھا کر صفر میں رکھنا۔ یہ اس وقت ہوتا تھا جب محرم میں غارت گری کے مواقع حاصل ہوں تو اگر اس مہینہ کو محرم مان لیں تو یہ مواقع ہاتھ سے نکل جائیں لہٰذا وہ اس وقت جو کچھ انہیں لوٹ مار کرنا ہے، وہ کرکے، دوسرے مہینہ میں محرم مناتے تھے جس میں جدال و قتال کو حرام قرار دیتے تھے۔

دوسرے حج کے مہینہ میں دن بڑھا کر شمسی حساب کے مطابق لاتے تھے اور اسے ہر سال ۱۱ دن یا اس سے کچھ زیادہ آگے بڑھاتے تھے جس کا دورہ ۳۳ برس میں پورا ہوتا تھا تو پھر وہ تاریخ اپنے اصل وقت میں پڑ جاتی تھی یعنی جب قدرتی حساب سے ۱۰ ذی الحجہ ہونا چاہئے اسی دن وہ دس ذی الحجہ ہوتی تھی۔ حجتہ الوداع وہ سال تھا جس میں حج اپنے اصلی دن میں ہوا تھا تو حضرتؐ نے نسی کے عمل درآمد کو ختم کرتے ہوئے اب فرمایا کہ اس سال سے حساب اسی معیار پر آ گیا ہے جس معیار پر خلقت آسمان و زمین کے وقت سے حساب چل رہا تھا۔

حج کی مفصل کیفیت

چونکہ اس کے پہلے دور رسالت میں حج نہیں ہوا تھا اور نہ اس کے بعد رسول ؐ کو اپنی زندگی میں حج کا موقع ملا' اس لئے اس حج کی کیفیت کو راویوں نے پورے جزئیات کی تفصیل کے ساتھ محفوظ کیا اور ایک دوسرے سے بڑے وجد وکیف کے ساتھ بیان کرتے رہے اور پھر محدثین نے اپنی کتابوں میں اسی تفصیل کے ساتھ درج کیا۔

یہاں ہم اس کی مفصل کیفیت کو علامہ ابن عربی کی کتاب "محاضرۃ الابرار" مطبوعہ مصر جلد ا صفحہ ۱۹ سے نقل کرتے ہیں۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ مکہ کے قصد سے شجرہ کی راہ سے روز پنجشنبہ ۲ ذیقعد سن ۱۰ ھ کو روانہ ہوئے۔

یہ شجرہ کا راستہ وہی ہے جس میں اب مدینہ سے نکل کر بیر علی مقام پر حجاج احرام باندھتے ہیں اور یہی اہل مدینہ کا میقات ہے جس کے آگے بغیر احرام کے بڑھنا جائز نہیں ہے۔ اس منزل پر آکر حضرتؐ نے نماز عصر پڑھی اور رات کو جو شب جمعہ تھی یہیں قیام فرمایا اور چوں کہ یہیں احرام باندھ چکے تھے لہٰذا اب جو حضرتؐ اس منزل سے آگے بڑھنے لگے تو "لبیک اللھم لبیک" صدا بلند کی جس پر ان ہزاروں آدمیوں نے جو ساتھ تھے' آپ کی معیت میں تھے آپ کی پیروی کی اور دور دور تک کی وادیاں بارگاہ الہٰی میں حاضری کے اس اعلان سے گونج اٹھیں اور یونہی حضرتؐ " لبیک اللھم لبیک " کی صداؤں کے ساتھ آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ راستے ہی میں حضرت کو روانگی کے آٹھویں دن شب پنجشنبہ ماہ ذی الحجہ کا چاند نمودار ہوا۔ اس کے بعد راستہ طے ہوتا رہا یہاں تک کہ شب یک شنبہ چار ذی الحجہ کو حضرتؐ نے ذی طوی میں رات گذاری اور نماز صبح پڑھ کر روانہ ہوئے۔ اور اسی اتوار کو صبح دن چڑھے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ حجر اسود کا استلام فرمایا (بظاہر آدمیوں کی کثرت کی وجہ سے "بوسہ" کا موقع نہ تھا) اور سات مرتبہ کعبہ کا

طواف فرمایا اور ہر طواف میں آپ حجر اسود اور رکن یمانی کا استلام فرماتے تھے۔ پھر پنجشنبہ کی صبح، روز ترویہ یعنی ۸ ذی الحجہ کو آپؐ تمام مسلمانوں کے ساتھ منیٰ تشریف لے گئے اس طرح کہ پنجشنبہ کو ظہر کی نماز منیٰ میں پڑھی۔ پھر شب جمعہ وہیں قیام فرما کر نماز صبح وہیں ادا فرمائی اور روز عرفہ ۹ ذی الحجہ کو جب سورج بلند ہو چکا ہے، اس وقت عرفات کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں حضرت کے لئے، حضرت کے حکم سے، مقام نمرہ پر خیمہ نصب ہو گیا تھا۔ آپ نے اس میں قیام فرمایا۔ جب زوال آفتاب ہو گیا تو حضرت نے اپنے ناقہ "قصوے" کے تیار کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ تیار ہوا، اور حضرت اس میدان کے وسط میں تشریف لائے جس کے گرد و پیش تمام مسلمان مقیم تھے اور پشت ناقہ پر سے حضرت نے اس پورے مجمع کو مخاطب فرمایا۔ آپ کی چچی ام الفضل زوجہ جناب عباسؓ نے اس وقت ایک پیالہ دودھ کا بھیجا جسے حضرتؐ نے اسی ناقہ کی پشت پر سواری کی حالت میں نوش فرمایا، جس سے تمام مسلمانوں کو یہ معلوم ہوا کہ آپ آج روزہ سے نہیں ہیں۔ جب خطبہ پڑھ چکے تو حضرتؐ ناقے سے اترے اور بلال کو اذان کا حکم دیا۔ چنانچہ اذان ہوئی، مسلمان نماز کے لئے صف بستہ ہو گئے۔ اور بلال ہی نے اقامت کہی جس کے بعد ظہر کی نماز ہوئی۔ پھر فوراً ہی حضرتؐ نے بلال کو دوسری دفعہ کی اقامت کا حکم دیا اور اسی وقت عصر کی نماز ہوئی۔ ظہر اور عصر کے درمیان کسی دوسری نماز کا فصل حضرتؐ نے نہیں کیا۔ علامہ ابن عربی کے الفاظ یہ ہیں کہ۔

صلاھما علیہ السلام بالناس مجموعتین فی وقت الظھر
باذان واحد لھما معا با قامتین و لکل صلوۃ اقامۃ

یہ دونوں نمازیں حضرت نے باجماعت ایک ساتھ ظہر کے وقت میں ایک اذان کے ساتھ جو دونوں کے لئے تھی اور دو اقامتوں کے ساتھ کہ ہر نماز کے لئے اقامت لگ ہو، ادا فرمائیں۔

(محاضرۃ الابرار جلد ا صفحہ ۲۱)

یہی وہ ترکیب نماز کی ہے جس کے شیعہ عمومی طور پر پابند ہو گئے ہیں۔ پھر

حضرت اپنے مرکب پر سوار ہوئے اور وہیں تشریف لائے جہاں گھرے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ جمعہ کا آفتاب غروب ہوا۔ اب یہاں یہ جملہ قابل لحاظ ہے کہ غروب کے بعد لکھا ہے۔ و ذھبت الصفرۃ یعنی صرف آفتاب کے غروب ہونے پر اکتفا نہیں فرمائی بلکہ انتظار کیا کہ زردی دور ہو جائے۔ یہ "زردی" کی لفظ بظاہر تعبیر ہے۔ "حمرۃ مشرقیہ" کے دور ہونے کی جسے شیعہ غروب آفتاب کا معیار قرار دیتے ہیں اور اس کے پہلے سمجھتے ہیں کہ مغرب کا وقت نہیں آیا۔ اب حضرتؑ اسامہ بن زید کو اپنے ساتھ بٹھا کر روانہ ہوئے اور ۱۰ ذی الحجہ کی رات کو کافی وقت گذرنے پر اس وقت مزدلفہ پہنچے جسے مشعرالحرام بھی کہتے ہیں۔ جب مغرب کی نماز کا جو عام طور پر وقت سمجھا جاتا ہے گذر چکا تھا۔ چنانچہ عشاء کے وقت میں مغرب اور عشا کی نمازیں اسی طرح ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ پڑھیں۔

اس طرح اس حجۃ الوداع کے تاریخی موقع پر حضرتؑ نے جمع بین الصلواتین کی دونوں صورتوں پر عمل کرکے دکھا دیا۔ یعنی نماز ظہر کے وقت میں اسی کے ساتھ عصر کی نماز اور پھر عشاء کے وقت میں اسی کے ساتھ مغرب کی نماز۔ جس سے یہ اصول ثابت ہوگیا کہ شروع اور آخر کے بس ذرا سے وقت کو چھوڑ کو جو عقلی طور پر پہلی اور آخری نماز کا وقت مختص ہے' باقی تمام وقت دونوں کا مشترک وقت ہے یہ اور بات ہے کہ فضیلت کے لحاظ سے اس میں ایک کا حصہ ظہر سے نسبت رکھتا ہے اور ایک حصہ عصر سے۔ اسی طرح غروب کے بعد ایک حصہ مغرب سے اور اس کے بعد کا حصہ عشاء سے مگر اس درمیان کے وقت کے ہر جزء میں ظہر اور عصر اور پھر مغرب اور عشاء کا ہونا درست ہے جو آئمہ اہل بیتؑ رسولؐ کے ارشادات سے ثابت ہے۔

جانشینی علیؑ کا اعلان

حج سے واپسی میں جب مدینہ کی طرف مراجعت کے لئے مکہ سے باہر آ گئے اور مقام غدیر خم پر پہنچے جس کے لئے ہندوستان کے مورخ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ "راہ میں ایک مقام خم پڑا جو جحفہ سے تین میل پر ہے، یہاں ایک تالاب ہے، عربی میں تالاب کو غدیر کہتے ہیں اور اس لئے اس مقام کا نام عام روایتوں میں غدیر خم آتا ہے۔ (سیرت النبیؐ حصہ دوم طبع ہشتم ۱۳۸۸ھ ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۶۷)

اب یہ نہیں معلوم کہ مقام خم اس تالاب سے کتنی دور تھا اور تالاب میں پانی تھا یا وہ خشک ہو چکا تھا مگر چوتھی صدی ہجری کے ملک عرب کے عالم کی تصریح ہے کہ یہاں عموماً" قافلے منزل نہیں کیا کرتے تھے اس لئے کہ یہاں آب و گیاہ موجود نہیں ہے۔ (ارشاد صفحہ ۸۱) بہرصورت حضرتؐ یہاں پہنچے تو حکم ربانی پہنچا۔

یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک
و ان لم تفعل فما بلغت رسالتہ

اے پیغمبر! جو آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اتارا جا چکا ہے، اسے پہنچا دیجئے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اس کا پیغام کچھ پہنچایا ہی نہیں۔

آیت کے الفاظ سے بھی خود ظاہر ہے اور روایت بھی بتاتی ہے کہ یہ حکم پہلے آ چکا تھا مگر اس کی تبلیغ کے لئے اس کے پہلے وقت مقرر نہ ہوا تھا۔ حضرتؐ نے

اس کے اعلان میں تاخیر فرمائی اس انتظار میں کہ موقع ایسا سازگار ہو کہ اس میں اختلاف زیادہ پیدا نہ ہو مگر اب یہ جگہ آگئی جہاں اللہ کو علم تھا اور دنیا پر بعد میں یہ حقیقت ثابت ہوئی کہ اگر حضرتؐ اس جگہ سے آگے بڑھ جائیں اور قافلہ روانہ ہو جائے تو پھر راستے بدل جائیں گے اور اتنا بڑا مجمع پھر کبھی پیغمبر خداؐ کو فراہم نہیں ہو سکتا تو اب خالق کی جانب سے یہ حکم تاکیدی آیا تاکہ زیادہ سے زیادہ مسلمان اس حکم ربانی کو سن لیں اور حجت تمام خلق پر زیادہ سے زیادہ تمام ہو جائے' اس حکم محکم کے ورود سے مجبور ہو کر بلا توقف حضرتؐ مرکب سے اتر پڑے اور لازماً" مسلمانوں کو بھی اترنا پڑا۔ اس وقت گرمی نہایت سخت تھی۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ چھوٹے چھوٹے درخت جو وہاں ہیں' وہ اکھاڑ دیئے جائیں تاکہ زمین صاف ہو جائے۔ پھر پالا نہائے شتر کو ایک دوسرے پر رکھ کر ایک طرح کا منبر وہاں بنوایا اور اب اعلان ہوا کہ الصلوٰۃ جامعۃ یعنی نماز جماعت میں سب آکر رسولؐ کے ساتھ شریک ہوں۔ مجبوراً" سب مسلمان سمٹ کر اکٹھا ہو گئے جب کہ ریگ صحرا کی تپش کا یہ عالم تھا کہ عبائیں یا چادریں پیروں سے لپیٹ لی گئیں تھیں۔ (ارشاد صفحہ ۸۱) رسول خداؐ حضرت علیؑ کو اپنے ساتھ لے کر اس مصنوعی منبر کی چوٹی پر تشریف لے گئے اور انہیں اپنی دائیں جانب کھڑا کیا اور بسیط خطبہ ارشاد فرمایا جس کے بعد جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ اور ان کے بعد علامہ طبرسیؒ نے کچھ مضامین اور خاص فقرے نقل کئے ہیں اس طرح:۔

خطب الناس محمد اللّٰہ و اثنٰی علیہ و وعظ و نعی الی الامۃ نفسہ فقال انی وعیت و یوشئ ان اجیب و قد حان منی حقوق مزیین اظھرکم و انی مخلف فیکم ما ان تمستکم بہ لن تضلوا کتاب اللّٰہ و عترتی اھل بیتی و انما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض ثم نادیٰ با علی صوتہ۔ الست اولی بکم منکم بانفسکم؟ فقالوا اللھم بلٰی فقال علی النسق و قد اخذ بضعی علی فرفعھا حتی بان بیاض ابطیھما و قال من کنت مولاہ فھذا علیؑ مولاہ اللھم و ال من والاہ و عاد من عاداہ و

انصر من نصره و اخذل من خذله ثم نزل و کان وقت الظهر تم ثم صلی رکعتین ثم زالت الشمس فاذن موذنه الصلواة الظہر فصلے بالناس و جلس فی خیمة و امر علیا ان یجلس بخیمة له بان ثم امر المسلمین ان یدخلوا علیه فوجا فوجا فهنؤه بالامامة و یسلموا علیه بامرة المسلمین ففعل الناس ذالک الیوم کلهم ثم امر ازاوجه و جمیع نسائه المومنین معه ان یدخلن معه و یسلهن علیه المومنین ففعلن ذالک و کان ممن اطنب فی قهنته بذلک المقدم عمر بن الخطاب و اظهر له من المسرة به و قال فیما قال۔ بخ بخ لک یا علی اصبحت مولای و مولی کل مومن و مومنة و جاء حسان بن ثابت الی رسول الله فقال یا رسول الله اتاذن لی ان اقول فی هذاالمقام مارضاء الله فقال له قم یا حسان علی اسم الله فوقف علی مرتفع من الارض و تطاول المسلهون لسمع کلامه فانشا یقول ایتا و یحهم یوم الغدیر فوقهم نجم واسمع بالرسول منادیا فقال فمن مولا کم و ولیکم فقالوا ولم یبدوا اهناک الهک مولانا وانت ولینا ولن نجدن منا لک الیوم عاصیا ' فقال له قم یا علی فانی رضیتک من بعدی اماما و هادیا فمن کنت مولاه فهذا و لیه فکونو له انصاریة صدق موالیا هناک دعا اللهم و ال ولیه وکن للذی عادی علیا معادیا فقال له رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم لا تزال یا حسان موید ابروح القدس ما نصرنیه بلسانک و لم یبرح رسول الله صلی الله علیه وسلم من ذالک المکان حتی نزل۔

حضرت نے یہ خطبہ پڑھ کر حمد و ثنا ادا فرمائی اور موعظہ و نصیحت کے ساتھ ساتھ امت کو اپنے وفات کی خبر سنائی اور فرمایا مجھے دعوت حق آ گئی ہے اور قریب ہے وہ وقت کہ میں اس پر لبیک کہوں اور اب تمہاری نظروں سے اوجھل ہونے کا میرا وقت آ گیا ہے اور میں تم میں چھوڑے جاتا ہوں وہ کہ جس سے تم اگر تمسک رکھو گے تو ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔ اللہ کی کتاب اور میری عترت جو میرے اہل

بیتؑ ہیں اور یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہنچیں- پھر آپ نے بلند آواز سے پکارا کہ کیا میں تم لوگوں پر تم سے زیادہ بااختیار ہونے کا حق نہیں رکھتا؟ سب نے کہا کیوں نہیں- بس اس سے ربط دے کر آپ نے فرمایا اس عالم میں کہ آپ نے حضرت علیؑ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اونچا کیا اتنا کہ دونوں کی سفیدی زیر بغل نحوط ہوئی اور فرمایا اچھا تو جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ مولا ہے- خداوندا! دوست رکھ اسے جو اس کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اسے جو اسے دشمن رکھے اور مدد کر اس کی جو اس کی مدد کرے اور بے مددگار چھوڑ اسے جو اسے بے مددگار چھوڑے پھر منبر سے اترے اور یہ عین دوپہر کا وقت تھا تو حضرت نے دو رکعت نماز پڑھی اور اب زوال آفتاب ہو گیا تو آپ کے موذن نے نماز ظہر کی اذان دی جس کے بعد آپ نے نماز پڑھائی اور آپ اپنے خیمہ میں بیٹھے اور حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ وہ ایک خیمہ میں جو سامنے لگایا گیا تھا بیٹھیں پھر آپ نے تمام مسلمانوں کو حکم دیا کہ ایک ایک کر کے آپ کے پاس جائیں اور امامت کی مبارکباد دیں اور امیرالمومنین کہہ کر سلام کریں چنانچہ اس دن سب نے ایسا ہی کیا- پھر آپ نے اپنے ازواج اور تمام مسلمان خواتین کو حکم دیا کہ وہ سب بھی آپ کے پاس آئیں اور آپ کو امیرالمومنینؑ کہہ کر سلام کریں چنانچہ ان سب نے بھی اس پر عمل کیا اور جنہوں نے اس میں کافی طول کلام سے کام لیا حضرت علیؑ کو اس منصب پر مبارک باد دینے میں وہ عمر بن خطاب تھے اور انہوں نے اس پر بہت خوشی کا اظہار کیا اور منجملہ اس کے جو کہا تھا یہ تھا کہ مبارک ہو مبارک اے علیؑ کہ آپ میرے اور ہر صاحب ایمان مرد اور صاحب و ایمان عورت کے مولیٰ ہو گئے اور حسان بن ثابت پیغمبر خداؐ کے پاس آئے اور کہا کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ میں اس موقع پر کچھ ایسا کہوں جسے اللہ پسند کرتا ہو- حضرت نے فرمایا اے حسان! بسم اللہ اٹھو- چنانچہ وہ ایک اونچے حصہ پر زمین کے کھڑے ہوئے اور تمام مسلمانوں نے گردنیں بلند کیں ان کے کلام کے سننے کے لئے تو انہوں نے اشعار پڑھنا شروع کئے جن کا ترجمہ یہ ہے کہ انہیں غدیر

کے دن ان کے پیغمبر پکار رہے تھے مقام خم پر اور پیغمبر سے بڑھ کر کانوں تک آواز پہنچانے والا کوئی ہو سکتا ہے - اور فرمایا بتاؤ تمہارا مولیٰ اور ولی کون ہے؟ تو سب بول اٹھے اور کسی نے اس وقت دشمنی ظاہر نہیں کی کہ خدا ہمارا مولیٰ ہے اور آپ ہمارے ولی ہیں اور آپ ہم میں سے کسی کو آج نافرمانی کرنے والا نہیں پائیں گے تو حضرت رسولؐ نے ان سے کہا کہ کھڑے ہو اے علیؑ کہ میں اپنے بعد تمہارے امام اور رہنما ہونے کو پسند کرتا ہوں تو جس کا میں مولیٰ ہوں اس کا یہ ولی ہے تو تم سب رہو ان کے لئے مددگار اور موافقت رکھنے والے اس موقع آپ نے دعا کی کہ خداوندا اس کے دوست کو تو دوست رکھ اور جو علیؑ کو دشمن رکھے اس کا تو دشمن ہو اس پر حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا اے حسان' ہمیشہ روح القدس کے ذریعہ سے تمہاری تائید ہوتی رہے گی جب تک تم اپنی زبان سے ہماری مدد کرتے رہو گے اور حضرت پیغمبر خدا اس جگہ سے ہٹے نہیں یہاں تک کہ یہ آیت اتری۔

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت عیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا فقالؑ الحمد للّٰہ علی کمال الدین و تمام النعمۃ و رضا الرب برب النبی و الوالایۃ لعلی من بعدی

آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور تمہارے لئے اس دین اسلام سے میں راضی ہوا اور حضرت نے فرمایا اللہ کا شکر دین کے مکمل اور نعمت کے پورے ہونے اور پروردگار کے میری رسالت اور علیؑ کی میرے بعد ولایت سے راضی ہونے پر۔

(اعلام الوریٰ صفحہ ۱۳۹ - ۱۴۰)

جناب شیخ مفید علیہ الرحمتہ اور ان کے بعد علامہ طبری ان دونوں کے لفظوں میں ہم نے اس پورے واقعہ کو مربوط شکل میں پیش کیا' شیعہ عالم اور مورخ ہیں' لیکن اس کے تمام اجزا اہل سنت کی معتبر کتب میں موجود ملتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ پریشاں شکل میں ہیں۔

ہاں -ایک حقیقت ہے جس پر ہم نے فتح مکہ کے موقع پر بت شکنی کے ذیل میں کسی حد تک روشنی ڈالی ہے اور یہاں ہم اسے زیادہ واشگاف الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ ہمیں اہل سنت کے معتبر ماخذوں پر نظر کرنے سے یہ محسوس ہوا ہے جسے از خود نہیں تو ہمارے توجہ دلانے سے ہر صاحب وجدان خود بھی محسوس کر سکتا ہے کہ راویان تاریخ پر اموی اور عباسی سلطنت کی سیاست کا اثر راویان حدیث و تفسیر سے زیادہ تھا' اس لئے بہت سی تاریخ کی کڑیاں جو با اقتدار سلطنتوں کے رجحانات کے خلاف تھیں ہمیں رسمی طور پر جن کتابوں کو تاریخ کہتے ہیں' ان میں نظر نہیں آتیں لیکن جوامع حدیث و تفسیر میں ہمیں تاریخ کی گم شدہ کڑیاں مل جاتی ہیں- اور کوئی وجہ نہیں کہ ایسی کتابوں کے نام کا جز اگر لفظ تاریخ ہو تو اسی کو ہم تاریخ سمجھیں' جبکہ حقیقتیں لفظوں کے تابع نہیں ہیں- اگر کسی محدث نے کوئی تاریخی واقعہ بیان کیا ہے تو اس واقعہ کے بیان کرنے میں وہ مورخ کی حیثیت رکھتا ہے- اسی طرح اگر کسی آیت کی تشریح کے ذیل میں کسی مفسر نے بطور شان نزول کوئی اسلامی واقعہ درج کرتا ہے تو اس واقعہ کے بیان کی حد تک وہ تفسیری بیان بھی تاریخ کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ جیسا اسی "تاریخ اسلام" میں جہاد کے پس منظر میں ہم نے لکھا ہے- قرآن مجید! مسلمانوں کے لئے دینی کتاب؟ اس لئے ایک سب سے بڑے دینی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے- واقعات اسلامی کے بیان میں غیر مسلم جماعتوں کو اسے اصولا" ایک تاریخ کی حیثیت تو دینا ہوگی جسے وہ منزل من اللہ ہونے پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے کلام الہی نہ مانیں مگر اسے نہ ماننے کے لئے انہیں اسے خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بزبان خود لکھوائی ہوئی تاریخ ماننا پڑے گا جس کا وزن روایتی طور پر بعد کی لکھی ہوئی تمام مسلم اور غیر مسلم تاریخوں سے زیادہ ہو گا-

اب ہم مذکورہ مسلسل واقعہ کی اہم کڑیاں کی نشان دہی کتب اہل سنت سے کرتے ہیں جسے ہر شخص تلاش کر کے دیکھ سکتا ہے اور خود اپنی آزاد عقل اور ضمیر سے نتیجہ نکال سکتا ہے-

کتاب لغات و معاجم میں غدیر خم کے خطبہ کی گونج

جامعہ ازہر مصر کے ایک عالم سعد محمد حسن نے جو وزارت معارف مصر کی طرف سے مدرس تھے' اپنی کتاب "الھدتیہ فی الاسلام" میں جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ادارہ علوم اسلامیہ کے کتب خانہ میں موجود ہے صفحہ ۱۷ پر اہل لغات و معاجم کے ان تصریحات کو یک جا کیا ہے۔

ہر صاحب فہم سمجھ سکتا ہے کہ بے شمار قطعات ارض میں سے کسی ایک سے جب تک کسی اہم واقعہ کا تعلق نہ ہو' لغت یا جغرافیہ کی کتابوں میں نمایاں طور پر اس جگہ کا تفصیلی تعارف ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

غدیر اور خم دونوں کے ایک ساتھ تذکرہ اور تفصیلی تعارف کا ہونا اس کا ثبوت ہے کہ اس واقعہ کا جو اس سفر سے متعلق ہے اس علمی حلقہ کے دل و دماغ پر پوری طرح اثر ہے چنانچہ بعض نے صراحۃ" غدیر خم کے خطبہ اور اس کے بعض اجزا کا تذکرہ بھی کر دیا ہے جسے ہم ذیل میں دیگر حوالوں کے ساتھ درج کریں گے۔

جن کتب اور مصنفین کا "الھداتیہ فی الاسلام" کے مولف نے تذکرہ کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) "قاموس" محمد بن یعقوب فیروز آبادی

(۲) "معجم ما استعجم" وزیر ابو عبید اللہ البکری الاوسی

(۳) "صبح الاعشیٰ قلقشندی (۴) تاریخ یعقوبی

علاوہ بران شیخ محمد طاہر فتنی نے مجمع بحارالانوار میں بھی غدیر اور خم دونوں کا تعارف کرایا ہے۔

اب ذیل میں واقعہ غدیر کی اہم کڑیوں کی نشان دہی کتب اہل سنت سے کی جا رہی ہے۔

(۱) نزول آیہ بلغ

علامہ واحدی ابو الحسن علی بن احمد نیشا پوری نے اپنی مشہور و معروف کتاب "اسباب النزول" میں ' جو صحیح معنی میں تاریخ تنزیل آیات قرآنی ہے' ابو سعید

خدریؓ کی روایت درج کی ہے۔

نزلت هذه آلایة- یا ایها الرسول بلغ ما انزل الیكٔ
من ربكٔ یوم غدیر خم فی علی بن ابی طالب

یہ آیت کہ "اے رسول تبلیغ کر دیجئے اس کی جو آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اترا ہے' غدیر خم والے دن حضرت علیؑ بن ابی طالب کے بارے میں نازل ہوئی"۔ (اسباب التنزیل مطبوعہ مصر ۱۳۱۵ھ صفحہ ۱۵۰)

حافظ جلال الدین سیوطی نے اپنی مشہور و معروف تفسیر "در منشور فی التفسیربالماثور" (مطبوعہ طراوہ جلد ۲ صفحہ ۲۹۸) اور اہل حدیث کے بہت بڑے عالم اور مفسر محمد بن علی بن محمد شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ نے اپنی تفسیر "فتح القدیر (جلد ۲ مطبوعہ مصر صفحہ ۶۰) میں اور ہمارے ہندوستان کے مشہور عالم اہل حدیث نواب صدیق حسن خاں قنوجی نے اپنی تفسیر "فتح البیان فی مقاصد القرآن" (مطبوعہ مصر ۱۳۰۱ھ صفحہ ۱۹) میں جو متفقہ الفاظ درج کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

اخرج ابن ابی حاتم و ابن مردویة و ابن عساکر عن ابی سعید الخدری قال نزلت هذه الآیة- یا ایها الرسول بلغ ما انزل لیكٔ علی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و آله وسلم یوم غدیر خم فی علی ابن ابی طالب و اخرج ابن مردویه عن ابن مسعود قال کنا نقرء علی عهد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و آله وسلم یا ایها الرسول بلغ ما انزل الیكٔ من ربكٔ ان علیا مولٰی المومنین و ان لم تفعل فما بلغت رسالته واللّٰه یعصمكٔ من الناس-

ابن ابی حاتم' ابن مردویہ اور ابن عساکر نے ابو سعید خدری کی زبانی بیان کیا ہے کہ یہ آیت تو یایا ایاھا الرسل .... (الخ) پیغبر خداؐ پر نازل ہوئی غدیر خم کے دن علی ابن ابی طالب کے بارے میں اور ابن مردویہ نے ا ابن مسعود کی زبانی نقل کیا ہے کہ ہم لوگ جب پیغبرؐ خدا کے زمانہ میں اس آیت کو پڑھتے تھے تو اس فقرہ کے ساتھ کہ "جو اللہ کی طرف سے اتارا گیا ہے" کہ علیؑ مومنین کا مولا ہے اور اگر

آپ نے ایسا نہ کیا تو اس کی رسالت کچھ پہنچائی ہی نہیں اور اللہ لوگوں سے آپ کی حفاظت کرے گا۔

ایسی روایتوں کی ہم نے مقدمہ تفسیر میں وضاحت کی ہے کہ ایسے اضافے جو کچھ صحابہ نے بیان کئے ہیں یہ تفسیری نوٹ کے طور پر ہوتے تھے جس کی تشریح میں وہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سن چکے تھے۔

(۲) خطبہ اور اس کے خاص خاص فقرات

جس طرح مذکورہ سابق شیعہ ماخذوں میں پورا خطبہ نہ تھا بلکہ اس کے خاص خاص جملے تھے۔ اسی طرح کتب اہل سنت میں اس خطبہ کے خاص خاص فقرے ہی نقل ہوئے ہیں۔ اسی بنا پر یہ غلط تصور قائم ہوا ہے کہ "آپؐ نے ایک مختصر سا خطبہ دیا"۔ (سیرت النبیؐ شبلی حصہ دوم صفحہ ۱۶۸)

حالانکہ اگر تمام فقرات جمع کئے جائیں جو متعدد ماخذوں میں بکھرے ہوئے ہیں تو وہ خطبہ ایسا "مختصر سا" نہیں تھا جیسا اس لفظ سے سمجھ میں آتا ہے۔

امام ولی الدین محمد بن محمد بن عبداللہ الخطیب العربی متوفی ۷۴۳ھ نے اپنی مشہور و معروف کتاب "مشکواۃ المصابیح" میں جو عموماً" مشکواۃ شریف کہلاتی ہے جو روایت درج کی ہے وہ اس طرح ہے۔

عن زید ابن ارقم یقول۔ نزل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم یومًا فینا خطیبا بین مکہ و مدینۃ محمد اللّٰہ و اثنیٰ علیہ

زید بن ارقم کا بیان ہے کہ ایک دفعہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ اور مدینہ کے درمیان خطبہ دینے کے لئے سواری سے اترے اور حمد و ثنائے اللہ بجا لائے۔

"سواری سے اترے" "مکہ اور مدینہ کے درمیان" اور "خطبہ دینے کے لئے اس اجمال کے تحت میں وہ پوری تفصیل آتی ہے جو ارشاد اور اعلام الوریٰ سے قبل میں درج ہو چکی ہے۔ پھر یہ کہ "حمد و ثنائے الہیٰ" ادا کی۔ یہ اجزاء بھی خطبہ کے ہیں بعض راوی نے پورا نقل نہیں کیا ہے مگر ظاہر ہے کہ وہ حمد و ثنائے الہیٰ جتنی بھی بسیط یا مختصر ہو، وہ اس جملہ بھر تو نہ تھی جسے راوی نے کہا ہے کہ "حمد و

ثنائے الٰہی ادا کی"۔ اور اگر وہ اتنی ہی مختصر ہوتی تو راوی اختصار کے تقاضا سے اس کے اصل الفاظ کے بیان کو ترک کیوں کرتا؟

و ذکر ما بعد یا ایھاالناس انما انا بشر یوشک ان یا تینی رسول اللّٰہ ربی فاجیب انی تارک فیکم الثقلین اولھا کتاب اللّٰہ فیہ الھدیٰ و النور فخذو بکتاب اللّٰہ و استمسکوا بہ فحث علے کتاب اللّٰہ و رغب فیہ

اس کے بعد آپ نے فرمایا اے لوگو! میں بس ایک انسان ہوں بہت نزدیک ہے وہ دن کہ میرے پروردگار کا پیغام آ جائے اور میں لبیک کہوں بلا شبہ میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ پہلی ان میں سے اللہ کی کتاب ہے جس میں ہدایت اور روشنی ہے تو اللہ کی کتاب کو لو اور اس سے تمسک کرو۔اور آپ نے کتاب اللہ پر عمل کی ترغیب دی اور اس پر بہت زور دیا۔

دیکھئے پھر راوی نے بنظر اختصار بہت سا حصہ ارشادات رسولؐ کا چھوڑ دیا جس سے ظاہر ہے کہ پھر اس منزل پر پیغمبر خداؐ نے کافی بسط و تفصیل سے کام لیا تھا۔

ثم قال اذکر کم اللّٰہ فی اھل بیتی اذکر کم اللّٰہ فی اھل بیتی۔

(رواہ مسلم)

پھر فرمایا میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں خدا کو یاد دلاتا ہوں۔ اپنے اہل بیتؑ کے بارے میں خدا کو یاد دلاتا ہوں۔ مسلم نے اس کی روایت کی۔

مولانا شبلی نعمانی نے صحیح بخاری و ترمذی کے حوالے سے حسب ذیل الفاظ اپنے ترجمہ کے ساتھ نقل کئے ہیں۔

الا ایھا الناس فانما انا بشر مثلکم یوشک ان یاتی رسول اللّٰہ فاجیب و انی تارک فیکم الثقلین اولھما کتاب اللّٰہ فیہ الھدیٰ والنور فخذو اکتاب اللّٰہ واستمسکوا بہ و اھل بیتی اذکر کم اللّٰہ فی اھل بیتی

اے لوگو! میں بھی بشر ہوں، ممکن ہے کہ خدا کا فرشتہ جلد آ جائے اور مجھے قبول کرنا پڑے یعنی موت میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں، ایک خدا کی کتاب جس کے اندر ہدایت اور روشنی ہے۔ خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑو اور

دوسری چیز میرے اہل بیتؓ ہیں۔ میں اپنے اہل بیتؓ کے بارے میں تمہیں خدا کی یاد دلاتا ہوں۔

آخری جملہ کو آپ نے تین دفعہ مکرر فرمایا۔ یہ صحیح مسلم (مناقب حضرت علیؓ) کی روایت ہے۔ نسائی۔ مسند امام احمد۔ ترمذی، طبرانی، طبری، حاکم وغیرہ میں کچھ اور فقرے بھی ہیں جن میں حضرت علیؓ کی منقبت ظاہر کی گئی ہے۔

(سیرت النبی حصہ دوم صفحہ ۱۶۸)

جناب شبلی کے شاگرد رشید شاہ معین الدین احمد ندوی نے بہت احتیاط سے کام لے کر صحیح مسلم جلد ۲ کتاب الفضائل - باب فضائل علیؓ" کو ماخذ قرار دے کر لکھا ہے۔

مدینہ کی طرف کوچ فرمایا اور راستہ میں مقام خم غدیر میں ایک مختصر خطبہ دیا۔

"حمد و ثناء کے بعد اے لوگو! میں بھی بشر ہوں۔ ممکن ہے خدا کا فرشتہ آ لے اور مجھے اس کی دعوت قبول کرنا پڑے۔ میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں۔ ایک خدا کی کتاب جس کے اندر ہدایت اور روشنی ہے۔ خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑو اور دوسری چیز میرے اہل بیتؓ۔ اپنے اہل بیتؓ کے بارے میں تم کو خدا کی یاد دلاتا ہوں"۔

(تاریخ اسلام حصہ اول مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ طبع پنجم ۱۹۶۶ء صفحہ ۱۱۱)

مرکزی فقرہ

اب اصل فقرہ جسے خطبہ کا ماحصل سمجھنا چاہئے۔ اس کے معنی چاہے بعد کو جو چاہے قرار دیئے جائیں بلکہ بروقت بھی۔ اس فقرہ کو اتنی اہمیت دی گئی کہ اسی کے الفاظ کو لیکر حضرت علیؓ کو مبارک باد دی گئی، وہ مستند جوامع حدیث میں متفق علیہ حیثیت رکھتا ہے۔

چنانچہ مشکواۃ ترجمہ مطبوعہ دہلی صفحہ ۶۰۶ میں زید بن ارقم والی حدیث ہے کہ۔

قال تعلمون انی اولٰی بالمؤمنین من انفسہم ثلث مرات قالوا نعم فقال رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم من کنت مولاہ فعلی مولا۔

فرمایا تین مرتبہ کہ کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ میں تمام مومن پر خود ان سے زیادہ اختیارات رکھتا ہوں۔ سب نے کہا ہم جانتے ہیں تو رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ مولا ہے۔

(مشکواۃ مطبوعہ دمشق جلد ۳ صفحہ ۳۰ میں ہے)۔

عن زید ابن ارقم ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔ رواہ احمد والترمذی

ترجمہ۔ زید ابن ارقم سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جس کا میں مولا اس کا علی مولا۔

مشکواۃ مترجم مطبوعہ دہلی صفحہ ۵۶۷ میں براء ابن عازب اور زید بن ارقم کی زبانی ہے کہ جب حضرت غدیر خم میں اترے تو علیؑ کا ہاتھ پکڑا پھر فرمایا۔

السنتم تعلمون انی اولٰی بالمومنین من انفسھم

کیا تم نہیں جانتے کہ میں مومنین پر ان کے نفوس سے زیادہ اختیار رکھتا ہوں"۔

قالوا بلٰی "سب نے کہا کیوں نہیں"۔

پھر فرمایا السنتم تعلمون ! نی اولٰی بکل مومن من نفسہ

"کیا تم نہیں جانتے کہ میں ہر فرد مومن پر اس کے نفس سے زیادہ اختیار رکھتا ہوں" سب نے کہا کیوں نہیں؟

اب فرمایا اللھم من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم و ال من والاہ و عاد من عاداہ "خدا وندا! جس کا میں مولا ہوں علیؑ اس کا مولا ہے۔ خداوندا تو دوست رکھ اسے جو اسے دوست رکھے اور دشمن ہو اس کا جو اس کا دشمن ہو"۔

مسند امام احمد بن حنبل میں یہ کئی دفعہ متعدد موقعوں پر درج ہے کہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے کوفہ کے مقام رحبہ میں جہاں ظاہر ہے کہ تمام اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موجود بھی نہ تھے بلکہ صرف وہی تھے جو اتفاق سے عراق پہنچ گئے تھے اور اس وقت اس مقام پر موجود تھے اس واقعہ کے چشم دید گواہیاں طلب کیں کہ جس نے اپنے کان سے رسول اللہ کو غدیر خم میں یہ الفاظ فرماتے سنا

ہے وہ گواہی دیں تو بارہ افراد ایسے صحابہ میں سے جو جنگ بدر میں شریک ہو چکے تھے کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اعلان کیا کہ ہم نے اپنے کانوں سے رسولؐ کو یہ الفاظ فرماتے سنا۔

(مسند احمد مطبوعہ مصر جلد ۱ صفحہ ۱۹۵، ۱۹۶ء و صفحہ ۲۰)

اس کے علاوہ جلد ۲ صفحہ ۲۷ میں جناب ابن عباس کی روایت سے یہ الفاظ درج ہیں کہ ۔ من کنت مولاہ فان مولاہ علی

ملا علی متقی کی کنزالعمال (جلد ۱۲ صفحہ ۲۰۲) میں ایک ہی مضمون کے تین جملے مختلف راویوں کی زبانی سے وارد ہیں۔ مشہور الفاظ من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔

براء ابن عازب اور جناب ام سلمہؓ کی روایت سے مسند احمد کے حوالے سے ہیں۔ اور بریدہ کے حوالہ سے یہ لفظیں ہیں کہ من کنت ولیہ فعلی ولیہ اور صفحہ ۲۰۴ میں محاملی کی امالی کے حوالے سے جناب ابن عباسؓ کی روایت کے الفاظ ہیں۔ علی ابن ابی طالب مولٰی من کنت مولاہ

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اصابتہ (جلد ۲ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۸ء صفحہ ۱۲۱۲)میں یہ الفاظ درج کئے ہیں کہ من کنت مولاہ فعلی مولاہ

ابن اثیر جزری نے اسد الغابتہ (جلد ۴ صفحہ ۲۸) میں وہی رحبہ والا واقعہ عبدالرحمن ابن ابی لیلٰی کی زبانی درج کی ہے جس میں بارہ بدری صحابیوں کی شہادت ہے کہ رسولؐ نے فرمایا من کنت مولاہ فعلی مولاہ

جناب شبلی نعمانی نے صحیح بخاری کے حوالہ سے خطبہ کے ابتدائی فقرات درج کرنے کے بعد لکھا ہے۔

مسند امام احمد، ترمذی، طبرانی، طبری، حاکم وغیرہ میں کچھ اور فقرے بھی ہیں جن میں حضرت علیؑ کی منقبت ظاہر کی گئی ہے۔ ان روایتوں میں ایک فقرہ اکثر مشترک ہے۔

من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم و ال من والاہ و عاد من عاداہ

(سیرت النبیؐ حصہ دوم صفحہ ۱۶۸)

خلیفہ ء دوم کی مبارک باد

مشکواۃ مترجم مطبوعہ دہلی جلد ۲ صفحہ ۵۹۰ میں اس خطبہ کے تذکرہ کے بعد لکھا ہے کہ۔

لقیہ عمر بعد ذلک فقال له هنیئا یا ابن ابی طالبؑ اصبحت و امسیت مولی کل مومن و مومنة (رواه احمد)

حضرت عمرؓ نے اس کے بعد آپ سے مل کر کہا مبارک ہو آپ کو اے ابوطالبؑ کے فرزند آپ صبح و شام مستقل طور پر ہر صاحب ایمان مرد اور ہر صاحب ایمان عورت کے آج سے مولیٰ ہو گئے۔ اس کی امام احمد بن حنبل نے تخریج کی ہے۔

ابن اثیر جزری نے بھی اسد الغابہ (جلد ۴ صفحہ ۲۸) میں درج کیا ہے ان الفاظ میں کہ قال عمرؓ بن الخطاب یا بن ابی طالبؑ اصبحت الیوم ولی کل مومن۔

حیدر آباد کے علمائے اہل حدیث میں سے وحید الزمان حیدر آبادی نے اللغۃ (مطبوعہ بنگلور پارہ ۱۶ صفحہ ۹۷) میں لکھا ہے۔

" حضرت عمرؓ نے حضرت علیؑ سے کہا تم تو ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت کے مولا بن گئے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؑ کو مبارک دی جب آنحضرت نے یہ حدیث فرمائی۔ من کنت مولاہ فعلی مولاہ"

انتباہ

یاد رکھنا چاہئے کہ تاریخ کا فرض واقعات کو محفوظ کرنا ہے۔

واقعہ۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پر ان الفاظ کا جاری ہونا ہے۔ وہ ہم دکھا چکے ہیں کہ شیعہ اور سنی میں متفق علیہ ہے۔ اب یہ کہ ان الفاظ کے معنی کیا تھے؟ اس پر بحث کرنا تاریخ کے حدود سے باہر ہے۔

خلاصہ فیصلہ۔ اس کا مجملا وہ ہے جسے اہل سنت کے ایک مشہور عارف شاہ علی حسن جانسی نے ان الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ "علی مولا بان معنی کہ پیغمبر بود مولا"۔ کیونکہ رسولؐ نے اپنی حدیث میں اپنے لئے اور حضرت علیؑ کے لئے ایک ہی لفظ دہرا دی ہے۔ لہٰذا اس فیصلے کے قبول کرنے سے کسی حدیث رسولؐ کے ماننے والے کو انحراف کی گنجائش نہیں ہے۔

مدینہ کی طرف واپسی اور لشکر اسامہ کے بھیجنے کی تیاری

رومیوں سے تصادم کی دو کڑیاں جنگ موتہ اور غزوہ تبوک کی شکل میں پہلے آ چکی تھیں۔ تبوک میں کسی جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ صرف اسلام کے حلقہ اثر میں اضافہ ہوا۔ مگر موتہ کی جنگ میں جو مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی' اس کی کوئی تلافی اب تک نہیں ہو سکی تھی جس کا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فطری طور پر صدمہ تھا۔ ظاہری بات تو یہی ہے اور باطنی طور پر خالق کی کچھ اور حکمتیں بھی اس سے وابستہ ہو سکتی ہیں جن میں سے بعض کا ممکن ہے بعد میں قرائن سے انکشاف ہو اور ممکن ہے کہ بعض راز سربستہ ہی رہیں۔

اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیش نظر اپنے سے بس قرابت ہوا کرتی تو جنگ موتہ میں متفق علیہ طور پر پہلے سردار جناب جعفر طیار ہوتے اس لئے کہ وہ حضرت کے حقیقی چچا زاد بھائی اور حضرت علیؑ ابن ابی طالب کے سگے بھائی تھے مگر اکثر مورخین کے قول کے مطابق پہلے سردار جناب زید بن حارثہ حضرت کے آزاد کردہ غلام تھے۔ بے شک حضرتؐ جناب جعفر سے نسبی قرابت اور ان کے اوصاف کی بنا پر محبت فرماتے تھے اس لئے ان کی وفات کا صدمہ آپ کو بہت ہوا۔ آپ کے گھر میں ان کا ماتم ہوا اور حضرت فاطمہ زہرا کو ان کی خبر شہادت سے جو گریاں دیکھا تو بجائے گریہ سے منع کرنے کے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا کہ علی مثل جعفر

فلتبکِ البواکی "جعفر ایسے شخص پر رونے والیوں کو رونا ہی چاہیے"۔

پھر بھی اب جنگ موتہ کے تدارک کے لئے جو فوج بھیجی جا رہی ہے تو یہ نہیں ہوا کہ عبداللہ بن جعفر کو جو عمر میں جوان نہیں تو نوجوانی کے حدود سے قریب ضرور تھے' سردار لشکر بنا کر بھیج دیتے جس سے یہ سمجھنے کا موقع ہوتا کہ اپنے چچا زاد بھائی جناب جعفر کے خون کا بدلہ لینے بھیج رہے ہیں لہٰذا ان کے ولی الدم کو سردار فوج بناتے ہیں بلکہ انہی زید بن حارثہ کے بیٹے اسامہ کو جو کم سن ہی تھے' سردار لشکر بنایا اور بڑے بڑے اکابر صحابہ کو ان کی ماتحتی میں جانے کا حکم دیا۔ سوا حضرت علیؑ بن ابی طالب کے باقی تمام قابل ذکر افراد ان کے زیر قیادت جانے پر مامور ہوئے جن میں وہ افراد بھی تھے جو اس کے بعد اپنے یا دنیا کے نزدیک قیادت عظمیٰ کے اہل سمجھے گئے۔ ان میں بڑی بڑی عمروں کے لوگ تھے اور اسامہ کم عمر تھے۔ اس پر اونچے حلقوں میں ناگواری کا اظہار ہوا۔ جناب شیخ عبدالحق دہلوی مدارج النبوۃ میں لکھتے ہیں۔

حکم عالی چناں صادر شد کہ اعیان مہاجر و انصار مثل ابوبکرؓ صدیق و عمرؓ و فاروق و عثمانؓ ذوالنورین و سعد بن ابی وقاص و ابو عبیدہ بن جراح وغیر ہم الا علی مرتضیٰؑ راہ کہ ہمراہ نہ کردوران لشکر ہمراہ اسامہ باشند و این در خاطر بعض مردم گراں آمد کہ غلامی را بر مہاجرین وانصار امیر گردانید و در مجالس ازیں جماعۃ سخنان ازیں باب جاری شد و ورد دمی یافت چوں این اخبار بسمع شریف رسید خاطر مبارک رنجیدہ شد و بغضب در آمد

حضرت کی طرف سے حکم ہوا کہ بڑے بڑے مہاجرین و انصار جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمانؓ ذوالنورین اور سعد بن ابی وقاص اور ابو عبیدہ بن جراح وغیرہ سب اس لشکر میں اسامہ کے ساتھ جائیں سوا علیؑ مرتضیٰ کے جنہیں ان کے ساتھ نہیں بھیجا اور یہ بات بعض حضرات کو بہت گراں گذری ایک غلام کو مہاجرین و انصار کا سردار بنا دیا اور ان لوگوں کے مجمعوں میں اس پر نکتہ چینی ہونے لگی۔ جب یہ اطلاعات حضرت کے کانوں تک پہنچے تو

آپ کو رنج ہوا اور حضرت غضب ناک ہوئے۔

اور پھر ان لوگوں کے اعتراض کا جواب جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیا ہے' اس سے گذشتہ تاریخ کی ایک گم شدہ کڑی کا بھی پتا ملتا ہے۔

آپ نے فرمایا۔

"تم لوگوں نے اس سے پہلے اسامہ کے باپ زید بن حارثہ کو سردار بنانے پر بھی ناگواری ظاہر کی تھی اور اب تم اسامہ کو نا پسند کر رہے ہو مگر خدا اور رسول تمہاری ناراضگی کی پرواہ نہیں رکھتے جو فیصلہ خدا اور رسولؐ کا ہے' وہ ٹل نہیں سکتا"۔

جناب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے الفاظ یہ ہیں۔

سر منبر رفت و فرمودات معشر الناس ایں چہ سبب است کہ در باب امیر ساختہ من اسامہ را از شما سر بر می زنند در باب امارت پدرش در غزوہ موتہ نیز سخن می کردید بخدا سوگند کہ او سزاوار امارت است و پدرش نیز سزاوار امارت بود"

(مدارج النبوۃ)

اس واقعہ میں دنیا کے لئے بڑی بصیرتیں مضمر ہیں۔ چونکہ حضرت کچھ عرصہ سے برابر عنقریب دنیا سے اپنے جانے کی طرف اشارہ فرما رہے تھے' اس لئے دوسرے لوگوں کو بھی کچھ کچھ اس کا احساس ہو گیا تھا' اس کے ساتھ آپ نے اتنے اہتمام کے ساتھ جو اپنی جانشینی کا اعلان فرمایا۔ اب آپ حضرتؐ کے سوا باقی تمام ایسے عناصر کو جو اس کے بعد آپ کی جانشینی کے دعویدار ہو سکتے تھے مدینہ سے باہر بھیج رہے ہیں' یہ بات بڑی معنی خیز تھی۔ اسے بعد کے لوگوں نے سمجھ لیا چنانچہ شیخ مفیدؒ نے چوتھی صدی ہجری میں لکھا ہے کہ۔

حتی لا یبقی فی المدینة عند موته من یختلف فی الریاسة و یطمع فی التقدم علی الناس لا مامة و یستعتب الامر لمن استخلفه من بعده ولا ینازع فی حقه منازع (ارشاد صفحہ ۸۴)

یہ اس لئے تھا کہ مدینہ میں آپ کی وفات کے وقت کوئی ایسا شخص نہ رہے جو امت کی سربراہی میں اختلاف کرے اور جو خود لوگوں کے آگے ہونے کی اپنے لئے توقع رکھتا ہو اور اسطرح اس شخص کے لئے جسے حضرت نے خود اپنا جانشین بنایا ہے مقصد کی تکمیل ہو جائے اور اس کے حق کے بارے میں کوئی نزاع کرنے والا نزاع نہ کرے۔

اور اسی کو ساتویں صدی میں نسبتاً مختصر الفاظ میں علامہ طبرسیؒ نے لکھ دیا ہے۔

انما فعل علیہ السلام ذلک لئلا یبقی بالمدینۃ عند وفاتہ علیہ السلام من یختلف بالامامۃ و یطمع فی الامامۃ و یستوسق الامر لاھلہ

حضرت نے یہ صرف اس لئے کیا کہ مدینہ میں حضرت کی وفات کے وقت کوئی شخص ایسا نہ رہے جو امامت میں اختلاف کرے یا خود امیر بننے کا خواہشمند ہو اور اس طرح جو اس کا حق دار ہے اس کے لئے یہ امر پایہ تکمیل تک پہنچ جائے۔

(اعلام الوریٰ)

تو بھلا وہ ذہین افراد جو اس معاملہ سے دلچسپی رکھتے تھے' بروقت اسے کیوں کر نہ سمجھتے؟ بلا شبہ وہ رسولؐ کے فرمان کو اپنے منصوبوں کے خاک میں ملنے کا سبب جانتے تھے۔ اب وہ کیا کرتے انہوں نے اسامہ کی سرداری کو محل بحث بنایا یہ کہہ کر کہ یہ کم سن ہیں۔ رسولؐ نے خدا اور رسولؐ کے فیصلے کے اٹل ہونے کا اظہار فرما کر ایک طرف یہ ثابت کر دیا کہ اہل بیتؑ کے مقابلہ میں اللہ کی نظر میں سن و سال کوئی چیز نہیں۔ دوسری طرف یہ ثابت کر دیا کہ اسلامی منصب کے تقرر میں جمہور کا فیصلہ کوئی چیز نہیں۔ دارومدار خدا اور رسولؐ کے فیصلہ پر ہے۔ اس وقت کے اکثر مسلمانوں نے وقتی مفادات کی رو میں ان بصیرتوں سے چشم پوشی کی تو بعد کے مسلمان جن کے ذاتی اغراض کوئی بھی نہیں ہیں' ان بصیرتوں کو آخر کس لئے نظرانداز کریں اور حق پوشی سے کام لیں؟!

یہ ناگواری صرف ذہنی طور پر رہتی یا زبانی سوالات و اعتراضات تک محدود

رہتی ہے تو کوئی خاص بات نہ تھی کیونکہ پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے جسے پیغمبر خداؐ نے بہ حکم الٰہی اسلام کے بلند مفادات کی خاطر نظر انداز کئے تھے مگر اب چونکہ کچھ فہم جو افراد کے منصوبوں کے لحاظ سے خود ان کے مقاصد کی حیات و موت کا سوال تھا۔ لہٰذا پیغمبر خداؐ کے فرمان کی تعمیل میں عملاً تاخیر سے کام لیا جانے لگا۔ بالاخر کسی طرح لشکر روانہ ہو بھی گیا تو مدینہ سے باہر مقام جرف پر جا کر پڑاؤ ڈال دیا گیا۔ یہاں حضرتؐ علیل بھی ہو گئے' اسی علالت میں کہ جس سے پھر دنیا سے رخصت ہوئے۔ اس علالت سے ذہنی طور پر مزید رکاوٹ یوں پیدا ہوئی کہ اب احساس ہو گیا کہ ان منصوبوں کی تکمیل کے جو بعد رسولؐ کے انتظام سے متعلق ہے' وقت بہت قریب ہے اور ظاہری طور پر بہانہ بھی بن گیا کہ اب رسولؐ کو بیمار چھوڑ کر جس میں روز بہ روز شدت ہوتی جاتی ہے ہم لوگ کیوں کر جائیں' جب کہ ان لوگوں کو جنہیں جانا ہے' رسولؐ کے یہاں کے وہ حاضر باش افراد بھی ہیں جنہیں بظاہر اپنے خصوصیات کی بنا پر اس عالم میں رسولؐ کو نہیں چھوڑنا چاہئے مگر جتنا ان لوگوں کو اس کام کے لئے فوراً روانگی سے انکار ہے' اتنا ہی خدا اور رسولؐ کو ان کے فوراً روانہ ہو جانے پر اصرار ہے۔ یہاں تک کہ رسولؐ اپنی علالت میں بار بار فرما رہے ہیں۔

نفذو اجیش اسامة

اسامہ کے لشکر کو روانہ کرو

(اعلام الوریٰ)

مگر مصلحت بنی اور سیاسی عاقبت اندیشی خدا اور سولؐ کے ان تمام احکام اور تاکیدوں کے اثر پر غالب رہی اور یہ لشکر رسولؐ کی زندگی میں نہ جانا تھا' نہ گیا۔

رسولؐ کی علالت اور زندگی کے آخری لمحات

ماہ صفر کی آخری تاریخوں میں حضرتؐ پر بیماری کا زیادہ غلبہ ہوا۔ آپ نے اندازہ فرمایا کہ اس کے بعد آپ کی جسمانی طاقت زیادہ ساتھ نہ دے گی۔ آپ نے حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھے۔ اصحاب کی ایک جماعت حضرت کے پیچھے چلی۔ حضرتؐ جنّت البقیع میں تشریف لے گئے جہاں آپ کے خاص خاص اعزا و احباب دفن تھے۔ یہاں آپ نے اہل قبور کو سلام کیا اور اس تخاطب میں اپنے ساتھ والوں کو یہ اطلاع دی کہ اب میرے بھی دنیا سے جانے کا وقت قریب ہے اور پھر ان سب کے سب نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ مجھے غسل تم ہی دینا اور کسی کی نگاہ میرے پورے جسم پر نہ پڑے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ یہ سہ شنبہ کے دن کا واقعہ ہے اس کے بعد حضرت نے بیت الشرف کی طرف مراجعت فرمائی۔ اور اس کے بعد مرض میں اور شدت ہوئی اور جسمانی ضعف و نقاہت میں اضافہ ہوگیا۔

آخری خطبہ یا قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے پیغام عمل

جمعہ کے دن حضرتؐ نے آخری خطبہ ارشاد فرمایا جس میں مسلمانوں کو قیامت تک کے لئے بڑی اہم ہدایت تھی مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسے فراموش کر دیا۔ یہاں تک کہ عام مسلمانوں کی تاریخ میں اس کا ذکر بھی نہیں ملتا۔ ہمارے علماء اور مورخین میں جناب شیخ مفید نے ارشاد میں اور علامہ طبری نے

اعلام الوریٰ میں یہ خطبہ درج فرمایا ہے- اس میں حضرتؑ نے فرمایا:-

یا معشر الناس انه لیس بین اللّٰه و بین احد شیئی یعطیه به خیرا او یصرف به عنه شرا الا العمل الصالح ایها الناس لا یدع مدع ولا یتمن متمن والذی بعثنی بالحق لا ینجینی الا العمل مع رحمة اللّٰه و الو عصیت لهلکت اللهم بلغت ثلثاً-

اے گروہ مردم! یقین جانو کہ اللہ اور کسی بھی شخص کے درمیان کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اسے کچھ بھلائی عطا کر سکے یا اس سے کسی برائی کو دور کرے سوا نیک اعمال کے - اے گروہ مردم! کوئی دعویدار دعوے نہ کرے اور کوئی سبز باغ دیکھنے والا آرزوؤں کے سبز باغ نہ دیکھے- قسم اس کی جس نے مجھے سچائی کے ساتھ بھیجا ہے مجھے بھی سوا عمل کے کوئی چیز نہیں جو نجات دے ہاں اس کے ساتھ اللہ کی رحمت اور اگر میں بھی نافرمانی کروں تو کہیں کا نہ رہوں- پھر تین دفعہ کہا (گواہ رہنا) میں نے جو پہونچانا تھا' پہنچا دیا-

(ارشاد مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۸۵- اعلام الوریٰ طبع ایران صفحہ۵۷)

یہ فرما کر حضرت منبر سے نیچے اترے اور نماز پڑھائی- پھر گھر کی طرف واپس تشریف لے گئے-

نقل مکان اور امامت نماز کا منصوبہ

اب تک حضرتؐ ام المومنین جناب ام سلمہؓ کے مکان میں تھے۔ اب جب کہ آثار و قرائن سے سب کو محسوس ہوا کہ حضرتؐ کے اس دار دنیا میں آخری دن ہیں تو ام المومنین عائشہؓ نے آکر درخواست کی کہ آپؐ میرے یہاں تشریف لے چلیں۔ میں تیمار داری کروں گی۔ مجسمہ خلق عظیم نے اس درخواست کو منظور فرما لیا۔ سب کے اندازہ کے مطابق پیغمبرؐ کی طبیعت گری رہتی تھی اور اب یہ عالم تھا کہ اکثر اوقات غشی طاری رہتی تھی۔ اسی میں صبح کے وقت بلال نے آکر جب اطلاع دی تو اس رات شاید خاص طور پر جناب عائشہ مکان میں ام المومنین حفصہ بھی موجود تھیں۔ آپس میں کہا گیا کہ پیغمبرؐ خدا کی حالت اس کی متقاضی نہیں ہے کہ وہ خود نماز کے لئے تشریف لے جائیں' اس لئے کسی اور کو اس وقت نماز پڑھانے کے لئے کہہ دیا جائے۔ چنانچہ جناب عائشہؓ نے اپنے پدر بزرگوار حضرت ابوبکرؓ کو تجویز کیا اور جناب حفصہ نے اپنے والد ماجد حضرت عمرؓ کا نام لیا مگر تیزی سے کام لے کر چکے سے حضرت ابوبکرؓ کے پاس آدمی بھیج دیا گیا کہ حضرت کی حالت دگرگوں ہیں۔ اس وقت نماز آپ پڑھائیے۔۔۔ یہی وہ کانٹے کی نماز جماعت ہے جس کی تاریخ نہیں بلکہ علم کلام و مناظرہ کی فضا میں زبردست گونج ہے۔

یہاں ہماری تاریخ جو بتاتی ہے ' وہ علامہ طبری" کی لفظوں میں یہ ہے۔

قالت عائشه مروا ابابکر لیصلی بالناس و قالت حفصة مروا عمر فقال صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم اکففن فانکن صویحبات یوسف ثم قام و هولاء یستقل علی الارض من الضعف و کان عنده انهما خرجا الی اسامة فاخذ بیده علی ابن ابی طالب و فضل بن عباس فاعتمدها و رجلاه یخطان الارض من الضعف فلما خرج الی المسجد و جد ابا بکر قد سبق الی المحراب فاؤما الیهم بیده فتاخر ابوبکر و قام رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و کبر و ابتدء الصلواۃ فلما اسلم وانصرف الی منزله استدعی ابابکر و عمر و جماعته ممن حضرت المسجد ثم قال۔ الم امرکم ان تنفذو جیش اسامة۔ فقال ابوبکر انی کنت خرجت ثم عدت لا حدث بلئ عهدا۔ و قال عمر انی لم اخرج لاننی لم احب ان اسال عنلئ الرکب۔ فبقال نفذوا جیش اسامة یکررها ثلاث مرات - ثم اغمی علیه من التعب الذی لحقه۔

حضرت عائشہؓ نے کہا حضرت ابوبکرؓ سے کہو وہ نماز پڑھائیں اور حفصہ نے کہا کہ عمرؓ سے کہو۔ حضور رسول خداؐ نے فرمایا یہ باتیں ختم کرو تم یوسف کا جن سے سابقہ پڑا تھا ویسی ہی عورتیں ہو۔ پھر کھڑے ہو گئے اس عالم میں کہ بے سہارا زمین پر کھڑے نہیں ہو سکتے تھے اور حضرت کے نزدیک وہ دونوں اسامہ کے لشکر میں گئے ہوئے تھے تو آپ نے علی بن ابی طالب اور فضل بن عباس کا ہاتھ پکڑا اور ان کا سہارا لیا اور آپ کے پیر کمزوری سے زمین پر کھنچتے جا رہے تھے جب آپ مسجد میں پہنچے تو حضرت ابوبکرؓ کو دیکھا کہ وہ محراب میں پہنچ چکے ہیں۔ آپ نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو حضرت ابوبکرؓ پیچھے ہٹے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہوئے اور آپ نے تکبیر کہہ کے نماز شروع کی۔ جب آپ نے سلام پھیرا اور مکان کی طرف

مراجعت فرمائی تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور کچھ دوسرے لوگوں کو جو مسجد میں تھے طلب فرمایا۔ پھر فرمایا' کیا میں نے تم لوگوں کو یہ حکم نہیں دیا تھا کہ اسامہ کے لشکر کے ساتھ روانہ ہو۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ میں گیا تھا۔ پھر واپس آیا کہ آپ کی ایک دفعہ زیارت اور کر لوں اور حضرت عمرؓ نے کہا میں نہیں گیا اس لئے کہ میں نے یہ نہیں چاہا کہ میں مسافروں سے جو یہاں سے جائیں آپ کا حال پوچھتا رہوں۔ یہ سن کر حضرت نے پھر تین دفعہ فرمایا ارے اسامہ کے لشکر کو روانہ کرو۔ اس کے بعد اس تھکان سے جو آپ کو ہوئی تھی' آپ پھر بیہوش ہو گئے۔

واقعہ نماز کی یہی تفصیلی کیفیت اس سے متقدم عالم جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ نے بھی درج کی ہے۔

اب اس میں جمہور کے مصنفین نے جو جو گل افشانیاں فرمائی ہیں' انہیں دیکھئے اور پھر اگر ضمیر کچھ پتا دے کہ اصلیت کیا ہے تو اسی کو اصل تاریخی حقیقت سمجھئے۔

علامہ ابن خلدون جو تاریخ کے امام مانے جاتے ہیں اور درایت کو روایت سے مقدم سمجھتے ہیں' وہ فرماتے ہیں کہ رسولؐ کے پہنچنے پر حضرت ابوبکرؓ نے پیچھے ہٹنا چاہا۔ حضرتؐ نے کھینچ کر انہیں ان کی جگہ پر کھڑا کیا۔ اور جہاں تک سورہ انہوں نے پڑھا تھا' وہاں سے خود شروع کر دیا۔ اب نماز یوں ہوئی کہ حضرت ابوبکرؓ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتدا میں نماز پڑھی' اور باقی سب نے حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا کی۔

اب یہ بات فقہائے امت کے طے کرنے کی ہے کہ پوری جماعت ایک امام کی مقتدی ہو اور وہ امام کسی دوسرے کا ماموم بنا ہوا نماز پڑھ رہا ہو۔

محدث دہلوی شاہ عبدالحق نے اس کی تشریح کچھ اس طرح کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی حیثیت امام جماعت نہیں' بلکہ مکبر کی رہ جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

حضرت "ابوبکرؓ مقتدی بوے بودند و مردمان مقتدی بہ ابوبکر بودند یعنی بواسط تکبیر دے برافعال و انتقالات پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم وقوف می یافتند"

غالباً علامہ شبلی نے انہی کی پیروی کی ہے جو یہ الفاظ لکھے ہیں کہ "آپؐ کو دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کو دیکھ کر دوسرے لوگ ارکان ادا کرتے جاتے تھے"۔

(سیرت النبی حصہ دوم صفحہ ۱۷۷)

ان کے شاگرد رشید شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں۔

"غسل فرما کر حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے سہارے مسجد تشریف لے گئے۔ جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے۔ آپ کی آہٹ پا کر پیچھے ہٹے۔ آپ نے اشارہ سے روکا اور ان کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھائی"۔

(تاریخ اسلام حصہ اول صفحہ ۱۱۴)

جناب ندوی صاحب نے بھی بلاشبہ حقیقت پسندی سے کام لیا ہے کہ انہوں نے "نماز پڑھی کے بجائے "نماز پڑھائی" لکھا ہے۔

(اعلام الوریٰ صفحہ ۱۴۱)

نفسیاتی کرب و اذیت
اور
آخری کوشش

تاریخ کا شروع سے دوبارہ ایک طائرانہ مطالعہ کر لیجئے اور اگر پھر محسوس ہو سکتا ہے تو محسوس کیجئے کہ وہ پیغمبرؐ جس نے ہدایت خلق کے لئے تمام مصائب برداشت کئے' پوری زندگی اسی کاوش میں صرف کی اور اب دنیا سے اٹھنے کا زمانہ جتنا جتنا قریب آتا گیا' اسے برابر یہ فکر رہی اور بڑھتی گئی کہ اس کے بعد اس کی محنت برباد نہ ہو جائے۔ اس کے لئے اس نے بعد کے لئے مسلسل ہدایتیں کیں' اظہار اعلانات کئے اور کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اب وہ اپنے آخری لمحات حیات میں اپنی آنکھوں سے ہوا کا رخ بدلا ہوا دیکھ رہا ہے۔ وہ مسلمان جن کو سبق یہ دیا گیا ہے کہ کبھی حکم پیغمبرؐ سے انحراف نہ کرنا' جس کے لئے رسولؐ کا ایک اشارہ اس کے پہلے منصوبوں کی تکمیل کے لئے کافی ہوا کیا--- اس وقت رسولؐ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ان کی مسلسل تاکیدوں اور سخت سے سخت الفاظ میں تنبیہوں کے باوجود عوام کا کیا ذکر' وہ خواص جن پر عوام کی نگاہیں پڑ سکتی ہیں۔ ذرہ بھر ان کے احکام پر عمل کرنا کیسا' پرواہ نہیں کر رہے ہیں۔ اس سے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فطری طور پر محسوس فرما سکتے ہیں کہ جب میرے سامنے صرف میری بیماری کے ضعف و نقاہت کو دیکھ کر اس طرح میری ہدایتوں کی مخالفت ہو رہی ہے تو میرے بعد کیا ہوگا؟ آپ کو نماز جماعت والے معاملہ سے اب شدت کے ساتھ یہ مشاہدہ ہو گیا کہ

جس ہستی کو خدا اور رسولؐ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے آگے بڑھانا ضروری سمجھتے تھے' اس وقت آپ کے گرد و پیش یہ پالیسی کارفرما ہے کہ اس ہستی کو نظرانداز کیا جائے' دوسرے لوگوں کو آگے بڑھایا جائے اور اب یہ بالکل نمایاں ہو گیا تھا کہ لشکر اسامہ کی روانگی میں تاخیر صرف انہی منصوبوں کی تکمیل کے لئے جو منشائے خدا و رسولؐ کے خلاف قرار دیئے گئے ہیں۔ دنیا رسولؐ کے بس مرض کی حالت دیکھ رہی تھی اور کرب و اذیت کو اسی کا نتیجہ سمجھتی یا سیاسی طور پر ظاہر کرنا چاہتی تھی مگر حقیقتاً حضرت کو اس مرض کی تکلیف سے زیادہ اس وقت روحانی کرب و اذیت بے چین کئے ہوئے تھی۔

اس عالم میں آپ نے آخری کوشش اتمام حجت کی فرمائی اور ارشاد کیا کہ میرے پاس دوات و قرطاس (کاغذ) لے آؤ کہ میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھ دوں جس سے میرے بعد قیامت تک کے لئے تم گمراہی سے محفوظ ہو جاؤ۔ اسے پہلے ایک شیعہ مورخ کے قلم سے دیکھئے' پھر مورخین و محدثین اہل سنت کے بیانات سے اس کی مطابقت کیجئے۔

اغمی علیہ من التعب الذی لحقه فمکث لفیئة و بکی المسلمون و ارتفع النحیب من ازواجه وولده و من حضرة فافاق فقال۔ ایتونی بدواة و کنف اکتب لکم کتابا لا تضلوا بعده ابدا ثم اغمیٰ علیه فقام بعض من حضیض اصحابه لیلتمسوا دواة و کتفا فقال له عمر ارجع فانه یهجر فلما افاق قال بعضهم الا ناتیك یا رسول اللّٰه بکتف و دواة فقال ابعدالذی قلتم؟ لا

اس شدید تکان سے جو حضرت کو ہوئی' آپؐ پر غشی طاری ہو گئی اور دیر تک یہ حالت رہی اور مسلمانوں میں شور و گریہ بلند ہوا اور حضرت کی ازواج و اولاد اور تمام حاضر الوقت اشخاص کی صدائے گریہ تو حضرت نے غش سے آنکھیں کھولیں اور فرمایا دوات لے آؤ اور (ذبیحہ جانور کا) شانہ (جس پر مثل کاغذ کے اس زمانہ میں لکھا جاتا تھا) میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھ دوں کہ تم کبھی اس کے بعد گمراہ نہ

ہو۔ اس کے بعد پھر حضرت کو غشی آ گئی اور اب مخصوص حاضر الوقت اشخاص میں سے کوئی اٹھا کہ دوات اور ایسی چیز (شانہ) جس پر لکھا جا سکے لے آئے تو حضرت عمرؓ نے اس سے کہا کہ واپس آ جاؤ۔ حضرت پر ہذیانی کیفیت طاری ہے۔ اب حضرت نے جو آنکھ کھولی تو کسی نے کہا، اے رسول خداؐ کیا دوات اور وہ شانہ جس پر لکھا جائے آپ کے پاس لاؤں آپ نے فرمایا کیا اس جملہ کے بعد جو تم لوگوں نے کہہ دیا اب؟ نہیں (اب بے کار ہے)

(ارشادات و اعلام الوریٰ صفحہ ۱۴۱)

اب اہل سنت کے صحاح حدیث و تاریخ کو دیکھتے ہیں تو وہاں یہ واقعہ زیادہ واضح انداز میں ملتا ہے۔

صحیح بخاری میں سعید بن جبیر کی زبانی ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں۔

یوم الخمیس و ما ادرئ ما یوم الخمیس اشتد بر سول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجعہ فقال ائتونی اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدہ ابدا فتنا زعوا ولا ینبغی عند نبی تنازع فقالو اما شانہ اھجر استفھمو فذھبوا یردون علیہ فقال دعونی فالذی انا فیہ خیرا ما تدعون الیہ

روز پنجشنبہ اور تمہیں کیا معلوم روز پنجشنبہ کیا ہے؟ رسول خداؐ پر مرض کی شدت ہو گئی تو آپ نے فرمایا۔ لاؤ میں تمہارے لئے ایک نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو گے اس کے بعد ان لوگوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ کسی نے کہا کہ پیغمبر کے پاس جھگڑا ٹھیک نہیں ہے۔ کچھ نے کہا کہ ان کو کیا علم ہے؟ کچھ نے کہا (معاذ اللہ) ہذیانی کیفیت ہے۔ پھر دوبارہ دریافت کر لو تو گئے آپ کے پاس کہ پھر پوچھیں - فرمایا چھوڑ دو مجھے میں جس حال میں ہوں، بہتر ہے اس سے جس کے تم مجھ سے طلب گار ہو۔

(صحیح بخاری مع تیسر الباری شائع کردہ امجد اکیڈمی لاہور جلد ۴ صفحہ ۳۲۷)

دوسری حدیث پھر بخاری میں اس کے بعد ہے۔

عن الزهری عند عبید اللّٰہ بن عبداللّٰہ ابن عتبۃ عن ابن عباس قال لما حضر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و فی البیت رجال فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم هلموا اکتب لکم کتابا لا تضلوا بعدہ فقال بعضھم أن رسول اللّٰہ قد غلب علیه الوجع و عندکم القرآن حسبنا کتاب اللّٰہ واختلف اھل البیت واختصموا فمنھم من یقول قربوا کتب لکم کتابا لا تضلوا بعدہ و منھم من یقول غیر ذلک فلما اکثروا اللغط والاختلاف قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قوموا عنی قال عبید اللّٰہ کان یقول ابن عباس ان الرزیۃ کل الرزیۃ باحال بین رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و بین ان تکتب لھم ذلک الکتاب

زہری کی روایت ہے عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ کے ذریعہ سے جناب ابن عباس سے کہ جب حضرت پیغمبر خداؐ کے احتضار کا عالم قریب تھا' اس وقت گھر میں کچھ لوگ تھے۔ حضرتؐ نے فرمایا آؤ! میں تمہیں ایک نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد گمراہ نہ ہو اس پر بعض اشخاص نے کہا کہ رسول خداؐ پر مرض کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے کتاب الٰہی ہمارے لئے کافی ہے۔ اب گھر والوں میں اختلاف ہوا اور ان میں جھگڑا ہونے لگا۔ کوئی کہتا تھا قلم دوات لے آؤ وہ تمہارے لئے ایسا نوشتہ لکھ دیں جس کے بعد گمراہ نہ ہو اور کوئی کچھ اور کہتا تھا تو جب بہت شور و غوغا ہوا تو رسول خداؐ نے فرمایا کہ میرے پاس سے اٹھ جاؤ۔ عبیداللہ کا بیان ہے کہ ابن عباس کہتے تھے مصیبت ' اصل مصیبت پوری کی پوری وہی تھی کہ رسول خداؐ کو تحریر لکھنے نہ دی گئی۔

(صحیح بخاری مع تیسرالباری جلد ۴ صفحہ ۳۲۸)

مسند امام احمد بن حنبل میں کئی جگہ یہ حدیث ہے جن میں سے بعض میں اس ابہام کو دور کر دیا گیا ہے کہ رسولؐ کی طلب پر اصل مخالفت کرنے والا اور ان خاص جملوں کا کہنے والا کون تھا؟

(۱) جلد ۵ صفحہ ۱۱۶)

عن سعید بن جبیر عن ابن عباس انه قال یوم الخمیس وما یوم الخمیس، ثم نظرت دموعه علی خدیه نحدر کانها نظام اللؤلو قال، قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ائتونی باللوح والدواة اذا الکتف اکتب لکم کتابالن تضلوا بعده ابدا فقالوا رسول اللّٰہ یهجر

سعید بن جبیر کی روایت ہے کہ ابن عباس سے کہ انہوں نے کہا پنجشنبہ کا دن اور کیا تھا وہ پنجشنبہ کا دن پھر میں نے دیکھا کہ ان کے آنسو ان کے دونوں رخساروں پر موتیوں کی لڑی کی طرح مسلسل بہہ رہے ہیں انہوں نے کہا کہ پیغمبر خدا نے فرمایا کہ میرے پاس تختی اور دوات یاشانہ گوسفند (جس پر لکھا جاتا تھا) لاؤ تو میں ایک تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم کبھی بھی گمراہ نہ ہو تو لوگوں نے کہا کہ پیغمبر (معاذ اللہ) ہذیان بک رہے ہیں۔

(۲) جلد ۵ صفحہ ۴۸

عن عبید اللّٰہ بن عبداللّٰہ بن عباس قال لما حضر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم و فی البیت رجال و فیهم عمر بن الخطاب قال النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعده ابدا فقال عمر ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قد غلب علیه الوجع و عند نا القر آن حسبنا کتاب اللّٰہ۔ فاختلف اهل البیت فاختصموا فمنهم من یقول قربوا یکتب لکم کتابا لا یضلوا بعده و منهم من یقول ما قال عمر فلا اکنووا اللغو والاختلاف عند رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قوموا قال عبید اللّٰہ و کان ابن عباس یقول ان الرزیة کل الرزیة ما حال بین رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلمو بین ان یکتب لهم ذلک الکتب من اختلافهم و لغطهم

عبیداللہ بن عبداللہ کی روایت ہے ابن عباس سے۔ انہوں نے کہا کہ جب رسول خدا کے احتضار کا وقت قریب آیا، اور اس وقت مکان میں کچھ لوگ تھے جن میں حضرت عمرؓ بن خطاب بھی تھے۔ رسولؐ نے فرمایا میں تمہارے لئے ایک تحریر

لکھ دوں جس کے بعد تم لوگ کبھی گمراہ نہ ہو تو عمرؓ نے کہا کہ رسول خداؐ پر مرض کی تکلیف کا غلبہ ہے اور ہمارے پاس قرآن موجود ہے کتاب خدا ہمارے لئے کافی ہے تو گھر میں اس وقت جو لوگ تھے ان میں اختلاف ہو گیا جس نے جھگڑے کی صورت اختیار کر لی۔ ان میں سے کوئی کہتا تھا ان کے پاس لے آؤ کہ لکھ دیں تمہارے لئے تحریر جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو اور بعض ان میں سے وہ کہتے تھے جو حضرت عمرؓ نے کہا تھا تو جب بے ہودگی اور اختلاف رسول خدا کے پاس بہت ہوا تو حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا کہ اٹھ جاؤ۔ عبیداللہ کا بیان ہے کہ ابن عباس کہتے تھے کہ مصیبت ساری مصیبت وہی تھی کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ کو اس تحریر کے لکھنے سے اختلاف اور شور و غل کر کے ان سے کہیں کہ اب وہ نوشتہ تحریر فرمائیں۔

(۳) جلد ۴ صفحہ ۲۳۵

عن طاوس عن ابن عباس قال لما حضر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ائتونی بکتف اکتب لکم فیہ کتابا لا یختلف منکم رجلان بعدی و قال فاقبل لقوم فی لغطھم فقالت المراۃ و یحکم عھد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

طاؤس کی روایت ہے ابن عباس سے انہوں نے کہا جب رسول خداؐ کے احتضار کا وقت قریب تھا تو فرمایا لاؤ ایک شانہ کہ اس میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھ دوں جس سے پھر تمہارے اور کسی دو آدمیوں میں اختلاف نہ ہو اس پر لوگ شور و غل کرنے لگے۔ تو خاتون نے کہا ارے وائے ہو تم پر رسول خداؐ کے عہد و پیمان کو یاد کرو۔

اس روایت میں یہ آخری ایک جز بڑا خاص ہے مگر راوی نے خاتون کے الفاظ کو مبہم چھوڑ کر یہ تشنگی باقی رکھی کہ وہ محترم خاتون کون تھیں جنہوں نے ان صحابہ کو مختصر مگر ایسے سخت الفاظ میں متنبہ کیا اور پھر وہ عہد و پیمان کیا ہے جسے ان خاتون نے یاد دلایا۔

(۴) جلد ۴ صفحہ ۳۵۶

عن عبیداللّٰہ بن عبداللّٰہ و ابن عباس قال لما حضرت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الوفاۃ قال ھلم اکتب لکم کتابالن تضلوا بعدہ و فی البیت رجال فیھم عمر بن الخطاب فقال ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قد غلبہ الوجع و عندکم القر آن حسبنا کتاب اللّٰہ قال فاختلف اھل البیت فاختصموا فمنھم من یقول یکتب لکم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم او قال قربوا یکتب لکم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و منھم من یقول ما قال عمر فلما اکثروا اللغط و الاختلاف و غم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال قوموا عنی فکان ابن عباس

عبیداللہ بن عبداللہ کی روایت ہے ابن عباس سے کہ جب حضرت رسولؐ خدا کی وفات کا وقت قریب ہوا تو فرمایا۔ آؤ میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو اور اس وقت اس مکان میں بہت سے لوگ تھے جن میں حضرت عمرؓ بن خطاب بھی تھے تو انہوں نے کہا کہ رسولؐ خدا پر مرض کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے ہی۔ ہمارے لئے کتاب خدا کافی ہے وہ کہتے تھے کہ اس مکان کے آدمیوں میں اختلاف ہوا جو جھگڑے کی حد تک پہنچا تو ان میں کوئی کہتا کہ رسولؐ خدا تمہارے لئے لکھ دیں جو لکھنا چاہتے ہیں یا یہ کہا کہ پاس لے آؤ (دوات وغیرہ) کہ رسولؐ خدا تمہارے لئے لکھ دیں اور ان میں سے بعض وہی کہہ رہے تھے جو حضرت عمرؓ نے کہہ دیا تھا تو جب بکواس اور اختلاف بہت ہوا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سے تکلیف ہوئی تو آپ نے فرمایا میرے پاس سے اٹھ جاؤ۔ تو ابن عباس کہتے تھے کہ مصیبت ساری مصیبت وہی تھی کہ رسولؐ خدا کو اس تحریر کے لکھنے سے اختلاف اور بکواس کرکے روک دیا گیا۔

آخری وصیتیں

"دواۃ و قرطاس" کے واقعہ کے بعد حضرت کو جماعت کی طرف سے اتنا صدمہ پہنچا کہ آپ نے لوگوں کی طرف سے منہ موڑ لیا اور پھر ایک حرف زبان مبارک پر جاری نہیں ہو پایا۔ جب سب نے یہ دیکھا تو اٹھ گئے اب خاص آپ کے اعزاء رہ گئے۔ تھوڑی دیر میں یہ حضرات بھی رخصت ہوئے۔ حضرت نے فرمایا کہ میرے چچا عباس اور بھائی علیؑ ابن ابی طالب کو واپس بلا لو۔ یہ دونوں آدمی آ کر بیٹھے۔ حضرتؐ نے پہلے اپنے عم محترم کو مخاطب کرکے فرمایا۔ چچا! آپ میری وصیت کو پورا کرنے کی ذمہ داری لینے اور جن جن سے میرے جو وعدے ہیں ان کو پورا کرنے اور میرے قرضے ادا کرنے پر تیار ہیں؟ جناب عباسؓ نے کہا' میں اب سن رسیدہ ہو گیا ہوں اور اہل و عیال بھی میرے بہت ہیں اور آپ کی فیاضی ہوا کا مقابلہ کرتی ہے۔ نجانے آپ نے کس کس سے آپ نے کتنے وعدے کر لئے ہوں۔ میں اس ذمہ داری کے پورا کرنے سے قاصر ہوں۔ اس پر حضرتؐ نے جناب علیؑ ابن ابی طالب کی طرف رخ کیا اور وہی سب باتیں پیش فرمائیں۔ آپ نے تمام باتوں کا اقرار کیا۔ تب حضرتؐ نے آپ کو گلے لگایا اور اپنی انگوٹھی انگلی سے نکال کر دی کہ اسے تم پہن لو۔ اس کے بعد اپنی تلوار اور اپنی زرہ منگوائی اور فرمایا ان چیزوں کو میری زندگی میں اپنے قبضہ میں لے لو اور اپنے مرکب خاص کو زین و لجام سے آراستہ کرکے آپ کو دیا اور کہا اسے اپنے گھر پر لے جاؤ۔

اس سب سے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے گرد و پیش والوں سے غیر مطمئن ہونا بالکل نمایاں تھا اور اس کے ساتھ یہ بھی یقینی ہے کہ آپ کے پاس ہی وہ عنصر موجود تھا جو یہ خبریں باہر ان افراد کو جنہیں اس سے دلچسپی ہو سکتی تھی پہنچا

رہا تھا جس کی بنا پر خدا و رسولؐ کے مقصد کو پامال کرنے کی ادھر پوری تیاری ہو رہی تھی جس پر سے پردہ اس وقت اٹھے گا جب اس کا وقت آئے گا۔

زندگی کا آخری دن اور وفات

گذشتہ واقعات کے بعد ایک دن ایسا گذرا کہ جس میں حضرتؐ نے ممانعت فرما دی تھی کہ کوئی میرے پاس آئے نہیں اور حالت حضرتؐ کی غیر ہو گئی۔ حضرت علی ابن ابی طالبؑ حضرتؐ سے کسی وقت بغیر کسی اہم ضرورت کے جدا نہیں ہوتے تھے۔ اتفاق سے کسی ایسی ہی ضرورت سے آپ کہیں چلے گئے تھے' اس دوران میں رسولؐ کی آنکھ کھلی تو فرمایا "ادعوا الی اخی و صاحبی" "میرے بھائی اور میرے رفیق خاص کو میرے پاس لاؤ" یہ کہہ کر ضعف سے آنکھ بند کر لی۔ ان الفاظ کے ابہام سے فائدہ اٹھا کر جناب عائشہؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو بلوا لیا۔ وہ آئے اور رسولؐ نے دیکھا تو منہ پھیر لیا۔ وہ چلے گئے۔ پھر دوسری دفعہ فرمایا۔ "میرے بھائی اور ہمدم کو بلاؤ" اب کی جناب حفصہ نے اپنے والد ماجد جناب عمرؓ کو بلوا لیا اور پہلے ہی کی طرح رسول نے دیکھ کر چہرہ موڑ لیا۔ آخر جناب ام سلمہ رضوان اللہ علیہا نے کہا ارے صاحبو! علی کو بلاؤ۔ ان کا مقصود ان کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اب کوئی جا کر حضرت علیؑ کو بلا کر لایا - جب وہ آئے تو حضرتؐ نے انہیں اپنے قریب بلایا اور سینہ سے لگا کر دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ پھر حضرت علی کھڑے ہو گئے اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آنکھیں بند کر لیں جیسے کہ آرام فرمایا۔ بس اس کے تھوڑی ہی دیر بعد حضرتؐ پر احتضاری کیفیت طاری ہو گئی۔ آپ نے فرمایا۔ یا علیؑ تم میرا سر اپنی گود میں لے لو۔ اپنا ہاتھ میرے منہ کے قریب رکھنا اور میرا دم نکلے تو اپنا ہاتھ اپنے منہ پر مل لینا۔ مجھے قبلہ رخ کر دو اور تم ہی میرے تمام امور کو انجام دینا اور سب سے پہلے تم نماز پڑھانا اور جب تک مجھے قبر میں دفن نہ کر لو' مجھ سے جدا نہ ہونا۔ چنانچہ حضرت علیؑ نے سر مبارک گود میں لے لیا

اور حضرتؐ پر غشی طاری ہو گئی حضرت فاطمہؑ نے جھک کر حضرتؐ کے چہرہ مبارک پر نظر کی اور ایک دم گریہ طاری ہو گیا اور یہ شعر پڑھنے لگیں جسے خود ایک موقع پر رسولؐ پڑھوا چکے تھے۔

و ابیض یستسقی الغمام بوجهه
شمال الیتامٰی عصمة للا رامل

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے آنکھ کھول دی اور بہت کمزور آواز میں فرمایا یہ ہمارے چچا ابوطالب کا شعر ہے، مگر اب اس وقت موقع اس کلام ربانی کے پڑھنے کا ہے کہ۔

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افئن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم

محمد نہیں ہے مگر اللہ کا ایک پیغمبر جس کے پہلے سب پیغمبر گذر گئے تو کیا یہ اگر مر جائے یا قتل کر دیا جائے تو تم لوگ پیچھے پیروں پلٹ جاؤ گے۔

اس ارشاد سے بھی بالکل نمایاں ہیں کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس وقت آخر میں خلق خدا کی فکر ہے اور جیسے آپ آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے ہیں کہ امت نے آپ کی ہدایتیں اور وصیتیں بھلا دی ہیں اور اس کی اکثریت راہ حق سے منحرف ہو گئی ہے۔ اس پر حضرت فاطمہ زہراؑ دیر تک روتی رہیں۔ حضرتؐ نے اشارہ کیا کہ میرے قریب آؤ۔ آپ قریب آئیں تو حضرتؐ نے آہستہ سے آپکے کان میں ایک بات کہی جس پر آپ کا چہرہ بشاش ہو گیا۔

بعد میں حضرت فاطمہؑ نے بیان کیا کہ اس وقت حضرتؐ نے مجھے اطلاع دی تھی کہ تم میرے اہل بیتؑ میں سب سے پہلے مجھ سے آکر ملو گی۔

غنیمت ہے کہ یہ واقعہ شبلی صاحب کو بھی یاد آگیا ہے مگر کس طرح کہ "آپ کو حضرت فاطمہؑ زہرا سے بے حد محبت تھی۔ اثنائے علالت میں ان کو بلا بھیجا۔ (یعنی باوجود اس محبت کے حضرت فاطمہؑ اپنے باپ کی اتنی شدید علالت میں ان کے پاس موجود نہ رہتی تھیں۔ رسولؐ کو بلوانے کی ضرورت ہوتی تھی

(استغفراللہ) تشریف لائیں تو ان سے کچھ کان میں باتیں کیں۔ وہ رونے لگیں ۔ پھر بلا کر کچھ کان میں کہا تو ہنس پڑیں۔ حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا تو کہا پہلی دفعہ آپ نے فرمایا کہ میں اس مرض میں انتقال کروں گا۔ جب میں رونے لگی تو فرمایا کہ میرے خاندان میں سب سے پہلے تمہی مجھ سے آکر ملوگی تو ہنسنے لگیں"

(سیرت النبیؐ حصہ دوم صفحہ ۱۸۰)

اس کے بعد پھر حضرت فاطمہؑ کا ذکر آگیا ہے اور پتا چلتا ہے کہ آپ باپ کے پاس موجود رہتی تھیں۔ وہ ذکر اس طرح ہے کہ۔

" دن جیسے جیسے چڑھتا تھا' آپ پر بار بار غشی طاری ہوتی تھی اور پھر افاقہ ہو جاتا تھا۔ حضرت فاطمہؑ زہرا یہ دیکھ کر بولیں واکرب آباہ "ہائے میرے باپ کی بے چینی" آپ نے فرمایا کہ "تمہارا باپ آج کے بعد بے چین نہ ہوگا"

(سیرۃ نبی صفحہ ۱۸۲)

بس اس کے بعد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا سے رحلت فرمائی۔ اس وقت حسب الحکم حضرت علی بن ابی طالبؑ اپنا داہنا ہاتھ حلقوم مبارک کے نیچے رکھے ہوئے تھے جسے روح اقدس کی مفارقت کے بعد آپ نے اپنے منہ پر ملا۔ پھر جو آداب میت ہیں' انہیں پورا کیا اور تجہیز و تکفین کے انتظامات میں مصروف ہوئے۔

یہ کتنا فطری مرقع ہے پیش آمدہ واقعات کا جو ہماری تاریخ میں درج ہے۔

(سیرۃ النبیؐ جلد ۲ صفحہ ۱۸۴)

بھلا عام تاریخوں کو جو حکومتوں کے زیر سایہ مرتب ہوئیں' توفیق تھی کہ وہ سچی محبتوں کے اس مرقع کو اپنے صفحات میں محفوظ کریں۔

بے شک اس مرحلہ پر جناب شبلی نے بھی لکھا ہے کہ "تجہیز و تکفین کی خدمت خاص اعزاو اقارب نے انجام دی فضل بن عباس اور اسامہ ابن زید نے پردہ کیااور حضرت علیؑ نے غسل دیا۔ حضرت عباس بھی موقع پر موجود تھے اور بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے پردہ بھی کیا تھا"۔

مدینہ میں کہرام

ظاہر ہے کہ صحابہ رسولؐ کی عام جماعت یعنی مدینہ کے تمام مسلمانوں کو تو سیاسیات سے دل چسپی نہ تھی۔ ان پر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کا جو اثر ہوا، اسے ہمارے ہی مورخ نے درج کیا ہے کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کی صدائے نالہ و شیون کے ساتھ تمام مسلمانوں میں کہرام پڑ گیا اور عالم یہ تھا کہ لوگ اپنے سروں پر خاک اٹھا اٹھا کر ڈال رہے تھے۔

تاریخ وفات

حضرتؐ کی وفات ہمارے ہاں کی مشہور روایت کے مطابق ۲۸ صفر ۱۱ھ کو ہوئی اور عام طور پر اہل سنت ۱۲ ربیع الاول مانتے ہیں ہمارے قدیم علماء میں جناب کلینی مصنف کافی نے بھی اسے اختیار کیا ہے اور قرائن کے لحاظ سے میرے نزدیک قوی قول یہ ہے کہ ۲ ربیع الاول کو وفات ہوئی ہے۔

والسلام

علی نقی النقوی

۱۴ جمادی الثانی ۱۴۰۱ھ

کنوز المعجزات

ترجمہ

الخرائج والجرائح

مؤلفہ

علامہ قطب الدّین ابوالحسن سعید بن ھبۃ اللہ راوندیؒ

ترجمہ وحواشی

ملک العلماء مولانا محمد شریف

ناشر

عباس بک ایجنسی

رستم نگر درگاہ حضرت عباسؑ لکھنؤ

Rs. 80/-